ایچ اقبال کلیکشن

(سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کی شاہکار کہانیاں)

(5)

ایچ اقبال کلیکشن

(سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ کی شاہکار کہانیاں)

(5)

مدفون ماضی
چہرہ در چہرہ
ازالہ
انوکھا سودا
دشمن وفا

مدفون ماضی

ایچ اقبال

محبت اور نفرت کے گہرے لیکن متضاد رنگوں کی عکاس ایک پیچ در پیچ کہانی

دولت کی آمد عموماً خوشیوں کا حرفِ آغاز نظر آتی ہے اور اس کے جلو میں موجود بہت سے عذابِ زندگی فوری طور پر انسان کو نظر نہیں آتے۔ وہ تو یہی خیال کرکے خوش ہوتا رہتا ہے کہ اب اس کا ہر مسئلہ چٹکی بجاتے حل ہوجائے گا لیکن جیسے جیسے وہ دولت کی ہم رکابی میں آگے کی جانب قدم بڑھاتا ہے، نت نئے اُلجھاوے اُسے اپنی گرفت میں لیتے چلے جاتے ہیں۔ اُس لاوارث اور مفلوک الحال دوشیزہ کی داستانِ حیرت جو اچانک ایسی ہی خوش کن صورتِ حال سے دوچار ہوگئی تھی۔ بڑے بڑے لوگ اُسے اہمیت دینے لگے تھے۔ امریکا میں مقیم ایک ارب پتی اُس سے مُلاقات کا متمنی تھا تو ایک صاحب کو وہ اپنے ولی عہد کی رفاقت کے لیے مطلوب ہوگئی تھی۔ ایک اور باخبر نے اُسے نوید سُنائی کہ وہ تو ایک جزیرے کی پرنسس ہے۔

اُس شخص کا ماجرائے عبرت جسے اپنے ماضی کو کریدنے کا شوق چرایا تھا

اچھے سازوسامان سے آراستہ وہ کشادہ خواب گاہ تھی۔ چند ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی کے حامل افراد ایسی خواب گاہ کی بس تمنا ہی کرسکتے تھے یا ایسی خواب گاہوں کے خواب دیکھ سکتے تھے لیکن سلطانہ نے کچھ ایسی زندگی گزاری تھی اور اس کا مزاج کچھ ایسا بن گیا تھا کہ اس نے نہ تو کبھی ایسی خواب گاہوں کی تمنا کی تھی اور نہ ان کے خواب دیکھے تھے پھر یہ کہ وہ جس صورتِ حال سے دوچار ہو کر یہاں پہنچی تھی، اس کے باعث وہ یہاں کسی قسم کی آسودگی یا سکون محسوس ہی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے برعکس وہ شدید ذہنی انتشار اور خوف زدگی کا شکار تھی کیونکہ یہاں اسے اغوا کرکے لایا گیا تھا۔

وہ ایک چھوٹے سے پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے تین ہزار روپے ماہانہ کی ملازم تھی اور اس کا قیام بیگم سبحانی کے سایۂ عاطفت میں تھا جو ایک فلاحی ادارہ چلاتی تھیں۔ وہ ادارہ صرف بے آسرا لڑکیوں یا عورتوں کے لیے تھا اور سلطانہ بھی ایک ایسی ہی لڑکی تھی۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا، اور اگر تھا بھی تو وہ اس سے بے خبر تھی۔ اس کی دنیا بیگم سبحانی کے ادارے "سائبان" سے لے کر اپنے اسکول تک اور اپنے اسکول سے سائبان تک محدود تھی۔

اس صبح جب وہ اسکول پہنچی تو بچوں کی حاضری بہت کم تھی۔ ٹیچرز بھی سب نہیں آئی تھیں اور جو آئی تھیں، وہ بھی پریشانی کے عالم میں پرنسپل صاحبہ کے کمرے میں بیٹھی فیصلہ کرنا چاہ رہی تھیں کہ ان حالات میں کیا کیا جانا چاہیے۔

سلطانہ کو معلوم ہوا کہ گزشتہ رات گئے کسی اہم سیاسی شخصیت کو قتل کردیا گیا تھا۔ اس اہم خبر کی وجہ سے اخبارات بھی دیر سے شائع ہوئے تھے۔ جن لوگوں کو اخبار کے بغیر ہی وہ خبر مل گئی تھی، انہوں نے شہر میں کسی امکانی ہنگامے کے پیشِ نظر اپنے بچوں کو اسکول نہیں بھیجا تھا اور جو بے خبر تھے ان کے بچے اسکول آگئے تھے۔ جو ٹیچرز نہیں آئی تھیں، وہ بھی اس سانحے سے باخبر ہوگئی ہوں گی۔

"سائبان" میں بیگم سبحانی کئی اخبار منگاتی تھیں۔ سلطانہ کسی نہ کسی اخبار پر اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد ہی اسکول روانہ ہوتی تھی مگر اس روز اخبارات نہیں آئے تھے۔ اگر سلطانہ ان کا انتظار کرتی تو اسے اسکول پہنچنے میں دیر ہوجاتی لہٰذا وہ بھی اس خبر سے بے خبر رہ گئی تھی۔

وہ خبر اس نے اس اخبار میں دیکھی جو پرنسپل صاحبہ کی میز پر رکھا ہوا تھا۔ باقی ٹیچرز وہ خبر پڑھ چکی تھیں۔

اسکول اسی علاقے میں تھا جہاں وہ سیاسی شخصیت قتل کی گئی تھی۔ ٹیچرز کی دانست میں قوی امکان تھا کہ اس علاقے میں ہنگامے شروع ہوسکتے ہیں اور کچھ تعجب نہیں کہ سارا شہر ہی اس کی زد میں آجائے۔



جلد ہی فیصلہ کرلیا گیا کہ بچوں کی چھٹی کر کے اسکول بند کردیا جائے اور ٹیچرز بھی اپنے اپنے گھروں کا رخ کریں۔ یہ فیصلہ کرنے میں تو انہیں کچھ دیر لگی لیکن اس پر عمل بہت تیزی سے کیا گیا۔

بچوں کو لانے لے جانے والی اسکول کی ایک ہی بس کام آگئی کیونکہ بچوں کی تعداد بھی خاصی کم تھی۔

جو ٹیچرز آئی ہوئی تھیں، وہ بھی اتفاق سے اسی علاقے میں رہتی تھیں۔ صرف سلطانہ کو چھ سات میل دور سے بس میں آنا پڑتا تھا۔ اسکول سے بس اسٹاپ ڈھائی تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ سلطانہ حتیٰ الامکان تیز رفتاری سے اس طرف روانہ ہوئی تھی۔

وہ سڑک ایسی تھی جس پر عموماً بہت کم ٹریفک ہوتا تھا مگر اس وقت تو سلطانہ کو وہ سناٹا کچھ زیادہ ہی گہرا اور پُرہول معلوم ہو رہا تھا۔ اِکّا دُکّا گاڑیوں کے سوا کوئی راہ گیر تک نظر نہیں آرہا تھا۔

قتل کی وہ خبر ایسی تھی کہ نفسیاتی طور پر سلطانہ کے اعصاب پر خوف مسلط ہوگیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ اگر کوئی ٹیکسی یا رکشا مل جائے تو بس اسٹاپ تک اسے پیدل نہ جانا پڑے لیکن کوئی رکشا یا ٹیکسی نظر ہی نہیں آرہی تھی۔

دفعتاً پیچھے سے آنے والی ایک کار سلطانہ کے بالکل قریب پہنچ کر رکی تھی اور سلطانہ کا دل بڑی زور سے اُچھل پڑا تھا لیکن اس وقت اس نے کچھ سکون محسوس کیا جب ڈرائیونگ سیٹ پر چالیس پینتالیس سال کی ایک فیشن ایبل عورت نظر آئی تھی۔

”بے بی! تم ان حالات میں اکیلی، اور پھر پیدل کہاں جارہی ہو؟“ عورت نے انگریزی میں کہا تھا اور اس کا لب ولہجہ بھی خاصا شائستہ تھا۔

”کوئی ٹیکسی نظر ہی نہیں آرہی ہے اس لیے میں بس اسٹاپ کی طرف جارہی ہوں۔“ سلطانہ نے جواب دیا تھا۔

”اس وقت شاید تمہیں کوئی بس بھی نہ ملے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں رات کو کیا ہوچکا ہے؟“

”میں یہاں ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ یہاں آنے کے بعد ہی مجھے اس کا علم ہوا تھا۔“

”تم کہاں رہتی ہو؟“

سلطانہ نے صرف اس سڑک کا نام بتا دیا جہاں ”سائبان“ کی دو منزلہ عمارت تھی۔

”چلو میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔ مجھے اسی طرف سے جانا ہے۔“

”ارے نہیں، میں دیکھتی ہوں۔ بس شاید مل ہی جائے۔“

”ان حالات میں پیدل چلنا بہت مخدوش ہے۔ ذرا ہی دیر پہلے یہاں سے ایک تیز رفتار کار گزری تھی اور اس میں بیٹھے ہوئے نامعلوم افراد نے ہوائی فائرنگ کی تھی۔“

یہ سنتے ہی سلطانہ کی سراسیمگی میں کچھ اور اضافہ ہوگیا تھا۔

”آؤ۔“ عورت نے اپنی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا ”ایسے وقت میں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔“

خوف زدہ سلطانہ تذبذب کی کیفیت میں کار میں بیٹھ گئی تھی۔ اسے کچھ اطمینان یہ بھی تھا کہ کار میں وہ عورت اکیلی تھی اور مہذب اور شائستہ بھی معلوم ہو رہی تھی لیکن اگر اس کے ساتھ مرد ہوتے یا کسی مرد ہی نے سلطانہ کو لفٹ دینا چاہی ہوتی تو وہ ہرگز کار میں نہ بیٹھتی۔

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”سلطانہ۔“

”میرا نام عابدہ گل ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے اپنے پرس سے ایک رومال نکالا اور سلطانہ کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی ”اپنا چہرہ صاف کرلو۔ تمہارے چہرے پر ہوائیاں بھی اڑ رہی ہیں اور پسینا بھی چمک رہا ہے۔“

”ارے نہیں۔“ سلطانہ نے جلدی سے کہا ”رومال کی ضرورت نہیں۔ میں....“

”تم کچھ ضدی بھی ہو!“ عابدہ گل ہنس پڑی پھر اس نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر رومال سلطانہ کے چہرے پر رکھ دیا تھا۔

سلطانہ نے نہایت تیز اور عجیب سی خوشبو محسوس کی۔

”یہ.... یہ....“ سلطانہ کی زبان میں لکنت آگئی۔

”یہ فرانس کا بہت عمدہ سینٹ ہے۔“ عابدہ گل کے ہونٹوں پر بڑی عیارانہ مسکراہٹ تھی۔

سلطانہ نے چاہا کہ رومال اپنے چہرے سے ہٹا دے لیکن وہ اپنے ہاتھوں کو حرکت ہی نہ دے سکی۔ اس سے پہلے ہی اس کے دماغ پر گہرا اندھیرا پھیلتا گیا تھا۔

پھر جب ہوش آیا تو وہ اس خواب گاہ میں تھی۔ اس کی آنکھ بستر پر کھلی تھی۔ ذرا دیر تک تو اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں ہے لیکن جب اس کے دماغ نے باقاعدگی سے کام شروع کیا تو وہ بوکھلا کر بستر سے اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ دروازہ کھولنے میں اسے ناکامی ہوئی تھی۔ وہ مقفل تھا۔ سلطانہ نے گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں اسے بُری طرح پیٹ ڈالا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، کوئی وہاں نہیں آیا۔

”یا میرے خدا! یہ کیا ہوگیا!“ وہ بڑبڑاتی ہوئی پاگلوں کی طرح کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ عابدہ گل کون تھی اور اس نے اسے اس طرح اغوا کیوں کیا تھا۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ وہ کبھی ٹہلنے لگتی، کبھی بستر یا کرسی پر بیٹھ جاتی۔ اچانک اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اس نے وہاں ایک چھوٹا فریج رکھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس کے پاس گئی۔

پانی پی کر وہ پھر ٹہلنے لگی۔

کوئی ساڑھے بارہ بجے کے قریب اس نے دروازے پر آہٹ

سنی تو چونکی اور ایک جگہ کھڑی ہوگئی۔ وہ ایسی کھڑکھڑاہٹ سن رہی تھی جیسے دروازے کے لاک میں چابی گھمائی جارہی ہو۔ اس کا رواں رواں خوف سے کھڑا ہوگیا۔ اسے ابھی ابھی خیال آیا تھا کہ عابدہ گل کسی ایسے گروہ کی آلۂ کار تو نہیں جو لڑکیوں کا کاروبار کرتا ہو!

دروازہ کھلا اور عابدہ گل مسکراتی ہوئی اندر آئی۔ اس وقت اس کے جسم پر آسمانی رنگ کی ساری تھی۔ کار میں سلطانہ نے اسے پنک کلر کی ساری میں دیکھا تھا۔

"مجھے افسوس ہے۔ تم اتنی دیر تک بہت پریشان رہی ہوگی۔" عابدہ گل آگے آتے ہوئے بولی "دراصل مجھے فوراً ہی ایک ضروری کام سے جانا تھا ورنہ میں تمہارے ہوش میں آنے تک ضرور رکتی۔ اوہ! تم کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھو نا!"

لیکن سلطانہ نے بیٹھے بغیر خوف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "تم کون ہو؟ تم نے مجھے اغوا کیوں کیا ہے۔"

"اغوا۔" عابدہ گل جیسے اچانک سوچ میں پڑ گئی، پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں۔ حالات کی روشنی میں تم اسے اغوا ہی سمجھ سکتی ہو، لیکن یقین کرو کہ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ اگر میں اس طرح تمہیں یہاں نہ لے آتی تو تمہارے حق میں بہت بُرا ہوتا۔"

"کیا اب کچھ اچھا ہوا ہے؟"

"یقیناً۔" عابدہ گل نے کہا "تمہیں چند ہی دن میں اس کا اندازہ ہوجائے گا۔"

"چند دن!" سلطانہ چونکی۔

"ہاں۔" عابدہ گل نے کہا "تمہیں چند دن تک یہیں رہنا ہوگا۔"

سلطانہ کے دماغ میں خیال اُبھرا کہ اس وقت دروازہ لاک نہیں ہے۔ اسے تیزی سے بھاگ نکلنا چاہیے۔ باہر نکلتے ہی وہ شور مچا کر آس پاس کے لوگوں کو متوجہ کرسکتی ہے۔ وہ مزید سوچے سمجھے تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔

"ارے ارے! یہ کیا حماقت کررہی ہو سلطانہ!" عابدہ گل بولی مگر اس نے سلطانہ کے پیچھے جھپٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سلطانہ نے تیزی سے دروازہ کھولا لیکن پھر جہاں تھی، وہیں بت کی طرح ساکت ہوگئی۔ دروازے کے باہر کھڑے ہوئے آدمی کے ہاتھ میں ایک ریوالور تھا جس کی نال سلطانہ کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"پاگل پن کا ثبوت دیا ہے تم نے!" عابدہ گل نے قریب آکر کہا اور اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولی "چلو بیٹھو۔ تھوڑی دیر میں ہم کھانا کھائیں گے۔ مجھے کچھ اندیشہ تو تھا کہ تم اس قسم کی حرکت کرسکتی ہو اس لیے میں نے جادر سے کہہ دیا تھا کہ وہ دروازے پر کھڑا رہے۔"

عابدہ گل اسے واپس بستر کی طرف لے گئی۔ اب سلطانہ کا جسم خوف سے سنسنانے لگا تھا۔ دل کی دھڑکن انتہائی تیز ہوگئی تھی۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ وہ ایک ایسے جال میں پھنس گئی ہے جس سے نکلنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

عابدہ گل نے اسے بستر پر بٹھایا اور خود کرسی پر بیٹھ گئی۔ سلطانہ نے دروازہ بند دیکھا۔ اس ریوالور والے ہی نے دروازے کو آہستگی سے بند کیا ہوگا۔

سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اوہ، بے بی! بے بی!" عابدہ گل بولی "میں آخر تمہیں کس طرح یقین دلاؤں کہ تم دشمنوں میں نہیں ہو!"

"اور دوست ریوالور لیے کھڑے رہتے ہیں!" سلطانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"اسے ایک مجبوری سمجھو۔ تمہیں کسی نادانی سے روکنے کے لیے ایسا کرنا پڑا۔ ابھی اگر تم اس گھر سے نکل جاتیں تو خطرات میں پڑجاتیں۔"

"میرے لیے کیا خطرہ ہوسکتا ہے!"

"مجھے اس کی تفصیل نہیں معلوم! یہ تمہیں گل صاحب ہی بتاسکیں گے۔"

"گل صاحب کون؟"

"میرے شوہر۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ میرا نام عابدہ گل ہے۔" وہ بولی "گل صاحب دو ایک دن میں یہاں آجائیں تو میری ذمّے داری ختم ہو۔ پھر وہی فیصلہ کریں گے کہ تمہاری حفاظت کے لیے کیا کیا جاسکتا ہے۔ میں جو کچھ کرسکتی تھی، وہ کرچکی تم خود کو اس کمرے میں قید بھی مت سمجھو۔ فی الحال کمرے کا دروازہ اس لیے بند کردیا گیا تھا کہ جب تک میں تمہیں سمجھا نہ دوں، ملازمین کو تم سے کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملے۔ اب تمہیں دروازہ کھلا ہوا ہی ملے گا۔ تم عمارت میں جہاں چاہو آجاسکتی ہو۔ بس بیرونی دروازے سے باہر مت نکلنا ورنہ پھر شکایت کروگی کہ کوئی آدمی ریوالور لیے ہوئے کھڑا ملا۔ تمہاری حفاظت کے لیے یہ احتیاط ضروری ہے۔"

سلطانہ نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو خشک کیے اور بولی "اگر میرے لیے کسی قسم کا خطرہ ہے تو مجھے پولیس کی حفاظت میں کیوں نہیں دے دیا جاتا۔"

"اس کا فیصلہ بھی گل صاحب ہی کرسکیں گے۔"

اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر عورت کمرے میں آئی۔ وہ وضع قطع سے ملازمہ معلوم ہوتی تھی اور کھانے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی کمرے میں لائی تھی۔

○☆○

ہوم سیکریٹری نے اپنے دفتر میں سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر غیر ملکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مسٹر فرائٹ! وہ لڑکی یہاں کے ایک فلاحی ادارے کے ہاسٹل میں رہتی تھی اور ایک

اسکول میں ٹیچر تھی۔ آج صبح دس بجے ہمیں اس کا پتا لگ سکا لیکن جب پولیس وہاں پہنچی تو معلوم ہوا کہ سلطانہ کہیں غائب ہو چکی ہے۔"

"غائب ہو چکی ہے؟" فراست چونک کر بولا۔

"جی ہاں۔" ہوم سیکریٹری نے کہا "آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ کل رات ایک اہم شخصیت کے قتل ہو جانے کے باعث شہر کی فضا میں آج خاصا تناؤ ہے۔ اخبارات بھی دیر سے شائع ہوئے تھے۔ مسز سبحانی نے جب اخبارات دیکھے اور انہیں اس قتل کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً سلطانہ کے اسکول سے رابطہ کیا۔ انہیں ٹیلی فون پر معلوم ہوا کہ حالات کی وجہ سے اسکول فوراً ہی بند کر دیا گیا تھا۔ بچے اور ٹیچرز سب جا چکی تھیں لیکن جب ساڑھے دس بجے تک سلطانہ واپس نہیں آئی تو مسز سبحانی نے پریشان ہو کر پولیس اسٹیشن میں رپورٹ کرادی۔"

"سلطانہ کا اس طرح غائب ہو جانا تو بڑی تشویش کی بات ہے۔" فراست نے کہا۔

"جی ہاں۔ آپ جو کچھ بتا چکے ہیں' اس کی روشنی میں یہ واقعی تشویش کی بات ہے۔" ہوم سیکریٹری نے کہا "لیکن ابھی آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔ میں نے پولیس کو خاصا الرٹ کر دیا ہے۔ ممکن ہے دو ایک گھنٹے میں اس کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ ایک امکان یہ بھی تو ہے مسٹر فراست کہ وہ خود ہی اپنی کسی دوست کے گھر چلی گئی ہو اور تھوڑی دیر میں واپس مسز سبحانی کے ہاسٹل پہنچ جائے۔"

"صرف اس امکان کی وجہ سے مطمئن تو نہیں ہوا جا سکتا۔" فراست نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"مطمئن تو میں بھی نہیں ہوں مسٹر فراست!" ہوم سیکریٹری نے کہا "میں تو اس امکان پر بھی غور کر چکا ہوں کہ شہر کی صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر کسی نے سلطانہ کو اغوا کر لیا ہو اس لیے میں نے شہر کی ناکا بندی کروادی ہے۔ اغوا کنندگان اسے اتنی جلدی شہر سے نکال لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ رات کو ہونے والے قتل کی وجہ سے سارا محکمۂ پولیس ہی انتشار کا شکار ہو گیا ہے لیکن میرے کہنے پر آئی جی نے اپنے ایک نہایت ذمّے دار افسر ایس پی رحمان کو یہ ذمّے داری سونپ دی ہے کہ وہ جلد از جلد سلطانہ کا پتا لگانے کی کوشش کرے۔"

"مجھے لگتا ہے کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے۔"

"اس سلسلے میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہو گی۔ اگر صرف آپ ہی میرے پاس آتے تو بھی میں اس معاملے کو ترجیحی بنیادوں پر دیکھتا۔ پھر آپ تو امریکا کی اتنی اہم شخصیت کی سفارش بھی لائے ہیں۔ اس کی وجہ سے حکومت کی اعلیٰ سطح بھی اس معاملے میں ضرور دلچسپی لے گی۔ رہی میری دلچسپی کی بات تو آپ اندازہ لگالیں کہ صرف چوبیس گھنٹے میں بیس سال پہلے کے اس کیس کا پتا لگالیا گیا۔"

"میں اس کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ اس وقت خاصے مصروف ہوں گے اس لیے میں اب چلتا ہوں لیکن مجھے صورتِ حال کا علم ہوتے رہنا چاہیے۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ اگر میں آپ کو پہلے ہی سے ٹائم نہ دے چکا ہوتا تو ان ہنگامی حالات میں اس وقت دفتر میں ہوتا ہی نہیں۔ مجھے پندرہ منٹ بعد ہی ایک میٹنگ میں شریک ہونا ہے۔ آئندہ کئی دن شاید ایسی ہی ہنگامی صورتِ حال میں گزریں گے لیکن میں ابھی آئی جی سے فون پر کہے دیتا ہوں کہ ایس پی رحمان کو آپ سے رابطے میں رہنے کی ہدایت کر دی جائے۔"

"یہ میرے لیے ایک اطمینان بخش بات ہو گی۔" فراست نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ وہ خاصا متفکر نظر آرہا تھا۔

ہوم سیکریٹری اسے رخصت کرنے کے لیے دروازے تک گیا۔



ان گنت غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہونے کے باوجود شاہ جی کا شمار شہر کے "باعزت شہریوں" میں ہوتا تھا کیونکہ قانون کے رکھوالے بہت کچھ جاننے کے باوجود بھی شاہ جی پر ہاتھ نہیں ڈال سکے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ اس کے تعلقات اہم شخصیات سے تھے اور دوسرا سبب یہ بھی ممکن تھا کہ قانون کو اس کے خلاف کبھی کوئی ثبوت نہ مل سکا ہو۔

رات گیارہ بجے شاہ جی اپنے بنگلے کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا شراب پیتے ہوئے ایک شخص پر بُری طرح بگڑ رہا تھا۔ جرائم کی دنیا میں اس شخص کی شہرت قلندر راجا کے نام سے تھی۔ وہ اپنے ایک چھوٹے سے گینگ کا سربراہ تھا۔ اس پر ڈاکے' اغوا اور قتل جیسے سنگین جرائم کے الزامات میں متعدد مقدمات چل رہے تھے۔ ایک مرتبہ سات سال کی جیل بھی کاٹ چکا تھا لیکن جب سے اس کو شاہ جی کی آشیرواد حاصل ہوئی تھی' وہ قانون کی زد سے خاصا محفوظ رہنے لگا تھا۔ شاہ جی کو جو چھوٹے موٹے کام ہوتے تھے' وہ قلندر راجا ہی کرتا تھا۔

ایک نوجوان دستک دے کر کمرے میں آیا اور بولا "شاہ جی! آصف بیگ صاحب آئے ہیں۔"

"اسے تو آنا ہی تھا۔" شاہ جی نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا اور پھر نوجوان سے بولا "یہیں لے آؤ۔"

نوجوان چلا گیا۔

"اب بتاؤ!" شاہ جی پھر قلندر راجا پر بگڑا "کیا جواب دوں گا اب میں اُسے!"

"آپ نے پہلے بھی میرے کو بہت کام دیے ہیں شاہ جی!" قلندر راجا نے گھگھیاتے ہوئے کہا "یہ پہلا چانس ہے کہ کام خراب ہو گیا۔ پر اپنے کو اس کا بھی تو نہیں پتا تھا کہ اس لڑکی پر کسی اور کا دانت بھی ہے۔"

شاہ جی اپنے لیے گلاس بنانے لگا۔ اس کا موڈ بہت خراب معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھا اور کھڑا ہوتا ہوا بولا "آیئے بیگ صاحب!"

آنے والے کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ ہی تھی.... وہ قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا۔ ہر اعتبار سے وہ خاصا آسودہ حال اور پڑھا لکھا آدمی معلوم ہو رہا تھا۔

"میں ایک گھنٹے انتظار کے بعد آیا ہوں۔" آصف بیگ نے سرد لہجے میں کہا "ڈارکی نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ جس کام کا وعدہ کرلیتے ہیں' وہ نہ صرف ہو جاتا ہے بلکہ بالکل صحیح وقت پر ہوتا ہے۔"

"ڈارکی نے آپ سے جو کچھ کہا تھا' بالکل ٹھیک کہا تھا اور میں ابھی جو کچھ عرض کروں گا' وہ بھی بالکل ٹھیک ہوگا۔ آپ تشریف تو رکھیے!"

آصف بیگ نے قلندر راجا پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر شاہ جی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میرا خیال ہے کہ پہلے تو آپ ایک پیگ لے لیں۔" شاہ جی نے اس کے لیے ایک گلاس بناتے ہوئے کہا "آپ کافی مضطرب ہیں۔"

"مضطرب ہونے کی بات ہی ہے۔"

قلندر راجا نے شاہ جی کے اشارے پر اٹھ کر شراب کا گلاس آصف بیگ کو دیا۔

"دراصل ایک گڑبڑ ہوگئی ہے آصف بیگ صاحب!" شاہ جی نے کہا "ورنہ ایک معمولی سی اسکول ٹیچر کو اغوا کرنا تو کوئی خاص کام ہی نہیں تھا۔"

"کیسی گڑبڑ!" آصف بیگ چونک کر سیدھا بیٹھ گیا۔

"کیا آپ کو اندازہ تھا کہ کسی اور کو بھی اس لڑکی سے دلچسپی ہوسکتی ہے؟" شاہ جی نے سوال کیا۔

"آخر ہوا کیا ہے!" آصف بیگ اسے گھورنے لگا۔

"یہ قلندر راجا ہے۔" شاہ جی نے کہا "اس سے پہلے کئی لڑکیوں ہی کو نہیں' کئی بڑے آدمیوں کو بھی اغوا کرچکا ہے۔ اس قسم کے کام میں اسی کے سپرد کرتا ہوں۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اسے ناکامی ہوئی ہو!"

"دراصل ساری گڑبڑ کل رات ہونے والی واردات کی وجہ سے ہوئی ہے۔" شاہ جی نے کہا "اس کی وجہ سے اسکول صبح ہی بند کردیا گیا تھا۔ قلندر راجا کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ چھٹی کے بعد جب وہ اسکول سے نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جائے گی تو اسے اغوا کرلیا جائے گا۔ دن میں اسے اپنے پاس قید رکھا جائے گا اور مقررہ وقت کے مطابق رات کے ساڑھے نو بجے اسے آپ کے پاس پہنچا دیا جائے گا لیکن جیسا کہ میں نے بتایا کہ اسکول جلدی بند ہوگیا تھا۔ وہ وہاں سے پہلے ہی نکل گئی تھی اور پھر غائب ہوگئی۔"

"غائب ہوگئی!" آصف اُچھل پڑا۔

"ہاں۔" شاہ جی نے کہا "قلندر راجا کا خیال ہے کہ صبح جب وہ اسکول سے نکلی ہوگی' اسی وقت کسی نے اسے اغوا کرلیا۔"

"اوہ گاڈ!" آصف بیگ نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔

"اسی لیے میں نے ابھی آپ سے پوچھا تھا کہ کیا کسی اور کو بھی اس لڑکی سے دلچسپی ہوسکتی ہے؟"

"میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔" آصف بیگ نے بگڑ کر کہا "میں نے اس لڑکی کے لیے آپ کو دس لاکھ ایڈوانس دیے تھے اور یہ کوئی کم رقم نہیں ہوتی!"

"دس لاکھ میرے لیے کوئی بڑی رقم نہیں ہے بیگ صاحب!" شاہ جی نے سکون سے کہا "وہ سب میں نے قلندر راجا کو دے دی تھی۔ ہاں اس کے لیے وہ رقم واقعی خاصی بڑی تھی۔"

"اس کے باوجود میرا کام بگاڑ دیا گیا۔" آصف بیگ نے کہا۔

"بگڑے ہوئے کام سدھارے بھی جاسکتے ہیں بیگ صاحب! آپ خود کو پُرسکون تو رکھیے۔" شاہ جی گلاس ہاتھ میں لے کر اٹھا اور دوسرے صوفے پر آصف بیگ کے پہلو میں جا بیٹھا "آپ نے اب تک ایک گھونٹ بھی نہیں لیا جبکہ میرے خیال میں اس وقت آپ کو اس کی شدید ضرورت ہے۔" شاہ جی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "....اس لڑکی کی جو بھی اہمیت ہے' وہ آپ مجھے بتایئے!" شاہ جی نے کہا "اس طرح ممکن ہے ہم یہ پتا لگانے میں کامیاب ہوجائیں کہ اسے کس نے اٹھوایا ہے۔"

آصف بیگ نے رومال نکال کر اپنے ہونٹ صاف کیے اور بولا "یہ تو آپ کو نہیں بتایا جاسکتا کہ اس لڑکی کی اہمیت کیا ہے' لیکن کچھ اہمیت بہرحال ہے۔ اسی لیے دس لاکھ کی خطیر رقم دی گئی تھی۔"

"رقم کی تو آپ بالکل فکر نہ کریں بیگ صاحب! وہ ابھی فوری طور پر بھی آپ کو واپس کی جاسکتی ہے' لیکن میں ڈارکی سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔ بہرصورت پتا لگانے کی کوشش کی جائے گی کہ اس لڑکی کو کس نے اٹھوایا ہے۔ اس شہر میں اس قسم کے کام کرنے والے' قلندر راجا کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ کل شام تک نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کا پتا لگالیا جائے گا بلکہ لڑکی بھی ان سے واپس لے لی جائے گی۔"

"کیا میں اسے آپ کا حتمی وعدہ سمجھوں؟"

"حتمی وعدہ تو میں اب اس لیے نہیں کر سکتا بیگ صاحب کہ یہ معاملہ مجھے کسی خاص اہمیت کا حامل محسوس ہونے لگا ہے اور اہمیت آپ بتانا نہیں چاہتے۔ اب اگر اس لڑکی کو اٹھوانے میں شہر کے پیشہ ور لوگوں کا ہاتھ نہیں ہے تو اس کا پتا لگانا خاصا مشکل ہو جائے گا۔ کم از کم قلندر راجا کے لیے تو ناممکن ہی سمجھئے تاہم میں اپنے طور پر اس سلسلے میں کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔ ایک اور بات بھی سامنے آئی ہے جس سے مجھے اس معاملے کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہے۔ راجا ہی نے مجھے بتایا ہے کہ اس لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ کے بعد........ تفتیش کے لیے کسی ایس پی کا مقرر کیا جانا خاصی غیر معمولی بات ہے۔"

"ایس پی کو مقرر کیا گیا ہے!" آصف بیگ پُر تشویش انداز میں بڑبڑایا۔

"جی ہاں۔" شاہ جی اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

"ایس پی کا نام کیا ہے؟" آصف بیگ نے پوچھا۔

"رحمان۔" شاہ جی نے بتایا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" آصف بیگ یک لخت کھڑا ہو گیا "میں کل تک اور آپ کی طرف سے پُر امید رہتا ہوں۔"

ان دونوں کے کھڑے ہونے کی وجہ سے قلندر راجا بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ ان دونوں کی گفتگو کے دوران میں بالکل خاموش رہا تھا۔

آصف بیگ کے جاتے ہی شاہ جی نے پھر بگڑے ہوئے لہجے میں قلندر راجا سے کہا "جاؤ، جا کر کسی طرح بھی اس معاملے کی کھوج لگاؤ۔ اگر لڑکی نہ ملی تو میرے اور ڈار کی کے تعلقات پر حرف آ سکتا ہے۔ اس سے میرا کروڑوں ڈالر کا کاروبار ہے۔"

شاہ جی کو سلام کر کے قلندر راجا بھی رخصت ہو گیا اور شاہ جی اپنے لیے ایک اور پیگ بناتا ہوا کچھ سوچنے لگا۔

○☆○

سلطانہ رات کو ٹی وی کا خبرنامہ سن کر سو جانے کی عادی تھی مگر اس رات ساڑھے گیارہ بجے کے بعد بھی اس کی آنکھوں میں نیند کا دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تو تھی لیکن اس کی کشادہ روشن آنکھیں چھت پر جمی ہوئی تھیں اور دماغ خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس کے سان گمان میں بھی یہ بات کبھی نہیں آئی تھی کہ برسوں پر محیط اس کی پژمردہ و پُر سکوت زندگی میں کبھی ایسا کوئی سنسنی خیز موڑ بھی آ سکتا ہے۔

عابدہ گل کی اس بات پر اسے بالکل یقین نہیں آیا تھا کہ وہ خود کو دوستوں میں سمجھے۔ وہ تو خود کو بہت ہی عیار لوگوں کے جال میں پھنسا ہوا محسوس کر رہی تھی تاہم اسے کسی حد تک یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ لوگ نہ تو خود لڑکیوں کا کاروبار کرتے ہوں گے اور نہ ان کا رابطہ یہ گھناؤنا کاروبار کرنے والے کسی گروہ سے ہو گا لیکن یہ اندازہ کر کے اس کی یہ اُلجھن اور بڑھ گئی تھی کہ آخر ان لوگوں نے اسے، ایک ایسی لڑکی کو کیوں اغوا کیا جو اپنے سماج اور معاشرے میں کسی بھی خاص اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ وہ بس ایک اسکول ٹیچر ہی تو تھی، اور ایک ایسی لڑکی جو فلاحی ادارے میں پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کے بیس سال مسز سبحانی کے شفیق سائے میں گزرے تھے۔

مسز سبحانی ایک مالدار بیوہ تھیں۔ جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں مگر نہ جانے کیوں انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی اور "سائبان" کے نام سے ایک فلاحی ادارہ کھول لیا تھا۔ وہ وہاں بے آسرا عورتوں اور لڑکیوں کو نہ صرف ایک گوشۂ عافیت میسر کرتی تھیں بلکہ یہ کوشش بھی کرتی تھیں کہ ان کی مناسب تربیت کر کے انہیں معاشرے کا ایک اچھا اور متحرک فرد بنا سکیں۔ یتیم و اسیر بچیوں کو وہ اسکولوں میں تعلیم بھی دلواتی تھیں اور انہیں کبھی احساس نہیں ہونے دیتی تھیں کہ وہ کسی یتیم خانے میں ہیں۔ مناسب رشتہ مل جانے پر وہ ان لڑکیوں کی شادیاں بھی کراتی تھیں اور سب کچھ اپنے ذاتی سرمائے سے کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنے ادارے کے لیے کبھی کسی سے چندہ نہیں لیا تھا۔

سلطانہ کو تو اس کی خواہش پر انہوں نے انگلش میڈیم میں پڑھوایا تھا۔

سلطانہ ایک حادثے کے باعث "سائبان" میں پہنچی تھی۔ بیس سال قبل ہونے والے اس حادثے کی خبر اور تصویریں اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک اخبار آج بھی سلطانہ کے سامان میں موجود تھا۔

خبر کے مطابق اس حادثے میں ہلاک ہونے والی عورت اور مرد سلطانہ کے والدین ہی ہو سکتے تھے۔ سلطانہ اس وقت اپنی ماں کی گود میں تھی اور ان کے ساتھ وہ حادثہ اس وقت پیش آیا تھا جب وہ ایک سڑک پار کر رہے تھے۔ ایک نہایت تیز رفتار ٹرک نے انہیں اتنی زور کی ٹکر ماری تھی کہ سلطانہ تو معجزانہ طور پر اپنی ماں کی گود سے اچھل کر فٹ پاتھ کے پاس کھڑے ایک ٹھیلے پر جا گری تھی لیکن اس کے ماں باپ کو اس ٹرک نے بُری طرح روند ڈالا تھا۔ ان کے چہرے تک مسخ ہو گئے تھے۔ ان کی شناخت ناممکن ہو گئی تھی اور ان کے سامان میں سے بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملی تھی جس سے ان کا نام یا پتا معلوم ہو سکتا۔

اس حادثے نے سلطانہ کے ذہن پر بہت بُرا اثر ڈالا تھا۔ تھوڑی بہت چوٹوں کی وجہ سے اسے کچھ ہی دن اسپتال میں رکھا جاتا لیکن زیادہ دن اس لئے رکھا گیا تاکہ وہ ذہنی طور پر نارمل ہو سکے لیکن بظاہر نارمل ہونے کے باوجود سلطانہ کسی کو اپنے ماں باپ یا خاندان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکی تھی۔ وہ حادثہ ہی اس کا سب ہو سکتا تھا کہ اسے کوئی بات یاد نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے "ممی اور پاپا" کا نام لے کر روتی تو تھی مگر ان کا نام نہیں بتا سکی تھی۔ ان کا تو کیا خود اپنا نام بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ سلطانہ تو اس کا وہ نام تھا جو مسز سبحانی نے رکھا تھا۔ وہ پولیس کی اجازت سے تمام قانونی کارروائی کر کے ہی اسے "سائبان" لائی تھیں۔

سلطانہ کو بس اتنا یاد تھا کہ اس کے ماں باپ ٹرک کے حادثے میں مرگئے تھے اور وہ تنہائی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے معجزانہ طور پر بچ گئی تھی۔ اس نے ہمیشہ یہی محسوس کیا تھا کہ اس کے وجود کے گرد اندھیرا ہے اور اس اندھیرے میں وہ بالکل یکہ و تنہا ہے۔ "سائبان" میں سبھی عورتیں اور لڑکیاں اس کا خیال رکھتی تھیں۔ خود مسز سبحانی تو اسے اتنا چاہنے لگی تھیں جیسے وہ ان کے بطن سے پیدا ہوئی تھی لیکن اس کا احساسِ تنہائی کبھی دور نہیں ہوسکا تھا۔ اسکول اور کالج کی زندگی بھی اس نے دیگر طلبا و طالبات سے الگ رہ کر گزاری تھی۔

جب اس نے بی اے کرلیا تو مسز سبحانی کی خواہش تھی کہ وہ کوئی مناسب لڑکا تلاش کرکے اس کی شادی کردیں لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئی تھی۔

"پہلے میں اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں اور شادی بھی اپنے ہی پیسے سے کروں گی۔" اس نے مسز سبحانی سے کہا تھا "یوں تو میرا رُواں رُواں آپ کا احسان مند ہے لیکن آپ سے التجا ہے کہ میری یہ درخواست آپ بخوشی قبول کرلیں۔ میں اب اس احساس کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ میں بالکل بے دست و پا نہیں ہوں اور اپنے مستقبل کا خاکہ اپنے ہاتھوں سے بھی بنا سکتی ہوں۔"

مسز سبحانی نے غالباً سمجھ لیا تھا کہ اب سلطانہ کے وجود میں خودداری کا جذبہ پوری طرح بیدار ہوچکا ہے اور انہوں نے یہ سوچ کر سلطانہ کی بات مان لی تھی کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر سلطانہ اپنا مستقبل تعمیر کرے گی تو اس میں نہ صرف خود اعتمادی بڑھتی رہے گی بلکہ وہ کبھی کسی ایسے کمپلیکس کا شکار نہیں ہوگی جو اس کی روح پر ایک بوجھ بن کر رہ جائے۔

سلطانہ کو یقین تھا کہ مسز سبحانی نے پولیس میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ ضرور درج کرادی ہوگی لیکن کیا پولیس اسے تلاش کرے گی؟ اس تک پہنچ جائے گی؟ اس بارے میں سلطانہ کوئی مایوسانہ خیال اپنے ذہن میں نہیں آنے دینا چاہتی تھی لیکن یہ بہرحال اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پولیس اس کا سراغ کس طرح لگا سکے گی!

○☆○

آصف بیگ کا قیام شہر کے ایک بڑے ہوٹل کی تیسری منزل کے ایک کمرے میں تھا۔ دوسرے دن شام کو جب اس کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو متفکر آصف بیگ ٹیلی فون کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ریسیور اٹھایا۔ ہوٹل کی آپریٹر نے بتایا کہ کوئی شاہ جی اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

پھر جیسے ہی شاہ جی سے رابطہ قائم ہوا' آصف بیگ نے کہا "میں امید کروں کہ آپ مجھے کوئی اچھی خبر سنائیں گے۔"

"مجھے افسوس ہے بیگ صاحب!" شاہ جی نے کہا "قلندر راجا اس وقت میرے پاس ہی موجود ہے۔ اس نے کل رات سے اب تک کی جدوجہد کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے' مجھے اس سے اتفاق ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ راجا اس شہر میں کیا کچھ کرسکتا ہے۔ اس

پہلی نظر

آپریشن کے بعد مریض کو ہوش آیا تو سب سے پہلے اس کی نظر اپنے سامنے کھڑی ہوئی نرس پر پڑی۔

"نرس" مریض نے کہا "کیا تم پہلی نظر میں محبت ہوجانے کی قائل ہو؟"

"نہیں" نرس نے بگڑ کر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے" مریض نے بڑبڑا کر آنکھیں بند کرلیں "اب میں تمہیں کل دیکھوں گا۔"

کا دعویٰ ہے کہ اس معاملے میں شہر بھر کے کسی بھی ایسے شخص کا ہاتھ نہیں جو اس قسم کے کام کرتا ہو۔"

"خوب!" آصف بیگ نے دانت پر دانت جما کر کہا "گویا میں یقین کرلوں کہ ڈارکی نے مجھے آپ کے پاس بھیج کر میرے ساتھ بڑی زیادتی کرڈالی۔"

"مجھے اندازہ ہے کہ آپ بہت ناراض ہیں لیکن میں یہی کہوں گا کہ ڈارکی نے آپ کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ اگر آپ نے مجھے معاملے کی اہمیت بتادی ہوتی تو یہ گڑبڑ ہرگز نہیں ہونے دی جاتی اور اب بھی اگر آپ۔۔۔"

"نہیں۔" آصف بیگ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اس بارے میں کچھ نہیں بتایا جاسکتا لیکن آپ نے کہا تھا کہ آپ ۔۔۔اپنے طور پر بھی اس سلسلے میں کچھ کریں گے۔"

"جی ہاں' میں نے کہا تھا' اور اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ آپ کو مطمئن کرنے کے لیے میں آپ کو بتا بھی سکتا ہوں کہ آپ کے جانے کے بعد کل میں نے کیا سوچا تھا لیکن مناسب نہیں ہوگا کہ وہ باتیں میں آپ کو ٹیلی فون پر بتاؤں۔ اگر آپ میرے پاس آنے کی زحمت کرلیں تو شکر گزار ہوں گا۔"

آصف بیگ کے چہرے پر ایسے اکتاہٹ کے آثار اُبھرے جیسے اب وہ شاہ جی کے پاس جانا بے کار سمجھ رہا ہو' تاہم اس نے گھڑی پر نظر ڈال کر کسی حد تک کھردرے لہجے میں کہا "میں ایک گھنٹے میں آتا ہوں۔"

"شکریہ۔"

اس گفتگو کے بعد آصف بیگ نے ٹیلی فون پر ہی برابر کمرے میں مقیم اپنے سیکریٹری آفتاب سے رابطہ کرکے اسے اپنے کمرے میں طلب کیا۔

دو منٹ بعد ہی آفتاب اس کے کمرے میں تھا۔ جوان العمر اور مناسب نقش و نگار کے مالک اس شخص کے چہرے پر ایسے

تاثرات تھے جیسے چاپلوس ہونے کی حد تک طابع فرمان ہو۔

"شاہ جی ناکام ہوگیا۔" آصف بیگ نے اس سے کہا اور مختصراً وہ باتیں بتادیں جو ٹیلی فون پر شاہ جی سے ہوئی تھیں۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا سر!" آفتاب نے کہا۔

"بہت ہی بُرا۔" آصف بیگ نے ٹہلتے ہوئے کہا "لیکن اب میرے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہورہا ہے۔ کسی طرح معلوم کرو کہ گل زادہ اور اس کی بیوی عابدہ گل اس وقت نیویارک میں ہیں یا نہیں۔"

"یہ تو بڑی آسانی سے معلوم ہوجائے گا سر! بس ایک ٹیلی فون کرنا ہوگا۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔" آصف بیگ نے اسے گھورتے ہوئے کہا "اگر وہ اپنے گھر میں نہیں ہوں گے تو یہ بھی ممکن ہے' کسی دوسرے شہر گئے ہوئے ہوں۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ امریکا سے یہاں تو نہیں پہنچ چکے ہیں' اور اگر پہنچ چکے ہیں تو کب پہنچے ہیں!"

"او، کے سر!" آفتاب نے جلدی سے کہا "میں اپنی جان کی بازی لگا کر بھی کل ہی اس کا پتا لگالوں گا۔"

"کیا تم اپنی گفتگو کا یہ بے ہودہ انداز کبھی نہیں بدل سکتے؟" آصف بیگ نے بگڑ کر کہا "اس میں ایسی کیا بات ہے کہ تمہیں جان کی بازی لگانا پڑے!"

"جی دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ....." آفتاب.... نے سٹپٹا کر کہنا چاہا۔

"بکواس بند کرو۔" آصف بیگ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے دروازے کی طرف قدم بڑھائے "میں شاہ جی سے مل کر آتا ہوں۔"

آفتاب مؤدبانہ انداز میں جھک گیا۔

آصف بیگ نے ہوٹل سے مستقل طور پر کرائے کی ایک گاڑی لے رکھی تھی۔ اسی گاڑی میں وہ شاہ جی کے گھر پہنچا۔

شاہ جی نے اس کا استقبال بڑے تپاک سے کیا اور ایک پیگ بنا کر اس کے سامنے رکھتا ہوا بولا "میری خواہش ہے بیگ صاحب کہ ہمارے تعلقات میں ناخوشگواری کی رمق بھی نہ آسکے۔"

"اس کی واحد صورت یہ ہے کہ آپ ڈارکی کے اعتماد پر پورے اُتریں۔"

"اگر آپ کا تھوڑا سا تعاون حاصل ہوجاتا تو اس کام میں شاید زیادہ دشواری نہیں ہوتی لیکن خیر! میں دوبارہ یہ گفتگو نہیں چھیڑنا چاہتا۔ میں نے آپ کو صرف اتنا بتانے کے لیے بلایا ہے کہ میری رسائی جہاں دوسری بہت سی جگہوں تک ہے' وہاں محکمۂ پولیس میں بھی ہے۔ میں نے کچھ ایسا بندوبست کرلیا ہے کہ جیسے ہی ایس پی رحمان کو اس لڑکی کا سراغ ملے' مجھے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس کا علم ہوجائے پھر اس سے پہلے کہ پولیس اس لڑکی تک پہنچے راجا کے آدمی کام کر گزریں گے اور اگر بالفرض پولیس پہلے پہنچ گئی تو ان میں سے ایک ایک کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر کے لڑکی کو ان سے چھین لیا جائے گا۔ میں نے آج چار پیشہ ور قاتلوں کا بندوبست کرلیا ہے جو بہت جیالے اور غضب کے نشانے باز ہیں۔ اس سلسلے میں جو بھی اخراجات آئیں گے' وہ اب میں خود کروں گا۔ اب یہ میری انا کا مسئلہ بن گیا ہے۔ آپ نے جو دس لاکھ دیے تھے' وہ برائے مہربانی آپ واپس لے لیجیے!"

شاہ جی نے ایک لفافہ آصف بیگ کی طرف بڑھایا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ آصف بیگ نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تو اس نے خود ہی وہ لفافہ آصف بیگ کے گھٹنے پر رکھ دیا۔

آصف بیگ بولا "اس کا تعین تو بہرحال نہیں کیا جاسکتا ناکہ ایس پی رحمان اس لڑکی کا سراغ کب تک لگا پائے گا' یا لگا بھی سکے گا یا نہیں!"

"ہاں اس میں انتظار کا پہلو تو ہے۔" شاہ جی نے کہا "میں اور میرے آدمی مستقل سوچ رہے ہیں۔ ممکن ہے کوئی اور تدبیر بھی سوجھ جائے۔"

آصف بیگ شراب کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا ہوا ایک گلدان کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ خود بھی کوئی ایسی تدبیر سوچنا چاہتا تھا جس پر شاہ جی سے عمل کروا سکے۔



فراسٹ نے ایس پی رحمان کو فون کیا اور تھوڑی دیر بعد کار خود ڈرائیو کر کے اس کے گھر پہنچ گیا۔ یہ کار اس کے ایک دوست نے مستقل طور پر اس کے لیے فراہم کردی تھی۔ اسی نے فراسٹ کو نقشے کی مدد سے ایس پی رحمان کے گھر کا پتا بھی سمجھایا تھا ورنہ اس اجنبی شہر میں فراسٹ کو مکان تلاش کرنے میں خاصی دقت پیش آتی۔

ایس پی رحمان سے یہ فراسٹ کی دوسری ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات میں رحمان نے اسے اپنے گھر کے پتے کے سوا گھر اور دفتر کے ٹیلی فون نمبرز بھی بتادیے تھے۔

ایس پی رحمان کو وردی میں بالکل تیار دیکھ کر فراسٹ کو حیرت ہوئی اور وہ بولا "میرا خیال تھا کہ میں اس وقت آپ کے آرام میں مخل ہوں گا۔"

"ہم پولیس والوں کو آرام کرنے کا موقع بہت کم ملتا ہے مسٹر فراسٹ!" ایس پی رحمان نے مسکرا کر کہا "لیکن آپ نے اس وقت کیسے زحمت کی؟"

"میں نے آپ کو بتایا تھا ناکہ میں اپنے جس دوست کے گھر ٹھہرا ہوں' وہ امریکی کونسلیٹ میں ملازم ہے۔ میں نے اس سے درخواست کی تھی کہ گزشتہ تین دنوں میں جو لوگ امریکا سے اور بطورِ خاص نیویارک سے یہاں پہنچے ہیں' وہ مجھے ان کی تصاویر ذرا بڑی کرا کے فراہم کردے۔ ابھی اس نے مجھے یہ لا کردی تھیں اور میں یہ لے کر فوراً آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"خوب!" ایس پی رحمان مسکرایا "جن خطوط پر میں نے سوچا تھا' انہی خطوط پر آپ نے بھی سوچا۔ آپ نے جو کچھ بتایا تھا' اس کی روشنی میں یہی خیال میرے ذہن میں آیا تھا کہ سلطانہ کے اغوا میں کسی امریکی پاکستانی کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور امکان ہے کہ وہ گزشتہ دو چار دن میں ہی یہاں آیا ہوگا۔ اسی لیے میں نے پہلے ہی دن نیویارک سے آنے والوں کی فہرست تیار کروالی تھی اور آج خفیہ طور پر ان سب کی تصاویر بھی بنالی گئی ہیں۔ میں اس وقت وہی دیکھ رہا تھا۔" ایس پی رحمان نے سینٹرل ٹیبل سے اخبار ہٹایا۔

میز پر بکھری ہوئی تصویریں دیکھ کر فراست ان پر جھک گیا "اوہ!" اس کے منہ سے نکلا "غالباً انہی لوگوں کی تصویریں میں بھی لایا ہوں۔" پھر وہ اپنا لفافہ کھولتا ہوا بولا "کام چونکہ بڑا تھا اس لیے میں نے تین ہی دن میں یہاں آنے والوں کی تصویریں بنوائی تھیں لیکن میں نے اپنے دوست سے کہہ دیا ہے کہ ان دنوں سے پہلے کے چار دنوں میں جو لوگ آئے ہیں' ان کی تصویریں بھی فراہم کرے۔ میرا خیال ہے کل تک وہ ان لوگوں کی تصویریں بھی فراہم کردے گا۔"

اس سے پہلے کہ ایس پی رحمان' فراست سے تصویریں لے کر دیکھتا' ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایس پی رحمان نے ریسیور اٹھالیا "ہاں میں بول رہا ہوں.... ویری گڈ آفاق! اب تم فوراً تیاری کے ساتھ وہاں پہنچو اور اس گھر کو محاصرے میں لے لو لیکن میرے پہنچنے.... تک کوئی اقدام نہ کرنا۔ میں فوراً پہنچ رہا ہوں۔" ایس پی رحمان کھڑا ہوگیا "ابھی آپ کو تعجب ہوا تھا نا کہ میں اس وقت وردی میں کیوں ہوں! دراصل مجھے ایک اطلاع کا انتظار تھا جو مجھے ابھی ملی ہے۔ آج دن میں مجھے یہ اطلاعات ملتی رہی تھیں کہ ایک جرائم پیشہ شخص قلندر راجا اپنے ہم پیشہ حلقوں میں لوگوں کو ٹٹولتا پھر رہا تھا کہ اسکول ٹیچر سلطانہ کو کس نے اغوا کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ واپس اپنے گھر پہنچے تو میں اسے پکڑوں۔ ابھی مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ اپنے گھر پہنچ گیا ہے۔ آپ جاکر آرام کریں۔ اگر مجھے کوئی بات معلوم ہوسکی تو آپ کو فون پر اطلاع دوں گا۔"

"خاص بات نہ معلوم ہو تو بھی اطلاع دیجئے گا۔" فراست نے ایس پی رحمان کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا "آپ کا فون نہ آیا تو مجھے بے چینی رہے گی۔"

"بہتر ہے۔ میں آپ کو ہر حال میں فون کروں گا۔"

ایس پی رحمان اپنی جیپ میں بیٹھ کر تیزی سے روانہ ہوگیا۔ اس کے بعد فراست نے اپنی کار اسٹارٹ کی۔

○☆○

سلطانہ اپنی سراسیمگی اور ذہنی انتشار پر بڑی حد تک قابو پاچکی تھی اور اس کا دماغ یہ سوچنے کے قابل ہوگیا تھا کہ ان لوگوں کے جال سے نکلنے کے لیے اسے ذہانت اور تحمل سے کام لینا ہوگا۔ اس نے آج سے بڑے مبہم انداز میں عابدہ گل پر یہ اظہار کرنا شروع کردیا تھا کہ اس کا دل اس پر اعتبار کرنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔

دن میں عابدہ گل نے اسے ساری کوٹھی بھی گھمائی تھی لیکن بیرونی دروازے اور ان زینوں کی طرف نہیں لے گئی تھی جن سے اوپری منزل پر پہنچا جاسکتا۔

"تمہارا اوپر جانا مناسب نہیں ہے۔" عابدہ گل نے کہا تھا "اگر تم کسی کھڑکی میں یا ٹیرس پر جاکھڑی ہوئیں تو سڑک سے تمہیں باآسانی دیکھا جاسکتا ہے اور یہ اندیشہ نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ تمہارے دشمنوں میں سے بھی کوئی تمہیں دیکھ لے۔"

"آخر مجھے کسی سے کیا خطرہ ہے؟" سلطانہ نے ٹھنڈی سانس لی تھی۔

"میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ یہ تمہیں گل صاحب ہی سے معلوم ہوسکے گا۔ وہ اگر آج رات نہیں تو کل صبح یہاں پہنچ جائیں گے۔"

سلطانہ خاموش ہوگئی تھی۔

دن میں ایک مرتبہ وہ اکیلی بھی گھومتی پھری۔ کوٹھی کے کسی ملازم نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس کے برعکس ان کا انداز مؤدبانہ ہی رہا۔ جیسے سلطانہ اسی گھر کی فرد تھی۔

رات کا کھانا سلطانہ نے عابدہ گل کے ساتھ ڈرائنگ روم میں کھایا اور پھر کمرے میں آگئی۔ سیدھی بستر کی طرف جانے کے بجائے وہ رائیٹنگ ٹیبل کی کرسی پر جابیٹھی تھی۔ اس کا یہ فعل قطعی غیرارادی تھا لیکن جب وہ کرسی پر بیٹھ گئی تو پنسل اٹھا کر سادے پیڈ پر آڑی ترچھی تصویریں بنانے لگی۔

مصوری کا شوق اسے آٹھ دس سال کی عمر سے تھا۔ ابتدا میں وہ چھوٹے گراف کھینچ کر تصویر کی نقل کیا کرتی تھی۔ پھر وہ گراف بڑے کرتے کرتے اس قابل ہوگئی تھی کہ کسی تصویر... کو سامنے رکھ کر پنسل سے ویسی ہی تصویر بنانے لگی تھی۔ بعد میں اس نے لوگوں کو دیکھ کر ہی ان کی تصویر بنانا شروع کردیا تھا۔ اس نے کبھی مصوری باقاعدہ سیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن بی اے کے پہلے سال میں پہنچتے پہنچتے وہ ایسے پنسل اسکیچ بنانے لگی تھی کہ وہ پرفیکٹ تو نہیں لیکن خراب بھی نہیں ہوتے تھے۔

اس وقت وہ خیالات میں ڈوبی ہوئی پنسل چلاتی رہی اور پھر دفعتاً چونک پڑی۔ اس نے بے خیالی ہی میں ایک نوجوان کا چہرہ بنا ڈالا تھا اور وہ کوئی تخیلاتی چہرہ نہیں تھا۔ وہ اس نوجوان کو جانتی تھی۔ اس کا نام حیدر تھا۔ وہ جہاں جہاں ملازمت کے سلسلے میں انٹرویو دینے گئی تھی، وہاں حیدر سے سامنا ہوتا رہا تھا۔ تیسری مرتبہ سامنا ہونے پر حیدر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر اپنے سر کو خفیف سی جنبش بھی دی تھی لیکن سلطانہ نے عادت کے مطابق اس کی طرف سے نظریں پھیر لی تھیں۔

"میرا نام حیدر ہے۔" وہ یکایک قریب آکر بولا "غالباً آپ یہاں ملازمت کے سلسلے میں آئی ہیں؟"

"کیا انٹرویو دینے کا کوئی اور مقصد بھی ہو سکتا ہے؟" سلطانہ نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہو تو سکتا ہے۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آئی تھی "کم از کم میں تو انٹرویو اس لیے نہیں دیتا کہ مجھے ملازمت کی ضرورت ہے۔"

سلطانہ کا دل چاہا تھا، کہہ دے کہ پھر کیا جھک مارنے کے لیے انٹرویو دیتے پھرتے ہو لیکن اس نے خاموشی اختیار کی تھی اور اٹھ کر دوسری طرف جا بیٹھی تھی۔

پھر ایک مرتبہ حیدر نے بس اسٹاپ سے اسکول تک اس کا تعاقب بھی کیا تھا اور سلطانہ دل ہی دل میں بہت جھلائی تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ حیدر اس سے دوستی کا خواہش مند ہے۔ وہ خوش شکل اور خوش لباس بھی تھا لیکن تنہائی کی خوگر سلطانہ کو اس قسم کی باتیں کبھی گوارا نہیں رہی تھیں۔ کالج میں تو ایک بار اس نے ایک لڑکے عمران کو بُری طرح لتاڑ دیا تھا جس نے بذریعہ تحریر اس سے بڑے مہذب انداز میں اظہارِ محبت کیا تھا۔ بعد میں سلطانہ کو تھوڑا سا افسوس بھی ہوا تھا کیونکہ عمران کالج کے چند اچھے لڑکوں میں سے ایک تھا۔

لیکن حیدر؟ سلطانہ متعجب تھی کہ اس نے بے خیالی میں حیدر کی تصویر کیوں بنا ڈالی۔ کیا یہ نوجوان اس کے لاشعور میں کوئی گہرا عکس چھوڑ گیا تھا؟

وہ سوچ میں ایسی ڈوبی کہ اُسے کمرے کا دروازہ کھلنے کی بھی آواز نہیں سنائی دی اور وہ اس وقت چونکی جب عابدہ گل اس کے بالکل قریب آکھڑی ہوئی۔

"اچھا ہوا تم ابھی سوئی نہیں تھیں۔" عابدہ گل بولی "چلو چل کر گل صاحب سے مل لو۔ وہ آگئے ہیں۔"

"اوہ!" سلطانہ جلدی سے کھڑی ہو گئی "چلیے!"

"ارے!" عابدہ گل کی نظر پیڈ پر گئی "تم تو اچھی خاصی تصویریں بنالیتی ہو، مگر یہ نوجوان کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔" سلطانہ نے جھوٹ بولا "ایسے ہی، تخیلاتی تصویر بن گئی ہے۔ کیا گل صاحب ڈرائنگ روم میں ہیں؟"

"ہاں، آؤ۔"

سلطانہ، عابدہ گل کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

○☆○

قلندر راجا کو پولیس کی حراست میں پولیس ہیڈکوارٹر لے جایا گیا۔ اس نے بہت چاہا تھا کہ حراست سے قبل اسے ایک ٹیلی فون کر لینے دیا جائے لیکن اسے اس کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔

ایس پی رحمان نے قلندر راجا کو اپنے کمرے میں اپنی میز کے سامنے بٹھایا اور اسے گھورتا ہوا بولا "تم کسے فون کرنا چاہتے تھے؟"

"اپنے وکیل کو۔" قلندر راجا نے جواب دیا۔

"وکیل کو یا اپنے آقا کو؟"

"میرا آقا کون ہو سکتا ہے صاحب! اپن تو خود راجا ہے۔" قلندر راجا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ایس پی رحمان نے اسے ایک بار پھر تیز نظروں سے دیکھنے کے بعد کہا "تمہیں صرف کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے یہاں لایا گیا ہے۔ اس کے بعد چھوڑ دیا جائے گا۔"

"بڑا مہربانی صاحب!"

قلندر راجا کے اندازِ گفتگو پر ایس پی رحمان کو جھنجلاہٹ سی ہو رہی تھی لیکن اس نے خود پر قابو رکھا اور ایک لفافے میں سے تصویریں نکالتے ہوئے کن انکھیوں سے دائیں جانب دیکھا۔ اس طرف دیوار میں کئی فٹ چوڑا شیشہ لگا ہوا تھا۔ دوسری طرف کے کمرے میں کچھ پولیس والے نقل و حرکت کر رہے تھے۔

"مجھے ایک آدمی کا انتظار ہے۔" ایس پی رحمان نے قلندر راجا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "وہ پانچ منٹ میں آجائے گا۔ اس وقت تک تم خاموش بیٹھو، میں ایک کام کرلوں۔"

جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے تصویریں دیکھنا شروع کردیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں کا زاویہ ایسا رکھا تھا کہ تصویروں کی ہلکی سی جھلک قلندر راجا بھی دیکھتا رہے۔ ہر تصویر کو چند سیکنڈ دیکھ کر وہ اسے باقی تصویروں کے نیچے رکھتا جا رہا تھا۔

کوئی ڈیڑھ منٹ بعد اس کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "یس!"

"سر!" دوسری طرف سے آواز آئی "دو تصویروں سے پہلے آپ نے جو تصویر دیکھی تھی، اس وقت قلندر راجا نے اپنی کرسی پر تھوڑا سا اونچا ہو کر اس تصویر کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔" ایس پی رحمان نے نیچے کی دو تصویروں اور اوپر کی تصویروں کے درمیان انگلی پھنسائی اور باقی تصویریں دیکھتا رہا۔ سب تصویروں کے بعد جب وہ تصویر اوپر آگئی جس کو قلندر راجا نے واضح طور پر دیکھنے کی کوشش کی تھی تو ایس پی رحمان نے تصویروں کو الٹا کر کے میز پر ایک طرف رکھ دیا اور قلندر راجا کی طرف دیکھتا ہوا بولا "آج تمہاری مصروفیات کیا رہیں؟"

"کوئی خاص تو نہیں صاحب!"

"آج تم اپنے ہم پیشہ لوگوں میں گھوم پھر کر یہ جاننے کی

کوشش نہیں کرتے رہے کہ اسکول ٹیچر سلطانہ کو کس نے اغوا کیا ہے؟"

"یہ تو ٹھیک ہے صاحب! اپنے کو یہ پتا تو کرنا تھا۔"

"کیوں! تمہیں اس اغوا سے کیا دلچسپی ہے؟"

"جب اس شہر میں کسی لڑکی کا اغوا ہوتا ہے نا صاحب' تو اپنے کو یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ کس نے اغوا کیا ہے' پر اس کا ہمارے کو بالکل معلوم نہیں پڑا تھا۔ اسی لیے اپنے کو یہ جاننے کی فکر تھی۔"

"کیوں! اگر تم کسی اغوا کے معاملے سے بے خبر رہتے ہو تو اس سے تمہاری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے؟"

"اپن راجا ہے صاحب!" وہ مسکرایا "راجا کو تو سب معلوم ہونا چاہیے۔"

"اچھا!" ایس پی رحمان کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا "تو معلوم ہو گیا تمہیں؟"

"ہاں صاحب!"

ایس پی رحمان چونکا "کس نے اغوا کیا ہے؟"

"یہ تو معلوم نہیں پڑا صاحب! بس اتنا معلوم پڑا کہ یہ کام اپنی برادری کے لوگوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔"

"اوہ!" ایس پی رحمان نے ایک طویل سانس لی "یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے تم سے کس نے کہا تھا؟"

"کسی نے نہیں صاحب! خود میرے کو جاننا تھا۔"

"اس آدمی کو تو فکر نہیں ہے یہ جاننے کی؟" ایس پی رحمان نے وہی تصویر نکال کر قلندر راجا کے سامنے ڈال دی جسے دیکھنے کے لیے قلندر راجا اپنی کرسی پر اُچکا تھا۔

"میں اس آدمی کو نہیں جانتا صاحب!" قلندر راجا فوراً بولا تھا۔

"جب میں یہ تصویریں دیکھ رہا تھا تو تم صرف اسی تصویر کو دیکھنے کے لیے تھوڑا سا اوپر اٹھے تھے۔"

"آپ نے کچھ غلط سمجھا ہے صاحب!"

"اچھا۔" ایس پی رحمان نے سر ہلایا "ابھی تمہیں ڈیڑھ دو گھنٹے ہماری حراست میں اور رہنا ہے۔" پھر اس نے قلندر راجا کے سامنے سے تصویر اٹھائی اور اسے پلٹ کر دیکھا۔ اس پر لکھا تھا۔

"آصف بیگ۔"

نام کے نیچے وہ پتا لکھا تھا جہاں آصف بیگ کا قیام تھا۔

○☆○

ٹیلی فون پر آصف بیگ نے شاہ جی کی آواز سنی "چوکس رہیے گا بیگ صاحب! قلندر راجا نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ آپ سے اگر ایسی کوئی بات کہی گئی تو وہ بالکل جھوٹ ہوگی۔"

"کیا مطلب!" آصف بیگ نے حیرت سے کہا۔

"بس وہ ذہن میں رکھیے جو میں نے کہا ہے۔ ٹیلی فون پر میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اور پھر دوسری طرف سے

تابعدار

نوکر "اٹھیے میرے آقا! اٹھیے اٹھیے۔"

آقا (گہری نیند سے بیدار ہوتے ہوئے) "کیا ہوا! کیا بات ہے؟"

نوکر "حضور' یہ آپ کا خواب آور گولیاں کھانے کا وقت ہے۔"

سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔

ریسیور رکھتے ہوئے آصف بیگ کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے۔ شاہ جی کی مبہم بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

بات اس کی سمجھ میں پانچ منٹ بعد اس وقت آئی جب ایس پی رحمان اس کے کمرے میں بیٹھا ہوا اس سے کہہ رہا تھا "آپ ان لوگوں کا سراغ کیوں لگانا چاہتے ہیں جنہوں نے اسکول ٹیچر سلطانہ کو اغوا کیا ہے؟.... آپ نے یہ معلوم کرنے کے لیے اس شہر کے ایک بدنام آدمی قلندر راجا کو مامور کیا تھا۔ اس نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"قلندر راجا نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔" شاہ جی کی آواز آصف بیگ کے کانوں میں گونجی "آپ سے اگر ایسی کوئی بات کہی گئی تو وہ بالکل جھوٹ ہوگی۔"

آصف بیگ سمجھ گیا کہ پولیس نے کچھ معلومات تو حاصل کر لی ہیں مگر ایس پی کی یہ بات "اندھیرے میں تیر" چلانے کے مترادف ہے کہ اسے قلندر راجا نے سب کچھ بتا دیا ہے۔

"آپ کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئی ہے ایس پی صاحب!" آصف بیگ نے سنجیدگی سے کہا "نہ میں قلندر راجا نامی کسی آدمی کو جانتا ہوں اور نہ مجھے کسی اسکول ٹیچر کے اغوا کا سراغ لگوانے کی فکر ہے۔"

ایس پی رحمان نے اسے گھور کر دیکھا "آپ خاصے ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہیں لیکن میں آپ کو بتا دوں کہ پولیس سے اس قسم کی ہوشیاری زیادہ عرصے تک نہیں چل سکتی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ کسی معاملے میں مجھے کیوں دھمکانا چاہتے ہیں!" آصف بیگ نے خشک لہجے میں کہا۔

"خیر!" ایس پی رحمان کھڑا ہو گیا "اس وقت تو کوئی آپ کو سنبھالا دے گیا ہے لیکن جلد ہی آپ سے دوسری ملاقات ہوگی۔"

پولیس کے جانے کے بعد آصف بیگ کے چہرے پر الجھن اور پریشانی کے تاثرات بہت گہرے تھے۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ آخر پولیس اس تک پہنچی کیسے؟ اور یہ بات اسے شاہ جی ہی سے معلوم ہو سکتی تھی لیکن اس کے لیے اب ہوٹل کا ٹیلی فون استعمال کرنا قطعی مناسب نہیں ہوتا۔ خود شاہ جی نے بھی ٹیلی فون پر وضاحت سے بات کرنے سے گریز کیا تھا۔

○☆○

ادھیڑ عمر گل زادہ کی شخصیت خاصی بارُعب تھی۔ وہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کی ہلکی پھلکی سی عینک تھی۔ موٹی موٹی انگلیوں میں سگار دبا ہوا تھا۔

"بے بی!" اس نے سلطانہ سے کہا "یوں سمجھو کہ تم دراصل ایک پرنسس ہو۔"

سلطانہ ہکا بکا سی رہ گئی اور گل زادہ کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"مناسب ہوگا کہ میں تمہیں بہت شروع سے سب کچھ بتاؤں۔" گل زادہ نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہنا شروع کیا "یہ لگ بھگ ایک صدی پہلے کی بات ہے۔ ایک بحری جہاز بھٹک کر جنوبی امریکا کے جنوب مشرق میں نکل گیا تھا۔ وہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے بلکہ اب بھی ہیں مگر اس صدی میں خاصے جزیرے زیرِ آب بھی جاچکے ہیں۔ وہ سب جزیرے غیر آباد تھے۔ ان کے غیر آباد ہونے کے کئی اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ جزیروں کے لوگ بہت زیادہ غریب ہیں۔ وہاں بے پناہ سردی ہوتی ہے۔ زیرِ آب چٹانیں بھی بہت ہیں۔ انہی میں سے ایک چٹان سے ٹکرا کر وہ بحری جہاز تباہ ہوگیا تھا لیکن اس کے تمام مسافر اس لیے زندہ بچ گئے تھے کہ وہ حادثہ ایک جزیرے سے صرف ڈیڑھ دو فرلانگ کے فاصلے پر ہوا تھا۔ جہاز کی غرقابی آہستہ آہستہ عمل میں آئی تھی اس لیے مسافروں کو کشتیوں کے ذریعے اس جزیرے پر پہنچنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کے بعد وہ لوگ اس جزیرے سے اس لیے نہیں نکل سکے کہ وہ عام بحری راستوں سے بہت زیادہ ہٹ کر ہے۔ کوئی جہاز اس طرف جاتا ہی نہیں تھا لہٰذا وہ لوگ وہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔ ان سب نے صبر کرلیا کہ خدا کو یہی منظور تھا۔ انہوں نے اسی جزیرے میں بودوباش اختیار کرلی۔ ابتدا میں انہیں کافی دشواریاں تو ہوئیں لیکن جب انسان پر پڑتی ہے تو وہ سبھی کچھ جھیل لیتا ہے۔ انہوں نے وہاں لکڑیوں اور درختوں کی چھالوں سے چھوٹے موٹے مکانات بنالیے۔ جنگلی پھل اور خرگوشوں جیسے بہت سے جانور خوردونوش کا ذریعہ بنے۔ وہاں ایک پھل ایسا بھی پایا جاتا ہے جو ناریل سے دو تین گنا زیادہ بڑا ہوتا ہے اور اس کے اندرونی خول میں بھرا ہوا پانی قدرتی پانی کی طرح میٹھا، صاف اور شفاف ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ڈیڑھ سو افراد جن میں مرد، عورتیں اور بچے سبھی تھے، اسی جزیرے کو اپنا وطن سمجھ کر وہاں رہ گئے۔ وہ جزیرہ آج بھی آباد ہے۔ اس جزیرے کو آباد کرنے والے تو مرکھپ چکے، گمران کی دوسری اور تیسری نسل زندہ ہے۔ تم شاید ان باتوں کو کہانی سمجھو لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ لفظ بہ لفظ درست ہے۔" گل زادہ خاموش ہوکر اپنا بجھا ہوا سگار سلگانے لگا۔

سلطانہ سچ مچ یہی محسوس کررہی تھی کہ وہ ایک کہانی سُن رہی ہے۔ اس کے قریب بیٹھی ہوئی عابدہ گل کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

گل زادہ نے سگار کا ایک گہرا کش لے کر دوبارہ بولنا شروع کیا "یہ بات بعد کی نسلوں کو منتقل نہیں ہوسکی کہ وہ جہاز کہاں سے روانہ ہوا تھا اور اس کی منزل کہاں تھی لیکن ان سب میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کی مادری زبان اردو تھی۔ چند انگریزی بولنے والے بھی تھے۔ تیس سال پہلے تک کوئی بھی اس جزیرے سے نہیں نکل سکا تھا لیکن تیس سال پہلے جنوبی امریکا کے چند ملکوں کو اس جزیرے کا پتا چل گیا۔ جزائر فاک لینڈ چونکہ سب سے قریبی آباد جزائر تھے اس لیے وہاں سے ایک بحری کمپنی نے اس جزیرے کے لیے بحری جہاز کی ہفتہ وار سروس بھی شروع کردی۔ تبھی سے وہاں کے لوگوں کا باقی دنیا سے رابطہ ہوگیا ہے۔ اب اس اعتبار سے تو وہ فاک لینڈ کا ایک حصہ بن گیا ہے کہ وہاں کے لوگ آزادانہ فاک لینڈ آجاسکتے ہیں لیکن دیگر ملکوں کا رخ کرنے کے لیے انہیں فاک لینڈ کا پاسپورٹ بنوانا پڑتا ہے۔ فاک لینڈ کی حکومت اس پر معترض نہیں ہے کیونکہ اس کے خیال میں اس جزیرے کے لوگ بہت سیدھے سادے اور دنیا سے بچھڑے ہوئے بدنصیب انسان ہیں۔ اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ جزیرے کی ساری آبادی پُرامن لوگوں پر مشتمل تھی لیکن باقی دنیا سے رابطہ ہونے کے بعد وہاں دھیرے دھیرے قسم قسم کی برائیوں نے جنم لینا شروع کردیا تھا۔ اسی لیے ایک سال سے فاک لینڈ میں یہ بحث شروع ہوچکی ہے کہ اب اس جزیرے کے لوگوں کو فاک لینڈ کا پاسپورٹ جاری کیا جائے یا نہیں۔ اب فیصلہ جو بھی ہو۔ خیر! میں دوسری باتوں کی طرف نکل آیا۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ تم اس جزیرے کی پرنسس ہو۔ جب ابتدا میں اس تباہ شدہ جہاز کے لوگ اس جزیرے پر آباد ہوئے تھے تو ان کے چھوٹے موٹے تنازعات کو نبٹانے کے لیے ایک طرح کی پنچائت بنالی گئی تھی لیکن بعد میں اس پنچائت کا سرپنچ ہی سب کچھ ہوگیا کیونکہ وہ نہایت شریف، ذہین اور سبھی لوگوں کے لیے ایک غیر متنازعہ شخصیت تھی۔ اس طرح وہاں کا پنچایتی نظام ایک اعتبار سے سرداری نظام میں تبدیل ہوگیا۔ اسی سردار کی اولاد بعد میں سردار بنی اور آج تک یہ سلسلہ اسی طرح چل رہا ہے لیکن اب وہاں کے مزاج میں ملوکیت آگئی ہے۔ یوں سمجھو کہ اب وہاں شاہی نظام چل رہا ہے۔ وہاں کے موجودہ سربراہ کے دو بیٹے تھے۔ ان دونوں بھائیوں میں ایک لڑکی کی وجہ سے کچھ رنجش پیدا ہوگئی تھی۔ بعد میں یہ ہوا کہ وہ لڑکی جسے پسند کرتی تھی، اس کے ساتھ اس نے وہ جزیرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کہاں گئے۔ اس بیٹے سے جزیرے کے فرمانروا کو بہت محبت تھی اس لیے وہ اپنے پہلے بیٹے سے بہت ناراض رہنے لگے۔ اس ناراضگی کی وجہ سے بیٹے میں بھی سرکشی اور بغاوت کے جراثیم پیدا ہوگئے۔ اس نے باپ کو مروا کر خود فرمانروا بننا چاہا مگر ناکامی کے بعد اس جزیرے سے فرار ہوگیا۔ کچھ عرصے قبل معلوم ہوا کہ وہ امریکا میں ہے اور بیمار ہے۔ موجودہ فرمانروا کو اس سے اتنی نفرت ہوگئی تھی کہ انہوں نے اس کی خبر گیری کی کوئی کوشش

نہیں کی البتہ اپنے دوسرے بیٹے کے لیے وہ ہمیشہ تڑپتے رہے ہیں۔ اب کہیں جا کر انہیں کسی طرح معلوم ہوا کہ ان کا بیٹا یہاں اپنی بیوی کے ساتھ ایک حادثے میں ہلاک ہو چکا ہے مگر ان دونوں کی ایک بچی نے یہاں کے ایک فلاحی ادارے میں پرورش پائی ہے اور کسی اسکول میں ٹیچر ہے۔"

"یعنی میں...." سلطانہ بولی تو اس کی آواز کپکپا گئی حالانکہ گل زادہ کی ساری باتیں اسے ایک گھڑی ہوئی کہانی لگ رہی تھی۔

"ہاں بیٹی! وہ تم ہی ہو۔" گل زادہ نے کہا۔ پھر سگار کا ایک کش لے کر بولا "تمہاری تلاش ہی کے لیے انہوں نے چند افراد کو یہاں بھیجا تھا جن میں ایک میں اور ایک میری بیوی عابدہ ہے۔ کسی طرح یہ بات ہمارے فرمانروا کے باغی بیٹے کو بھی معلوم ہو گئی تھی۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس نے بھی اپنے کچھ متعمد لوگوں کو یہاں بھیجا ہے کہ وہ کسی طرح تمہیں قتل کروا دیں۔"

گل زادہ خاموش ہوا ہی تھا کہ عابدہ گل بول پڑی "یہ بھی تو بتائیے کہ وہ ہرہائی نس سلطانہ کو کیوں قتل کروانا چاہتا ہے!"

سلطانہ نے چونک کر عابدہ گل کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے لیے "ہرہائی نس" کے الفاظ بہت عجیب لگے تھے۔

"اب میں اسی طرف آتا۔" گل زادہ نے کہا اور پھر سلطانہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا "دراصل اس کے دو بیٹے اب بھی جزیرے پر ہیں۔ اگر تم نہیں ہو گی تو انہی دونوں میں سے کوئی تمہارے دادا کی جگہ لے گا لیکن تم جزیرے پر واپس پہنچ گئیں تو تمہارے دادا تم ہی کو اپنا جانشین بنائیں گے بشرطیکہ تم ارمغان سے شادی کر لو۔"

سلطانہ اب بھی کھوئی کھوئی سی کیفیت میں گل زادہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے کسی خاص چکر میں پھنسانے کے لیے یہ ساری کہانی گھڑی گئی ہے۔

"ارمغان ہمارے موجودہ فرمانروا کے معتمدِ خاص کا بیٹا ہے۔" گل زادہ نے کہا "جزیرے کے اپنے قوانین کے مطابق یہ ضروری ہے کہ جو بھی ولی عہد بنے، اس کی شادی معتمدِ خاص کی اولاد سے ہونا چاہیے۔ اگر باغی شہزادے کی دونوں اولادوں میں سے کسی کو ولی عہد بنایا جائے تو اس کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ ارمغان کی بہن مہ پارہ سے شادی کرے۔ موجودہ فرمانروا نے اب تک اپنے باغی بیٹے کی کسی اولاد سے مہ پارہ کی شادی اس لیے نہیں ہونے دی کہ وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی اپنا جانشین نہیں بنانا چاہتے۔ بالفرض تم نہ ہوتیں اور تمہارے وہ دونوں چچا زاد بھائی بھی نہ ہوتے تو از روئے قانون فرمانروائی کا حق از خود ارمغان کو منتقل ہو جاتا، مگر اب چونکہ تم ہو اور فرمانروا تم ہی کو اپنا جانشین بنانا چاہتے ہیں اس لیے ارمغان سے تمہاری شادی ایک اور وجہ سے بھی ضروری ہے۔ اس سے شادی کے بعد تمہارے دشمن خدا نخواستہ تمہیں ہلاک کروا بھی دیں تو اس سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ تمہارے بعد فرمانروائی کا حق صرف ارمغان کو ہو گا۔"

سلطانہ پہلے ہی سوچ چکی تھی کہ اسے ان عیار لوگوں کے جال سے نکلنے کے لیے بڑے تحمل اور ذہانت سے کام لینا ہو گا لہٰذا اس نے نظریں جھکا کر آہستگی سے کہا "اور اگر وہ لوگ ارمغان کو بھی قتل کروا دیں؟"

"تو فرمانروائی کا حق مہ پارہ کو ہو گا۔"

"اور وہ ان دونوں میں سے کسی کو اپنا شوہر بنا سکتی ہے جنہیں آپ کے بقول میرے دادا اپنا جانشین نہیں بنانا چاہتے!"

"وہ ایسا نہیں کرے گی۔ یہ تو سبھی سمجھ لیں گے کہ تم دونوں کو قتل کروانے میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں مہ پارہ اپنے بھائی کے قاتل کی کسی اولاد کو کیونکر قبول کر سکتی ہے؟"

"ارمغان اس وقت کہاں ہے؟"

"وہ اسٹیٹس میں زیرِ تعلیم ہے مگر اسے ہدایت پہنچائی جا چکی ہے کہ وہ فوراً یہاں آ کر تم سے شادی کر لے۔"

"یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ میں جزیرے پر پہنچنے کے بعد ارمغان سے شادی کروں؟"

"ہو تو سکتا ہے لیکن اس وقت ہمارے لیے مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں یہاں سے بخیر و عافیت کسی طرح نکال کر لے جائیں! ارمغان سے شادی کے بعد یہ مسئلہ نہیں رہے گا۔ اس کے ساتھ تم پہلے امریکا پھر فاک لینڈ اور اس کے بعد اپنے جزیرے پر جا سکتی ہو۔ ارمغان سے تمہاری شادی کے بعد تمہارے دشمن مایوس ہو جائیں گے۔ شادی کے بعد انہیں تمہارے یا تم دونوں کے قتل سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا لہٰذا وہ اس سنگین اقدام کا خیال ہی ترک کر دیں گے۔"

"اس خطرے سے بچنے کے لیے یہاں کی پولیس سے بھی تو رابطہ کیا جا سکتا ہے۔" سلطانہ نے کہا۔

"اس طرح بات پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ تمہارے دشمن بھی واقف ہو سکتے ہیں کہ تم کہاں ہو جبکہ اس وقت تم بالکل محفوظ ہو۔ تمہارے دشمن تمہاری تلاش میں سارے شہر کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں۔"

سلطانہ نے سوچا کہ یہ کہانی گھڑنے میں ان لوگوں نے خاصی تیاری کی ہے، ہر متوقع سوال کا جواب پہلے سے سوچ لیا ہے۔

"کیا اب تمہیں یقین آگیا ہے بے بی کہ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں!" گل زادہ نے سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

"میں شدید الجھن میں پڑ گئی ہوں۔" سلطانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ ایک خواب سا محسوس ہو رہا ہے کہ مجھ جیسی بے سہارا لڑکی کسی جگہ کی شہزادی بھی ہو سکتی ہے!"

"کبھی کبھی کسی خوش قسمت انسان کو ایسی سچائیوں سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے جو اسے خواب ہی محسوس ہوتی ہیں!" گل زادہ نے مسکراتے ہوئے کہا "جب تم جزیرے پر پہنچو گی تو بہت خوش ہوگی کہ تم کو جو خواب نظر آیا تھا، وہ سوتے میں نہیں بلکہ جاگتی آنکھوں سے نظر آیا تھا۔ اب وہ جزیرہ کوئی جھاڑ جھنکاڑ قسم کی جگہ نہیں ہے۔ بہت خوب صورت بنا دیا گیا ہے اُسے۔ خصوصاً ان تین سالوں میں بہت ترقی ہوئی ہے جب سے بیرونی دنیا سے رابطہ ہوا ہے۔ معدنیات سے مالا مال ہونے کے باعث وہاں بہت زیادہ ترقیاتی کام کیے جا سکے ہیں۔"

"یہ کوٹھی کس کی ہے؟" سلطانہ نے اچانک سوال کیا۔

"چند دن پہلے ہی کرائے پر لی گئی ہے۔"

خوب، سلطانہ نے سوچا، ہر سوال کا جواب سوچا جا چکا ہے۔

"اب تم جا کے آرام کرو۔" گل زادہ نے مسکراتے ہوئے کہا "آج کی رات تمہیں اس خوشی میں بمشکل ہی نیند آئے گی کہ اچانک تمہاری قسمت چمک گئی ہے۔"

"ابھی تو خود کو یہ باور کرانے ہی میں وقت لگے گا کہ میں وہی ہوں جو آپ نے مجھے بتایا ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے ذہن پر خاصا دباؤ پڑ گیا ہوگا۔"

سلطانہ کھڑی ہوگئی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔

○☆○

رات کو ایک بجے فراست نے اپنے بستر سے اٹھ کر لائٹ نہیں جلائی کیونکہ نائٹ بلب کی روشنی میں بھی اسے سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے اپنے موبائل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اس نے یہاں آتے ہی خرید لیا تھا۔

موبائل فون پر اس نے پندرہ سے زیادہ نمبر دبائے اور کان سے لگالیا۔ ایک منٹ سے زائد وقت گزرنے کے بعد دوسری طرف گھنٹی بجی۔ دو گھنٹیوں کے بعد رابطہ قائم ہوگیا اور فراست نے جو آواز سنی، وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔

"مسٹر جمیل!" فراست بولا "کل میں نے آپ کو جو پیغام دیا تھا، وہ آپ نے پرنس کو دے دیا تھا؟"

"جی نہیں۔" جمیل نے جواب دیا "دراصل ابھی تک پرنس کی حالت زیادہ بہتر نہیں ہو سکی ہے اور کل ان کے دونوں ہی ڈاکٹرز نے مجھے ہدایت کی تھی کہ ایسی کوئی بات پرنس کے کانوں تک نہ پہنچائی جائے جو ان کے لیے کسی صدمے کا باعث ہو۔ آپ کی دی ہوئی اطلاع اس وقت بھی بس مجھ تک محدود ہے۔"

"اس وقت بھی پرنس کی طبیعت زیادہ خراب ہے؟" فراست نے بے چینی سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اس وقت تو کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ ان کے دونوں ڈاکٹر۔۔۔ فوری طور سے ان کے کمرے میں موجود ہیں۔ اچانک ہی انہیں سانس لینے میں کچھ دشواری محسوس ہونے لگی تھی جس کا ٹریٹمنٹ شروع کرنے سے پہلے ایک ڈاکٹر نے فوری طور پر ان کے منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا دیا تھا۔"

"کیا ڈاکٹرز نے پرنس کی حالت تشویش ناک قرار دے دی ہے؟" فراست نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

"مجھے تو یہی محسوس ہو رہا ہے لیکن ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں کہ صورتِ حال ان کے لیے زیادہ پریشان کن نہیں ہے۔ انہیں اُمید ہے کہ وہ جلد ہی پرنس کی مزید بگڑی ہوئی حالت کو سنبھال لیں گے۔"

"دیکھیے مسٹر جمیل! ایک اور نئی بات بھی سامنے آئی ہے۔ جیسے ہی ان کی حالت سنبھلے، آپ ان سے میری بات کرا دیں۔"

"لیکن آپ ان سے کوئی ایسی بات نہیں کر سکتے جس سے انہیں صدمہ پہنچے۔ جب تک مجھے ڈاکٹرز سے اجازت نہ مل جائے، میں آپ کی وہ اطلاع بھی ان تک نہیں پہنچاؤں گا جو آپ نے مجھے کل دی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ اب میں جو اطلاع دینا چاہتا ہوں، وہ بھی کل کی بات کے حوالے سے ہے مگر اب میں وہ بات کسی ایسے ڈھنگ سے کرلوں گا کہ ڈاکٹرز کی ہدایت کی نفی نہ ہو سکے مگر ان سے بات کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"جیسے ہی وہ بات کرنے کے قابل ہوئے، میں فون پر ان سے آپ کی گفتگو کرا دوں گا۔"

"شکریہ مسٹر جمیل!"

رابطہ منقطع کر کے اور موبائل فون رکھ کر فراست لیٹ تو گیا مگر اس کی آنکھیں کھلی رہیں۔ وہ کچھ متفکر اور سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

گزشتہ روز اس نے پرنس کو اسی بات سے آگاہ کرنا چاہا تھا کہ سلطانہ کو کچھ نامعلوم افراد نے اغوا کرلیا ہے مگر اس کی بات صرف جمیل ہی سے ہو سکی تھی۔ خود پرنس نے فراست سے کہا تھا کہ وہ اس کے پرائیویٹ سیکریٹری جمیل پر مکمل بھروسا کر سکتا ہے اس لیے فراست نے سلطانہ کے اغوا کی اطلاع جمیل کو دے دی تھی جو جمیل کے بقول ابھی پرنس کو نہیں دی جا سکی تھی۔

اس وقت فراست پرنس کو کچھ بتانا اور کچھ معلوم کرنا چاہتا

تھا۔ اسے کچھ دیر پہلے ہی ایس پی رحمان سے آصف بیگ اور قلندر راجا کے بارے میں معلوم ہوا تھا' وہی سب پرنس کو بھی بتاتا اور یہ معلوم کرتا کہ کیا آصف بیگ نام کا کوئی ایسا شخص ہے جس کو سلطانہ کے اغوا سے دلچسپی ہوسکے؟ لیکن اسے پرنس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اور یہ نئی بات وہ صرف پرنس ہی سے کرنا چاہتا تھا۔

○☆○

صبح ہی صبح آصف بیگ کو دیکھ کر شاہ جی نے مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "مجھے اندازہ تھا کہ آپ مجھ سے ملنے کے لیے بے چین ہوں گے۔"

"میں رات ہی آپ کے پاس آتا لیکن مجھے ڈر تھا کہ کسی کو میری نگرانی پر مامور نہ کردیا گیا ہو اور ہوٹل کا فون اب میں آپ سے بات کرنے کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس وقت بھی میں آپ تک بہ مشکل پہنچ سکا ہوں۔ ہوٹل سے نکلنے کے بعد میں نے جلدی ہی محسوس کرلیا تھا کہ میری نگرانی کی جارہی تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح اس شخص کو جل دے کر آپ تک پہنچ سکا ہوں۔"

"خیر! اب تو آپ آہی گئے ہیں لیکن بہتر ہوگا کہ آپ مجھ سے اب براہِ راست نہ ملیں۔ کسی پبلک کال بوتھ سے فون کرلیا کریں یا موبائل فون خرید لیں۔ دراصل قلندر راجا کے مشکوک ہوجانے کے باعث یہ امکان بھی ہے کہ ایس پی رحمان کہیں میری یا میرے گھر کی نگرانی بھی شروع نہ کروا دے۔ دراصل وہ جانتا ہے کہ میں کبھی کبھی قلندر راجا سے بھی کام لیتا ہوں۔"

"خیر یہ سب تو بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ بتائیے کہ گڑبڑ کیا ہوئی ہے! میں بہت پریشان ہوگیا۔ آخر پولیس مجھ تک کیسے پہنچ گئی؟"

"میرا خیال ہے کہ ایس پی رحمان سبھی ایسے لوگوں کو چیک کرنا چاہتا ہے جو باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ یہ مجھے نہیں معلوم کہ اسے قلندر راجا پر کیوں شک ہوگیا۔" شاہ جی نے مصلحتاً جھوٹ بولا "وہ کل رات قلندر راجا کو اس کے گھر سے اٹھا کر پولیس ہیڈکوارٹر لے گیا تھا۔ وہاں اس نے قلندر راجا کو کچھ تصویریں دکھائی تھیں اور پوچھا تھا کہ کیا وہ ان لوگوں کو جانتا ہے؟ قلندر راجا نے انکار کردیا۔ مجھے اطلاع مل گئی تھی کہ قلندر راجا کو اٹھالیا گیا ہے اور پھر مجھے بروقت یہ اطلاع بھی مل گئی کہ ایس پی رحمان کی گاڑی آپ کے ہوٹل پہنچ کر رکی تھی۔ اسی وقت میں نے آپ کو فون کردیا۔ دراصل میں یہاں کے پولیس والوں کے طریقے اچھی طرح جانتا ہوں۔ مجھے یقین تھا' ایس پی رحمان آپ سے کہے گا کہ اس نے قلندر راجا کو گرفتار کرلیا ہے اور راجا نے اسے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کی یہ بات آپ کو گڑبڑاہٹ کا شکار کرسکتی تھی اس لیے میں نے آپ کو بروقت ہوشیار کردیا تھا۔ کیا اس نے آپ سے یہ بات نہیں کہی؟"

"کہی تھی۔" آصف بیگ نے کہا "لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آخر یہ گڑبڑ ہوئی کیسے؟ قلندر راجا پر شبہ کیسے کیا گیا؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" شاہ جی اپنے جھوٹ پر اڑا رہا "لیکن کوشش کررہا ہوں کہ معلوم ہوجائے۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس سے کوئی حماقت سرزد ہوئی ہوگی۔" آصف بیگ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا "جو اس نے آپ سے بھی چھپائی۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی کہ میں اس معاملے میں آپ کا تعاون حاصل کر بیٹھا۔"

شاہ جی کسی سے ایسی کڑوی کسیلی باتیں سننے کا عادی نہیں تھا لیکن محض ڈارکی سے اپنے وسیع کاروبار کے باعث اسے برداشت کرنا پڑا۔

"ٹھیک ہے۔" شاہ جی نے تحمل سے کہا "فی الحال یہ آپ کو اپنی غلطی ہی محسوس ہورہی ہوگی لیکن مستقبل ضرور ثابت کرے گا کہ میں ہی آپ کے کام آسکوں گا۔ ایس پی رحمان کی تمام سرگرمیاں میرے علم میں آتی رہیں گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کل رات میں آپ کو ہوشیار نہ کرپاتا۔"

"آپ نے بتایا ہے کہ قلندر راجا نے ایس پی رحمان کو کچھ نہیں بتایا ہے لیکن یہ اندیشہ تو ہے کہ اس پر تشدد کرکے اس کی زبان کھلوالی جائے۔"

"ایسا کوئی امکان نہیں ہے۔ قلندر راجا رات ہی اپنے گھر آگیا تھا۔ اول تو ایس پی رحمان کے پاس اس کی گرفتاری کا کوئی جواز ہی نہیں تھا' تاہم اگر دھاندلی کرنے کے بارے میں اس نے محض اس لیے نہیں سوچا ہوگا کہ میں کسی نہ کسی اہم شخصیت کو سامنے لاکر صبح ہونے سے پہلے پہلے قلندر راجا کی ضمانت کرالیتا یا کسی طرح بھی اسے چھڑوالیتا۔"

"یہ بہت برا ہوا ہے کہ میں پولیس کی نظر میں آگیا ہوں۔ اب مجھے یہاں سے جانا چاہیے۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی کہ آپ سے ملا۔" آصف بیگ کے لہجے میں تلخی تھی۔

"جلد ہی آپ کو احساس ہوجائے گا کہ آپ نے غلطی نہیں کی۔" شاہ جی نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا اور پھر وہ آصف بیگ کو چھوڑنے کے لیے باہر تک گیا۔

○☆○

کمرے کے دبیز قالین پر سلطانہ ننگے پیر ٹہل رہی تھی۔ اس نے اپنے خوف وہراس پر تو مکمل قابو پالیا تھا لیکن پریشانی سے تو نجات ممکن ہی نہیں تھی۔ گل زادہ کی کہانی نے اسے اور زیادہ الجھا دیا تھا۔ وہ اس پر یقین کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی اور برابر اس سوال پر غور کررہی تھی کہ کیا اس کہانی کے گھڑنے کا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ارمغان نامی کسی نوجوان سے شادی کرلے۔

مگر کیوں؟ سلطانہ کے ذہن میں دوسرا سوال یہ تھا۔ آخر اس کی اچانک ایسی کیا اہمیت ہوگئی تھی کہ اسے کسی مالدار نوجوان کی

بیوی بنانے کے لیے اتنا لمبا چوڑا پلان بنایا گیا تھا۔
ارمغان کے مالدار ہونے کا یقین سلطانہ کو اس لیے تھا کہ اس کا تعلق گل زادہ اور عابدہ گل سے تھا۔ وہ مالدار تو یقیناً تھے۔ یہ شاندار کوٹھی ہی ان کے خاصے مالدار ہونے کا ثبوت تھی۔ عابدہ گل کی قیمتی کار میں تو وہ بیٹھ بھی چکی تھی اور وضع قطع سے بھی وہ دونوں طبقۂ امرا ہی سے معلوم ہوتے تھے۔
کسی مالدار نوجوان سے شادی کرنا سلطانہ کے لیے ایک بہتر زندگی کی طرف پیش قدمی ہوتی۔ اسے کسی سے محبت تو تھی نہیں کہ وہ اس کے سوا کسی سے شادی نہ کرنا چاہتی لیکن ارمغان سے شادی کرنے کے لیے اس کے دل و دماغ دونوں ہی تیار نہیں تھے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ شادی کر کے وہ کسی خطرناک جال میں پھنس جائے گی۔ اس سے ارمغان کی شادی کرا کے خود یہی لوگ کوئی خاص مقصد حاصل کرنا چاہتے ہوں گے لیکن وہ مقصد کیا ہو سکتا ہے، اس بارے میں کوئی خیال بھی سلطانہ کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے لیے یہ تو سراسر حیرت کی بات تھی کہ اس جیسی بے سہارا، بے آسرا لڑکی سے طبقۂ امرا کے کچھ لوگ کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں!
ٹہلتے ہوئے سلطانہ رائیٹنگ ٹیبل کے قریب گئی تو اس کی نظر پڈ پر اپنی بنائی ہوئی اس نوجوان کی تصویر پر پڑی جس کا نام حیدر تھا۔ سلطانہ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ بے خیالی ہی میں سہی مگر اس نے حیدر کی تصویر کیوں بنائی تھی۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا مگر اسے حیدر کے لیے محبت جیسا کوئی جذبہ اپنے دل میں محسوس نہیں ہوا۔ اس کی دانست میں یہ بات ہی احمقانہ تھی کہ دو چار مرتبہ اچانک مل جانے والے کسی نوجوان سے کوئی لڑکی محبت کرنے لگے۔ تو پھر صرف یہی ہو سکتا تھا کہ وہ لاشعوری طور پر حیدر کی خوب صورتی سے متاثر ہو گئی ہو اور بے خیالی میں اس کی تصویر بنا بیٹھی ہو۔
اپنے ہی ان خیالات نے سلطانہ کو کسی حد تک چونکا دیا۔ وہ سوچنے لگی کہ کسی خوب صورت نوجوان سے متاثر ہونا، محبت کا ابتدائی مرحلہ بھی تو ہو سکتا ہے!
سلطانہ اس بارے میں مزید نہیں سوچ سکی کیونکہ دروازہ کھولنے کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ عابدہ گل کمرے میں آئی تھی۔ آج اس سے سلطانہ کی پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ ناشتا کرنے کے لیے ڈائننگ روم میں نہیں گئی تھی، ناسازیٔ طبع کا بہانہ کر کے ملازمہ سے ناشتا کمرے ہی میں منگوا لیا تھا۔
"میرا خیال ہے رات کو آپ جاگی ہوں گی یور ہائی نس!" عابدہ گل نے کہا "اسی لیے آپ کی طبیعت کچھ ڈل ہو گئی ہوگی۔"
سلطانہ کو اس اندازِ تخاطب پر کچھ جھنجلاہٹ سی ہوئی لیکن اس نے تحمل سے کام لیا "کل رات سے میں ہرہائی نس اور یور ہائی نس کیسے بن گئی!"
"اس لیے کہ کل رات ہی آپ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اگر میں اس سے پہلے آپ کو یور ہائی نس کہتی تو آپ مجھ پر سوالات کی بوچھار کر دیتیں اور گل زادہ مجھے فون پر تاکید کر چکے تھے کہ جب تک وہ آپ سے بات نہ کر لیں، میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہ دوں۔"
"لیکن خود گل زادہ صاحب نے مجھے ایک بار بھی یور ہائی نس نہیں کہا۔ وہ مجھے تم کہہ کر مخاطب کرتے رہے۔"
"یہ غلطی وہ جھونک میں کر بیٹھے تھے۔ وہاں سے آپ کے ہٹ جانے کے بعد میں نے انہیں ٹوکا تھا۔ وہ آپ سے اس غلطی کی معافی ضرور مانگیں گے۔"
"مجھے کسی معافی کی ضرورت نہیں ہے۔" سلطانہ کا منہ بن گیا۔
"گل زادہ کو تو اپنا فرض ادا کرنا ہی پڑے گا یور ہائی نس!"
سلطانہ اکتائے ہوئے سے انداز میں رائٹنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ گئی۔
عابدہ گل قدرے توقف سے بولی "میں آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ گل زادہ مارکیٹ گئے ہوئے ہیں۔ وہ بہت سے کپڑوں کے تھان لے کر آئیں گے۔ ان میں سے آپ جو پسند کریں گی، وہ خرید لیے جائیں گے۔ کچھ درزیوں کا بندوبست بھی کیا گیا ہے۔ وہ رات کو بھی کام کریں گے تاکہ کل سہ پہر تک آپ کے گیارہ سوٹ تیار ہو جائیں۔ ان میں ساریاں بھی ہوں گی جن کے بلاؤز اور پیٹی کوٹ سیئے جائیں گے۔ ساریوں میں صرف فال لگانا ہوگی۔"
"مجھے کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔" سلطانہ نے کہا "میں نے جس قسم کی زندگی گزاری ہے، آپ اس سے واقف ہیں۔ میں اپنے یہی کپڑے آج دھو کر اور استری کر کے پہن لوں گی۔"
"لیکن یہ اب آپ کی شان کے خلاف ہے یور ہائی نس! اس کے علاوہ کپڑوں کی ضرورت اس لیے بھی ہے کہ کل آپ کی شادی ہونا ہے۔ کل دوپہر تک آپ کے زیورات کا بندوبست بھی کر لیا جائے گا۔"
"شادی!" سلطانہ نے عابدہ گل کو گھورتے ہوئے کہا "یہ پروگرام آپ لوگوں نے کیسے بنا لیا؟"
عابدہ گل کچھ مضطرب نظر آئی، پھر بولی "کل رات گل زادہ نے آپ کو بتایا تو تھا۔"
"بتایا تو تھا لیکن میری مرضی نہیں معلوم کی تھی۔ میں جزیرے پر اپنے لوگوں ہی میں جا کر شادی کروں گی۔ میری شادی یہاں نہیں ہوگی۔"
"لیکن گل زادہ نے آپ کو بتایا تھا کہ شادی کے بغیر آپ کو یہاں سے بخیریت نکال لے جانا ممکن نظر نہیں آتا۔"
"جو بھی مشکلات یا خطرات ہوں، ان کا مقابلہ کرنا آپ لوگوں کا

کا دردِ سر ہے۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے کہ میں یہاں شادی نہیں کروں گی اور ہاں! اگر کپڑوں کا بندوبست ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن زیورات کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

عابدہ گل سوچ میں ڈوبی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر بولی "بہتر ہے۔ گل زادہ آجائیں تو میں انہیں آپ کے فیصلے سے آگاہ کردوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ یہ میں اس لیے پوچھ رہی ہوں کہ دوپہر کا کھانا آپ ڈائننگ روم میں کھائیں گی یا یہیں بھجوا دیا جائے۔"

"میں ڈائننگ ہال ہی میں آجاؤں گی۔" سلطانہ نے کہا۔

عابدہ گل نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور کمرے سے چلی گئی۔

اب سلطانہ کو دیکھنا تھا کہ شادی سے انکار کا ان لوگوں پر کیا ردِعمل ہوگا۔ اسے اتنا اطمینان تو ہوگیا تھا کہ یہ لوگ اسے کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اس سے ان لوگوں کی کوئی غرض اٹکی ہوئی تھی۔ اب وہ کوئی اور منصوبہ سوچتے اور سلطانہ کو مزید مہلت دی جاتی۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ ان لوگوں کے جال سے نکلنے کے لیے وہ کیا کرسکتی ہے۔ اس نے کوٹھی میں کئی ٹیلی فون دیکھے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ مسز سبحانی یا پولیس سے رابطہ قائم کرے لیکن اس نے کوٹھی میں نقل وحرکت کرتے وقت برابر یہ محسوس کیا تھا کہ نادیدہ آنکھیں اس کی نگرانی کرتی رہتی ہیں۔ اگر اس نگرانی کے باوجود وہ فون کرنے کی کوشش کرتی تو یقیناً اسے روک دیا جاتا۔

ایک اور الجھن سلطانہ کو یہ بھی تھی کہ وہ مسز سبحانی یا پولیس کو یہ کیسے بتائے گی کہ وہ کہاں ہے۔ اسے جب اس کوٹھی میں لایا گیا تھا تو وہ بے ہوش تھی۔ وہ کسی کو صرف اتنا ہی بتا سکتی تھی کہ اسے "قید" کرنے والوں کے نام عابدہ گل اور گل زادہ ہیں۔

کپڑوں کی ہامی بھی اس نے اچانک اس لیے بھرلی تھی کہ جب درزی اس کوٹھی میں آتے تو وہ کسی طرح انہیں یہ اشارہ دینے کی کوشش کرتی کہ وہ یہاں "قید" ہے لیکن اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ ایسا موقع ملنا آسان نہیں ہوسکتا۔ درزیوں کو یقیناً کوٹھی کے کسی الگ تھلگ حصے میں بٹھایا جاتا اور یہ خیال بھی رکھا جاتا کہ سلطانہ کی رسائی ان تک نہ ہو اور اگر ہو بھی تو عابدہ گل اس کے سر پر مسلط رہے۔ سلطانہ کے لیے صرف ایک موقع وہ ہوسکتا تھا جب کوئی درزی اس کا ناپ لیتا۔

ایک گھنٹے بعد عابدہ گل پھر اس کے کمرے میں آئی۔ دو ملازمین کپڑوں کے تھان اور چند ساریوں کے پیکٹ لئے ہوئے تھے۔ سلطانہ کے انتخاب کے بعد ملازمین وہ سب کچھ لے کر چلے گئے۔

عابدہ گل بولی "میں نے گل زادہ کو آپ کے فیصلے سے آگاہ کردیا ہے۔ وہ بہت پریشان ہوگئے ہیں۔ کھانے کی میز پر وہ اس سلسلے میں آپ سے بات کریں گے۔"

"کیا بات کریں گے! میں کہہ چکی ہوں کہ میرا فیصلہ اٹل ہے۔"

عابدہ گل مزید کوئی بات کئے بغیر کمرے سے چلی گئی۔

سلطانہ بستر پر لیٹ گئی۔ اب وہ صرف اس بات پر غور کررہی تھی کہ ان لوگوں کے جال سے نکلنے کے لیے کیا کچھ کیا جاسکتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک ملازمہ نے آکر بتایا کہ ڈائننگ روم میں کھانے کی میز پر اس کا انتظار کیا جارہا ہے۔

سلطانہ جب ڈائننگ روم میں پہنچی تو وہ دونوں وہاں موجود تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس طرح کھڑے ہوگئے جیسے اس کا احترام ان پر لازم ہو۔

قدرت میرے ساتھ عجیب وغریب ہی کھیل، کھیل رہی ہے، سلطانہ سوچتی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ آج اس کے لیے میز کے سرے کی کرسی مخصوص کی گئی تھی۔

پریشان و متفکر گل زادہ نے سلطانہ کو کئی طرح سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرِثانی کرے لیکن سلطانہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

کھانے کے بعد جب سلطانہ کمرے میں لوٹی تو اس کے پیچھے پیچھے عابدہ گل بھی آئی۔ اس کے ہاتھ میں اس قسم کا فیتہ تھا جس سے درزی کسی کا ناپ لیتے ہیں۔

"یور ہائی نس!" عابدہ گل نے کہا "آپ اپنا ناپ دے دیجئے تاکہ درزیوں کو بھیج دیا جائے۔"

"آپ لیں گی ناپ؟" سلطانہ الجھ کر بولی۔

"جی ہاں یور ہائی نس! درزیوں کو یہاں بلانے میں تو آپ کے لیے خطرہ ہوسکتا ہے۔"

سلطانہ کو بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کے ذہن میں جو ایک تدبیر آئی تھی، اس پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

عابدہ گل جب ناپ لے کر جانے لگی تو سلطانہ نے پوچھا "میرا فیصلہ سننے کے بعد گل زادہ صاحب نے کیا سوچا؟"

"ابھی تو وہ پریشان ہی ہیں یور ہائی نس! دیکھئے کیا سوچتے ہیں!"

عابدہ گل کے جانے کے بعد سلطانہ پھر بستر پر لیٹ گئی۔



ایس پی رحمان کی بیوی کا انتقال ہوچکا تھا۔ وہ اپنے گھر میں صرف اپنے جوان بیٹے اور نوجوان بیٹی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس روز بیٹی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ رات کے کھانے کی میز پر صرف اپنے بیٹے عمران کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔

"سلطانہ کے سلسلے میں مزید کچھ پیش رفت ہوئی ڈیڈی!" عمران نے پوچھا۔

ایس پی رحمان نے کھانے سے ہاتھ روک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر بولا "میں تمہیں اس معاملے کے بارے میں شروع

سے اب تک سبھی کچھ بتا رہا ہوں۔ اسی کے بارے میں نہیں بلکہ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنے ہاتھ میں آنے والے ہر کیس کی تفصیلات بتائی ہیں۔ میرا مقصد یہی رہا ہے کہ تمہیں اپنے ہی محکمے کی طرف آنے کے لیے راغب کر سکوں لیکن تم راغب نہیں ہوئے اور اب تمہارا ارادہ اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کا بھی ہے۔ تمہیں ویزا کب مل رہا ہے؟"

"دو ایک دن میں مل جانا چاہیے۔ اس کے بعد دیکھوں گا کہ فلائٹ کب کی ملتی ہے۔"

"ہوں، خیر! یہ باتیں تو برسبیلِ تذکرہ آگئیں۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ پہلے کبھی تم نے کسی کیس کے سلسلے میں از خود مجھ سے کچھ نہیں پوچھا لیکن سلطانہ کے بارے میں برابر پوچھتے رہتے ہو۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"اگر آپ اسے خاص سمجھیں تو صرف یہ ہے کہ میرے خیال کے مطابق وہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے۔ وہ بھی اسی کالج میں پڑھتی تھی جہاں سے میں نے بی اے کیا ہے۔"

"ابھی تم نے جس لہجے میں اس کی تعریف کی ہے' اس سے مجھے ایسا لگا ہے جیسے تم اسے پسند کرنے لگے تھے!" ایس پی رحمان نے غور سے عمران کی طرف دیکھا۔

"وہ ایسی ہی ہے ڈیڈی کہ اسے پسند کیا جائے۔" عمران نے سر جھکا کر کہا۔

"کیا اس سے تمہاری دوستی بھی تھی؟"

"جی نہیں۔ وہ بہت ریزرو رہتی تھی۔"

"کیا تم اس سے شادی کے خواہش مند تھے؟"

عمران سر جھکائے چند لمحے خاموش رہا' پھر بولا "ڈیڈی! امی کے انتقال کے بعد آپ نے ہم دونوں ہی بہن بھائیوں سے کہہ دیا تھا کہ اب چونکہ تمہاری والدہ کا انتقال ہو چکا ہے اس لیے اب تم دونوں ہی اپنی اپنی شادی کے سلسلے میں معقول انتخاب کے لیے آزاد ہو۔"

"یہ میرے سوال کا ڈائریکٹ جواب تو نہیں ہے!"

"جی ہاں ڈیڈی!" عمران نے باپ سے نظریں ملائے بغیر کہا "میں اس سے شادی کا خواہش مند تھا۔ میں نے اس سے کھل کر یہ بات کہہ بھی دی تھی' بلکہ دراصل میں نے اسے خط لکھا تھا مگر اس نے مجھے یکسر نظر انداز کر دیا۔"

"کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی؟"

"میرے خیال میں ایسا بھی نہیں تھا۔"

"کیا تم اب بھی اس سے شادی کے خواہش مند ہو؟"

"اگر ہوتا بھی تو اب اس سے کیا فرق پڑتا۔ اس کے بارے میں آپ سے مجھے جو کچھ معلوم ہو چکا ہے' اس کے بعد یہ امکان ہی نہیں رہا کہ اگر آپ نے اسے ڈھونڈ ہی لیا تو بھی اس سے میری شادی نہیں ہو سکتی۔ کہاں وہ اور کہاں میں! میری خواہش اب بس اتنی ہے کہ وہ بخیر و عافیت بازیاب ہو جائے۔ اسی لیے میں آپ سے اس کے بارے میں پوچھتا رہتا ہوں۔"

ایس پی رحمان کچھ سوچتے ہوئے پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ قدرے توقف سے اس نے کہا "حالات سے اب تک یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ مسٹر فراسٹ کے علاوہ اس وقت شہر میں دو گروہ اور ہیں جن کو سلطانہ کی تلاش رہی ہے اور غالباً انہی میں سے ایک پارٹی سلطانہ کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ ممکن ہے آج اس سلسلے میں مزید کچھ پیش رفت ہو سکے۔ گزشتہ آٹھ نو دن میں جو لوگ امریکا سے یہاں آئے ہیں' ان کی تصاویر میں حاصل کر چکا ہوں۔ وہ سب تصویریں ابھی کھانے پر بیٹھنے سے پہلے میں نے انسپکٹر آفاق کو دی ہیں اور اسے ایک جگہ بھیجا ہے۔ ممکن ہے کوئی کام کی بات معلوم ہو ہی جائے۔ دراصل سلطانہ کے اغوا سے قبل رات کو جو قتل ہوا تھا' اس کی وجہ سے شہر میں کشیدگی کے ڈر سے پولیس کو بہت الرٹ کر دیا گیا تھا۔ سلطانہ کا اسکول اسی علاقے میں ہے جہاں قتل ہوا تھا' اس لیے وہاں آس پاس کی کئی سڑکوں پر کھڑی کی جانے والی پولیس موبائلز میں موجود پولیس والوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی تھی کہ سڑک سے گزرنے والی ہر گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کیا جائے اور بہت پوشیدہ طریقے سے ان کی تصویریں بھی کھینچ لی جائیں تاکہ ان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی ہمارے ریکارڈ پر آجائیں اور کسی بھی گڑبڑ کی صورت میں ان سب کو چیک کیا جا سکے۔ سلطانہ کے بارے میں قیاس یہی ہے کہ اسے اس وقت اغوا کیا گیا ہو گا جب وہ اسکول سے بس اسٹاپ کی طرف جا رہی ہو گی۔ اب اگر ایسا ہی ہے اور اسے کسی بند گاڑی کے بجائے کسی کار میں اغوا کیا گیا ہے تو اس طرف سے گزرنے والی تمام کاروں کے فوٹو ریکارڈ میں موجود ہوں گے۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کی تصویر کسی ایسے شخص کی ہو جس کی تصویر ان تصویروں میں شامل ہو جو میں نے ابھی انسپکٹر آفاق سے بھجوائی ہیں۔ اگر ایسی صورت سامنے آتی ہے تو پھر ہم اس شخص کو چیک کریں گے۔"

عمران نے سر ہلایا اور پھر کہا "اگر کسی ایسے شخص کی تصویر مل بھی گئی تو اس کی کار میں سلطانہ تو دکھائی نہیں دی ہو گی۔ اغوا کر کے اسے باندھ کر یا بے ہوش کر کے پچھلی نشست پر یا شاید ڈکی میں ڈال دیا گیا ہو گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" ایس پی رحمان نے کہا "لیکن ایک ایسا شخص تو ہماری نظر میں آجائے گا جسے مشتبہ سمجھا جا سکے۔ اسے چیک کرنے پر یہ بات بھی معلوم ہو ہی جائے گی کہ سلطانہ کے اغوا میں اس کا ہاتھ ہے یا نہیں۔ ہم لوگوں کو اسی طرح محنت کرنا پڑتی ہے۔ پولیس میں جادوگر ہوتے نہیں ہیں کہ گھر بیٹھے مجرم کا سراغ لگا لیں۔ اسی طرح کام جاری رکھا جائے تو کسی وقت محنت بار آور ہو جاتی ہے۔"

عمران نے سر ہلایا اور پھر کچھ کہے بغیر کھانا کھاتا رہا۔

ایس پی رحمان نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تمہارے دل میں اب بھی سلطانہ کی چاہت موجود ہے۔"

"چھوڑیے ڈیڈی! اب اس ذکر سے کیا فائدہ!"

عمران کے لہجے میں چھپا ہوا دکھ، ایس پی رحمان جیسے جہاں دیدہ پولیس آفیسر سے چھپا نہیں رہ سکا لیکن پھر وہ بھی سر جھکائے کھانے ہی کی طرف متوجہ رہا۔



آصف بیگ کا سیکریٹری آفتاب کسی نہ کسی طرح معلوم کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا کہ گل زادہ اور اس کی بیوی نو دن قبل امریکا سے یہاں پہنچ چکے ہیں۔ یہ اطلاع اس نے دن میں دو بجے آصف بیگ کو دی تھی۔ وہ ہوٹل تو ڈیڑھ بجے ہی پہنچ گیا تھا لیکن اسے فوری طور پر آصف بیگ سے گفتگو کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ کسی سے مصروفِ گفتگو تھا اس کے جانے کے بعد ہی آفتاب نے وہ اطلاع آصف بیگ کو دی تھی اور آصف بیگ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا "آخر میرا شبہ درست ہی نکلا۔ سلطانہ میں انہی دونوں کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔ کیا تم یہ بھی معلوم کر سکے ہو کہ ان دونوں کا قیام کہاں ہے؟"

"نہیں سر!"

"یہ بات پولیس ہیڈ آفس سے معلوم کی جا سکتی تھی لیکن وہاں تمہارا جانا مناسب بھی نہیں تھا۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ عابدہ گل کا کوئی کزن ریشم خاں یہاں رہتا ہے اور یہاں کے خاصے بڑے ٹرانسپورٹرز میں سے ایک ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ دونوں اسی کے گھر میں ٹھہرے ہوں لیکن مجھے اس کا علم نہیں کہ ریشم خاں کا گھر کہاں ہے۔"

"عابدہ گل کہاں مقیم ہے اور ریشم خاں کا گھر کہاں ہے، یہ دونوں ہی باتیں میرا خیال ہے کہ شاہ جی کے ذریعے معلوم کی جا سکتی ہیں۔"

"میں اس سے اب کوئی کام نہیں لینا چاہتا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں اس کی مدد لینا ہی پڑے گی، وہ یقیناً یہ دونوں ہی باتیں معلوم کر سکتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ میں اسے یہاں سے فون نہیں کر سکتا اور اس سے ملنے کے لیے جانا بھی مناسب نہیں ہے۔"

"کوئی پی سی او۔۔۔۔"

"ہاں، پی سی او استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ ایک گھنٹے انتظار کر لیا جائے۔ میں موبائل فون خرید رہا ہوں۔ ابھی جو نوجوان آیا ہوا تھا وہ ایک سیلولر کمپنی ہی کا نمائندہ تھا۔ وہ مجھ سے فارم بھروا کر لے گیا ہے۔ ایک گھنٹے بعد آ کر موبائل فون دے جائے گا۔"

لیکن اس وقت آصف بیگ کو بڑی کوفت ہوئی جب ایک گھنٹے بعد نوجوان نے آ کر موبائل فون تو اسے دے دیا لیکن یہ بتایا کہ لائن پانچ بجے تک مل سکے گی۔ اس نے کمپنی کی کچھ تکنیکی مجبوریوں کا ذکر کیا تھا۔

آصف بیگ نے اب بھی پی سی او جانے کا ارادہ نہیں کیا اور سوچا کہ دو گھنٹے اور گزار لیے جائیں۔

پانچ بجے اس کے موبائل فون میں ٹون آ گئی۔ اس نے فوراً شاہ جی کو رنگ کیا لیکن اس وقت پھر اسے بڑی کوفت ہوئی کہ شاہ جی سے بات نہیں ہو سکی۔ اسے بتایا گیا کہ شاہ جی گھر پر نہیں ہیں اور دو گھنٹے بعد آئیں گے۔

شاہ جی نے اپنے پاس موبائل فون نہیں رکھا تھا ورنہ آصف بیگ اس پر رابطہ کرتا۔

آصف بیگ نے آفتاب کو اس کے کمرے میں بھیج دیا اور بے چینی سے وقت گزارنے لگا۔ سات بجے اس نے شاہ جی کو فون کیا اور اطمینان کی سانس لی۔ شاہ جی کی آواز سنائی دے گئی تھی۔

"میں آپ سے بات کرنے کے لیے دو گھنٹے سے بے چین ہوں۔" آصف بیگ نے کہا۔

"غالباً آپ نے موبائل فون خرید لیا ہے؟"

"ہاں۔" آصف بیگ نے کہا "شاہ جی مجھے یہاں کے ایک ٹرانسپورٹر ریشم خاں کے بارے میں معلوم کرنا ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ وہ یہاں کے مشہور ٹرانسپورٹرز میں سے ایک ہے۔"

"میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا لیکن اس کا پتا لگا لیا جائے گا۔ کیا بات ہے؟ کیا کسی وجہ سے آپ کو یہ شبہ ہوا ہے کہ سلطانہ کے اغوا میں اس کا ہاتھ ہے؟"

"کچھ باتیں میں آپ کو اسی وقت بتا سکوں گا جب آپ مجھے اس کا پتا بتائیں گے۔"

"اچھا!" شاہ جی نے ایک طویل سانس لی "جیسی آپ کی مرضی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کے بارے میں جلد از جلد معلوم ہو سکے۔ معلوم ہوتے ہی آپ کو اطلاع دوں گا۔ آپ کا موبائل نمبر کیا ہے؟"

آصف بیگ نے نمبر بتایا۔

اس گفتگو کے بعد بھی آصف بیگ کی بے چینی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ریشم خاں کے بارے میں جلد از جلد معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اسے بڑی حد تک یقین تھا کہ عابدہ گل اور گل زادہ اسی کے گھر میں مقیم ہوں گے اور سلطانہ کو بھی انہوں نے وہیں رکھا ہوگا۔ اسی یقین کے باعث اس نے شاہ جی کو عابدہ گل اور گل زادہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ شاہ جی پر زیادہ بھروسا کرے۔

رات کے کھانے تک شاہ جی کا فون نہیں آیا تھا۔ اس سے آصف بیگ کی بے چینی اور بڑھی تھی۔ آخر دس بجے شاہ جی کا فون آ گیا۔

"ریشم خاں کے گھر کا پتا چل گیا ہے لیکن دیر اس لیے لگ گئی

کہ وہ یہاں صرف مسٹر خان کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا پورا نام معلوم کرنے ہی میں دیر لگی لیکن وہ آج کل شہر سے باہر کہیں گیا ہوا ہے۔ گھر میں اس کے صرف ملازم ہیں۔ اس کا پتا لکھیں۔"

آصف بیگ نے جلدی جلدی شاہ کا بتایا ہوا پتا لکھا۔

"لیکن وہاں آپ کو کچھ نہیں ملے گا۔" شاہ جی نے کہا "سلطانہ وہاں نہیں ہے۔ آپ شاید مجھ پر اب زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہتے ورنہ مجھے عابدہ گل کے بارے میں بھی بتا دیتے۔"

آصف بیگ چونک پڑا "یہ نام آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

شاہ جی دھیرے سے ہنسا "میں نے آپ کو شروع ہی میں بتا دیا تھا کہ میرے وسائل کہاں تک ہیں۔ میری اطلاع کے مطابق ابھی صرف پانچ منٹ قبل کسی وجہ سے ایس پی رحمان کو شبہ ہوا ہے کہ سلطانہ کے اغوا میں عابدہ گل کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ رحمان کو اس گھر کا پتا بھی چل گیا ہے جہاں عابدہ گل اور اس کا شوہر گل زادہ رہتے ہیں۔ ویسے وہ گھر بھی ریشم خاں ہی کا ہے لیکن وہ خود اس کوٹھی میں نہیں رہتا۔ ایس پی رحمان اس گھر پر ریڈ کر کے وہاں کی تلاشی لینا چاہتا ہے مگر چونکہ وہ دونوں امریکی پاسپورٹ پر یہاں آئے ہیں اس لیے ایس پی رحمان احتیاطاً یہ کام سرچ وارنٹ کے بغیر نہیں کرنا چاہتا۔"

"اسے سرچ وارنٹ حاصل کرنے میں کتنی دیر لگے گی؟" آصف بیگ نے جلدی سے پوچھا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ وہ گیارہ بجے سے پہلے اس کوٹھی پر ریڈ نہیں کر سکے گا۔"

"اس کوٹھی کا پتا کیا ہے؟"

شاہ جی نے ہنس کر اس کوٹھی کا پتا بھی لکھوا دیا۔

آصف بیگ بولا "اگر سلطانہ وہاں ہوئی تو پولیس اب اسے برآمد کر لے گی؟"

"یقینی بات ہے لیکن ہوگا وہی جو میں کہہ چکا ہوں۔"

"کیا مطلب!"

"آپ نے تو غالباً فیصلہ کر لیا ہے کہ اب مجھ پر زیادہ اعتماد نہیں کریں گے لیکن ڈار کی کی وجہ سے میں نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا' وہ پورا ہو کر رہے گا۔ اگر سلطانہ کو وہاں سے بازیاب کر لیا گیا تو اسے پولیس سے چھین لینا میرے آدمیوں کا کام ہوگا۔ خواہ اس کے لیے خون کی ندیاں ہی کیوں نہ بہانا پڑیں۔ سلطانہ کو اس بنگلے میں پہنچا دیا جائے گا جس کی چابی مجھ سے واپس لینے کا شاید آپ کو خیال نہیں رہا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ شاہ جی لیکن کیا کروں کہ حالات کے بگاڑ کی وجہ سے میرا دل آپ کی طرف سے کھٹا ہونے لگا تھا۔"

"شاید آج رات میں اسے میٹھا کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔" شاہ جی نے ہنس کر کہا۔ پھر پوچھا "اس بنگلے پر آپ کب پہنچیں گے؟"

"میں نہیں' میرا بیٹا کاشف وہاں پہنچے گا۔ وہ آج یہاں پہنچنے والا ہے۔ اس کی فلائٹ گیارہ بجے لینڈ کرے گی۔ میں اسے لینے کے لیے ابھی اپنے سیکریٹری آفتاب کو بھیج رہا ہوں۔ اسے تو آپ پہچانتے ہی ہیں۔ اگر کاشف کو وہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہو جائے تو اس کا انتظار کر لیجیے گا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جب آپ عابدہ گل کے گھر کی طرف روانہ ہوں تو میں بھی آپ کے ساتھ موجود رہوں۔"

"میں خود وہاں نہیں جاؤں گا' میرے آدمی جائیں گے۔ آپ ان کے ساتھ جا سکتے ہیں۔ کوئی پوائنٹ مقرر کر لیجیے جہاں وہ لوگ آپ کو مل جائیں گے لیکن اس وقت آپ کی نگرانی کرنے والا آپ کے تعاقب میں ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں اسے جُل دے کر ہی وہاں پہنچوں گا۔"

"اس میں آپ کو دیر بھی لگ سکتی ہے۔"

"آپ کے آدمی کب روانہ ہوں گے۔"

"ٹھیک اسی وقت جب مجھے یہ اطلاع ملے گی کہ ایس پی رحمان اپنے اس مشن پر روانہ ہو رہا ہے اور امکان یہ ہے کہ وہ آدھے گھنٹے میں روانہ ہو جائے گا۔"

"پھر تو مجھے دیر ہو سکتی ہے۔" آصف بیگ نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔

"تو پھر آپ صرف میرے فون کا انتظار کریں۔ اس بنگلے میں سلطانہ کے پہنچتے ہی میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔"

"اچھا' ٹھیک ہے۔" آصف بیگ کے لہجے میں کچھ مایوسی تھی۔

فون بند کرنے کے بعد اس نے آفتاب کی طرف دیکھا "تمہیں اب ائرپورٹ روانہ ہو جانا چاہیے۔"

"سر' آپ عابدہ گل کے گھر پہنچنے کے لیے خاصے بے چین معلوم ہوتے ہیں!" آفتاب بولا "میں نے شہر کی سڑکوں کا ایک نقشہ خرید لیا ہے۔ اس نقشے کی مدد سے آپ خود وہاں پہنچنے کی کوشش کریں۔"

"کہاں ہے نقشہ؟" آصف بیگ نے جلدی سے پوچھا۔

آفتاب نے نقشہ نکال کر تپائی پر پھیلا دیا۔ آصف بیگ نے لکھے ہوئے پتے کو بھی سامنے رکھ لیا اور نقشے پر نظر دوڑانے لگا۔ آفتاب نے بھی جھک کر لکھا ہوا پتا دیکھ لیا اور پھر جلدی سے نقشے پر ایک جگہ انگلی رکھ کر بولا "وہ کوٹھی اس جگہ ہو سکتی ہے۔"

آفتاب بیگ نے قلم سے اس جگہ پر نشان لگایا اور پھر نقشہ تہ کر کے اپنی جیب میں رکھتا ہوا بولا "میں فوراً روانہ ہوتا ہوں۔ اگر نگرانی کرنے والا موجود ہے تو اسے ڈاج دینے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔ تم بھی فوراً ائرپورٹ روانہ ہو جاؤ اور اسے لے کر سیدھے بنگلے پر پہنچو!"

"بہتر ہے۔" آفتاب نے کہا "اگر مجھے چھوٹے صاحب کو لینے ائرپورٹ نہ جانا ہوتا تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتا۔"

آصف بیگ نے کمرے ہوتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بج کر بارہ منٹ ہو چکے تھے۔

○☆○

پونے گیارہ بج چکے تھے اور سلطانہ آج بھی جاگ رہی تھی۔ حالات نے اس کی نیندیں اڑا رکھی تھیں۔ شادی سے انکار کے بعد آج تو عابدہ گل یا گل زادہ کا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا لیکن سلطانہ کو یقین تھا کہ ایسا کچھ ہو کر ضرور رہے گا اور وہ یہ اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ وہ ردِعمل کیا ہو سکتا ہے۔

اچانک کمرے کے دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا۔ دستک کا اتنا ہلکا ہونا اس کے لیے تعجب خیز تھا۔ عابدہ گل یا گل زادہ ہوتے تو اتنی آہستگی سے دستک دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

سلطانہ تیزی سے بستر سے اٹھی اور سائڈ لیمپ جلا کر دبے قدموں دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ دستک پھر ہوئی۔

"کون ہے؟" سلطانہ نے آہستہ سے پوچھا۔ اس کی آواز کانپ گئی تھی۔

اسے جواب تو نہیں ملا لیکن اس نے اپنے قدموں کے پاس کچھ سرسراہٹ محسوس کی۔ اس نے چونک کر نیچے دیکھا۔ باہر سے کسی نے ایک چھوٹا سا کاغذ دروازے اور فرش کی درز سے اندر کھسکایا تھا۔ سلطانہ نے وہ جلدی سے اٹھایا۔ کاغذ پر بڑی گھسیٹا تحریر میں لکھا گیا تھا۔

"سلطانہ! میں حیدر ہوں۔ میں آپ کی خاطر اپنی جان پر کھیل کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ میں آپ کو ان لوگوں کے جال سے نکال کر لے جانا چاہتا ہوں۔ پلیز، جلدی دروازہ کھولئے اور میرے ساتھ یہاں سے نکل چلئے!"

وہ پرچہ پڑھتے ہوئے سلطانہ کے ہاتھ کانپنے لگے اور دل کی دھڑکنیں خاصی تیز ہو گئیں۔ یہ حیدر وہی نوجوان تھا جس کی تصویر وہ بے خیالی میں بنا چکی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی ہے۔ اس کا دماغ جیسے شل ہو گیا تھا۔

جلد ہی پھر اس کے قدموں کے پاس سرسراہٹ ہوئی۔ یہ دوسرا پرچہ اندر ڈالا گیا تھا۔ سلطانہ نے اسے بھی اٹھا کر پڑھا۔ لکھا تھا۔

"سلطانہ! میں یہاں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ خود میری زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اگر آپ اب بھی مجھ پر اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ اب میں صرف تیس سیکنڈ تک دروازہ کھلنے کا انتظار کروں گا۔"

سلطانہ اس وقت کچھ زیادہ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھی لیکن اسے یہ خیال ضرور آ گیا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے یہاں سے تو نکل ہی جانا چاہیے۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور پھر اچانک خوف سے اس کا منہ کھل گیا۔ اس نے حیدر کے ہاتھ میں ریوالور دیکھا تھا۔

"گھبرایئے نہیں!" حیدر نے جلدی سے سرگوشی کی "میرے ہاتھ میں یہ ریوالور صرف آپ کی حفاظت کے لیے ہے۔ جلدی آیئے!" اس نے سلطانہ کی کلائی پکڑلی مگر اس کی گرفت غیر دوستانہ نہیں تھی۔

کوٹھی مکمل سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

حیدر، سلطانہ کو تیزی سے بیرونی دروازے کی طرف لے جا رہا تھا۔ دو جگہ سلطانہ کو ملازمین بے حس و حرکت پڑے نظر آئے۔

"یہ... یہ..." وہ ہکلا سی گئی۔

"انہیں میں نے ہی بے ہوش کیا ہے۔ آپ ان کی پروا نہ کریں۔ رفتار بڑھایئے!"

سلطانہ کو اس وقت اتنا ہوش بھی نہیں تھا کہ وہ ننگے پیر ہی کمرے سے نکل آئی تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے کسی معمول کی طرح حیدر کے ساتھ کھنچی چلی جا رہی ہو۔

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ وہیں ایک تیز رفتار اسپورٹس کار کھڑی تھی۔ حیدر نے سلطانہ کو اس ٹو سیٹر کار کی ایک نشست پر بٹھایا اور خود تیزی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ ابھی تک ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ چوکنا نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھے جا رہا تھا۔

انجن اسٹارٹ کر کے وہ کار کو تیزی سے حرکت میں لے آیا۔

"چوکی دار۔" سلطانہ کے منہ سے کانپتی ہوئی آواز نکلی۔

"اسے بھی بے ہوش کر کے آیا ہوں۔" حیدر نے بتایا "آپ دیکھ نہیں رہی ہیں کہ پھاٹک کھلا ہوا ہے۔"

تیز رفتار کار پھاٹک سے نکلی۔ حیدر نے اسے بائیں جانب موڑا تھا۔ کار کی ہیڈ لائٹس کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی ایک کار پر پڑیں۔

"اوہ گاڈ!" حیدر کے منہ سے نکلا اور اس نے تیزی سے بریک لگاتے ہوئے کار دائیں جانب موڑی۔ پہیوں کے تیزی سے رخ بدلنے اور بریک لگنے کے باعث چرچراہٹ کی تیز آواز سناٹے میں دور تک پھیلی تھی۔

پھر کسی طرف سے ایک فائر ہوا اور سلطانہ کو یوں لگا جیسے اس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔

○☆○

ہوٹل سے نکل کر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد آصف بیگ کو حیرت ہوئی تھی کہ اس کے تعاقب میں کوئی نہیں تھا۔ ایس پی رحمان نے کسی خیال کے تحت آج سے اس کی نگرانی ختم کروا دی تھی یا شاید اس کی کوئی اور وجہ ہو لیکن آصف بیگ کے لیے تو یہ ایک نیک شگون تھا۔ اس نے کار کی رفتار خاصی تیز کر دی تاکہ جلد

از جلد اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے لیکن اجنبی شہر کی اجنبی سڑکیں اسے بار بار مجبور کر رہی تھیں کہ وہ کار کی رفتار کم کر کے اندرونی لائٹ کی روشنی میں سڑکوں کا نقشہ بھی دیکھتا رہے۔

آخر اس نے ایک جگہ کار روک دی۔ وہی اس کی منزل مقصود تھی۔ اتنی رات کو اس نے کوٹھی کا پھاٹک کھلا ہوا دیکھا تو اسے حیرت ہوئی لیکن وہ حیرت بس چند سیکنڈ کی تھی۔ اس نے ایک تیز رفتار اسپورٹس کار کو پھاٹک سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ کار اسی طرف مڑی تھی جدھر اس نے اپنی کار روکی تھی لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اسپورٹس کار کو تیزی سے روکتے ہوئے مخالف سمت میں موڑا گیا۔

آصف بیگ نے کار کی دونوں سیٹوں پر بیٹھے ہوئے افراد کو دیکھ لیا تھا۔ وہ نوجوان اس کے لیے اجنبی تھا لیکن سلطانہ تو اس کے ذہن پر نقش تھی۔

ایک پل میں آصف بیگ کے ذہن میں آگیا کہ اس کی کار اس تیز رفتار اسپورٹس کا تعاقب جاری نہیں رکھ سکتی۔ اس نے پھرتی سے ریوالور نکال کر اسپورٹس کے ایک ٹائر کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ اس کا نشانہ خطا گیا اور دوسرے فائر سے قبل اس نے محسوس کر لیا کہ کار..... اس کے ریوالور کی رینج سے نکل چکی تھی۔ اس نے ہونٹ بھینچ کر اپنی کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور اسی وقت پیچھے سے کچھ تیز رفتار گاڑیاں آکر اس کی کار کے پاس رکیں۔ ان میں دو موٹر سائیکلیں بھی تھیں۔ آصف بیگ نے ایک کار کی کھڑکی سے قلندر راجا کا سر باہر نکلتے دیکھا۔

"یہ آپ نے کس پر فائر کیا تھا؟"

آصف بیگ نے اسے بتایا کہ عمارت سے ایک اسپورٹس کار نکلی تھی جس میں سلطانہ ایک نوجوان کے ساتھ موجود تھی اور اس نے اسپورٹس کا ٹائر برسٹ کرنے کے لیے فائر کیا تھا۔

○☆○

اسپورٹس دو تین فرلانگ آگے ایک موڑ پر مڑی۔ تیز رفتاری کے باوجود حیدر نے اسے بڑی مشاقی سے اپنے قابو میں رکھا تھا۔

سلطانہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا اور وہ خود کو بالکل بے جان سا محسوس کر رہی تھی۔

وہ چونکہ رہائشی علاقہ تھا اس لیے وہاں کی سڑکیں زیادہ چوڑی نہیں تھیں۔ سناٹا بھی تھا اس لیے بھی حیدر کو تیز رفتار ڈرائیونگ میں کوئی پریشانی نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے جلدی جلدی کئی موڑ کاٹے اور پھر اسپورٹس کار ایک ایسی سڑک پر پہنچ گئی جہاں ٹریفک رواں دواں تھا۔ اسپورٹس اس ٹریفک کا حصہ بن گئی لیکن اب پہلے جیسی تیز رفتاری قائم رکھنا ممکن نہیں تھا اور اس سڑک پر آتے ہوئے حیدر کو بھی اس کا اندازہ تھا۔

"ناممکن ہے کہ فائر کرنے والا ہمارے پیچھے لگ سکا ہو۔" حیدر نے سلطانہ سے کہا "لیکن میں اب بھی غافل نہیں ہوں۔" وہ بار بار عقب نما آئینے کی طرف ضرور دیکھ رہا تھا۔

جلد ہی کار..... کو ایک جانب موڑا گیا۔ اب وہ پھر ایک ویران سی سڑک پر تھی اور یہ بھی ایک رہائشی علاقہ تھا لیکن وہاں بنے ہوئے بنگلے زیادہ بڑے نہیں تھے۔

کار.... ایک بنگلے کے کھلے ہوئے پھاٹک میں داخل ہوئی اور دس بارہ فٹ آگے بڑھ کر ہی رک گئی۔ وہ انجن بند کرتا ہوا بولا

"جلدی اتریں۔"

سلطانہ کار سے اتر آئی۔ اس کا جسم خوف سے کانپ رہا تھا۔ اس کی زندگی کا یہ دوسرا خوفناک تجربہ اس کے لیے پہلے تجربے سے زیادہ خوفناک ثابت ہوا تھا کیونکہ اس میں بھاگ دوڑ کے علاوہ ایک گولی کی گونج بھی شامل تھی۔ یہ اندازہ لگانا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ گولی کس نے کس پر چلائی ہوگی' خود اس پر یا حیدر پر؟

حیدر اسے بنگلے میں لے آیا۔

"اوہ! آپ ننگے پیر ہیں!" حیدر نے یہ چیز اب دیکھی تھی۔

سلطانہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ اس کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے وہ اب تک دوڑتی رہی ہو۔

"بیٹھ جائیے! اب آپ خطرے میں نہیں ہیں۔" حیدر بولا۔

خود سلطانہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کی ٹانگوں میں جان نہیں رہی ہے۔ وہ ایک صوفے پر ڈھیر سی ہو گئی۔ حیدر جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔ ریوالور تو اس نے اپنی جیب میں اسی وقت رکھ لیا تھا جب گاڑی ... کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔

○☆○

گل زادہ کی کوٹھی میں پولیس پھیلی ہوئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں گل زادہ اور عابدہ گل پریشان سے بیٹھے ایس پی رحمان سے باتیں کر رہے تھے۔

"آپ خود دیکھ چکے ہیں ایس پی صاحب!" گل زادہ بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا "ہمارے سب ملازمین بے ہوش پڑے تھے۔ ہمیں شاید اس لیے بے ہوش نہیں کیا جا سکا کہ ہمارا کمرا اندر سے بند تھا۔ وہ تو جب آپ لوگوں نے زور زور سے پکارنا شروع کیا کہ یہاں کوئی ہے' اور ہم نے وزنی جوتوں کی آواز سے بھی اندازہ لگا لیا کہ پولیس ہی ہو سکتی ہے تو ہم کمرا کھول کر باہر نکلے۔"

"آپ کے خیال میں یہ سب کچھ کون کر سکتا ہے؟" ایس پی رحمان نے پوچھا۔

"یہ اندازہ لگانا تو ہمارے لیے مشکل ہوگا کہ کون کر سکتا ہے لیکن اس کا مقصد تو سامنے آگیا ہے۔ اختری جان غائب ہے۔ وہ لوگ جو کوئی بھی تھے' اسی کو اغوا کرنے آئے تھے' اور اغوا کر کے لے گئے؟"

"یہ تو آپ بتا چکے ہیں کہ اختری جان آپ کی بیوی کے بھائی

ریشم خاں کی کوئی عزیزہ تھی مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ آپ کے ساتھ کیوں تھی۔"

"پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ یہ کوٹھی جس میں ہم اس وقت ہیں، ریشم خاں کی ہے۔ وہ دوسری جگہ رہتا ہے مگر آج کل شہر میں نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے ہمیں فون کیا تھا کہ پرسوں اس کی ایک عزیزہ ٹرین سے سٹی اسٹیشن پر اترے گی۔ ہم اسے ریسیو کر کے اپنے ساتھ اسی کوٹھی میں لے آئیں۔ میں عابدہ کے ایک دن بعد امریکا سے آیا ہوں۔ ریشم خاں کا فون دراصل عابدہ ہی کو ملا تھا۔ وہی اختری جان کو ریسیو کرنے اسٹیشن گئی تھی۔ ریشم خاں نے عابدہ کو اس کا حلیہ بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اختری جان کو بھی اس کا حلیہ بتا چکا ہے چنانچہ عابدہ اسٹیشن گئی تھی اور اس نے اختری جان سے اپنا تعارف کرانے کے بعد ریشم خاں کا حوالہ بھی دیا تھا لہٰذا وہ عابدہ کے ساتھ یہاں آگئی تھی لیکن۔۔۔"

"ایک منٹ" ایس پی رحمان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ابھی آپ نے بتایا تھا کہ اختری جان، ریشم خاں کی کوئی عزیزہ تھی؟"

"جی ہاں۔"

"اور آپ کی بیگم اس کی کزن ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"تو پھر اختری جان ان کے لیے اجنبی کیسے ہوئی؟"

"دراصل میری بیوی پہلی بار یہاں آئی ہیں۔ ان کی پیدائش ہی امریکا کی ہے۔ ان کے والد اپنی جوانی ہی میں امریکا میں سیٹل ہو گئے تھے۔ صرف ریشم خاں دو ایک بار امریکا آیا تھا۔۔۔ تو ہم سے ملا تھا۔ عابدہ یہاں پر آباد اپنے دوسرے عزیزوں کو نہیں جانتی نہ وہ لوگ اسے جانتے ہیں۔"

"خوب!" ایس پی رحمان نے گل زادہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "خیر! تو آپ بتا رہے تھے کہ وہ عابدہ صاحبہ کے ساتھ یہاں آگئی تھی لیکن۔۔۔"

"جی ہاں۔" گل زادہ نے کہا "دراصل یہاں آنے کے بعد ریشم خاں کو نہ پا کر وہ پریشان اور اس خیال سے کچھ خوف زدہ ہوئی تھی کہ کسی نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ شاید ریشم خاں نے اسے بتایا نہیں تھا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔"

"وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے ریشم خاں کا مستقل قیام کہاں ہے؟"

"اپنے آبائی شہر میں۔"

"اختری جان کہاں سے آئی تھی؟"

"وہیں سے۔"

"ریشم خاں اپنے آبائی شہر میں نہیں ہے؟"

"جی نہیں، لیکن کہاں ہے، یہ بھی نہیں معلوم۔"

"اچھا تو جب اختری جان پریشان ہوئی تو کیا ہوا؟"

"اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا کہ وہ گھر سے نکل کر کہیں اِدھر اُدھر نہ چلی جائے۔ ملازمین کو بھی ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ اس کمرے کا دروازہ نہ کھولیں مگر چند گھنٹے بعد اختری جان مطمئن ہو گئی۔ ریشم خاں نے بتایا تھا کہ وہ اس وقت دوبارہ فون کرے گا۔ اس سے فون پر بات کرنے کے بعد اختری جان مطمئن ہو گئی تھی اور بڑے سکون سے ہمارے ساتھ رہ رہی تھی کہ آج یہ واقعہ پیش آگیا۔"

"وہ کس کمرے میں ٹھہرائی گئی تھی؟"

"میں وہ کمرا آپ کو دکھائے دیتا ہوں۔"

گل زادہ اسے اس کمرے میں لے گیا۔ ایس پی رحمان نے اِدھر اُدھر گھوم کر اس کمرے کا جائزہ لیا اور پھر رائٹنگ ٹیبل کے قریب رک گیا۔ اس کی نظر پیڈ پر لگے ہوئے ایک نوجوان کے پینسل اسکیچ پر جمی ہوئی تھی۔ اس نے مڑ کر گل زادہ کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

"یہ تصویر کس نے بنائی ہے؟" ایس پی رحمان نے پوچھا۔

"شاید اختری جان نے ہی بنائی ہوگی۔ ممکن ہے اسے ڈرائنگ کا شوق ہو۔"

"کیا یہ کسی خاص نوجوان کی تصویر ہے؟"

"اس بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"ہوں، آئیے!" ایس پی رحمان نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور پھر اپنے خصوصی ماتحت انسپکٹر آفاق سے بولا "یہ کمرا فنگر پرنٹ سیکشن کے حوالے کردو۔ یہاں انگلیوں کے نشانات ضرور ملنے چاہئیں۔" ایس پی رحمان نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ گل زادہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا تھا۔

واپس ڈرائنگ روم میں آکر ایس پی رحمان نے کہا "مسٹر گل زادہ! آپ کے ملازمین کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ممکن ہے وہ سب اب تک ہوش میں آچکے ہوں۔ ان میں سے ایک کو شروع ہی میں ہوش آگیا تھا۔ اسے ہم نے ایک لڑکی کی تصویر دکھائی تھی۔ اس نے تصدیق کی ہے کہ وہی لڑکی عابدہ گل صاحبہ کے ساتھ یہاں آئی تھی اور جب آئی تھی تو اس پر غشی سی طاری تھی۔ عابدہ صاحبہ نے بتایا تھا کہ وہ کچھ بیمار ہے اور کسی وقت اس پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ یہ بات انہیں ریشم خاں نے فون پر بتائی تھی اور علاج ہی کے لیے اسے یہاں بلایا تھا۔ کیا آپ کے ملازم کا یہ بیان درست ہے۔"

"جی ہاں، مگر۔۔۔" گل زادہ کے چہرے پر الجھن کے آثار دکھائی دیئے۔ "اختری جان کی تصویر آپ کے پاس کہاں سے آگئی؟"

"میں نے جس لڑکی کی تصویر آپ کے ملازم کو دکھائی تھی، اس لڑکی کو میں سلطانہ کے نام سے جانتا ہوں۔ یہ لڑکی اسی دن اغوا ہوئی تھی جس دن آپ کے بیان کے مطابق عابدہ گل صاحبہ اختری

جان کو یہاں لائی تھیں۔"

"لیکن وہ تصویر ہمارے ملازم نے اختری جان کی حیثیت سے کیسے پہچان لی؟" گل زادہ کے لہجے کی پریشانی کچھ بڑھ گئی۔ اس کی بیوی عابدہ گل بھی پریشان نظر آرہی تھی۔

"آپ بھی دیکھ لیں وہ تصویر۔" ایس پی رحمان نے جیب سے تصویر نکال کر گل زادہ کی طرف بڑھا دی "یہ تصویر مجھے مسز سبحانی سے ملی تھی جن کے فلاحی ادارے کے ہاسٹل میں سلطانہ کا قیام تھا۔"

عابدہ گل نے اپنے شوہر کی طرف جھک کر وہ تصویر دیکھی اور گل زادہ پریشان لہجے میں بولا "بلاشبہ یہ اختری جان ہی کی تصویر معلوم ہوتی ہے لیکن ایسی حیرت انگیز مشابہت....."

"بات صرف مشابہت کی ہے' اس کا فیصلہ بھی جلد ہو جائے گا۔ آپ کی اختری جان کے کمرے سے اس کی انگلیوں کے جو نشانات ملے ہیں' ان کا موازنہ ان نشانات سے کرلیا جائے گا جو ہم نے سلطانہ کے ہاسٹل کے اس کمرے سے پہلے ہی حاصل کر رکھے ہیں۔ دونوں جگہ کے دو نشانات اگر ایک سے ہوئے تو ثابت ہو جائے گا کہ اختری جان اور سلطانہ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔"

عابدہ گل اور گل زادہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' اس کے بعد پھر ایس پی رحمان کی طرف متوجہ ہوئے۔

ایس پی رحمان بولا "اخبارات میں سلطانہ کی پُراسرار گمشدگی کے ساتھ اس کی یہ تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔ کیا وہ آپ لوگوں کی نظر سے نہیں گزری؟"

"اخبارات تو ہم پڑھتے ہیں لیکن اتفاق سے ہم دونوں ہی میاں بیوی کی نظر اس تصویر یا خبر پر نہیں پڑی ورنہ یہ حیرت انگیز مشابہت ہمیں یقیناً چونکاتی۔"

"خیر!" ایس پی رحمان کھڑا ہوتا ہوا بولا "میں ذرا آپ کے باقی ملازمین سے بھی مل لوں لیکن یہ جان لیجیے کہ اختری جان اور سلطانہ اگر ایک لڑکی ثابت ہوگئی تو آپ لوگوں کے لیے پریشانی کتنی بڑھ سکتی ہے' اس کا اندازہ لگانا آپ کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔"

ایس پی رحمان نے گل زادہ سے تصویر واپس لی اور ڈرائنگ روم میں ان دونوں کو پریشان چھوڑ کر باہر چلا گیا۔



"سلطانہ صاحبہ!" حیدر نظریں جھکائے ہوئے مدھم لہجے میں کہہ رہا تھا "ماضی میں جس طرح ہمارا آمنا سامنا ہوتا رہا ہے' اس سے آپ نے شاید میرے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہ کی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس قسم کا نوجوان نہیں ہوں جیسا آپ نے مجھے سمجھا ہوگا۔ اگر آپ میرے اس انداز کو میرے کھلنڈرے پن کے سوا کچھ نہ سمجھیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ میں آپ کے معاملے میں کتنا سنجیدہ تھا' اس کا اندازہ آپ آج کے واقعے سے لگا سکتی ہیں۔ میں اپنی جان پر کھیل کر اس کوٹھی میں گھسا تھا تاکہ آپ کو ان لوگوں کے جال سے نکال سکوں۔"

"لیکن آپ ہیں کون اور آپ کو اس کا علم کیسے ہوگیا کہ میں اس کوٹھی میں تھی؟" سلطانہ نے پوچھا۔

"میں ابھی آپ سے اسی سوال کی توقع کر رہا تھا۔" حیدر نے سرہلا کر کہا "دراصل میں ایک فری لانسر صحافی ہوں۔ کرائم رپورٹر سمجھ لیجیے! اور....."

"میں نے کسی اخبار میں آپ کا نام کبھی نہیں پڑھا۔"

"یقیناً نہیں پڑھا ہوگا۔ وہ رپورٹیں فرضی ناموں سے شائع کرواتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہ کروں اور میری شخصیت سامنے آجائے تو وہ لوگ مجھے قتل کروا دیں جن کے خلاف میں لکھتا رہتا ہوں۔"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے' ہمارے یہاں کے صحافی اتنے مالدار تو نہیں ہوتے۔"

"یہ غالباً آپ اس بنگلے اور میری کار کی وجہ سے کہہ رہی ہیں۔" حیدر نے کہا "دراصل یہ بنگلا تو ہمیں اپنے مرحوم والد سے ترکے میں ملا تھا۔ وہ ایک اچھے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ رہی وہ کار تو وہ میری ہی ہے۔ ہمارے یہاں کے صحافی تو وہ کار بھی نہیں خرید سکتے لیکن میں اپنی بہت سی غیر معمولی رپورٹیں غیر ملکی اخبارات و جرائد میں بھی شائع کرواتا ہوں جہاں سے مجھے معقول معاوضہ ملتا ہے۔ ہاں تو میں آپ کے اس سوال کا جواب دے رہا تھا کہ اس کوٹھی میں آپ کی موجودگی کا علم مجھے کیسے ہوا۔ سلطانہ صاحبہ! کہا جاتا ہے کہ ہم کرائم رپورٹرز آدھے جاسوس بھی ہوتے ہیں۔ پولیس سے رابطہ رہنے کی وجہ سے ہمیں مطلوبہ معلومات بھی حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کا کیس یہاں کے ایک ایس پی مسٹر رحمان کے پاس ہے۔ میں چونکہ آپ کی گمشدگی کی وجہ سے پریشان ہوگیا تھا اس لیے میں نے ایس پی رحمان کے چند قریبی افسران سے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اس طرح مجھے بہت سی معلومات حاصل ہوتی رہی ہیں۔ ابھی آپ سے گفتگو کرنے سے قبل میں اندر ایک ٹیلی فون کرنے گیا تھا۔ اس سے مجھے معلوم ہوگیا کہ ایس پی رحمان نے اس کوٹھی پر ریڈ کردیا ہے۔ ان کے اس ریڈ کی تیاری کا علم مجھے پہلے ہی ہوگیا تھا اس لیے اس سے پہلے کہ پولیس وہاں پہنچتی' میں آپ کو وہاں سے نکال لایا۔"

"اگر آپ کو مجھ سے کسی قسم کی ہمدردی ہے تو آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت مجھے پولیس ہی کا سہارا تو درکار ہے۔"

"آپ یقیناً اسی انداز میں سوچ سکتی تھیں لیکن مجھے اس دوران میں جو معلومات حاصل ہوتی رہی ہیں' ان کی وجہ سے میں جانتا ہوں کہ پولیس تو آپ کو نیک نیتی ہی سے تلاش کر رہی ہے لیکن اس کے بعد آپ کسی مشکل میں پھنس جائیں گی۔"

"اس کے بعد میرے لیے کیا مشکل ہو سکتی ہے!"

"میں ابھی تک بہت زیادہ معلومات تو حاصل نہیں کر سکا ہوں لیکن مجھے اس کا علم ہوگیا ہے کہ آپ کسی وجہ سے اچانک کوئی خاص اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ اسی اہمیت کی وجہ سے تین مختلف پارٹیوں کو آپ کی تلاش ہے۔ ایک تو وہی لوگ ہیں جن کی کوٹھی سے میں آپ کو نکال لایا ہوں، اور دوسری پارٹی کو بھی کسی طرح اس کا علم ہوگیا تھا کہ آپ اس کوٹھی میں موجود ہیں۔ جب میں وہاں سے آپ کو نکال کر سڑک پر پہنچا تھا تو ان لوگوں میں سے ایک نے آپ پر گولی چلائی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اس سے محفوظ رہیں۔ تیسری پارٹی ایک امریکن ہے۔ اس کا نام کوئل فراسٹ ہے۔ اس نے یہاں آکر ہوم سیکریٹری سے ملاقات کی تھی۔ وہ پولیس کے ذریعے آپ کو تلاش کروانے کے بعد اپنے ساتھ امریکا لے جانا چاہتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اسے براہ راست آپ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ کسی کے نمائندے کی حیثیت سے یہاں آیا ہے۔ جس کے نمائندے کی حیثیت سے یہاں آیا ہے، اس کا پورا نام تو مجھے نہیں معلوم ہو سکا لیکن وہ پرنس کہلاتا ہے۔"

"پرنس؟" سلطانہ چونکی۔

"جی ہاں" حیدر نے اس کی طرف دیکھا "کیا آپ امریکا میں مقیم کسی پرنس کو جانتی ہیں؟"

سلطانہ نے بے چینی سے پہلو بدلا اور پھر بات بناتے ہوئے کہا "میں اس بات پر چونکی تھی کہ کسی پرنس کو بھی مجھ سے کوئی دلچسپی ہو سکتی ہے!"

"میں نے کہا تھا ناکہ آپ اچانک کوئی خاص اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ وہ چونکہ پرنس ہے اس لئے اس کے تعلقات بھی خاصے ہوں گے۔ انہی تعلقات کی وجہ سے اس نے ایک سینیٹر کا سفارشی خط کوئل فراسٹ کے ساتھ بھیجا تھا تاکہ یہاں کوئل فراسٹ کو مکمل تعاون حاصل ہو سکے۔ اس سینیٹر کے ہماری موجودہ قیادت سے بھی بڑے اچھے تعلقات ہیں۔"

سلطانہ ہیجان محسوس کرنے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ گل زادہ نے اسے جو کہانی سنائی تھی، وہ واقعی سچ ہو سکتی ہے۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کا دشمن چچا جو پرنس ہی کہلاتا ہوگا، وہی اسے کوئل فراسٹ کے ذریعے امریکا بلا کر اسے قید کر لینا یا شاید قتل ہی کروا دینا چاہتا ہوگا کہ وہ اپنے جزیرے پر واپس نہ جا سکے اور یہاں اس کے جو ہمدرد ہیں، وہ ان کے ہاتھ نہ لگ سکے۔

"میں نے آپ کو آپ کے تیسرے دشمن کا نام نہیں بتایا" حیدر بولا "اس کا نام آصف بیگ ہے۔ آپ کے معاملے میں یہ تینوں ہی پارٹیاں آپ کے خلاف سرگرم عمل ہیں اور ایک دوسرے کی کاٹ میں لگی ہوئی ہیں۔ آصف بیگ نے تو اس وقت آپ کو قتل کر دینے ہی کی کوشش کی تھی۔"

آصف بیگ کے بارے میں تو سلطانہ اندازہ نہیں لگا سکی تھی کہ وہ اسے کیوں ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن حیدر کی باتیں اگر درست مان لی جائیں تو پھر پولیس کے ذریعے فراسٹ کے ہاتھ لگ کر وہ عذاب ہی میں پڑ جائے گی۔ ان حالات میں صرف گل زادہ اور عابدہ گل ہی اس کے سچے بہی خواہ معلوم ہوتے ہیں۔

اب سلطانہ کو کسی حد تک یقین آنے لگا تھا کہ وہ واقعی کسی جزیرے کی شہزادی ہے لیکن وہ الجھن میں بھی تھی۔ اس کا یقین ڈگمگایا ہوا سا تھا۔ وہ پڑھی لکھی تھی اور بیسویں صدی میں رہتے ہوئے اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کسی نامعلوم جزیرے کی شہزادی ہو سکتی ہے! وہ متذبذب تھی کہ گل زادہ اور عابدہ گل پر اعتبار کرے یا نہ کرے! بعید از قیاس نہیں تھا کہ وہ دونوں بھی اس سے اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

حالات کی پیچیدگی سلطانہ کے ذہن کو کسی ایک خیال پر مرتکز نہیں ہونے دے رہی تھی۔ خیالات بار بار بکھر رہے تھے۔

"ایک منٹ" حیدر کھڑا ہوتا ہوا بولا "میں ابھی آیا۔"

وہ اندر چلا گیا تو سلطانہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نوجوان نے اس کی خاطر واقعی جان کی بازی لگا دی تھی۔ مگر کیوں! کیا واقعی یہ مجھے بہت زیادہ پسند کرنے لگا ہے!

حیدر جلد ہی واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں عورتوں کے استعمال کے چپل تھے۔ وہ اس نے سلطانہ کے پیروں کے قریب ڈالتے ہوئے کہا "میں باتوں میں الجھ کر بھول ہی گیا تھا کہ آپ ننگے پیر ہیں۔"

"لیکن یہ چپل آپ کے گھر میں کہاں سے آگئے۔ یہ تو....."

"یہ میری بہن کے ہیں" حیدر نے مسکرا کر کہا "وہ ذرا جلدی سو جانے کی عادی ہے اور بہت گہری نیند سوتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ گھوڑے بیچ کر سونے کے فن میں اس سے زیادہ مہارت کسی کو نہیں ہو سکتی۔"

اپنے منتشر ذہن کی وجہ سے سلطانہ، حیدر کے جملے سے محظوظ نہیں ہو سکی اور بولی "آپ کے گھر میں ملازمین نہیں ہیں؟"

"بس ایک چوکیدار ہے" حیدر نے کہا "میں اس سے کہہ کر گیا تھا کہ وہ پھاٹک کھلا رکھے۔ ہمارے آنے کے بعد اس نے پھاٹک بند کر دیا ہوگا۔ گھر کے کام کاج کے لئے دو ملازمائیں صرف دن میں آتی ہیں۔"

سلطانہ کچھ نہیں بولی۔

حیدر نے کہا "اب یہ بتایئے کہ ان حالات میں آپ کیا فیصلہ کرنا چاہتی ہیں؟"

"ابھی تو میرا ذہن منتشر ہے، بہت منتشر ہے۔ میں فوری طور پر شاید کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکوں۔"

"تو پھر اب آرام کیجئے! میں آپ کو بیڈ روم تک پہنچائے دیتا ہوں۔ وہ بیڈ روم مہمانوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔"

"ایک بات بتایئے حیدر صاحب!" سلطانہ نے نظریں جھکا کر کہا "آپ نے خود کو اس وقت اتنے خطرے میں کیوں ڈالا تھا؟"

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں وضاحت سے سب کچھ کہوں؟ اس وقت بھی میں اشارے کنائے میں دو ایک جملے کہہ چکا ہوں۔ آپ تو خاصی پڑھی لکھی لڑکی ہیں۔ سلطانہ! میرا خیال تھا کہ آپ نے میرے دلی جذبات کو سمجھ لیا ہوگا۔ خیر' چھوڑیئے! اس وقت تو آپ آرام کیجئے۔ کل صبح آپ میری بہن الماس سے بھی مل لیجئے گا۔ وہ آپ کو یہاں دیکھ کر بے انتہا خوش ہوگی۔"

"کیوں!"

"اس لئے کہ....." حیدر نے سلطانہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "وہ آپ کے بارے میں میرے جذبات سے اچھی طرح واقف ہے۔ میں معذرت کے ساتھ آپ کو بتاؤں کہ میں نے پوشیدہ طور پر آپ کی بہت سی تصویریں کھینچی ہیں اور انہیں انلارج کروا کے اپنے بیڈ روم میں لگا رکھا ہے۔ کل آپ الماس کے ساتھ میرا بیڈ روم دیکھئے گا۔ اب چونکہ میرے دل کی وضاحت میری زبان پر آہی گئی تو میں کچھ باتیں اور کہوں گا۔ الماس مجھ سے ضد کرتی رہی ہے کہ میں اسے آپ سے ملاؤں تاکہ وہ آپ سے..... میرا مطلب ہے..... خیر چھوڑیئے! دراصل یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ میں اگر کسی لڑکی سے محبت کرنے لگوں تو وہ بھی مجھ سے محبت کرنے لگے۔ میرے دل میں جو کچھ ہے' وہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ اگر آپ کو کسی مصیبت سے نکالنے کے لئے میں نے کوئی خطرہ مول لیا تو یہ بھی میرے دل کی مجبوری تھی۔ آپ کو تمام پریشانیوں سے چھٹکارا دلا کر مجھے بہت سکون ملے گا لیکن اپنی زندگی کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا آپ کا اپنا حق ہے۔ ان معاملات میں کسی قسم کے جبر کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ اوہ! میں پھر لمبی باتیں چھیڑ بیٹھا۔ پلیز آپ اٹھئے! میں آپ کو بیڈ روم تک پہنچا دوں۔"

حیدر نے اب تک اس سے کوئی غیر شائستہ بات نہیں کی تھی۔ وہ خود کو اس کی خاطر خطرے میں بھی ڈال چکا تھا لیکن سلطانہ کسی نہ کسی حد تک اس سے بھی خوف زدہ تھی۔ اسے معلوم تھا کہ بڑے بڑے شرافت کے پیکر ایک پل میں اپنی کینچلی بدل لیتے ہیں لیکن اس وقت وہ خود کو بے بس بھی پا رہی تھی۔ فی الحال حیدر کے گھر میں رہنے کے علاوہ اسے کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

حیدر نے اسے ایک بیڈ روم میں پہنچایا اور اندر جاتے ہی سلطانہ نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

○☆○

صبح ساڑھے آٹھ بجے فراست ناشتا کر ہی رہا تھا کہ ایس پی رحمان آگیا۔ فراست نے اسے بھی ناشتے میں شامل کرنا چاہا لیکن رحمان نے صرف چائے ایک کپ پر اکتفا کیا۔

فراست بولا "آپ کی اتنی صبح آمد سے میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ نے کوئی خاص کامیابی حاصل کرلی ہے۔"

"ایک اعتبار سے وہ کامیابی تو ہے لیکن میں آپ کے پاس خصوصاً اس لئے آیا ہوں کہ ہوم سیکریٹری صاحب کی ہدایت کے مطابق آئی جی صاحب نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں آپ کو حالات سے آگاہ کرتا رہوں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ کل رات بڑی اہم ثابت ہوئی ہے۔"

"کیسے!" ناشتے پر فراست کی توجہ کم ہوگئی۔

ایس پی رحمان نے اسے گزشتہ رات کے تمام واقعات تفصیل سے بتائے۔ سب کچھ سننے کے بعد فراست بے چینی سے بولا "تو جب فنگر پرنٹس سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ اختری جان نہیں بلکہ سلطانہ ہی تھی تو آپ ان دونوں کو گرفتار کیوں نہیں کرتے!"

"انہوں نے جو بیان دیا ہے' اس میں ان کے لئے بچاؤ کا پہلو بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کیا' وہ ریشم خاں کے کہنے سے کیا۔ اب اگر وہ لڑکی سلطانہ ثابت ہو رہی ہے تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ریشم خاں سے فون کرنے کے بعد سلطانہ آخر مطمئن کیوں ہوگئی تھی۔"

"ان کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے کہ سلطانہ نے ریشم خاں سے فون پر گفتگو کی تھی۔"

"لیکن سلطانہ وہاں سے غائب ہوچکی ہے۔ ہم اسے بازیاب کرلیں تو وہ گل زادہ کے بیان کی تردید کرسکتی ہے اور اسی صورت میں ان دونوں کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ریشم خاں کا یہ کوئی اپنا چکر ہے جس میں وہ دونوں پھنس گئے ہیں۔ اب اگر ریشم خاں ہاتھ لگ جاتا ہے تو بھی یہ معاملہ خاصا سمجھ میں آجائے گا لیکن وہ تو ایسا غائب ہوا ہے جیسے اسے آسمان کھا گیا ہے یا زمین نگل گئی ہے۔ عابدہ گل تو اپنے کزن کو برا بھلا بھی کہہ رہی تھی۔ گل زادہ کہہ رہا تھا کہ نہ وہ اس کے مکان میں ٹھہرے ہوتے نہ ان کو یہ پریشانی لاحق ہوتی۔ وہ آپس میں کہہ رہے تھے کہ فوراً وہ کوٹھی چھوڑ دیں لیکن میں نے انہیں تاکید کی ہے کہ جب تک سارے معاملات صاف نہیں ہوجاتے وہ اسی کوٹھی میں رہیں۔ مشکل یہ ہے مسٹر فراست کہ وہ دونوں بھی امریکی ہیں۔ امریکی پاسپورٹ پر ہی یہاں آئے ہیں۔ میں صرف شبے میں ان کو حراست میں نہیں لے سکتا۔ آپ کے ملک کا سفارت خانہ ہمارے آڑے آجائے گا۔ ہاں اگر ان کے خلاف ٹھوس ثبوت مل جائے تو پھر امریکی سفارت خانہ بھی ان کے لئے کچھ نہیں کرسکے گا۔ ہم تو ابھی یہ ثابت کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہیں کہ عابدہ گل نے سلطانہ کو اغوا کیا تھا یا واقعی اسے اسٹیشن سے لے کر آئی تھی۔ اغوا کے دن عابدہ گل کی کار کی جو تصویر لی گئی تھی' اس کا رخ ایسا تھا کہ یہ بھی امکانی بات نظر آتی ہے کہ وہ اسٹیشن ہی سے آرہی ہو۔ اب سارا انحصار اس بات پر ہے کہ ریشم خاں ہمارے ہاتھ لگ جائے یا ہم سلطانہ کو بازیاب کرلیں۔"

"وہاں سے سلطانہ کو اڑا لے جانے میں کس کا ہاتھ ہوسکتا

ہے؟"
"شاید آصف بیگ کا" ایس پی رحمان نے کہا "پولیس جب وہاں پہنچی ہے، اس سے شاید دو تین منٹ پہلے ہی سلطانہ کو وہاں سے اڑایا گیا ہے لیکن ایک بات الجھن میں ڈال رہی ہے۔ پڑوسیوں کا بیان ہے کہ انہوں نے ایک فائر کی آواز سنی تھی۔ اگر کسی نے اغوا کرنے والے پر فائر کیا تھا یا اغوا کرنے والوں نے کسی پر گولی چلائی تھی تو پھر یہ شبہ ہوتا ہے کہ آصف بیگ کے علاوہ بھی کسی کو سلطانہ میں دلچسپی ہے۔"

"یعنی آصف بیگ اور گل زادہ کے علاوہ کوئی تیسری پارٹی؟" فراسٹ نے پُر تشویش لہجے میں کہا۔

"ہاں، اس فائر کی وجہ سے اس امکان پر غور کرنا پڑ رہا ہے۔"

فراسٹ نے نیپکن سے ہاتھ صاف کر کے مضطربانہ لہجے میں کہا "خاصا وقت گزر گیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ سلطانہ کو ڈھونڈنے میں آپ کو زیادہ دن نہیں لگیں گے۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہی تھا مسٹر فراسٹ! ہم کل اس کوٹھی تک پہنچ ہی گئے تھے جہاں سلطانہ قید تھی۔ اب یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ چند منٹ قبل وہاں سے بھی غائب ہو گئی" ایس پی رحمان نے کہا، پھر بولا "اب میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس سے معاملے کو سمجھنے میں کچھ مدد مل سکے۔ آپ فون پر اپنے پرنس سے بات کیجئے۔ انہیں گل زادہ اور آصف بیگ کے نام بتایئے۔ ممکن ہے وہ ان لوگوں سے واقف ہوں اور ہمیں بتا سکیں کہ یہ لوگ سلطانہ کے پیچھے کیوں پڑ سکتے ہیں۔"

"یہی تو مشکل ہو گئی ہے ایس پی صاحب!" فراسٹ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "پرنس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ وہ آکسیجن ماسک سے سانس لے رہے ہیں۔ ان سے گفتگو ممکن نہیں رہی۔"

"اوہ!"

"بہر حال، آج میں پھر ان سے رابطے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے ان کی حالت بہتر ہو گئی ہو۔ ڈاکٹروں نے امید دلائی تھی کہ وہ جلدی ہی پرنس کی بگڑی ہوئی حالت کو سنبھال لیں گے۔"

"اگر ان سے آپ کی بات ہو جائے تو مجھ سے ضرور رابطہ کیجئے گا" ایس پی رحمان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"یقیناً! میں آپ کو فوراً بتاؤں گا۔"

○☆○

رات کو دیر سے سونے کے باوجود سلطانہ خوابیدگی میں اتنی بے چین رہی تھی کہ صبح چھ بجے سے پہلے ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ ذرا دیر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ بستر سے اٹھی اور باتھ روم کا رخ کیا۔ اس کا دماغ بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ وہ غسل کر کے تازہ دم ہو جانا چاہتی تھی۔

باتھ روم میں اسے واشنگ مشین نظر آئی تو اس نے سوچا کہ کپڑے بھی دھو لے۔ نہانے سے قبل اس نے کپڑے دھوئے اور انہیں ڈرائر مشین میں سکھانے کے بعد غسل کیا۔ کمرے میں اسے ایک استری بھی مل گئی تھی۔ اس نے کپڑے پہننے سے قبل ان پر استری بھی کر لی۔ ایک گھنٹے میں وہ پوری طرح تیار ہو چکی تھی اور اس ایک گھنٹے میں اس کا دماغ بھی برابر کام کرتا رہا تھا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ مسلسل سوچتے رہنے کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔

تذبذب کے عالم میں اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ وہ دوبارہ گل زادہ اور عابدہ گل تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ اس سلسلے میں وہ حیدر سے بھی مشورہ کر سکتی تھی۔ شاید تمام باتیں جاننے کے بعد وہ بھی سلطانہ کے اس خیال سے متفق ہو جاتا کہ عابدہ گل اور گل زادہ اس کے دشمن نہیں بلکہ ہمدرد تھے۔

مگر یہ سب کچھ سوچتے ہوئے سلطانہ متذبذب ہی رہی۔ حیدر پر زیادہ اعتماد کرتے ہوئے بھی اسے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

پھر اچانک ہی ایک خیال اس کے ذہن میں اس طرح آیا جیسے بجلی کوند جاتی ہے۔ ان حالات میں بھی ایک ہستی ایسی ضرور تھی جس پر وہ مکمل اعتماد کر سکتی تھی۔ مسز سبحانی!

لیکن مسز سبحانی تک رسائی کیسے ہو؟ کیا حیدر کسی طرح اسے مسز سبحانی تک لے جانے کے لئے تیار ہو جائے گا؟

وہ سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے سات بج رہے تھے۔ وہ دروازے کے قریب گئی اور پوچھا "کون ہے؟"

"حیدر" جواب ملا۔

سلطانہ نے دروازہ کھول دیا۔ حیدر کے ساتھ ہی اسے ایک لڑکی بھی نظر آئی جو چہرے مہرے سے حیدر کی بہن ہی معلوم ہوتی تھی۔ حیدر نے اس کا نام الماس بتایا تھا۔

سلطانہ کو دیکھ کر اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

حیدر ہنس کر بولا "دیکھا! میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ مہمان کو دیکھ کر تم حیران رہ جاؤ گی۔"

"لیکن....." الماس شاید حیرت کی زیادتی سے بات پوری نہیں کر سکی۔

"تفصیلات میں تمہیں ناشتے کی میز پر بتاؤں گا۔ انہیں لے چلو" پھر وہ سلطانہ سے بولا "آپ نے تو شاید اپنے کپڑے بھی دھو لئے!"

"جی ہاں" سلطانہ نے آہستہ سے کہا "خاصے خراب ہو گئے تھے۔"

"چلیں اچھا کیا۔ ویسے الماس کے کپڑے بھی آپ کے جسم پر ٹھیک ہی آ جائیں گے۔ خیر، الماس! لے چلو نا انہیں!"

الماس ابھی تک حیرت زدہ سی تھی۔ وہ چونکی، پھر مسکرا کر آگے آئی۔ اس نے بڑی محبت سے سلطانہ کا ہاتھ پکڑ لیا "آیئے!"

سلطانہ کمرے سے نکل آئی۔

"بھائی جان نے قسم کھائی تھی کہ یہ آپ کو تلاش کر کے دم لیں گے" الماس نے کہا "اور مجھے یقین بھی تھا کہ آپ کو ڈھونڈنے میں یہ اپنے سر سے کھیل جائیں گے۔"

"انہوں نے واقعی بہت بڑا خطرہ مول لیا تھا" سلطانہ نے کہا۔

"کیسے!"

حیدر بول پڑا "میں نے کہا نا کہ ناشتے کی میز پر تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"ناشتا میں خود ہی تیار کرتی ہوں۔ شاید آپ کو پسند آئے۔"

"حیدر صاحب بتا رہے تھے کہ دن میں ملازمائیں آتی ہیں!"

"وہ ساڑھے نو بجے کے بعد آتی ہیں۔"

"الماس!" حیدر بولا "آج تم کالج نہیں جانا۔ سلطانہ کو اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا اور ہاں! یہ خیال بھی رکھنا کہ ملازماؤں کی نظر ان پر نہ پڑے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انہیں اپنے بیڈ روم میں لے جاؤں گی۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ تینوں ڈائننگ روم میں آ گئے۔

ناشتا کرتے ہوئے حیدر نے الماس کو تفصیل سے گزشتہ رات کی ساری باتیں بتا دیں۔

"اوہ گاڈ!" الماس کے منہ سے نکلا "یہ سب کچھ کتنا خوفناک ہے مگر آخر یہ کیسے پتا چلے گا کہ اتنی پارٹیاں سلطانہ صاحبہ کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہیں۔"

"میں ترجیح تو اس بات کو دے رہا تھا کہ پہلے انہیں ڈھونڈ نکالوں۔ اسی دوران میں کچھ معلومات بھی حاصل ہوتی رہیں۔ اب میں ساری توجہ یہ معلوم کرنے پر دوں گا کہ آخر یہ لوگ ان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ میں ابھی اسی سلسلے میں جا رہا ہوں۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک لوٹ آؤں گا۔" پھر وہ کھڑا ہوتا ہوا سلطانہ سے بولا "آپ گھبرائیے گا نہیں۔ یہاں آپ بالکل محفوظ ہیں۔ میں نے اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا۔ وہ کار ہمارے تعاقب میں نہیں آ سکی تھی۔ جس میں بیٹھے ہوئے آصف بیگ نے آپ پر گولی چلائی تھی۔"

سلطانہ نے سرہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ حیدر کے جانے کے بعد الماس نے سلطانہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "آئیے میں آپ کو پہلے گھر دکھاؤں۔"

سلطانہ سمجھ گئی کہ گھر دکھانا تو محض ایک بہانہ ہے۔ الماس اسے وہ کمرا دکھانا چاہتی ہے جہاں وہ اپنی بڑی بڑی تصویریں دیکھے گی اور جو بقول حیدر، اس نے پوشیدہ طور پر کھینچی تھیں۔

آخر کئی کمروں کے بعد وہ اس کمرے میں پہنچیں۔

"یہ بھائی جان کا بیڈ روم ہے۔"

سلطانہ اپنی وہ بڑی بڑی تصویریں دیکھنے لگی جو اس کمرے میں بڑے سلیقے سے آراستہ کی گئی تھیں۔ ان کی تعداد سات تھی۔

"ان تصویروں کو دیکھ کر آپ چونکیں نہیں!" الماس بولی۔

"حیدر صاحب مجھے کل رات اس بارے میں بتا چکے تھے۔"

"آپ بہت کیوٹ اینڈ سوئٹ ہیں سلطانہ!" الماس نے سلطانہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد آپ کے احساسات کیا ہیں؟"

"حیدر صاحب کل رات مجھ سے بہت کچھ کہہ چکے ہیں" سلطانہ نے سنجیدگی سے کہا "لیکن ابھی میرا ذہن اس قسم کی باتیں سوچنے کی طرف مائل نہیں ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے کہ آپ شدید ذہنی انتشار میں ہوں گی" الماس سنجیدہ ہو گئی "آئیے، اب آپ میرے بیڈ روم میں چلیے۔"

سارے گھر میں گھومتے ہوئے اور پھر الماس کے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے سلطانہ نے دیکھ لیا تھا کہ اس گھر میں دو ٹیلی فون تھے۔ ایک حیدر کے بیڈ روم میں اور دوسرا لاؤنج میں!

سلطانہ نے الماس سے کہا "کیا میں ایک فون کر لوں؟"

"کسے؟" الماس نے چونک کر پوچھا۔

"ایک ہستی ایسی ہے جس پر میں مکمل اعتماد کر سکتی ہوں۔"

"کیا آپ مسز سبحانی سے بات کرنا چاہتی ہیں!" الماس خاصی ذہین تھی۔

"ہاں" سلطانہ نے کہا "میں انہیں آنٹی کہتی ہوں۔ ویسے انہوں نے ماں کی طرح پرورش کی ہے میری۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے لئے تڑپ رہی ہوں گی۔"

الماس کے چہرے پر گہری سنجیدگی پھیل گئی۔

"اگر آپ نے بھائی جان کے سامنے یہ بات کہہ دی ہوتی تو اچھا ہوتا۔ وہ مجھ سے نہیں بلکہ شاید آپ سے بھی زیادہ بہتر سوچ سکتے ہیں کہ ان حالات میں آپ کو کس سے رابطہ کرنا چاہئے اور کس سے نہیں! میں آپ کو کیا بتاؤں کہ آپ کی گمشدگی کا سارا عرصہ بھائی جان نے کس طرح پاگلوں کی طرح دوڑ بھاگ کر کے گزارا ہے۔ اب اگر میری کسی غلطی سے آپ پھر کسی چکر میں پھنس گئیں تو بھائی جان اتنے ناراض ہوں گے کہ شاید مجھ سے بات ہی کرنا چھوڑ دیں۔ پلیز سلطانہ!" اس نے سلطانہ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر بڑی لجاجت سے کہا "آپ دوپہر تک انتظار کر لیجئے۔ بھائی جان کہہ کر گئے ہیں کہ وہ کھانے کے وقت آ جائیں گے۔"

الماس نے جس لب و لہجے میں ساری بات کی تھی، اس کے بعد سلطانہ کے لئے ممکن نہیں رہا کہ وہ فون کرنے کے لئے اصرار کرتی۔

"اچھا!" سلطانہ نے ایک طویل سانس لے کر کہا "اگر تم اس ذمّے داری سے اتنا گھبرا رہی ہو تو میں دوپہر تک انتظار کر لوں گی۔"

"تھینک یو سلطانہ!" اس نے سلطانہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا لئے "آپ نے میرے سر سے بہت بڑا بوجھ اتار دیا۔ یقین کیجئے کہ بھائی جان مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں لیکن آپ کے

سلسلے میں اگر مجھ سے کوئی کوتاہی ہو گئی تو وہ مجھ سے نہ جانے کس طرح پیش آئیں۔"

سلطانہ سوچ میں پڑ گئی' کیا واقعی حیدر اس سے اتنی محبت کرنے لگا ہے؟



آصف بیگ کی کار تیز رفتاری سے اس علاقے کی طرف فراٹے بھر رہی تھی جہاں اس نے اپنے بیٹے کاشف کے لئے ایک بنگلا یہاں آتے ہی کرائے پر لے لیا تھا مگر خود مصلحتاً ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔

"ہمارا تعاقب تو نہیں ہو رہا ہے نا سر!" برابر میں بیٹھا ہوا اس کا سیکریٹری آفتاب بولا۔

"نہیں" آصف بیگ نے کہا "اور مجھے اس پر تعجب بھی ہے۔ میری نگرانی صرف ایک ہی دن ہوئی تھی۔"

"اس میں ایس پی رحمان کی کوئی چال نہ ہو!"

"اگر کوئی چال ہو بھی تو مجبوری ہے۔ ہم خطرات مول لینے کے لئے مجبور ہیں لیکن میرا خیال ہے اس نے نگرانی صرف اس لئے ختم کر دی ہوگی کہ میں نگرانی کرنے والے کو ڈاج دیتا ہوا نکلتا رہوں گا۔"

آفتاب نے اس طرح سر ہلایا جیسے آصف بیگ کی بات اس کی سمجھ میں آگئی ہو۔

آصف بیگ کی توجہ ڈرائیونگ پر رہی لیکن اس کے چہرے پر غصے کے بھی کچھ آثار تھے۔ اچانک وہ شاید کچھ سوچتے سوچتے بڑبڑایا "باسٹرڈ"

"جی....."

"تم سے نہیں کہا ہے!" آصف بیگ نے جھنجلا کر کہا۔

"آپ کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہیں سر!" آفتاب نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"مجھے خود اپنے اوپر ہی غصہ آرہا ہے" آصف بیگ نے کہا "میں یہاں کے کاموں کے لئے کچھ اور سوچتا تو بہتر تھا لیکن ڈار کی کے کہنے میں آکر شاہ جی پر ہی تکیہ کر بیٹھا!"

"کیا اس کی وجہ سے پھر کوئی بات ہو گئی؟"

"بیس گھنٹے ضائع ہو گئے" آصف بیگ نے کہا "شاہ جی بھی شاید اس قسم کے معاملات میں صرف قلندر راجا جیسے ڈفر پر ہی مکمل بھروسا کرتا ہے۔"

"اب اس نے کیا کہا ہے سر!"

"جس نوجوان نے کل رات سلطانہ کو گل زادہ کے گھر سے اڑایا تھا' اس کا تعاقب قلندر راجا کے ایک موٹر سائیکل سوار نے کیا تھا۔ خیر یہ تو اس نے عقل مندی کی تھی کہ صرف ایک موٹر سائیکل سوار کو تعاقب میں بھیجا تھا۔ اسی وجہ سے وہ نوجوان اپنے تعاقب سے بے خبر رہ گیا اور موٹر سائیکل سوار نے وہ گھر دیکھ لیا جہاں وہ نوجوان سلطانہ کو لے گیا تھا۔"

"اوہ!" آفتاب کے منہ سے نکلا "یعنی کل ہی اس جگہ کا پتا چل گیا تھا؟"

"ہاں" آصف بیگ نے کہا "اسی لئے تو مجھے شاہ جی پر غصہ آرہا ہے۔ اس کے آدمی کل رات ہی وہاں دھاوا بول کر سلطانہ کو حاصل کر سکتے تھے لیکن یہ کام آج رات کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔"

"کیوں!"

"موٹر سائیکل سوار نے اس کی اطلاع جب قلندر راجا کو دی تھی تو اس علاقے کی صورتِ حال کے بارے میں بھی کچھ بتایا تھا۔ قلندر راجا نے وہ رپورٹ شاہ جی کو دی تھی اور اس نے قلندر راجا کا یہ مشورہ مان لیا تھا کہ یہ آپریشن آج رات کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔"

"مگر کیوں سر!"

"کل رات اس علاقے کے دو بنگلوں میں ڈاکے پڑے تھے۔ پولیس کی پٹرولنگ بہت زیادہ تھی۔ شاہ جی کا کہنا ہے کہ ان حالات میں اگر اس بنگلے پر دھاوا بولا جاتا تو پولیس بھی آجاتی اور خاصی خون ریزی کا امکان ہو جاتا۔"

"لیکن وہ تو دعویدار تھا کہ ایس پی رحمان سے بھی سلطانہ کو چھین لیا جائے گا خواہ کتنی ہی خونریزی کیوں نہ ہو!"

"یہ بات میں نے بھی اس سے کہی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ ایس پی رحمان سے ٹکراؤ تو ایک مجبوری ہوتا لیکن اب ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے کہ زیادہ خونریزی کی جائے جس میں اپنے آدمیوں کی ہلاکت بھی زیادہ ہو گی۔"

"دراصل اسے معاملے کی نزاکت کا احساس نہیں ہے۔ یہ تو ہم ہی جانتے ہیں کہ سلطانہ کا دوسروں کے ہاتھوں میں ہونا ہمارے لئے کتنا پریشان کن ہے۔ گھنٹے بھر میں بھی ایسا کچھ ہو سکتا ہے کہ سارا معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔"

"شاہ جی کو میں اس اہمیت سے آگاہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔"

"کیوں نہ یہاں کے دوسرے جرائم پیشہ لوگوں سے رابطہ قائم کیا جائے!"

"ہم یہاں اجنبی ہیں بے وقوف! کسی پر آسانی سے بھروسا نہیں کر سکتے' پھر بھی میں کچھ اور سوچتا اگر ڈار کی نے شاہ جی کی سفارش نہ کر دی ہوتی۔ ہاں اگر آج بھی شاہ جی کے گرگے ناکام رہے تو پھر مجھے کچھ اور سوچنا ہی پڑے گا۔"

آفتاب سر ہلاتا ہوا کچھ سوچتا رہا' پھر بولا "وہ نوجوان آخر تھا کون سر! آپ بتا رہے تھے کہ سلطانہ بہ خوشی اس کے ساتھ گئی تھی!"

"ہاں' یہ بات میرے لئے بھی حیران کن ہے" آصف بیگ نے کہا "اور ہاں! اب بنگلا قریب آگیا ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ کاشف کو کچھ باتیں سمجھانے کے بعد جب ہم وہاں سے

روانہ ہوں گے تو میں پہلے باہر نکل آؤں گا۔ تم ایک منٹ اس کے پاس ہی رک جانا۔ تمہیں اس سے ایک ایسی بات کہنی ہے جو میں اس سے نہیں کہہ سکتا۔"

"ایسی کیا بات ہے سر!" آفتاب نے تعجب سے کہا۔

"یہ تو اسے میں ہی بتادوں گا کہ آج رات دس بجے تک سلطانہ کو اس بنگلے میں پہنچا دیا جائے گا۔ شاہ جی کا پروگرام یہ ہے کہ رات نو بجے سے پہلے پہلے اس بنگلے پر دھاوا بول کر سلطانہ کو وہاں سے نکال لیا جائے گا۔ اسے کوئی ایسی دوا بھی دی جائے گی کہ جب وہ یہاں پہنچے گی تو غشی کے عالم میں ہوگی۔ تمہیں کاشف سے یہ کہنا ہے کہ جتنی دیر میں اس کی غشی ختم ہو، میرا مطلب ہے جب وہ پوری طرح ہوش میں آئے تو اسے احساس ہو جانا چاہئے کہ اب وہ اس قابل نہیں رہی ہے کہ کاشف کے سوا کسی سے شادی کرسکے۔"

"اوہ!" آفتاب نے جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں، پھر بولا "اپنے چھوٹے سرکار تو اس قسم کے کاموں میں بڑی مہارت رکھتے ہیں سر!"

آصف بیگ نے جھٹکے سے سر گھما کر آفتاب کو اتنی تیز نظروں سے دیکھا کہ اس نے گھبرا کر سر جھکا لیا۔

کار جس بنگلے کے سامنے رکی، وہ متمول طبقے کی آبادی کے ایک ایسے حصے میں تھا جہاں ابھی تعمیری کام جاری تھا اور بعض تیار شدہ بنگلے اور کوٹھیاں ابھی آباد ہی نہیں ہوئی تھیں۔ یہی سب باتیں دیکھ بھال کر آصف بیگ نے یہ بنگلا حاصل کیا تھا۔

اس بنگلے سے نکل کر جس نوجوان نے اپنے باپ کا استقبال کیا، وہ قبول صورت ہونے کے باوجود بلا کا عیاش و مکار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی سبزی مائل آنکھوں سے خباثت عیاں تھی۔

○☆○

دوپہر کو جب حیدر واپس آیا تو ملازمائیں گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر جا چکی تھیں۔ حیدر نے آتے ہی شدید بھوک کا اظہار کیا تو الماس کھانا نکالنے کچن میں چلی گئی۔

سلطانہ مسز سبحانی سے بات کرنے کے لئے بے چین تھی اور اس سلسلے میں حیدر سے بات کرنا چاہتی تھی مگر کھانے کی بات سامنے آنے کے بعد اس نے سوچا کہ وہ اس سلسلے میں کھانا کھا کر ہی حیدر سے بات کرے گی۔

جلد ہی وہ تینوں ڈائننگ ٹیبل پر تھے اور کھانے کے دوران میں ہی الماس نے حیدر کو سلطانہ کی خواہش سے آگاہ کر دیا۔

حیدر کے چہرے پر تشویش کے آثار دکھائی دیئے۔ اس نے سلطانہ سے پوچھا "آپ ان سے کیا بات کریں گی؟"

"وہ میرے لئے بہت پریشان ہوں گی حیدر صاحب! میں انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میں کن حالات سے گزری ہوں لیکن اب محفوظ ہوں۔"

"وہ یہ تو لازماً پوچھیں گی کہ آپ کہاں سے بات کر رہی ہیں!"

"اگر آپ اسے مناسب نہیں سمجھتے تو میں یہ بات انہیں نہیں بتاؤں گی۔"

"دیکھیے سلطانہ! مجھے یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا کہ آپ کو آپ کی کسی عزیز ہستی سے بات نہ کرنے دوں لیکن مجھے ڈر یہ ہے کہ اس طرح میرے اب تک کے کئے دھرے پر پانی نہ پھر جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ مسز سبحانی کا پولیس سے رابطہ قائم ہے اور یہ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ پولیس بڑی نیک نیتی سے فراست کے لئے کام کر رہی ہے۔ آج تو مجھے فراست کے بارے میں ایک بالکل ہی نئی بات معلوم ہوئی ہے جو میرے لئے خاصی سنسنی خیز ہے۔ وہ کسی نو دریافت جزیرے کے پرنس کا نمائندہ ہے۔"

"جی!" سلطانہ چونک پڑی۔

"کیوں!" حیدر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

سلطانہ کے سارے جسم میں سنسناہٹ پھیل گئی تھی۔ حیدر کی یہ بات تو ان ساری باتوں کی تصدیق کر رہی تھی جو گل زادہ اور عابدہ گل نے کی تھیں۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعی میرے بہی خواہ ہیں اور میں....." سلطانہ نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ یہ یقین کرنا اسے اب بھی بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کہ وہ کسی جزیرے کی شہزادی ہے۔

"آپ کس کو اپنا بہی خواہ سمجھ رہی ہیں؟" حیدر نے پوچھا۔

"گل زادہ اور عابدہ گل کو۔"

اس مرتبہ الماس نے بھی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں!" حیدر نے بے چینی سے پہلو بدلا "آپ نے تو میری بھوک ہی اڑا دی۔"

"خود میرا بھی یہی حال ہے" سلطانہ نے نظریں جھکا کر کہا۔

حیدر نے نیپکن سے ہاتھ صاف کئے اور بولا "مناسب ہوگا کہ پہلے یہی گفتگو ہو جائے۔ بعد میں موڈ ہوا تو کھانا کھالوں گا۔"

وہ تینوں پھر ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔

سلطانہ نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا "اب تو شاید اور ضروری ہو گیا ہے کہ میں ٹیلی فون پر آنٹی کو ان حالات سے آگاہ کردوں اور ان سے مشورہ کروں۔"

"میں آپ کو انہیں فون کرنے سے نہیں روکوں گا لیکن اگر آپ مجھے اپنا ہمدرد سمجھتی ہیں تو پہلے مجھے بتا دیجئے کہ آپ ان سے کیا کہیں گی اور کیا وجہ ہے کہ آپ عابدہ گل اور گل زادہ کو اپنا بہی خواہ سمجھنے لگی ہیں۔"

"دراصل آپ سے یہ جاننے کے بعد کہ فراست کسی نو دریافت شدہ جزیرے کے پرنس کا نمائندہ ہے، اب مجھے اس بات پر یقین کر ہی لینا چاہئے کہ میں واقعی اس جزیرے کی شہزادی ہوں۔"

الماس اور حیدر کے ہونٹوں پر ایک پل کے لئے مسکراہٹ

آئی لیکن سلطانہ کا چہرہ دیکھ کر وہ پھر سنجیدہ ہو گئے۔
"آپ دونوں کی مسکراہٹ کا میں بالکل بُرا نہیں مانوں گی" سلطانہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا "مجھے بھی اس وقت گل زادہ کی وہ باتیں پریوں کی کہانیوں جیسی ہی لگی تھیں۔"

سلطانہ نے ان دونوں کو وہ سب کچھ بتانا شروع کیا جو اسے گل زادہ سے معلوم ہوا تھا۔ جیسے جیسے اس کی بات آگے بڑھتی رہی، الماس اور حیدر کی سنجیدگی گہری اور بے چینی بڑھتی رہی اور جیسے ہی سلطانہ سب کچھ کہنے کے بعد خاموش ہوئی، حیدر یک لخت کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا۔

الماس دم بخود سی بیٹھی ہوئی تھی۔

سلطانہ بولی "حیدر صاحب! آپ نے آج جو کچھ معلوم کیا ہے، اس سے گل زادہ کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ میرا دشمن چچا جو اس جزیرے کا پرنس ہے، ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ ایک طرف اس نے فراسٹ کو بھیجا ہے کہ وہ کسی طرح مجھے یہاں سے نکال کر امریکا لے جائے اور وہاں میرا وہ چچا میرا نہ جانے کیا حشر کرے لیکن اس خیال سے کہ فراسٹ ناکام نہ ہو جائے، اس نے ایسے لوگ بھی بھیجے ہیں جو مجھے یہیں قتل کر دیں۔ مجھ پر ایک فائر تو کیا ہی جا چکا ہے۔"

حیدر کا چہرہ بار بار رنگ بدلتا محسوس ہو رہا تھا۔ آخر وہ ٹہلتے ٹہلتے رک کر سلطانہ کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔

"اب آپ ان حالات میں مجھے کیا مشورہ دے سکتے ہیں؟" سلطانہ بولی "کیا مجھے آنٹی کو ان حالات سے آگاہ نہیں کرنا چاہئے؟"

"نہیں" حیدر نے آہستہ سے کہا "میں پھر اپنی بات دہراؤں گا۔ اس میں خدشہ ہے کہ آپ پولیس کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ ایسی صورت میں فراسٹ آپ کو امریکا لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اب میں آپ کو ایک اور ہی مشورہ دے سکتا ہوں لیکن اس سے پہلے میں آپ کو مبارکباد بھی دوں گا۔ اپنی عمر کے اس حصے تک آپ خود کو ایک بے یارومددگار لڑکی سمجھتی رہیں لیکن اب قسمت نے کیا قلابازی کھائی ہے کہ اب....." وہ پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ وہ نہ جانے کیا کہتے کہتے رکا تھا۔ وہ قدرے توقف سے بولا "میرے مشورے کے مطابق اب ضرورت اس بات کی ہے کہ فوری طور پر گل زادہ صاحب سے رابطہ قائم کیا جائے۔ آپ فوری طور پر ارمغان سے شادی کر لیں اور جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں!"

الماس نے چونک کر حیدر کی طرف دیکھا۔

"ہاں الماس!" حیدر نے اسے چونکتے دیکھ کر کہا "اب صرف یہی ہونا چاہئے۔ رہے میرے جذبات تو وہ اپنی جگہ ہیں۔ ہر انسان کی ہر خواہش اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ پوری بھی ہو۔"

سلطانہ نے غور سے حیدر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر غمناک سی نرمی پھیلی ہوئی تھی۔

"میرے خواب تو اب بکھر ہی جائیں گے" حیدر نے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے مغموم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "لیکن مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ آپ نے مجھ سے وعدہ ہی کب کیا تھا کہ میرے خوابوں کو بکھرنے نہیں دیں گی۔"

سلطانہ نے دیکھا کہ الماس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

سلطانہ نے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "الماس! میری اچھی بہن، حیدر صاحب میرے محسن ہیں۔ ان کی عزیز بہن کی آنکھوں میں آنسو میرے لئے تکلیف کی بات ہے۔"

الماس رومال نکال کر اپنے آنسو خشک کرنے لگی۔

حیدر نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا اور سوچتا ہوا بولا "اب فوری طور پر گل زادہ صاحب سے رابطہ قائم کرنا چاہئے۔ میں خود ان کے گھر جاؤں گا۔ انہیں فون کرنا تو مناسب نہیں ہے۔"

"کیوں!" سلطانہ نے پوچھا۔

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔ کل پولیس ان کے گھر پر ریڈ کر چکی ہے۔ اگر میں وہاں سے آپ کو نہ نکال لایا ہوتا تو اب تک آپ پولیس کے ذریعے فراسٹ کے پاس جا چکی ہوتیں۔ اب گل زادہ صاحب کے گھر کے فون شاید پولیس آبزرویشن میں ہوں۔ مناسب یہی ہے کہ میں خود ان سے ملنے جاؤں۔"

"اس میں آپ کے لئے کوئی خطرہ تو نہیں ہے!" الماس پریشان لہجے میں بولی۔

"نہیں۔ میں ایک صحافی ہوں۔ میں وہاں جاؤں گا تو مجھ پر کسی کو بھی شک نہیں ہو سکتا۔"

"آپ ان سے کیا کہیں گے؟" الماس نے ہی پوچھا۔

"جو بات بھی ہے صاف صاف بتا دوں گا۔ میں اب بہرحال ان کا اور سلطانہ کا طرف دار ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سلطانہ یہاں محفوظ ہیں۔ انہیں یہاں سے کہیں اور لے جانے میں خطرے کا اندیشہ ہے۔ بہتر ہو گا کہ گل زادہ صاحب اور ارمغان یہیں آ جائیں۔ یہیں نکاح کا بندوبست ہو جائے گا۔"

سلطانہ نے نظریں جھکا لیں۔ وہ اب تک یہی محسوس کر رہی تھی کہ کچھ عجیب سا خواب دیکھ رہی ہے۔

○☆○

شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ ایس پی رحمان، فراسٹ سے کہہ رہا تھا "آپ کا یہ خیال بالکل درست ہے مسٹر فراسٹ! گل زادہ اور عابدہ گل کے ملازمین کو اس کا علم نہیں ہو گا کہ وہ دونوں وہاں کیا کھیل، کھیل رہے تھے۔ اگر وہ ان دونوں کے رازدار ہوتے تو سلطانہ کی تصویر ہرگز شناخت نہ کرتے۔"

"کیا ریشم خاں کا کچھ پتا چلا؟" فراسٹ نے پوچھا۔

"میں اس کے معاملے میں ابھی تک مایوسی کا شکار ہوں۔ اس کے ملنے کے بعد تو گل زادہ اور عابدہ گل پر ہاتھ ڈالنا خاصا آسان ہو جاتا۔ خیر! اس وقت میں آپ کے پاس دو کاموں سے آیا ہوں بلکہ ایک ہی کام سے سمجھئے۔ پرنس سے تو ظاہر ہے کہ آپ کی بات نہیں ہو سکی ہوگی ورنہ آپ مجھے خود ہی اطلاع دیتے۔ آپ ذرا یہ تصویر دیکھئے۔ یہ نوجوان آپ کا جانا پہچانا تو نہیں ہے؟" ایس پی رحمان نے اپنی جیب سے وہ پینسل اسکیچ نکالا جو وہ گل زادہ کی کوٹھی کے گھر میں سلطانہ کے کمرے سے لے آیا تھا۔

"نہیں۔ میرے لئے تو یہ چہرا اجنبی ہے۔" فراست نے اسکیچ دیکھ کر کہا "آپ کو کہاں سے ملا ہے اور آپ کو اس کی تلاش کیوں ہے؟"

"یہ مجھے سلطانہ ہی کے کمرے سے ملا تھا اور غالباً اسی کا بنایا ہوا ہے۔ میں مسز سبحانی سے بھی تصدیق کر چکا ہوں کہ سلطانہ اچھے خاصے پینسل اسکیچ بنا لیتی ہے۔ مسز سبحانی بھی اس نوجوان کو نہیں پہچان سکیں اور میں بھی اندازہ نہیں لگا سکا ہوں کہ اس نوجوان سے سلطانہ کا کیا تعلق ہو سکتا ہے، تاہم مجھے اس کی تلاش ہے۔ سلطانہ نے پریشانی کے عالم میں یہ چہرہ بنایا ہوگا اس لئے میرا خیال ہے کہ اس نوجوان کی کوئی اہمیت ضرور ہونا چاہئے۔ ہو سکتا ہے یہ ہمیں مل جائے تو اس سے کوئی خاص بات معلوم ہو سکے۔"

"یہ اسکیچ تخیلاتی بھی تو ہو سکتا ہے مسٹر رحمان!"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتا کہ یہ تخیلاتی نہیں۔" ایس پی رحمان نے مسکراتے ہوئے کہا "مسٹر فراست! ہم پولیس والوں کو امکانات ہی کے سہارے کام کرنا پڑتا ہے۔"

"اگر آپ اسے تلاش کرنا ہی چاہتے ہیں تو یہ تصویر اخبارات میں چھپوا دیتے!"

"یہ میں نے اس خیال سے نہیں کیا کہ ممکن ہے اس سارے معاملے میں یہ نوجوان بھی کوئی منفی کردار ادا کر رہا ہو۔ تصویر چھپنے کی صورت میں تو یہ ہوشیار ہو جائے گا۔"

"امکان" فراست دھیرے سے ہنسا "گویا آپ ہر امکان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔"

"یہ تو کرنا ہی پڑتا ہے مسٹر فراست! اچھا اب مجھے اجازت دیجئے! دراصل یہ تصویر میں نے آپ کو اس لئے دکھائی کہ شاید یہ نوجوان بھی سلطانہ ہی کے سلسلے میں امریکا سے آیا ہوا ہو اور آپ اسے جانتے ہیں۔"

"میں اب تک آپ کے کسی کام نہیں آیا۔ بس آپ ہی کو محنت اور بھاگ دوڑ کرنا پڑ رہی ہے۔"

"یہ سب کچھ تو میرے فرائض میں شامل ہے مسٹر فراست!" ایس پی رحمان کہتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

○☆○

الماس باتھ روم میں غسل کر رہی تھی۔ حیدر ابھی واپس نہیں لوٹا تھا۔ سلطانہ الماس کے بیڈ روم میں ہی تھی۔ ذہنی انتشار سے اسے اب بھی نجات نہیں ملی تھی۔ اسی عالم میں وہ ایک طرف رکھی ہوئی کتابوں کے شیلف سے کتابیں نکال نکال کر دیکھتی اور واپس رکھتی جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک چرمی پاؤچ پر پڑی۔ ایک تو یہی عجیب سی بات تھی کہ وہ پاؤچ کتابوں کے پیچھے چھپا کر رکھی گئی تھی لیکن سلطانہ کے ذہن کو جس بات سے جھٹکا لگا، وہ اس نام کو پڑھ کر لگا جس کا اسٹکر پاؤچ پر لگا ہوا تھا۔

"الماس گلزادہ"

سلطانہ کا دل بڑی زور سے دھڑکا۔ الماس کے نام کے ساتھ گل زادہ کا اضافہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں تھی جسے نظر انداز کر دیا جائے۔

ایک ہی وقت میں مختلف النوع خیالات سلطانہ کے دماغ میں چکرا گئے۔ اس نے ایک نظر باتھ روم کے دروازے پر ڈالی۔ اندر سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ سلطانہ نے بڑی احتیاط سے چار پانچ کتابیں ہٹا کر وہ پاؤچ نکال لی۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اس میں کاغذات بھرے ہوئے ہیں۔ سلطانہ نے اسے کھولا۔ اس میں مختلف قسم کے کاغذات ہی تھے لیکن سلطانہ کو جو بہت اہم چیز نظر آئی، وہ دو پاسپورٹ تھے۔ اس نے وہ دونوں باہر نکالے۔ وہ دونوں ہی امریکی پاسپورٹ تھے۔ سلطانہ نے دونوں پاسپورٹ کھول کر دیکھے اور اسے یوں لگا جیسے اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا ہو۔

ایک پاسپورٹ پر حیدر کی تصویر لگی ہوئی تھی اور پورا نام لکھا تھا۔

"ارسلان حیدر گل زادہ"

ولدیت کے خانے میں صرف "گل زادہ" لکھا ہوا تھا۔

دوسرے پاسپورٹ پر الماس کی تصویر چسپاں تھی اور اس کا نام الماس گل زادہ لکھا ہوا تھا جب کہ شوہر کے نام کے خانے میں "ارسلان حیدر گل زادہ" لکھا ہوا تھا۔

سلطانہ کی سانس پھولنے لگی۔ اب اس میں شبے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ وہ اب تک گل زادہ اور عابدہ گل ہی کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ ان دونوں نے اس کے ساتھ ایک لمبا کھیل کھیلا تھا اور یہ بات بھی سلطانہ کی سمجھ میں آنے لگی تھی کہ اس لمبے کھیل کا مقصد کیا تھا۔

حیدر جس کا پورا نام ارسلان حیدر تھا، گل زادہ ہی کا بیٹا تھا اور الماس جو ارسلان حیدر کو مسلسل "بھائی جان" کہہ کر حد درجہ ذلالت کا ثبوت دیتی رہی تھی، وہ دراصل ارسلان حیدر کی بیوی تھی۔ گل زادہ اور عابدہ گل اپنے اس کھیل میں اپنے بیٹے اور بہو کو بھی شامل کئے ہوئے تھے۔

باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز بند ہوتے ہی سلطانہ چونکی۔ اس نے جلدی سے دونوں پاسپورٹ پاؤچ میں رکھے اور پاؤچ

شیلف میں رکھ کر اس کے آگے وہی کتابیں رکھ دیں جو اٹھائی تھیں۔

سلطانہ فوراً وہاں سے بھاگ نکلنا چاہتی تھی۔ اس پر اپنا اعتماد بحال دیکھ کر ہی الماس اتنی دیر تک باتھ روم میں رہی تھی۔

سلطانہ نے یہ بھی سوچ لیا کہ وہ یہاں سے کس طرح فرار ہو سکتی ہے لیکن ابھی اس نے دروازے کی طرف ایک ہی قدم اٹھایا تھا کہ حیدر کی آواز سنائی دی۔

"الماس!... سلطانہ!" اور اس کے ساتھ ہی قدموں کی قریب آتی ہوئی آہٹ بھی سنائی دی۔

سلطانہ ٹھٹک کر رکی اور پھر جلدی سے بستر پر بیٹھ گئی۔

حیدر کمرے میں آیا۔

"الماس کہاں ہے؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا بولا۔

"باتھ روم میں" سلطانہ نے جواب دیا۔

"کیا بات ہے! آپ کا چہرہ کچھ پیلا سا لگ رہا ہے!" حیدر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی ہے" سلطانہ اس وقت حیدر سے نظریں نہیں ملا سکی۔

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی زندگی جو پل پل رنگ بدل رہی ہے' اس کا اثر آپ کے اعصاب پر پڑ رہا ہے" حیدر نے کہا "میں آپ کو ایک ٹیبلٹ دیتا ہوں۔ اس سے آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

"ارے نہیں۔" سلطانہ جلدی سے بولی "ایسی کوئی زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے کہ ٹیبلٹ کی ضرورت پڑے۔ میں بس ایک گلاس یخ پانی پینا چاہتی ہوں" سلطانہ خود ہی روم فریج کی طرف گئی اور پانی نکال کر پیا۔

"میں بس دو منٹ میں باہر آ رہی ہوں بھائی جان!" باتھ روم سے الماس کی آواز آئی۔

ذلیل عورت' سلطانہ نے دل ہی دل میں کہا' کیسے لوگ ہیں یہ کہ رشتوں کا احترام بھی ان کی نظر میں کوئی معنی نہیں رکھتا!

"تم لاؤنج میں آ جانا الماس!" حیدر نے کہا "مجھے سلطانہ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔ انہیں لے کر اُدھر ہی جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے' آپ چلیں" الماس کی آواز آئی "میں چائے بنا کر اُدھر ہی لے آتی ہوں۔"

"آیئے!" حیدر نے سلطانہ سے کہا "آپ چلنے میں کوئی دقت تو نہیں محسوس کریں گی؟"

"نہیں۔ میری طبیعت اتنی زیادہ گڑبڑ نہیں ہے۔ آپ کی بات درست ہے کہ میری زندگی کے بار بار بدلتے رنگ ہی میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔ میں جلد ہی خود پر قابو پا لوں گی۔"

"بس آج کی بات اور ہے۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

سلطانہ نے اس کی بات کی وضاحت نہیں چاہی اور اس کے ساتھ لاؤنج کا رخ کیا۔

"دراصل چند منٹ میں ہی گل زادہ صاحب کا فون آئے گا۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں" لاؤنج میں پہنچ کر حیدر نے کہا "میں ان سے مل کر سب بات چیت کر آیا ہوں لیکن شاید وہ آپ سے بات کئے بغیر مکمل طور پر مطمئن نہیں ہو سکیں گے۔"

سلطانہ نے سوچا' یہ لوگ بڑی ہوشیاری اور تحمل سے سارے کام کرنا چاہتے ہیں۔

حیدر بولا "آپ سے بات کر کے جب وہ مطمئن ہو جائیں گے تو سارا کام اس منصوبے کے مطابق ہوگا جو میں ان سے طے کر کے آیا ہوں۔ وہ اندھیرا پھیلتے ہی اپنی بیگم کے ساتھ یہاں آ جائیں گے۔ ان کی آمد کے چند منٹ بعد ارمغان بھی آ جائے گا۔ میں نکاح خواں سے بھی بات کر آیا ہوں" پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور نظریں جھکا کر کہا "عشا کے وقت سے پہلے پہلے آپ کی شادی ہو جائے گی۔"

چالاک' سلطانہ نے سوچا' یہ ایسا ظاہر کر رہا ہے جیسے یہ شادی اس کے لئے مغموم و ملول ہونے کا سبب ہو کیونکہ وہ اس کے لئے اپنے جذبات کی قربانی دے رہا ہے۔

بات اب پوری طرح سمجھ میں آ چکی تھی۔ اس نے چونکہ ارمغان سے شادی کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا لہٰذا گل زادہ نے یہ نیا ڈراما کھیلا تھا۔ اس کے گھر سے اس کا "اغوا" گل زادہ اور حیدر کی ملی بھگت تھی۔ مقصد یہی تھا کہ حیدر اسے مکمل طور پر اپنے اعتماد میں لینے کے بعد اسے غیر ملکی فراڈ کی کہانی سنائے۔ حیدر پر اعتماد کے بعد اسے وہ کہانی سن کر یقین آ جاتا کہ گل زادہ اور عابدہ گل نے اس سے کوئی بات جھوٹ نہیں کہی تھی۔ اس طرح قوی امکان تھا کہ وہ ارمغان سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتی۔

ان لوگوں کے اس ڈرامے کی کامیابی میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی لیکن تقدیر کی مہربانی سے سلطانہ کو حیدر اور الماس کے پاسپورٹ مل گئے تھے اور وہ سارا کھیل سمجھ گئی تھی۔ اس کی دانست میں یہ امکان بھی تھا کہ ارمغان اور حیدر سگے بھائی ہوں۔ حیدر کا پورا نام ارسلان حیدر گل زادہ تھا' ارمغان کا پورا نام ارمغان حیدر گل زادہ بھی ہو سکتا تھا۔

ابتدا میں اس پر حیدر نے جال پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ اس کے جال میں پھنس جاتی تو شاید ارمغان کو سامنے ہی نہ لایا جاتا۔ کسی وجہ سے الماس بھی اس کے لئے تیار رہی ہوگی کہ اس کے شوہر کی دوسری شادی ہو جائے۔

مگر کیوں! یہ سب لوگ اسے اس طرح اپنے جال میں کیوں پھانسنا چاہتے ہیں؟ اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس سوال کا جواب سلطانہ کے پاس نہیں تھا۔ اگر وہ حیدر پر اعتماد کرنے کی غلطی نہ کر بیٹھی ہوتی تو مسز سبحانی کو اس وقت فون کر دیتی جب الماس باتھ

روم میں گئی تھی۔ وہ اس کے لئے ایک نہایت ہی سنہرا موقع تھا۔
اور اب ایسا کوئی موقع ملنا مشکل نظر آرہا تھا۔ سلطانہ خاصی پریشان تھی۔ اس کے پاس وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ دو گھنٹے بعد اندھیرا پھیلنے والا تھا۔ اس کے بعد وہ ان کے جال میں پھنس چکی ہوتی! اسے اگر ان لوگوں کے جال سے بچنا تھا تو اس کے لئے انہی دو گھنٹوں میں کوئی کوشش کرنا ضروری تھا۔

اگر وہ نکاح خواں کو حقیقت سے آگاہ کردے؟ سلطانہ نے سوچا، لیکن پھر اسے خیال آیا کہ شاید وہ نکاح خواں بھی ان لوگوں کا اپنا ہی آدمی ہو۔ دوسرے اس نے یہ بھی سوچا کہ کھل کر ان لوگوں کے مقابل آنے کے بعد کیا وہ ان لوگوں کے جال سے نکل سکے گی؟

ابھی تک تو یہ لوگ اس کے ساتھ کوئی زیادتی کئے بغیر اسے اپنا آلۂ کار بنانے کی کوشش کرتے رہے تھے لیکن اس کے بعد وہ شاید کسی زیادتی سے بھی گریز نہیں کرتے اور وہ اکیلی ان سب کا تو کیا، صرف حیدر کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ حیدر کے پاس ریوالور تھا۔ نہ بھی ہوتا تو وہ بہرحال مرد تھا۔ سلطانہ اس کے سامنے بے بس ہوجاتی۔ پھر الماس بھی تو تھی ظاہر ہے کہ وہ حیدر ہی کا ساتھ دیتی!

فون کی گھنٹی نے سلطانہ کو چونکادیا۔

"گل زادہ صاحب ہی کی کال ہوگی" حیدر بولا "آپ خود ہی ریسیو کیجئے!" وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا تھا۔

سلطانہ اٹھ کر ٹیلی فون کے قریب گئی۔ اس وقت حیدر کی طرف اس کی پشت تھی۔ اس نے اس موقع پر سلطانہ کے قریب آنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

○☆○

اس روز آصف بیگ کی بے چینی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ کئی بار وہ اپنے بیٹے کاشف کو بھی فون کرچکا تھا اور ہربار اسے صرف یہی تاکید کی تھی کہ وہ گھر سے کہیں نہ نکلے اور اندھیرا پھیلنے کے بعد بالکل الرٹ رہے۔

ایک اور کار بھی اس نے کرائے پر حاصل کرلی تھی۔ اس نے موبائل فون پر شاہ جی سے یہی کہا تھا کہ وہ صرف اپنے سیکریٹری آفتاب کو اس کے آدمیوں کے ساتھ بھیجے گا لیکن درحقیقت وہ خود بھی "موقع" پر موجود رہنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اسے ایک اور کار بھی کرائے پر لینا پڑی تھی۔

ساڑھے پانچ بجے اس نے تیسری بار شاہ جی کو بھی فون کیا اور پوچھا کہ معاملات بدستور ہیں؟ یعنی پروگرام میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟

"بیگ صاحب! آپ بہت ہی الجھے ہوئے ہیں" شاہ جی نے کہا "اس لئے آپ کو بتارہا ہوں کہ اب تو صورتِ حال میرے لئے بہت ہی زیادہ اطمینان بخش ہے۔ دراصل صبح سے اب تک تو چیک کیا جاتا رہا تھا کہ سلطانہ کی حفاظت کے لئے ان لوگوں نے کیا بندوبست کئے ہیں لیکن اب یہ بات کنفرم ہوگئی ہے کہ وہ لوگ یا تو بہت زیادہ بے وقوف ہیں یا انہیں خود پر بہت زیادہ اعتماد ہے۔"

"کیا مطلب!"

"ایک مسلح چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہے" شاہ جی نے بتایا "اگر اس بات پر مجھے دن میں ہی یقین آجاتا تو سلطانہ کو اب تک وہاں سے اٹھایا بھی جاچکا ہوتا۔ دراصل اس پر یقین کرنے کے لئے ذہن آمادہ ہی نہیں تھا کہ وہ لوگ تحفظ کا کوئی باقاعدہ بندوبست ہی نہیں کریں گے۔"

"تو پھر اب؟" آصف بیگ نے بے چینی سے پوچھا۔

"اب اتنی دیر ہوچکی ہے کہ میں پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتا" شاہ جی نے جواب دیا "اندھیرا پھیلنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی وہاں دھاوا بولا جائے۔ آپ دس منٹ بعد ہی آفتاب کو روانہ کردیجئے تاکہ وہ مقررہ وقت اور معینہ جگہ پر ہمارے آدمیوں سے مل جائے۔"

"مگر اتنی جلدی کیوں!"

"اسے یہ بھی تو خیال رکھنا ہوگا کہ کوئی اس کی نگرانی نہ کرے۔ اسے ہدایت کردیجئے کہ وہ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد ہی میرے آدمیوں سے ملے۔"

"اچھا۔ میں اسے روانہ کرتا ہوں۔"

بات ختم ہوئی۔ رابطہ منقطع ہوا اور اسی وقت دوسری طرف شاہ جی نے اپنے قریب موجود قلندر راجا سے کہا "تمہارا آدمی آصف بیگ کے ہوٹل کے سامنے پہنچ چکا ہوگا نا!"

"جی ہاں" قلندر راجا نے جواب دیا "اور وہ بہت ہی ہوشیار آدمی ہے۔ اگر آفتاب کو اپنی نگرانی کا پتا نہ بھی چل سکا تو میرا آدمی اس سے بے خبر ہرگز نہیں رہے گا اور مجھے موبائل پر اس کی اطلاع دے دے گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"لیکن جب ہمارے آدمی آفتاب کو نہیں ملیں گے تو وہ آصف بیگ کو اطلاع دے گا۔"

"ظاہر ہے" شاہ جی نے جواب دیا "اس وقت آصف بیگ فوراً مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میں اسے سمجھادوں گا کہ آفتاب کی نگرانی ہورہی تھی اس لئے اسے ساتھ رکھنے کا خطرہ ہم کیسے مول لے سکتے تھے؟"

"پھر اس لڑکی کو کدھر پہنچانا ہوگا! وہ تو آفتاب ہی جانتا ہے نا؟"

"میں آصف بیگ سے نیا پروگرام طے کرلوں گا۔ تم بس موبائل فون پر مجھ سے رابطے میں رہنا۔ ذرا وہ بوتل اور گلاس تو اٹھاؤ۔"

قلندر راجا نے ایک شیلف پر رکھی ہوئی بوتل اور گلاس اٹھاکر شاہ جی کے سامنے تپائی پر رکھ دیئے۔

○☆○

گل زادہ بہت خوش خوش کوٹھی پہنچا تھا لیکن عابدہ گل کو پریشانی کے عالم میں ٹہلتے دیکھ کر اس کے چہرے سے خوشی کے آثار غائب ہوگئے۔

"اچھا ہوا آپ آگئے!" عابدہ گل اسے دیکھ کر چھوٹتے ہی بولی "خان بھائی آپے سے باہر ہوئے جارہے ہیں!"

"کیوں!"

"ابھی وہ تہ خانے سے باہر نکل آئے تھے اور بگڑ رہے تھے کہ آخر وہ کب تک اس طرح تہ خانے میں رہیں گے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر ہم نے انہیں تہ خانے میں چھپنے پر کیوں مجبور کردیا ہے اور ہمارا منصوبہ کب تک مکمل ہوجائے گا۔"

"پھر تم نے انہیں واپس کیسے بھیجا؟"

"میں نے ان کے ہاتھ جوڑ کر صرف ایک گھنٹے کی مہلت لی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آپ آجائیں تو وہ ان سے اس معاملے میں صاف گفتگو کرلیں گے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"ابھی کوئی آدھے گھنٹے پہلے کی!"

"ہوں" گل زادہ نے ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا "کامیابی تو اب ہم سے دو تین گھنٹے کے فاصلے پر رہ گئی ہے۔ میں ابھی ارسلان سے مل کر آرہا ہوں۔ اس نے سلطانہ کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ اندھیرا پھیلنے کے بعد سلطانہ سے ارمغان کی شادی ہوجائے گی۔ میں نے ارمغان کو بتادیا ہے کہ اسے کس وقت کہاں پہنچنا ہے۔"

"اوہ، فائن!" عابدہ گل کے منہ سے نکلا "لیکن اس کے بعد جب سلطانہ، ارمغان کے ساتھ سامنے آجائے گی تو پولیس کی پوچھ گچھ کا سامنا کس طرح کرے گی؟ ہم نے تو پولیس کو بتایا ہے کہ ہم اسے صرف اختری جان کے نام سے جانتے تھے۔"

"شادی کے بعد میں اسے سمجھادوں گا۔ وہ پولیس کے سامنے اعتراف کرلے گی کہ ہمیں اس نے وہی بتایا تھا جو ہم پولیس کو بتاچکے ہیں۔ اس کا پورا بیان یہ ہوگا کہ ارمغان دو سال پہلے یہاں آیا تھا تو ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کسی حد تک پسند کرنے لگے تھے۔ انہی دنوں میں ارمغان نے اسے اپنے انکل ریشم خاں سے ملایا تھا۔ پھر واپس امریکا جانے کے بعد اس نے سلطانہ سے خط و کتابت جاری رکھی تھی۔ کچھ عرصے بعد ان دونوں کو محسوس ہوا کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے چنانچہ طے پایا کہ ارمغان پھر یہاں آئے اور اسے شادی کرکے اپنے ساتھ لے جائے۔ ارمغان نے سلطانہ کو اطلاع دے دی کہ وہ ایک ہفتے میں آرہا ہے۔ اسی دوران میں سلطانہ نے اچانک محسوس کیا کہ کچھ نامعلوم افراد اسے اغوا کرنے یا قتل کرنے کی فکر میں لگ گئے ہیں۔ اسے یہ احساس کیوں ہوا، اس بارے میں ایک اور چھوٹی سی کہانی بھی میں نے سوچ لی ہے جو سلطانہ پولیس کو بتائے گی۔ اس کا مزید بیان یہ ہوگا کہ اس نے ریشم خاں سے اس کا ذکر کیا جو اس کا اور ارمغان کا رازدار تھا۔ سلطانہ اس معاملے میں خود کو پولیس کے چکروں میں نہیں پھنسانا چاہتی تھی لہٰذا ریشم خاں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ارمغان کی آمد تک اس کی اس کوٹھی میں روپوش ہوجائے جہاں ان دنوں اس کے بہن اور بہنوئی بھی آکر ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن وہ انہیں بھی حقیقت نہ بتائے بلکہ ایک فرضی کہانی سنادے جو ہم پولیس کو سناچکے ہیں۔ دوسری طرف ہمارا بیان یہ ہوگا کہ ہم سلطانہ اور ارمغان کے تعلقات اور شادی سے بے خبر تھے۔ ارمغان نے ہم سے یہ بات چھپائی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ہم ایک معمولی لڑکی کو اپنی بہو بنانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اور ریشم خاں نے بھی ارمغان سے اپنی دلی وابستگی کے باعث ہم سے یہ بات چھپائی تھی کہ سلطانہ دراصل وہ لڑکی ہے جو ہماری بہو بنے گی۔"

"اسے ہم اپنی خوش قسمتی کہیں یا اتفاق کہ دو سال پہلے ارمغان واقعی یہاں آیا تھا۔"

"اتفاق کہو یا خوش قسمتی لیکن اسی بنیاد پر میں یہ ساری کہانی گھڑ سکا ہوں" گل زادہ نے کہا "تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ دو سال پہلے ارمغان اور ریشم خاں کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

"اسی لئے میں پریشان ہوں کہ اتنے پیچیدہ معاملے میں خاں بھائی کیا اس کے لئے تیار ہوجائیں گے کہ پولیس کے سامنے ہماری ان تمام باتوں کی تائید کریں!"

"ہم کامیابی کے بالکل قریب پہنچ چکے ہیں۔ فی الحال میں انہیں کسی نہ کسی طرح سمجھادوں گا کہ وہ اس تہ خانے میں صرف کل تک اور رہیں۔"

"یہ تو مجھے یقین ہے کہ آپ انہیں اس طرح سمجھا بجھادیں گے کہ وہ کل تک اور اس قید میں رہنا گوارا کرلیں گے مگر کل کے بعد؟ وہ زیادہ عرصے تک تو آپ کی بات نہیں مانیں گے۔"

"اس بارے میں آج رات کے بعد سوچیں گے" گل زادہ نے جواب دیا لیکن دراصل وہ اسی وقت فیصلہ کرچکا تھا کہ ریشم خاں کو ان حالات میں ختم ہی کردیا جانا چاہئے۔ کل تک کوئی ایسا بندوبست کرنا پڑے گا کہ اسے تہ خانے ہی میں قتل کرنے کے بعد تیزاب سے اس کی لاش، گلا کر گٹر میں بہادی جائے، لیکن یہ بات گل زادہ فی الحال اپنی بیوی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔

○☆○

اندھیرا پھیلنے کے ذرا دیر بعد ہی گل زادہ اور عابدہ گل وہاں پہنچ گئے۔ ان کے چند منٹ بعد ارمغان بھی آگیا تھا اور اب صرف نکاح خواں کا انتظار تھا۔

ایک صوفے پر عابدہ گل، سلطانہ کے برابر میں بیٹھی بڑے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے حیدر سے کہہ رہی تھی "ہم آپ کے

شکرگزار ہیں کہ حقیقت جاننے کے بعد آپ نے سلطانہ کے بارے میں وہی فیصلہ کیا جو ایک اچھے انسان کو کرنا چاہئے تھا۔"

"یہ ایک انسانی فریضہ تھا جو میں نے سرانجام دیا۔ اس میں شکرگزار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں" حیدر نے جواب دیا۔

بہت ہی مکار لوگ ہیں' سلطانہ نے سوچا' اور یہ ارمغان تو شکل ہی سے خبیث معلوم ہوتا ہے۔

"میں ذرا باتھ روم ہو آؤں" سلطانہ نے آہستہ سے کہتے ہوئے اٹھنا چاہا۔

"ہاں ہاں" حیدر بولا" الماس! تم بھی ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ تمہیں گل زادہ صاحب نے یہ فرض بھی تو سونپا ہے کہ تم ہی انہیں دلہن بناؤ گی۔"

"مجھے یاد ہے" الماس مسکراتی ہوئی اٹھی۔

عروسی جوڑا اور زیورات' گل زادہ کی کار سے الماس کے کمرے میں پہنچائے جا چکے تھے۔

"لیکن ذرا جلدی کرنا" حیدر نے گھڑی دیکھ کر الماس سے کہا "بس آدھے گھنٹے سے زیادہ نہ لگے۔ قاضی صاحب کے آنے میں بس اتنا ہی وقت ہے۔"

"آپ فکر نہ کیجئے!" الماس نے کہا "ویسے تو دلہن بنانے میں بہت وقت لگتا ہے لیکن ایسی ہنگامی صورتِ حال میں تو جلدی ہی کرنا پڑے گی۔ آپ لوگ فکر نہ کریں۔ میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگاؤں گی۔"

وہ سلطانہ کو لے کر اندر چلی گئی۔ باقی لوگ ڈرائنگ روم ہی میں بیٹھے رہے۔ ان دونوں کے جاتے ہی ان سب لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا' پھر قدرے توقف سے عابدہ گل نے دھیمی آواز میں حیدر سے کہا۔

"اس مہم کا سہرا تو دراصل تمہارے سر بندھ رہا ہے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں...." ارمغان بولا "بھائی جان نے کمال ہی کر دکھایا ہے۔"

حیدر مسکرا کر رہ گیا۔

"نکاح خواں کا مسئلہ تم نے کیسے حل کیا ہے؟" گل زادہ نے پوچھا۔

"ریشم خاں نے یہاں کے چوکیدار کی حیثیت سے اپنا جو آدمی دے رکھا تھا' اسی کے ذریعے" حیدر نے جواب دیا "اس علاقے کا نکاح خواں بھی اس کا ہم قوم ہے۔ اسے بتا دیا گیا ہے کہ یہ شادی بہت سادگی سے کی جا رہی ہے کیونکہ لڑکی اور لڑکے کے والدین امریکا میں ہیں۔ یہاں ان کی صرف دوست اور ان کی بیگم ہیں اور میں دلہا کا دوست ہوں۔ دلہن کی طرف سے صرف اس کی بہن امریکا سے آئی ہے۔ یہ کردار الماس سرانجام دے گی۔ میں اور آپ گواہ بنیں گے اور فرضی ناموں کے دستخط کریں گے۔"

"نکاح خواں کو کسی قسم کا شبہ نہ ہو جائے!"

"ایسا نہیں ہوگا" حیدر نے مسکرا کر کہا۔ "اس سے ملاقات کرتے ہوئے ہم نے کسی قسم کی رازداری یا کسی اور پیچیدہ طریقے سے کام نہیں لیا تھا۔ اسے بالکل شبہ نہیں ہوا ہے۔ پھر یہاں بھی جب وہ دیکھے گا کہ لڑکی اور لڑکا بالغ ہیں اور شادی میں دونوں کی رضامندی شامل ہے تو پھر اس کے دل میں کوئی بات ہی نہیں آئے گی۔"

"لڑکی کے والدین کا کیا نام لکھوایا جائے گا؟"

"رضا جان" حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا اور باقی تینوں بھی مسکرا دیئے۔ حیدر پھر بولا "ارمغان کے والد کے خانے میں تو آپ ہی کا نام آئے گا کیونکہ اس شادی کے بعد ان دونوں کو منظرِ عام پر بھی آنا ہے۔"

"فراست کا معاملہ بھی تو سامنے آئے گا" ارمغان بولا۔

"ابھی تمہارے نکاح کے بعد تم دیکھنا کہ میں سلطانہ کو کیا کیا سمجھاتا ہوں" گل زادہ نے مسکرا کر کہا۔

وہ سب اسی قسم کی باتیں کرتے رہے۔ کبھی کوئی کسی مسئلے کا ذکر کرتا تو گل زادہ اسے تشفی بخش جواب دے دیتا۔

آخر چوکیدار دستک دے کر اندر آیا اور اطلاع دی کہ قاضی صاحب آگئے ہیں۔

"انہیں عزت سے اندر لے آؤ" حیدر نے کہا اور پھر گھڑی دیکھ کر بولا "پینتیس منٹ ہو گئے۔ الماس اور سلطانہ کو آجانا چاہئے تھا۔"

"دو چار منٹ کی دیر کوئی اہمیت نہیں رکھتی" گل زادہ نے کہا "ویسے تم جا کر دیکھ آؤ۔ میں قاضی صاحب کا استقبال کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔"

لیکن حیدر کے جانے سے پہلے قاضی صاحب آگئے۔ غالباً انہیں دروازے ہی پر کھڑا کر کے چوکیدار نے ان کی آمد کی اطلاع دی تھی۔

گل زادہ کے ساتھ ارمغان اور حیدر نے بھی ان کا استقبال کیا اور پھر حیدر نے کہا "میں دلہن اور ان کی بہن کو لے کر آتا ہوں۔"

"جلدی آیئے گا" قاضی صاحب نے کہا "میری عشا کی نماز قضا نہ ہو۔ آپ کی آمد تک میں رجسٹر کے اندراجات مکمل کرتا ہوں۔"

"اس کام میں آپ کی مدد میں کروں گا" گل زادہ نے کہا "فی الحال میں ہی یہاں دلہن کا سرپرست ہوں۔"

حیدر انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر الماس کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ الماس کے کمرے کے دروازے پر رک کر اس نے دستک دیتے ہوئے الماس کو آواز بھی دی لیکن جواب نہیں ملا۔ دوسری مرتبہ اس نے زیادہ زور سے آواز دی پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا تو اسے کچھ تشویش ہوئی۔ اس نے دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ کھلتا چلا

گیا۔ حیدر تیزی سے اندر داخل ہوا۔

"الماس!" حیدر کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

الماس کا سر خون سے لت پت تھا اور بہا ہوا خون قالین میں جذب ہو رہا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں رکھا ہوا پیتل کا وزنی گلدان الماس کے قریب ہی قالین پر پڑا ہوا تھا۔ الماس فرش سے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سلطانہ کا عروسی جوڑا بستر پر بکھرا ہوا تھا۔ اسی کا دوپٹہ اٹھا کر حیدر جلدی سے الماس کے قریب پہنچا اور اس کے سر پر باندھنے لگا تاکہ مزید خون نہ بہہ سکے۔

"یہ کیا ہوا الماس! سلطانہ کہاں ہے؟" حیدر نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا تھا۔

الماس نے اٹک اٹک کر بتایا کہ سلطانہ نے کمرے میں آتے ہی پیتل کا گلدان اٹھا کر شاید اپنی پوری طاقت سے الماس کے سر پر دے مارا تھا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ الماس بے ہوش ہو گئی تھی اور اب لگ بھگ آدھے گھنٹے بعد اسے ہوش آیا تھا۔

حیدر نے زور زور سے گل زادہ کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ ڈرائنگ تک اس کی آوازیں مدھم ہی پہنچی ہوں گی لیکن پہنچ گئی تھیں۔ گل زادہ کے ساتھ عابدہ گل بھی دوڑی ہوئی وہاں آگئی۔

"یہ کیا!" عابدہ گل کے منہ سے نکلا۔

"سلطانہ بھاگ گئی ہے" حیدر نے کہا "آپ الماس کو دیکھئے" وہ عابدہ گل کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا "میں سلطانہ کو تلاش کرتا ہوں۔"

"مگر وہ بھاگی کیوں؟ اسے کوئی شبہ کیسے ہو گیا؟ اور کیا پھاٹک پر چوکیدار نہیں ہوگا؟" گل زادہ نے بیک وقت کئی سوال کر ڈالے۔

"میں وہی دیکھنے جا رہا ہوں" حیدر کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

پھاٹک پر جانے کے لئے اسے ڈرائنگ روم سے گزرنا تھا۔

"کیا ہوا جناب!" قاضی صاحب نے اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

ارمغان بھی پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا تھا۔

"ابھی آکے بتاتا ہوں" حیدر نے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھایا لیکن پھر فوراً ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

باہر سے ایک گولی چلنے کی آواز سنائی دی تھی پھر دوسری گولی چلی اور پھر ایسا لگا جیسے فائرنگ کا طوفان آگیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو گروہوں کی بڑی نفری کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ ہو گیا ہو۔

"یہ کیا!" قاضی صاحب اچھل پڑے۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔

"شاید ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے" حیدر نے قاضی صاحب کو پھسلایا لیکن اس کے دماغ میں کچھ اور ہی خیالات زہریلے سانپوں کی طرح پھنکارنے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے بیرونی دروازہ بولٹ کر دیا۔

"پولیس کو فون کیجئے نا!" قاضی صاحب بوکھلا کر بولے۔

اتنے میں گل زادہ بھی فائرنگ کی آواز سن کر بوکھلایا ہوا وہاں آگیا تھا۔ حیدر نے اس کے کسی استفسار کا جواب نہیں دیا اور بولا "فی الحال آپ یہیں رکئے" پھر وہ تیزی سے الماس کے کمرے کی طرف دوڑا۔

فائرنگ کی آواز عابدہ گل نے بھی سن لی تھی۔ لیکن الماس کی وجہ سے وہ وہیں رکی رہی تھی۔ اس نے الماس کو اب بستر پر بٹھا دیا تھا۔ دوپٹہ اس کے سر پر خاصا کس کر بندھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے خاصی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے حیدر!" عابدہ گل کی آواز میں بے حد پریشانی تھی۔

"مجھے کچھ شبہ تو ہے کہ کیا گڑبڑ ہو گئی ہے لیکن یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔" حیدر نے تیزی سے کہا اور پھر الماس سے بولا "پچھلے دروازے کی چابی کہاں ہے؟"

الماس نے اٹک اٹک کر بتایا کہ وہ لاؤنج میں ٹیلی فون کے قریب اس "میٹ" کے نیچے رکھی ہے جس پر گلدان رکھا ہوا ہے۔

"میں وہ جا کے لیتا ہوں۔ اب ہم پیچھے ہی سے بھاگ سکیں گے" حیدر نے تیزی سے کہا اور پھر عابدہ گل سے بولا "آپ الماس کو لے کر پچھلے دروازے کی طرف چلیں' میں ارمغان اور ڈیڈی کو لے کر آتا ہوں۔"

وہ جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے نکل کر لاؤنج کی طرف دوڑا اور پھر اس وقت اس کے ذہن کو اچھا خاصا جھٹکا لگا جب چابی اس جگہ پر نہیں ملی جہاں الماس نے بتایا تھا۔ حیدر کو فوراً یاد آگیا کہ تیسرے پہر کے قریب گل زادہ کا فون ریسیو کرنے کے لئے سلطانہ جب اٹھی تھی تو حیدر اپنی جگہ ہی پر بیٹھا رہا تھا۔ ایسی صورت میں وہ چابی اپنے قبضے میں کر لینا سلطانہ کے لئے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔

وہ عقبی دروازہ گھر کا کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لئے دونوں ملازمائیں ہی استعمال کرتی تھیں۔ الماس ان کے لئے دروازے کا تالا خود کھولتی تھی اور خود ہی بند کر کے چابی رکھ دیتی تھی۔ آج یقیناً سلطانہ نے اسے چابی رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اس چابی پر ہاتھ صاف کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تک سلطانہ کسی طرح اپنے لئے خطرہ محسوس کر چکی تھی۔

اس طرح ان لوگوں کے سارے کئے کرائے پر پانی تو پھر گیا تھا لیکن یہ بات یقینی تھی کہ وہ دروازہ کھلا ہوا ملتا لہٰذا وہ لوگ اب بھی ادھر سے فرار ہو سکتے تھے۔

حیدر تیزی سے ڈرائنگ روم میں پہنچا۔

باہر سے آنے والی فائرنگ کی آوازوں کی شدت میں اب تک کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"میں نے پولیس کو فون کردیا ہے" گل زادہ نے حیدر سے کہتے ہوئے اسے کچھ اشارہ بھی کیا۔ غالباً اس بات سے قاضی صاحب کو مطمئن کرنا مقصود تھا۔

"پوزیشن ایسی نہیں ہے کہ ہم یہاں رک کر پولیس کا انتظار کریں۔ ہمیں فوراً پچھلے دروازے کے ذریعے یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی آئیں قاضی صاحب!"

جس وقت وہ چاروں عقبی دروازے کے قریب پہنچے' الماس اور عابدہ گل بھی اسی وقت پہنچیں۔ عابدہ گل نے زخمی الماس کو سہارا دے رکھا تھا جس کے کپڑے بھی اب خون سے سرخ ہوچکے تھے۔

"ارے! انہیں کیا ہوا!" قاضی صاحب بوکھلا کر بولے "اور دلہن کہاں ہے؟ کیا یہی دلہن ہیں!"

لیکن حیدر نے انہیں جواب دینے کے بجائے غیر مقفل دروازے کا پٹ کھولا۔ اس کی آواز کے فوراً بعد گلی میں ایک فائر ہوا اور پھر میگا فون پر ایک آواز گونجی۔

"کوئی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش نہ کرے۔ پولیس نے بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔"

عقبی دروازے کے پاس اندھیرا تھا ورنہ وہ آواز سننے کے بعد ان سبھی کے چہرے زرد نظر آتے۔



سلطانہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں' آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی اور وہ صوفے پر مسز سبحانی کے ساتھ تقریباً چپکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا سر مسز سبحانی کے شانے پر ٹکا رکھا تھا۔ وہ انہیں سارے حالات سے آگاہ کرنے کے بعد اب بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی "اس سارے عرصے میں صرف آج مجھے موقع ملا تھا کہ میں آپ کو فون کرسکتی تھی لیکن اس وقت میں حیدر کی باتوں میں آچکی تھی' اور جس وقت مجھ پر اس دھوکے کا پردہ چاک ہوا تو اس کا امکان ختم ہوچکا تھا کہ میں آپ سے رابطہ کرسکتی۔ میرا حشر تو نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ بس خوش قسمتی سے میں نے دیکھ لیا تھا کہ الماس نے عقبی دروازے کی چابی کہاں رکھی تھی پھر جب گل زادہ کا فون آیا تھا تو مجھے وہ چابی اپنے قبضے میں کرنے کا موقع مل گیا تھا۔"

"ایسا ہوتا ہے میری بچی!" مسز سبحانی نے پیار سے سلطانہ کا ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا "مظلوموں کی نجات کا راستہ قدرت خود پیدا کردیتی ہے۔ اچھا ہوا کہ وہاں سے تم سیدھی میرے پاس ہی آگئیں۔ اب...." ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ انہوں نے اٹھ کر ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس میں بولیں "ہیلو!.... جی میں بول رہی ہوں.... اوہ' آپ! جی ہاں۔ سلطانہ میرے پاس پہنچ چکی ہے۔"

سلطانہ نے یک بیک مضطربانہ انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ وہ نہیں چاہتی تھی' مسز سبحانی کسی کو بتائیں کہ وہ ان کے پاس آچکی ہے۔

"بہتر ہے۔ میں آپ کی منتظر رہوں گی" مسز سبحانی نے کہا اور سلسلہ منقطع کرکے پھر سلطانہ کے پاس آبیٹھیں "ایس پی رحمان کا فون تھا" انہوں نے بتایا "اگر تم وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب نہ ہوتیں تو بھی پولیس تمہیں بازیاب کرلیتی۔ ایس پی رحمان نے اس بنگلے پر چھاپا مار کر تمہارے سب دشمنوں کو گرفتار کرلیا ہے۔ ابھی انہیں کافی کام ہے لیکن تمہاری وجہ سے وہ جلد از جلد یہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔"

"اور پھر مجھے گوئل فراسٹ کے حوالے کردیا جائے گا!" سلطانہ نے روہانسی آواز میں کہا۔

"تو اس میں تمہارے لئے پریشانی کی کیا بات ہے!.... وہ تو...."

"مجھے یہ سبھی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے لگتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے! یہ گوئل فراسٹ ہے کون؟ یہ میری تلاش میں امریکا سے یہاں کیوں دوڑا آیا ہے؟"

"وہ تمہارے لئے خوش قسمتی کی کنجی لے کر آیا ہے میری بچی!" مسز سبحانی نے کہا "اسے امریکا کے ایک بہت دولت مند شخص رضا جان نے یہاں بھیجا ہے۔ وہ ڈائمنڈز کا بہت بڑا تاجر ہے۔ افریقہ میں اس کی ہیروں کی کئی کانیں ہیں۔ اسی لئے وہ امریکا میں ڈائمنڈ پرنس کہلاتا ہے اور اس کے قرب وجوار میں جو لوگ ہیں' وہ اسے صرف پرنس کہتے ہیں۔ کچھ دنوں سے وہ خاصا بیمار ہے اور آج کل تو اس کی حالت بہت غیر ہورہی ہے۔ گوئل فراسٹ اس کا وکیل ہے۔ وہ تمہیں لینے اس لئے آیا ہے کہ ڈائمنڈ پرنس رضا جان نے اپنی ساری دولت تمہیں دینے کی وصیت کی ہے۔"

"کیا!" سلطانہ پاگلوں کی طرح ہنس پڑی "اب آپ بھی مجھے خوابوں جیسی کوئی کہانی سنانا چاہتی ہیں!"

"تم کو یہی کہنا چاہئے تھا" مسز سبحانی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "تم اس وقت تک جن حالات سے گزر چکی ہو' ان کی وجہ سے تمہیں میری یہ بات بھی کہانی ہی معلوم ہونا چاہئے تھی۔"

"آپ بھی یہ پوری کہانی سنا دیجئے مجھے!" سلطانہ نے کسی حد تک کھسیائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے بس اتنا ہی معلوم ہے جو میں تمہیں بتا چکی ہوں۔"

"یہ ڈائمنڈ پرنس رضا جان ہے کون اور اسے مجھ سے ایسی کیا دلچسپی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ مجھے دے دینا چاہتا ہے!"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ اسے تم سے کیا دلچسپی ہے اور وہ اپنا سب کچھ تمہیں کیوں دینا چاہتا ہے۔ ایس پی رحمان نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا تھا۔ جو سوال تم نے ابھی مجھ سے کیا ہے' میں نے بھی ایس پی رحمان سے کیا تھا لیکن اس نے مجھے کچھ اور نہیں بتایا' لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں تو بتا ہی دے گا۔ ابھی وہ آرہا ہے' اس سے پوچھ لینا۔"

"نہ آنٹی' میں اب کسی مصیبت میں نہیں پھنسنا چاہتی" سلطانہ

کچھ روہانسی ہونے لگی۔

"تم اب کسی مصیبت میں نہیں پھنسو گی میری بچی! معاملہ اب پولیس کے ہاتھ میں ہوگا۔"

"لیکن پولیس بھی تو اس گوئل فراسٹ سے دھوکا کھا سکتی ہے۔ اس فراڈ کی حقیقت کیسے معلوم ہوگی؟"

"پولیس سب کچھ معلوم کر سکتی ہے۔ تم ذرا صبر تو کرو۔ ایس پی رحمان آجائے تو اس سے کھل کر بات کرنا۔ میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گی۔ آخر میں تمہاری قانونی سرپرست ہوں۔ آؤ کھانا کھالو۔ تم بھوکی ہوگی۔ میں ابھی کھانا کھانے کے ارادے سے اٹھ ہی رہی تھی جب تم اچانک آگئیں۔"

سلطانہ کی بھوک اڑی ہوئی تھی لیکن مسز سبحانی کے اصرار پر اسے تھوڑا بہت کھانا ہی پڑا۔

وہ کھانے سے فارغ ہوئی ہی تھیں کہ ایس پی رحمان آگیا۔

"میں بہت خوش ہوں بے بی کہ تم یہاں آگئی ہو اور بہ خیریت ہو" وہ بولا "مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ تم خاصی الجھن میں بھی ہوگی۔ مسز سبحانی نے تمہیں ضرور رضا جان صاحب کے بارے میں بتایا ہوگا۔ اس سے تمہاری الجھن اور بڑھی ہوگی لیکن تم کسی طرح آج کی رات تو گزار ہی لو۔ میں کل صبح آکر تفصیلی گفتگو کروں گا۔ ابھی مجھے خاصا مصروف رہنا ہوگا۔ شاید ساری رات ہی گزر جائے۔ میں فوراً اس لئے آیا ہوں کہ یہاں تمہاری حفاظت کا بندوبست کردوں۔ ہر چند میرے خیال کے مطابق تمہارے سب دشمن گرفتار ہو چکے ہیں تاہم احتیاط میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں نے عمارت کے گرد تو پہرا لگوا ہی دیا ہے لیکن اس کمرے کے دروازے پر بھی دو مسلح سنتری موجود رہیں گے جہاں آج تم سوؤ گی۔"

"میں آج آنٹی ہی کے کمرے میں سوؤں گی۔"

"جہاں بھی سو، وہاں دو سنتری پہرا دیں گے۔"

"اگر آپ بہت جلدی میں ہیں تو بھی میری کم از کم یہ الجھن تو رفع کرتے جایئے کہ کسی ڈائمنڈ پرنس کو میری ذات سے کیا دلچسپی کہ وہ اپنا سب کچھ میرے نام کر جانا چاہتے ہیں؟"

ایس پی رحمان نے کچھ سوچا اور پھر کہا "نہیں، میں آپ کے ہر سوال کا جواب کل ہی دوں گا۔ ابھی تو میں صرف انسپکٹر آفاق کو یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آپ اپنا بیان ریکارڈ کروا دیجئے۔ وہ بیان لے کر چلا جائے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ کل صبح کا ناشتا آپ کے ساتھ ہی کروں اور آپ کی تمام باتوں کا جواب دوں۔"

مسز سبحانی نے بہت اصرار کیا کہ وہ سلطانہ کی کم از کم ایک الجھن تو رفع کر جائے لیکن وہ نہیں مانا اور رخصت ہوگیا۔

O☆O

دوسری صبح ایس پی رحمان اس وقت آیا جب سلطانہ اور مسز سبحانی ناشتا کر چکی تھیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ایس پی رحمان رات سے اب تک جاگ ہی رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں نیند کی سرخی تھی۔ مسز سبحانی نے اسے چائے پلائی اور چند رسمی باتوں کے بعد ایس پی رحمان نے بتانا شروع کیا کہ یہ سارا چکر کیا تھا۔

گل زادہ، ڈائمنڈ پرنس رضا جان کا خالہ زاد بھائی تھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ رضا جان اپنی ساری دولت سلطانہ نامی کسی لڑکی کے نام کرنا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں اپنے لائر گوئل فراسٹ کو یہاں بھیج رہا ہے تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ رضا جان کے بعد وہ ساری دولت اس کی ہوگی۔ بہر حال اس نے طے کیا کہ وہ یہ بے پناہ دولت اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دے گا چنانچہ وہ یہاں پہنچا۔

دوسری طرف آصف بیگ نے بھی یہ بات سوچی کہ اگر وہ کسی طرح اپنے بیٹے کی شادی سلطانہ سے کردے تو بھی وہ ساری دولت اس کے قبضے میں آسکتی ہے چنانچہ وہ بھی یہاں پہنچا۔ امریکا میں اس کے تعلقات ڈارکی نام کے ایک بہت بڑے جرائم پیشہ سے تھے۔ ڈارکی کا غیر قانونی کاروبار یہاں کی ایک اہم شخصیت سے تھا۔ ڈارکی نے آصف بیگ کو اس شخصیت کے نام ایک پرچہ لکھ دیا کہ وہ ہر معاملے میں آصف بیگ کی مدد کرے۔

آصف بیگ کو رضا جان کی دولت کا اندازہ اس لئے بھی تھا کہ افریقہ میں رضا جان کی ہیرے کی کانوں کی نگرانی کا کام اسی کے سپرد تھا۔ گویا وہ افریقہ میں رضا جان کا جنرل منیجر تھا۔

رضا جان نے گوئل فراسٹ کو سلطانہ کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ بیس سال قبل اس شہر کی ایک سڑک پر ٹرک کا ایک حادثہ ہوا تھا جس میں لڑکی کے ماں باپ جاں بحق ہوگئے تھے لیکن چند سال کی سلطانہ معجزانہ طور پر بچ گئی تھی جس کی پرورش مسز سبحانی نام کی ایک خاتون کے فلاحی ادارے میں ہوئی ہے۔

گوئل فراسٹ کا تعلق امریکا میں وکیلوں کی ایک کمپنی سے تھا۔ امریکا میں اس قسم کی کمپنیاں بے حد ذمے دار سمجھی جاتی ہیں لیکن آصف بیگ اور گل زادہ نے کسی طرح اس کمپنی میں کسی سے ساز باز کرکے یہ بات معلوم کر ہی لی کہ رضا جان نے گوئل فراسٹ کو کیا کچھ بتایا ہے۔ اس طرح انہیں بھی سلطانہ کا پتا چل گیا۔

یہاں آنے کے بعد وہ دونوں اسی چکر میں تھے کہ کسی طرح اپنے کسی لڑکے کی شادی سلطانہ سے کرادیں۔ اس سلسلے میں آصف بیگ نے تو جرائم پیشہ افراد کی خدمات حاصل کیں لیکن گل زادہ یہ سارا کام اپنے طور پر کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ یہاں اس کا تعلق ریشم خاں نامی ایک شخص سے تھا۔

ریشم خاں عابدہ گل کا رشتے کا بھائی تھا۔ گل زادہ نے صرف اسی کا کچھ تعاون حاصل کیا تھا۔ باقی کام وہ خود کر رہا تھا یا اس کے دونوں لڑکے جن میں سے ایک لڑکے ارسلان حیدر کی بیوی الماس بھی اس کے ساتھ تھی۔

اس ڈرامے کے سارے کردار طویل عرصے سے امریکا میں

مقیم تھے اور وہیں کی شہریت انہیں حاصل تھی لیکن صرف ریشم خان یا اس کے اجداد یہاں سے رہائش کے ارادے سے امریکا نہیں گئے تھے یہاں ریشم خاں کا ایکسپورٹ کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ گل زادہ اور عابدہ گل جب یہاں آئے تو ریشم خان نے انہیں اپنی ایک ایسی کوٹھی میں ٹھہرایا جہاں وہ صرف اپنے مہمانوں ہی کو ٹھہرایا کرتا تھا۔

جب ایس پی رحمان نے کچھ سراغ لگنے پر اس کوٹھی پر چھاپا مارا تو سلطانہ وہاں سے غائب تھی لیکن اس نے رائٹنگ پیڈ پر ایک نوجوان کا اسکیچ بنا رکھا تھا۔ ایس پی رحمان نے اس اسکیچ کے سہارے اپنی تفتیش آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ نوجوان یہیں کا رہنے والا ہے تو شناختی کارڈ کے کسی دفتر سے اس کا پتا چل جائے گا اور وہ بھی امریکا ہی سے آیا ہے تو اس کا علم پولیس ہیڈ آفس سے ہو جانا چاہئے۔ جہاں تمام غیر ملکیوں کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔

اسی دوران میں ایس پی رحمان نے اعلیٰ سطح کے ذریعے امریکی حکومت سے گل زادہ اور آصف بیگ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی درخواست بھی کی تھی اور وہاں سے اس کو آج ہی معلوم ہوا تھا کہ ان لوگوں کا رضا جان سے کیا تعلق تھا۔ اس کے علاوہ پولیس ہیڈ آفس سے بھی آج ہی شام کو ارسلان حیدر کے بارے میں پتا لگ گیا تھا کہ وہ گل زادہ اور عابدہ گل سے پہلے یہاں آگیا تھا۔ گل زادہ کسی کام کی وجہ سے فوراً یہاں نہیں آسکتا تھا اس لئے اس نے ارسلان گل اور اس کی بیوی الماس کو بھیج دیا تھا۔ پھر وہ دونوں خود آئے تھے اور ان کے بعد ارمغان آیا تھا۔ پولیس ہیڈ آفس سے ایس پی رحمان کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ارسلان اور اس کی بیوی کی سکونت کہاں ہے۔

امریکا سے حاصل ہونے والی معلومات کے باعث ایس پی رحمان کو یقین ہوگیا تھا کہ سارا دولت کا چکر ہے اور یہ لوگ اپنے بیٹوں سے سلطانہ کی شادی کرا کے اس دولت پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ مزید تحقیق سے یہ بات بھی اس کے علم میں آگئی کہ ارسلان حیدر نے کسی لڑکی کے نکاح کے سلسلے میں علاقے کے نکاح خواں کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں۔ اس طرح کوئی شک ہی نہیں رہا کہ سلطانہ اسی بنگلے میں تھی چنانچہ ایس پی رحمان نے پروگرام بنایا کہ اس بنگلے پر دھاوا اس وقت بولا جائے جب نکاح خواں وہاں پہنچے کیونکہ امکان تھا کہ اس وقت وہاں سبھی کو دھرا جا سکے گا۔

لیکن اس ریڈ سے ذرا پہلے آصف بیگ کے کرائے کے غنڈے وہاں پہنچے۔ انہیں بھی اس کا علم ہوگیا تھا کہ سلطانہ وہاں تھی۔ نکاح خواں کی آمد کے بعد جب وہ لوگ چوکیدار کو ہلاک کرکے پھاٹک کود کر اندر جانے لگے تو پولیس نے ان پر فائر کھول دیا۔ اس مقابلے میں قلندر راجا زخمی ہوا۔ اس کے تین ساتھی مارے گئے جب کہ پولیس کے چار آدمی زخمی ہوئے جن میں سے ایک کی حالت بھی نازک تھی۔

سلطانہ اس وقت وہاں سے فرار ہو چکی تھی اور گل زادہ نے پھر یہ جھوٹ بولا تھا کہ سلطانہ وہاں نہیں تھی لیکن وہاں بھی سلطانہ کے لنگر پر تتس مل جانے کے باعث وہ بوکھلا گیا۔

"اور اب بے بی!" ایس پی رحمان نے سلطانہ سے کہا "تمہارا اور ریشم خاں کا بیان ان لوگوں کو قانون کے شکنجے میں بُری طرح جکڑ دے گا۔ تمہارا بیان تو خیر ہو چکا ہے لیکن ریشم خاں کی تلاش ابھی جاری ہے۔" ایس پی رحمان نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔ "......اگر ریشم خاں مل گیا تب تو بہت ہی اچھا ہوگا لیکن نہ ملا تو بھی تمہارے ہی بیان کی وجہ سے ان لوگوں کا بچنا مشکل ہے۔"

"لیکن گل زادہ نے یہ جزیرے وغیرہ کی کہانی کا چکر کیوں چلایا تھا؟" مسز سبحانی نے سوال کیا۔

"دراصل یہ ضروری تھا کہ سلطانہ اپنی خوشی سے شادی کرے ورنہ اسے امریکا لے جانا ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔"

"لیکن اس طرح سلطانہ کے سامنے آنے سے بھی تو ان کو دو پریشانیاں لاحق ہو سکتی تھیں" مسز سبحانی نے کہا "مسٹر فراسٹ کی باتوں کے جواب میں وہ سلطانہ سے کیا کہتے؟"

"ابھی وہ لوگ باقاعدہ بیان دینے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے ہیں۔ وہ اپنے لئے امریکا سے کوئی لائر بلوانا چاہتے ہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے امریکن ہونے کی وجہ سے ہم ان پر تشدد بھی نہیں کرسکتے تاہم میں ناامید نہیں ہوں۔ ابھی مجھے اتنا وقت نہیں ملا ہے کہ سارے کیس کو قاعدے سے منضبط کرسکوں۔ اس کے بعد شاید وہ بالکل بے بس ہو کر ہر بات کا اقرار کرلیں، سب کچھ بتادیں اور کئی الجھنیں رفع ہو جائیں اور مسٹر فراسٹ کے سلسلے میں تو میں ایک قیاس کرسکتا ہوں۔ شاید وہ سلطانہ کو یہ باور کرادیتے کہ وہ ڈائمنڈ پرنس تو بن گیا ہے لیکن اس نے کسی پر بھی یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی ہے کہ وہ کسی جزیرے کا جلاوطن شہزادہ ہے۔"

"لیکن امریکا پہنچنے کے بعد؟"

"اس بارے میں بھی صرف قیاس ہی کیا جاسکتا ہے جو بہت خوفناک ہے۔ ممکن ہے ان کا پروگرام یہ ہو کہ امریکا پہنچنے کے بعد وہ کسی ایسے طریقے سے سلطانہ کو ختم کروادیں کہ ان پر الزام نہ آسکے۔"

سلطانہ کا چہرہ سفید پڑ گیا اور مسز سبحانی نے ایس پی کو بڑی ناخوشگوار نظروں سے دیکھا۔ ایس پی رحمان نے بھی فوراً سر جھکالیا۔ غالباً اسے بھی اب احساس ہوگیا تھا کہ اسے یہ بات سلطانہ کے سامنے نہیں کہنا چاہیے تھی۔ پھر شاید اس نے موضوع بدلنے کے لئے کہا "مسٹر فراسٹ، سلطانہ بی بی کی بازیابی کی اطلاع پر بہت خوش ہوئے تھے۔ وہ آج ہی کسی وقت ان سے ملنے آئیں گے۔"

"میری کل رات کی بات کا جواب آپ نے آج بھی نہیں دیا

ہے" سلطانہ بولی "آخر مسٹر رضا جان اپنی ساری دولت مجھے کیوں دینا چاہتے ہیں؟ وہ مجھے کیسے جانتے ہیں۔ میں نے تو ان کا نام بھی پہلے کبھی نہیں سنا!"

"کل رات میں نے اس کا جواب اس لئے نہیں دیا کہ میں آپ کی رات کو ایک مزید الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا" ایس پی رحمان نے جواب دیا "حقیقت یہ ہے کہ مسٹر فراست نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا' بلکہ ان کا کہنا ہے کہ مسٹر رضا جان نے انہیں بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"تو پھر مسٹر فراست سے کہہ دیجئے کہ وہ مجھ سے ہرگز نہ ملیں۔ میں ان کے ساتھ ہرگز امریکا نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں اپنی سادہ سی زندگی میں بہت خوش ہوں۔ میں دولت کے لالچ میں وہاں جاکر کسی اور مصیبت میں نہیں پھنسنا چاہتی۔ مجھے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ مسٹر فراست سے ملنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ یہ البتہ آپ کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ امریکا جائیں یا نہ جائیں۔ کوئی بھی آپ کو یہاں سے زبردستی تو نہیں لے جاسکتا۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ آپ کو اتنی بڑی دولت کو اس طرح نہیں ٹھکرانا چاہیے۔ اس کا وعدہ میں ضرور کرسکتا ہوں کہ وہاں آپ کسی خطرے سے دوچار نہیں ہوں گی۔ ہم وہاں کی حکومت سے یہ درخواست کرسکتے ہیں کہ وہ اپنے کسی خفیہ محکمے کے کچھ آدمیوں کو آپ کی حفاظت پر مامور کردے۔ آپ کی حفاظت ائرپورٹ سے ہی شروع کردی جائے گی۔"

سلطانہ کچھ بولی تو نہیں مگر اس کے چہرے سے تذبذب کا اظہار ہورہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب ایس پی رحمان ... جانے لگا تو دروازے پر رک کر اس نے مسز سبحانی سے کہا کہ امریکا جانے کے سلسلے میں وہ بھی سلطانہ کو سمجھائے۔



دوپہر کو فراست بھی سلطانہ سے ملنے آیا۔ اس سے پہلے کہ سلطانہ کچھ بولتی' مسز سبحانی نے فراست سے کہا "پلیز' آپ دو ایک دن توقف فرمائیں۔ ابھی سلطانہ ذہنی طور پر اس قابل نہیں ہوسکی ہے کہ کوئی فیصلہ کرسکے۔"

"لیکن مسٹر رضا جان کی حالت بہت خراب ہے۔ خدانخواستہ......"

"کچھ بھی ہو" سلطانہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں امریکا جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ہاں اگر مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ مسٹر رضا جان اپنا سب کچھ مجھے دینے کے لئے کیوں تیار ہیں تو میں امریکا جانے کے بارے میں غور کرسکتی ہوں۔"

فراست نے مسز سبحانی کی طرف دیکھا اور مسز سبحانی نے اسے اشارہ کیا کہ فی الحال وہ اس موضوع کو آگے نہ بڑھائے۔

فراست کے جانے کے کچھ دیر بعد ایس پی رحمان کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ ریشم خاں سامنے آگیا۔ وہ اپنی ہی اس کوٹھی کے تہ خانے میں چھپا ہوا تھا جہاں گل زادہ کو ٹھہرایا گیا تھا۔ ریشم خان نے بیان دیا تھا کہ پولیس ریڈ کے بعد اس کی کزن عابدہ گل نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ کچھ دن کے لئے تہ خانے میں روپوش ہوجائے۔

"ریشم خاں کے بیان کے بعد وہ لوگ بہت بُری طرح پھنس گئے ہیں" ایس پی رحمان نے کہا تھا۔

سلطانہ کو خوشی ہوئی کہ اسے اپنے جال میں پھانسنے والے اب پوری طرح قانون کے جال میں پھنس چکے ہیں لیکن امریکا جانے کے لئے وہ اب بھی خود کو تیار نہیں محسوس کررہی تھی۔

رات ہونے تک سلطانہ اور مسز سبحانی میں امریکا جانے کے موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ سلطانہ جانتی تھی کہ ایس پی رحمان بھی مسز سبحانی سے کہہ گیا تھا کہ وہ سلطانہ کو سمجھائیں لیکن سلطانہ سمجھ رہی تھی کہ مسز سبحانی اس موضوع سے کیوں گریز کررہی تھیں۔ وہ بہت ذہین خاتون تھیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ سلطانہ اس معاملے کو ذہن سے جھٹک نہیں سکتی۔ بات ایسی تھی ہی نہیں کہ اسے اتنی جلدی فراموش کیا جاسکتا اس لئے مسز سبحانی خود کچھ کہنے کے بجائے پہلے سلطانہ ہی کو سوچنے سمجھنے کا' فیصلہ کرنے کا موقع دینا چاہتی تھیں۔

مسز سبحانی کی سوچ اور توقع کے مطابق سلطانہ اس مسئلے پر نہ صرف سوچتی رہی بلکہ ایک فیصلے تک بھی پہنچ گئی۔

رات کے کھانے پر مسز سبحانی بولیں "آج شام مسٹر فراست کا فون آیا تھا۔"

سلطانہ سنبھل گئی۔ اس نے سمجھا تھا کہ مسز سبحانی آخر زیادہ ضبط نہیں کرسکیں لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔

"وہ تمہاری خیریت پوچھ رہا تھا" مسز سبحانی نے کہا "وہ مسلسل ایس پی رحمان سے رابطے میں ہے۔ اس سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آصف بیگ نے اپنے بیٹے کاشف کو بھی امریکا سے بلالیا تھا۔ تمہیں گل زادہ وغیرہ سے چھیننے کے بعد کاشف کے پاس پہنچایا جاتا جس کے لئے ایک بنگلا کرائے پر لیا گیا تھا۔ یہ بات آصف بیگ کے سیکریٹری آفتاب نے اگل دی ہے لیکن کاشف نے پولیس کو بیان دیا ہے کہ اسے اس کے باپ نے یہاں بلایا ضرور تھا لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ پولیس فی الحال اسے گرفتار نہیں کرسکی ہے کیونکہ صرف آفتاب کا بیان کوئی ایسا ثبوت نہیں کہ کاشف کو بھی ہتھکڑیاں لگائی جاسکیں۔"

"دولت کے پجاری!" سلطانہ نے حقارت سے بس اتنا ہی کہا اور انتظار کرنے لگی کہ مسز سبحانی مزید کچھ کہیں گی مگر ایسا نہیں ہوا۔

کھانے کے بعد ان دونوں نے چائے پی۔ اس دوران میں بھی

مسز سبحانی نے کچھ نہیں کہا۔ چائے پی کر انہوں نے ٹی وی کھول لیا لیکن سلطانہ کسی پروگرام میں دلچسپی لینے کے بجائے اپنے خیالوں میں غرق رہی۔

آخر جب مسز سبحانی نے ٹی وی بند کر کے سونے کا ارادہ ظاہر کیا تو سلطانہ ہی کو اس موضوع پر بات چھیڑنا پڑی۔

"آنٹی!" اس نے کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مسٹر فراسٹ اور ایس پی رحمان کو صبح ناشتے پر بلالیں۔"

"کیوں!" مسز سبحانی نے اسے غور سے دیکھا۔

"میں ان دونوں سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا تم نے کوئی فیصلہ کرلیا ہے؟"

"جی ہاں آنٹی! میں امریکا جانے کے لئے تیار ہوں۔"

"میرا خیال ہے کہ تم نے مناسب فیصلہ کیا ہے۔"

"بات وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ یہ فیصلہ میں نے اس دولت کے حصول کے لئے نہیں کیا ہے۔ میں اپنی صرف یہ خلش دور کرنا چاہتی ہوں کہ مسٹر رضا جان نے اپنا سب کچھ مجھے سونپنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے۔"

"اوہ!" مسز سبحانی کو کچھ مایوسی ہوئی تھی۔

"اس کے علاوہ وہاں جانے کے لئے میری ایک شرط یہ بھی ہے کہ آپ کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے میری بچی!" مسز سبحانی پہلو بدل کر بولیں۔ "آخر یہاں میرے ادارے کی دیکھ بھال کون کرے گا۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ کو وہاں مستقل طور پر رہنا ہوگا! میں سمجھتی ہوں کہ خود میری واپسی بھی ضروری ہے۔ جب گل زادہ وغیرہ کا مقدمہ عدالت میں آئے گا تو یہاں میری موجودگی تو لازمی ہوگی۔"

"پھر تم مجھے کیوں لے جانا چاہتی ہو۔"

"اس لئے کہ مجھے ایک سہارے کی ضرورت ہے" سلطانہ نے کہا "میں وہاں جا کر اپنی خلش تو دور کرنا چاہتی ہوں لیکن وہاں جاتے ہوئے خوف زدہ بھی ہوں۔ وہاں مجھے نہ جانے کس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے!"

"ایس پی رحمان نے وعدہ تو کیا ہے کہ وہاں تمہارے تحفظ کا مکمل بندوبست ہوجائے گا۔"

"اس کے باوجود میں چاہتی ہوں کہ وہاں میرا اپنا بھی کوئی میرے ساتھ ہو، اور آپ کے سوا کون ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں۔"

مسز سبحانی ذرا دیر کچھ سوچتی رہیں، پھر بولیں "مجھے وہاں کب تک رکنا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ دو چار روز سے زیادہ رکنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"اچھا!" مسز سبحانی نے ایک طویل سانس لے کر کہا "تمہاری خاطر میں چند روز کے لئے چلی چلتی ہوں۔"

"شکریہ آنٹی!"

○☆○

دوسرے دن فراسٹ اور ایس پی رحمان صبح کے ناشتے پر تو نہیں لیکن دوپہر کے کھانے پر آگئے۔ فراسٹ بہت خوش تھے کہ سلطانہ امریکا چلنے کے لئے تیار ہوگئی ہے۔ سلطانہ نے اسے بتایا کہ وہ مسز سبحانی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے۔ فراسٹ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"یہ سب اخراجات کیسے پورے ہوں گے؟" سلطانہ نے پوچھا "ریٹرن ٹکٹ خریدنا ہوگا۔ مسز سبحانی کی واپسی تو ویسے ہی لازمی ہے اور مجھے غالباً اس مقدمے کی وجہ سے بھی آنا ہوگا۔ اس کے علاوہ روانگی کے دیگر اخراجات بھی ہیں۔"

"پرنس رضا جان کو ان سب باتوں کا خیال تھا" فراسٹ نے کہا "انہوں نے مجھے اتنا روپیا دیا تھا کہ آپ کو امریکا لانے میں مجھے ذرا بھی مالی پریشانی نہ محسوس ہو۔"

"اور" سلطانہ نے ایس پی رحمان کی طرف دیکھا "آپ سے مجھے یہ بات کرنا تھی کہ وہاں میرے تحفظ کا بندوبست کرنے میں کتنا وقت لگ سکتا ہے!"

"مسٹر فراسٹ!" ایس پی رحمان نے کہا "آپ کب امریکا روانہ ہونا چاہتے ہیں؟"

"جلد از جلد" فراسٹ نے کہا "مجھے پرنس رضا جان کے بارے میں مسلسل اطلاع مل رہی ہے کہ ان کی طبیعت بگڑتی جارہی ہے، لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ امریکا کے لئے فلائٹ تین دن بعد ہی مل سکے گی۔"

"ٹھیک ہے" ایس پی رحمان نے سلطانہ کی طرف دیکھ کر کہا "یہ کافی وقت ہے وہاں آپ کے تحفظ کا مکمل بندوبست ہوجائے گا۔ اور ہاں! میرا لڑکا بھی اعلیٰ تعلیم کے لئے دو دن قبل امریکا گیا ہے۔ میں اسے فون پر ہدایت کردوں گا کہ وہ آپ سے ملتا رہے تاکہ وہاں آپ کو تنہائی کا زیادہ شدید احساس نہ ہو۔"

"آپ کے لڑکے کا کیا نام ہے؟" مسز سبحانی نے پوچھا۔

"عمران" ایس پی رحمان نے جواب دیا "بے بی اسے جانتی بھی ہیں۔"

"میں!" سلطانہ چونکی۔

"ہاں، وہ آپ کا کلاس فیلو رہا ہے۔"

"اوہ، اچھا۔ وہ آپ کے بیٹے ہیں؟"

"ہاں" ایس پی رحمان نے سر جھکا کر کہا "لیکن بے بی! میں ایک بات واضح کردوں۔ وہ صرف میری ہدایت پر آپ سے ملتا رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہوگی کہ اب آپ ایک بہت بڑے دولت کی مالک بن چکی ہیں۔"

سلطانہ زیرِ لب مسکرادی۔ کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ

وہ کیوں مسکرائی تھی۔

○☆○

پانچویں دن سلطانہ، مسز سبحانی اور فراسٹ نیویارک ائرپورٹ پر تھے۔ فراسٹ کے ادارے کا ایک شخص ان کے لئے ایک کار لے کر وہاں آیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ تینوں، ائرپورٹ سے روانہ ہوئے۔

ایک گھنٹے بعد کار ایک کثیرالمنزلہ عمارت کے بیسمنٹ میں رکی جہاں بہت سی کاریں پارک تھیں۔

"آپ کو پانچ دس منٹ کار میں ہی بیٹھ کر میرے انتظار کی زحمت اٹھانا ہوگی" فراسٹ نے سلطانہ سے کہا "اس عمارت میں میرا دفتر ہے۔ وہاں سے مجھے ایک ضروری چیز لینا ہے۔ اس کے بعد ہم سیدھے آپ کے گھر ہی چلیں گے۔"

"میرے گھر؟" سلطانہ نے تعجب سے کہا۔

"جی ہاں" فراسٹ نے کہا "پرنس رضا جان کا گھر اب آپ ہی کا گھر تو ہے۔"

"اچھا!" سلطانہ مسکرادی۔

جو شخص کار لے کر آیا تھا، اسی کے ساتھ فراسٹ چلا گیا لیکن واپسی پر وہ اکیلا ہی تھا۔ اسی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور کار چل پڑی۔

دوبارہ کار ایک ایسی عمارت کے احاطے میں رکی جسے اچھا خاصا محل کہا جاسکتا تھا۔ ایک نوجوان نے ان کا استقبال کیا۔ فراسٹ سے مصافحہ کرتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور فراسٹ بھی ملول نظر آنے لگا تھا۔ پھر اس نے سلطانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہ مسٹر جمیل ہیں۔ طویل عرصے سے پرنس کے سیکریٹری کی حیثیت سے اپنے فرائض ادا کرتے رہے ہیں۔ اب اگر آپ نے گوارا کیا تو یہ آپ کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہیں گے۔"

جمیل، سلطانہ کے سامنے مؤدبانہ انداز میں جھکا اور سیدھا ہوگیا۔ "کیوں!" سلطانہ بولی "اب یہ بدستور پرنس کے سیکریٹری کیوں نہیں رہیں گے؟"

"میں چاہتا تھا کہ جب آپ یہاں آجائیں، تبھی آپ کو وہ اطلاع دوں جو مجھے روانگی سے دو دن قبل ہی مل گئی تھی" فراسٹ نے کہا "پرنس رضا جان کا انتقال ہوچکا ہے۔"

"اوہ!" سلطانہ کے ذہن کو اچھا خاصا جھٹکا لگا۔ گویا وہ مقصد ہی فوت ہوچکا تھا جس کے لئے وہ امریکا آئی تھی۔ اب اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ رضا جان نے اپنا سب کچھ اس کو کیوں سونپا تھا۔

"آیئے میڈم!" جمیل نے دروازے کی طرف اشارہ کیا "باہر کی فضا میں آپ تو خاصی ٹھنڈک محسوس کررہی ہوں گی۔"

سلطانہ نے کھوئے ہوئے سے انداز میں آہستگی سے قدم بڑھائے۔ مسز سبحانی اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"ڈرائنگ روم کی فضا میں آپ خود کو پُرسکون محسوس کریں گی۔" جمیل نے سلطانہ سے ایک قدم پیچھے چلتے ہوئے کہا "آتش دانوں کی گرمی باہر سے آنے والوں کے لئے بڑی سکون بخش ہوتی ہے۔"

سلطانہ کچھ نہیں بولی۔ فراسٹ بھی خاموشی سے چل رہا تھا۔

آخر وہ اندر پہنچ گئے۔ جمیل نے جسے ڈرائنگ روم کہا تھا، اس کی کشادگی اتنی تھی کہ وہاں کئی سو آدمیوں کے بیٹھنے کا بندوبست کیا جاسکتا تھا۔

جو جو باوردی ملازم سامنے آتے رہے تھے، وہ بڑے ادب سے سلام کرتے رہے تھے۔

ایک آتشدان کے قریب رک کر جمیل بولا "اگر آپ پسند کریں تو یہاں تشریف رکھیں۔"

"ٹھیک ہے" سلطانہ کے بجائے مسز سبحانی بول پڑیں۔

آتش دان کے قریب چار نہایت بیش قیمت اور جدید طرز کی آرام دہ کرسیوں کے ساتھ ایک تپائی بھی رکھی۔

مسز سبحانی، سلطانہ اور فراسٹ بیٹھ گئے۔

جمیل کھڑے کھڑے بولا "دوپہر کے کھانے میں تو ابھی دو گھنٹے باقی ہیں۔ فی الحال آپ کچھ پینا پسند کریں گی؟"

سلطانہ گم صم سی ہوگئی تھی اس لئے پھر مسز سبحانی کو بولنا پڑا۔ "فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

"بہتر ہے" جمیل نے کہا اور مؤدبانہ انداز میں تھوڑا سا جھک کر وہاں سے چلا گیا۔

"میڈم!" فراسٹ نے سلطانہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے جلد ہی واپس دفتر جانا ہے اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مجھے جو باتیں کہنا ہیں، وہ جلد از جلد کہہ ڈالوں۔ آپ کو کچھ کاغذات پر دستخط کرنا ہیں۔ اس کے بعد آپ پرنس رضا جان کی منقولہ جائداد کی قانوناً مالک بن جائیں گی۔ دوسری بات یہ کہ....."

"مسٹر فراسٹ!" سلطانہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ واقعی نہیں جانتے کہ پرنس رضا جان نے اپنا یہ سب کچھ مجھے سونپنے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

"یقین کیجئے کہ مجھے کچھ نہیں معلوم! اس بارے میں انہوں نے شاید کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا لیکن ایک امکان ہے کہ شاید آپ کو معلوم ہوجائے۔"

"کیسے؟" سلطانہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"دراصل مجھے آپ کی تلاش میں بھیجنے کے بعد یہاں پرنس رضا جان پر کچھ مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔ بیمار تو وہ تھے ہی۔ وہ بار بار جمیل سے کہا کرتے تھے کہ انہیں موت کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ پھر اچانک انہوں نے کچھ فیصلہ کیا اور بیماری

ہی کے عالم میں آپ کے نام ایک خط لکھ ڈالا۔ وہ خط ایک لفافے میں رکھ کر انہوں نے میری فرم کے حوالے کردیا تھا اور تاکید کی تھی کہ اگر آپ ان کی زندگی ہی میں یہاں آجائیں اور انہیں آپ سے بات چیت کا موقع مل جائے تو یہ خط انہیں جوں کا توں واپس لوٹا دیا جائے ورنہ جب آپ آئیں اور وہ اس دنیا میں نہ ہوں تو وہ خط آپ کو دے دیا جائے۔ مجھے میری فرم نے فون پر ہی اس بات سے آگاہ کردیا تھا اسی لئے ائرپورٹ سے آتے ہوئے میں اپنے دفتر پر رکا تھا۔ میں وہ لفافہ لے کر آیا ہوں" فراسٹ نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔

سلطانہ نے کچھ بے چین سی ہو کر ذرا سا آگے جھک آئی لیکن مسز سبحانی تحمل مزاجی سے بیٹھی رہیں۔

فراسٹ نے ایک لفافہ نکال کر سلطانہ کو دیا اور پھر فوراً ہی کھڑا ہوگیا۔ "میں اب اجازت چاہوں گا۔ کل کس وقت حاضر ہوجاؤں ؟"

"دوپہر کو فون کرلیجئے گا۔" سلطانہ نے کہا۔

"بہتر ہے۔" فراسٹ نے کہا اور پھر اس کی نظریں دیوار پر آویزاں ایک بڑی سی تصویر پر ٹھٹک گئیں۔

"یہ کس کی تصویر ہے؟" مسز سبحانی نے کہا۔

"پرنس رضا خان کی۔" فراسٹ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

سلطانہ نے بھی غور سے اس کی طرف دیکھا۔ تصویر میں وہ شخص پچاس پچپن سال سے زیادہ کا نہیں معلوم ہو رہا تھا لیکن اس تصویر سے یہ بات صاف ظاہر ہورہی تھی کہ جوانی میں وہ بلا کا خوبصورت رہا ہوگا۔

فراسٹ کے جاتے ہی سلطانہ بے چینی سے وہ لفافہ چاک کرنے لگی۔ مسز سبحانی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ سلطانہ نے خط نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

"سلطانہ! میری بچی! کیا تم یقین کروگی میں تمہارا باپ تم سے مخاطب ہوں؟"

خط کا یہ پہلا ہی جملہ سلطانہ کے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ گئے۔ اس کی نظر ایک دم رضا جان کی تصویر کی طرف اٹھی۔ اس تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے تنفس کی رفتار اور دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ چہرے کا رنگ بھی کچھ بدل گیا تھا جسے محسوس کرکے مسز سبحانی جلدی سے بول پڑیں۔

"کیا بات ہے سلطانہ۔"

مگر سلطانہ انہیں کوئی جواب دینے کے بجائے پھر خط کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس کی نظریں سطروں پر تیزی سے دوڑنے لگیں۔ اس نے خط کو پھر شروع ہی سے پڑھنا شروع کیا تھا۔

"سلطانہ! میری بچی! کیا تم یقین کروگی کہ میں تمہارا باپ تم

سے مخاطب ہوں؟ ہاں میری جان! میری روح! میں تمہارا وہ مجرم باپ ہوں جس نے تمہیں بدنصیبیوں کے سائے میں چھوڑ کر خود کو اپنی رنگین دنیا میں گم کرلیا تھا۔

میں یہ سارے اعترافات تمہارے سامنے کرتا لیکن مجھے ڈر ہے کہ میں تمہیں دیکھنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہوچکا ہوں گا۔ اسی لئے میں نے تمہیں یہ خط لکھنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ اپنے دل کا بوجھ بھی ہلکا کروں اور تمہاری یہ الجھن قائم نہ رہے کہ ایک "اجنبی شخص" نے اپنا سب کچھ سونپنے کے لئے تمہارا ہی انتخاب کیوں کیا ہے۔

باپ کے لئے بیٹی سے وہ باتیں کرنا بے حد مشکل ہے جو میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے جو اعتراف کرنا ہے' اس کے لئے مجھے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔ بیٹی سے یہ سب کچھ کہنا کتنا دشوار ہے' یہ کچھ میرا ہی دل جانتا ہے اور اس وقت شدید کرب سے دوچار ہوں۔

میری بچی! میں اپنی عمر کے آخری ایک ڈیڑھ سال کے علاوہ اور خصوصاً اپنی جوانی میں کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ بے پناہ دولت سے میں وہ تمام رنگینیاں حاصل کرلینا چاہتا تھا جو اس دنیا میں ہیں۔ ان رنگینیوں کے حصول کے لئے میں نے دنیا کے بیشتر ملکوں میں بھی وقت گزارا اور ہر جگہ کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اپنی بیٹی سے کوئی باپ اس سے زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے امید ہے کہ تم میری ان باتوں کا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔

بائیس سال قبل میں اس ملک بھی گیا تھا جہاں سے تم امریکا آوگی۔ وہاں میری ملاقات ایک لڑکی شازیہ فرخ سے ہوئی۔ وہ ایک اچھے گھر کی' پڑھی لکھی' ذہین اور بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ وہ مجھے پسند آگئی۔ میں بھی اسے اچھا لگا۔ اس کے گھر والے نہیں چاہتے تھے کہ وہ امریکا میں رہنے والے ایک ایسے شخص سے شادی کرے جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے ہوں لیکن شازیہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار تھی۔ اسے مجھ سے اتنی ہی محبت تھی کہ میری خاطر وہ اپنے گھر والوں کو تو کیا' ساری دنیا چھوڑنے کے لئے تیار تھی لیکن میں اسے اپنانے کی شدید خواہش کے باوجود اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ہمیشہ شادی کئے بغیر ہی دنیا کے متعدد ممالک کی رنگینیاں سمیٹی تھیں لیکن شازیہ فرخ نے مجھے کبھی ان حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دی جس کی اجازت کوئی شریف لڑکی دے بھی نہیں سکتی۔ عجیب بات یہ ہے کہ میرے افتادِ طبع کے منفی پہلو کو محسوس کرنے کے باوجود مجھ سے اس کی محبت کم نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی تو وہ رو رو کر مجھ سے التجا کرتی تھی کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ اس کے لئے بے چین میں بھی تھا۔ آخر اسے پانے کے لئے میں نے یہ گھٹیا فیصلہ کیا کہ شادی کے کچھ عرصے بعد جب میری طبیعت کسی اور طرف مائل ہوگی تو میں شازیہ فرخ کو طلاق دے دوں گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے اس سے شادی کرلی۔ اسے ایک بیش قیمت کوٹھی میں رکھا' اس کے لئے قیمتی کار خریدی' غرضیکہ آرام و آسائش کی ہر چیز فراہم کی لیکن شازیہ کا مزاج کچھ اور ہی تھا۔ اسے ان چیزوں کی نہ تمنا تھی' نہ پروا۔ وہ تو صرف مجھے چاہتی تھی اور میری خاطر اس نے اپنے گھر والوں کو بھی چھوڑ دیا تھا' یا یوں کہہ لو کہ گھر والوں نے اسے چھوڑ دیا تھا لیکن وہ خوش تھی کہ اس نے مجھے پالیا۔

شادی کے اگلے ہی دن میں ایک عجیب و غریب واقعے سے دوچار ہوا۔ ایک جوان العمر شخص مجھے ملا جس کا نام شرجیل تھا۔ اس نے مجھ سے کیا کیا باتیں کیں' اگر وہ میں تفصیل سے بیان کروں تو بات بہت پھیل جائے گی جب کہ میں اتنا ہی لکھ کر تھکن محسوس کرنے لگا ہوں۔ مختصراً یوں سمجھ لو کہ وہ ایک ایسا جرائم پیشہ شخص تھا جس کو معاشرے میں ایک باعزت شخص سمجھا جاتا تھا۔ دنیا میں ہر جگہ اس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ شرجیل کی باتوں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا تعلق کسی بڑی مافیا سے تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ شازیہ سے محبت کرتا تھا۔ انڈرورلڈ کا آدمی ہونے کی وجہ سے وہ شازیہ کو اغوا بھی کرسکتا تھا' اس کے ساتھ کوئی بھی زیادتی کرسکتا تھا مگر اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ شاید اسی کو "سچی محبت" کہتے ہیں جو اسے شازیہ سے تھی۔ اس نے بتایا کہ شازیہ نے اس کی محبت کو قبول نہ کرتے ہوئے مجھ سے شادی کرلی مگر وہ رکاوٹ نہیں بنا۔ اس نے اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دیا ہے لیکن اگر میں نے اس کی محبت یعنی شازیہ کو ذرا بھی تکلیف پہنچائی یا اسے طلاق دینے کا فیصلہ کیا تو وہ مجھے ہرگز زندہ نہیں چھوڑے گا اور اب صرف ایک دوست کی حیثیت سے ہمارے گھر آتا جاتا رہے گا تاکہ میرے اور شازیہ کے تعلقات پر نظر رکھ سکے کہ وہ ناخوشگوار تو نہیں ہورہے ہیں!

شادی سے قبل شازیہ فرخ نے مجھے ہنس ہنس کر بتایا تھا کہ ایک نہایت خطرناک شخص شرجیل اس سے محبت کرتا ہے لیکن وہ اسے اس حد تک پسند نہیں کرتی کہ اس سے شادی کرلے۔ میں شازیہ کی ان باتوں کو مذاق سمجھتا تھا لیکن جب شرجیل نے مجھ سے ملاقات کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مذاق نہیں تھا اور میں ایک خطرناک دلدل میں قدم رکھ چکا ہوں۔

شادی کے بعد شرجیل نے واقعی ہمارے گھر آنا جانا بھی شروع کردیا۔ گھر سے مراد وہ کوٹھی ہے جو میں نے شازیہ کے لئے خریدی تھی۔ اس نے میرے سامنے شازیہ سے گفتگو کی اور کہا کہ اب وہ ساری زندگی ہم دونوں کا دوست بن کر رہے گا۔

شادی کے سال بھر بعد ہمارے گھر میں ایک بچی نے جنم لیا جس کا نام شفق رکھا گیا لیکن مجھے اس لڑکی سے بالکل محبت نہیں ہوئی کیونکہ میرے خیال کے مطابق وہ لڑکی اور شازیہ' دونوں ہی

میرے لئے شرجیل کی وجہ سے ایک "جبر" بن گئے تھے جب کہ میں نے ہمیشہ ایک آزاد زندگی گزاری تھی۔

ہاں! یہ ذکر رہ گیا کہ میں اس عرصے میں اپنے کام کے سلسلے میں امریکا اور افریقہ آتا جاتا رہتا تھا۔ شازیہ کی خواہش تھی کہ میں اسے اپنے ساتھ امریکا لے جاؤں لیکن میں اسے اتنے معقول بہانوں سے ٹالتا رہتا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں ہو سکی تھی۔

اسی دوران میں ایک بار تنہائی میں شرجیل نے مجھ پر یہ بھی واضح کردیا تھا کہ وہ نہ صرف میرے سارے کاروبار سے واقف ہے بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں افریقہ اور امریکا میں کہاں کہاں مقیم رہتا تھا۔ اس کی یہ واقفیت بھی میرے لئے ایک عذاب سے کم نہیں تھی لیکن اس نے مجھ سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ وہ شازیہ کو یہ سب باتیں کبھی نہیں بتائے گا' ہاں اگر میں خود چاہوں تو شازیہ کو بتادوں۔ اس کا نظریہ تھا کہ یہ میاں بیوی کا نجی معاملہ ہے اور اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی بھی ایک فریق کا کوئی راز دوسرے فریق پر ظاہر کرے۔ یہاں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شرجیل ایک عجیب و غریب انسان تھا۔ ہر معاملے میں اس کے سوچنے کا ڈھنگ مجھے بہت عجیب و غریب معلوم ہوتا تھا۔ یہاں میں یہ اعتراف بھی کروں گا میں اس سے خوف زدہ رہتا تھا اور اسی لئے شازیہ کو طلاق دینے کی ہمت مجھ میں نہیں رہی تھی حالانکہ دو سال بعد ہی میں اپنی افتاد طبع کے مطابق اس سے بالکل اکتا چکا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے اسے طلاق دی تو شرجیل مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا' خواہ اسے امریکا یا افریقہ ہی کیوں نہ آنا پڑے۔

میری اس بے بسی کا عرصہ برسوں پر محیط ہوگیا۔ مجھ پر جھنجلاہٹ سی طاری رہنے لگی اور میں نے یہ سنگین فیصلہ کیا کہ طلاق دینے کے بجائے میں کسی طرح شرجیل اور شازیہ کو قتل ہی کرادوں۔ جیسے جیسے میں نے اس پر سوچا' ویسے ویسے مجھے یقین ہوتا چلا گیا کہ اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے اور آخر میں اس پر عمل بھی کر بیٹھا۔

پہلے میں کام کا بہانہ کرکے امریکا گیا پھر ایک ماہ بعد امریکا سے لوٹ کر میں نے شازیہ کو اپنی واپسی کی اطلاع نہیں دی اور پوشیدہ رہ کر ان دونوں کے قتل کی منصوبہ بندی میں مصروف رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دنوں ہماری بچی شفق کی طبیعت خراب تھی۔ شازیہ ایک خاص وقت پر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتی تھی۔ اس وقت شرجیل بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ کلینک تک پہنچنے کے لئے انہیں کار پارک کرکے پیدل سڑک پار کرنا ہوتی تھی۔ میں نے اسی سڑک پر انہیں قتل کروانے کا منصوبہ بنایا۔ اس کے لئے مجھے ایک ٹرک ڈرائیور کے علاوہ مزید چار پانچ آدمیوں کی خدمات بھی حاصل کرنا پڑیں۔ ان کا کام یہ تھا کہ جب ٹرک انہیں کچل کر ختم کرتا ہوا گزر جائے تو ان کی طرف لپکنے والوں کی بھیڑ میں وہ پانچوں افراد بھی ہوں۔ اس قسم کے حادثات میں اکثر جرائم پیشہ افراد کچھ ایسی

بگلا

مغربی ممالک میں مشہور ہے کہ نوزائیدہ بچوں کو بگلا اپنی چونچ میں لے کر آتا ہے۔

ایک صاحب کے ہاں جب بچے کی پیدائش ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ بچہ کتنا بدصورت ہے تو وہ بھاگے بھاگے چڑیا گھر گئے اور بگلے کی جانب پتھر پھینکنے لگے۔

حرکتیں کرتے ہیں کہ حادثے کا شکار ہونے والوں کی جیبیں صاف کردیتے ہیں۔ ان پانچوں کو یہی فرض سونپا گیا تھا کہ وہ مرنے والوں کے پاس یا ان کی جیبوں میں کوئی ایسی چیز نہ رہنے دیں جو بعد میں ان کی شناخت کا سبب بن سکیں۔ انہی میں سے ایک کے پاس تیزاب کی شیشی بھی تھی کہ اگر حادثے میں ان لوگوں کے چہرے قابل شناخت رہ جائیں تو ان پر تیزاب پھینک دیا جائے لیکن اس کام کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔ ان دونوں کے چہرے پہلے ہی بالکل مسخ ہو چکے تھے لیکن اس حادثے میں صرف شرجیل اور شازیہ ہی ہلاک ہوئے تھے' وہ بچی معجزانہ طور پر بچ گئی تھی اور اب تم خود ہی سمجھ گئی ہوگی کہ وہ بچی شفق تم ہی تھیں۔"

خط میں ٹرک کا ذکر آتے ہی سلطانہ کی آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں اور یہاں تک پڑھ کر اس کی آنکھوں سے دو آنسو بھی خط پر ٹپک گئے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان آنسوؤں سے بے خبر رہی ہو۔ وہ آگے پڑھتی رہی!

"میری بچی!... میں اس زمانے میں اپنی ہوس کے ہاتھوں کیسا شیطان' کیسا درندہ بن چکا تھا' اس واقعے سے اس کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ میں نے اس حادثے' یعنی قتل کے فوراً بعد اس ڈاکٹر کو بھی قتل کروادیا تھا جو تمہارا علاج کررہا تھا۔ چونکہ تم زندہ بچ گئی تھیں اس لئے مجھے ڈر تھا کہ وہ کہیں تمہیں پہچان نہ لے۔ اس صورت میں شرجیل اور شازیہ کی شناخت بھی ہوجاتی۔

ان سارے شیطانی کاموں پر میں نے بے دریغ روپیا خرچ کیا تھا تاکہ یہ راز کبھی نہ کھل سکے کہ وہ حادثہ نہیں بلکہ قتل تھا۔ اگر میں اس سارے منصوبے کی تفصیل لکھوں گا تو ایک صفحہ اور بھر جائے گا۔

میں وہاں ایک ہفتے اور رکا' کوٹھی اور کار بیچی اور واپس امریکا آگیا۔ اسی ایک ہفتے میں مجھے یہ بات معلوم ہوگئی تھی کہ میری بچی کو ایک فلاحی ادارے کی مالکہ نے پولیس سے لے لیا تھا اور اس کا نام سلطانہ رکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اتنے سنگین جرائم کرنے کے بعد میں کئی ماہ تک بے چین اور پریشان رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ معمول پر آتا چلا گیا۔ میں نے خود کو پھر انہی رنگینیوں میں ڈبو دیا اور

وقت گزرتا رہا۔ میں.... تمہارا گناہ گار باپ اعتراف کرتا ہوں کہ اس سارے عرصے میں تم کو میں نے کبھی اس طرح یاد نہیں کیا جس طرح کوئی اپنی بیٹی کو یاد کرتا ہے لیکن اب کوئی ڈیڑھ سال سے مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ ضائع کرتا رہا ہوں۔ میں دھیرے دھیرے تمام رنگینیوں سے دور ہوتا چلا گیا اور پھر ایک وقت آیا جب مجھے تمہاری اور شازیہ کی یاد شدت سے آنے لگی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں دنیا کے ایک بدترین گناہ کا مرتکب ہوچکا ہوں۔ اسی احساس نے مجھے بیمار ڈال دیا اور نہ جانے کیوں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ اب زندہ نہیں بچوں گا۔ اسی عالم میں میرے دل میں خیال آیا کہ اگر میں اپنا سب کچھ اپنی بیٹی سلطانہ کے نام کرجاؤں تو شاید میرے گناہ کا کچھ کفارہ ادا ہوسکے۔

میری بچی! اب میں بہت تھک گیا ہوں۔ چار نشستوں میں یہاں تک لکھ پایا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ بات اور مختصر کردوں۔ میں نے اپنی وصیت تیار کرنے کے بعد اپنے وکیل مسٹر گوئل فراسٹ کو تمہاری تلاش میں روانہ کردیا ہے مگر آج مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے میں تمہاری آمد تک زندہ نہیں بچوں گا۔ شاید میری گناہ گار روح اس پر آمادہ نہیں ہے کہ تمہارا سامنا کرسکے اس لئے آج یہ خط لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ خدا کرے کہ تم آجاؤ اور میرے گناہوں کا کچھ کفارہ ادا ہوجائے۔

میں تمہیں ایک نصیحت بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں میرے کئی عزیز ہیں مگر وہ سب خودغرض اور برے لوگ ہیں۔ میں خود کو ان سے بڑا الگ تھلگ رکھتا ہوں۔ تم بھی ان سے دور ہی رہنا۔ خاص طور سے میرا کزن گل زادہ اور اس کا گھرانا تو مجھے زہر ہی لگتا ہے۔ ان سے بہت دور رہنا۔

میرا خیال ہے کہ اب مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں۔ اب آخر میں تم سے چند باتیں اور کرنا چاہوں گا۔ یہ پہلا موقع ہے جب میں نے اپنے سنگین جرائم کا اعتراف تمہارے سامنے کیا ہے۔ کیا تم یہ چاہو گی کہ میرا یہ جرم دوسرے لوگوں کے علم میں بھی آجائے؟ کیا تم چاہو گی کہ میں مرنے کے بعد رسوا ہوجاؤں؟

اگر یہ خط پڑھتے ہوئے تمہارے دل میں میرے لئے نفرت پیدا ہوچکی ہے تو تم یقیناً ایسا ہی کرو گی اور اگر ایسا نہیں ہوا ہے تو یہ سمجھ لینا چاہیے۔ کہ میں اتنا بدنصیب بھی نہیں ہوں جتنا خود کو سمجھ رہا ہوں۔

اب اجازت دو میری جان! خدا کرے کہ تم مجھے معاف کردو' ہرچند میں اس قابل نہیں ہوں۔

اور ہاں! ایک بات اور! اب تم جب بھی اپنی ماں کی قبر پر پھول چڑھانے جایا کرو تو پھولوں کی ایک چادر مجھ بدنصیب کی طرف سے بھی چڑھا دیا کرنا۔

تمہارا بدنصیب باپ
رضا جان"

سلطانہ کے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے خط چھوٹ کر قالین پر گر گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مسز سبحانی نے اسے رونے سے نہیں روکا' نہ فرش پر گرا ہوا خط اٹھانا چاہا۔ وہ بس خاموشی سے سلطانہ کی طرف دیکھتی رہیں۔

آخر سلطانہ کی ہچکیاں خود ہی بند ہوئیں۔ اس نے نڈھال سا ہو کر اپنا سر کرسی پر ایک طرف ڈھلکا دیا اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے رضا جان کی تصویر کی طرف دیکھنے لگی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں آپ کو کیا کہہ کر مخاطب کروں" وہ تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں بولی۔" میں آپ کو معاف تو اس لئے کیے دیتی ہوں کہ آپ نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا ہے لیکن میں اس دولت میں سے کچھ نہیں لوں گی جو مجھے میری ماں کے قاتل کی طرف سے دی جارہی ہے۔ آپ کی وصیت کے مطابق میرے نہ ملنے کی صورت میں آپ کی ساری دولت کو امریکا بھر کے ان اسپتالوں میں تقسیم ہوجانا تھا جہاں اپاہجوں کا علاج ہوتا ہے' سو بس ایسا ہی ہوگا۔ جس طرح میری اماں کو تعیشات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' اسی طرح مجھے بھی نہیں ہے۔ اپنی ماں کی طرح میں بھی صرف محبت کی بھوکی ہوں اور ایک شخص امریکا ہی میں موجود ہے جو مجھ سے محبت کا دعویدار رہا ہے۔ اگر اب بھی اس کا دعویٰ برقرار ہے اور وہ کسی ڈائمنڈ پرنس کی وارث کے بجائے ایک بے مایہ لڑکی کا ہاتھ پکڑنے کے لئے تیار ہے تو میں کل ہی اس سے کہوں گی کہ چلو' میرے ساتھ واپس اسی سرزمین پر چلو جہاں میرا سرمایہ دو گز زمین میں دفن ہے۔" سلطانہ کی آنکھوں سے ایک بار پھر دو آنسو ڈھلک گئے۔

"سلطانہ!" مسز سبحانی آہستہ سے بولیں۔

سلطانہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"بیٹی!" مسز سبحانی پھر بولیں "کیا میں یہ خط پڑھ لوں؟"

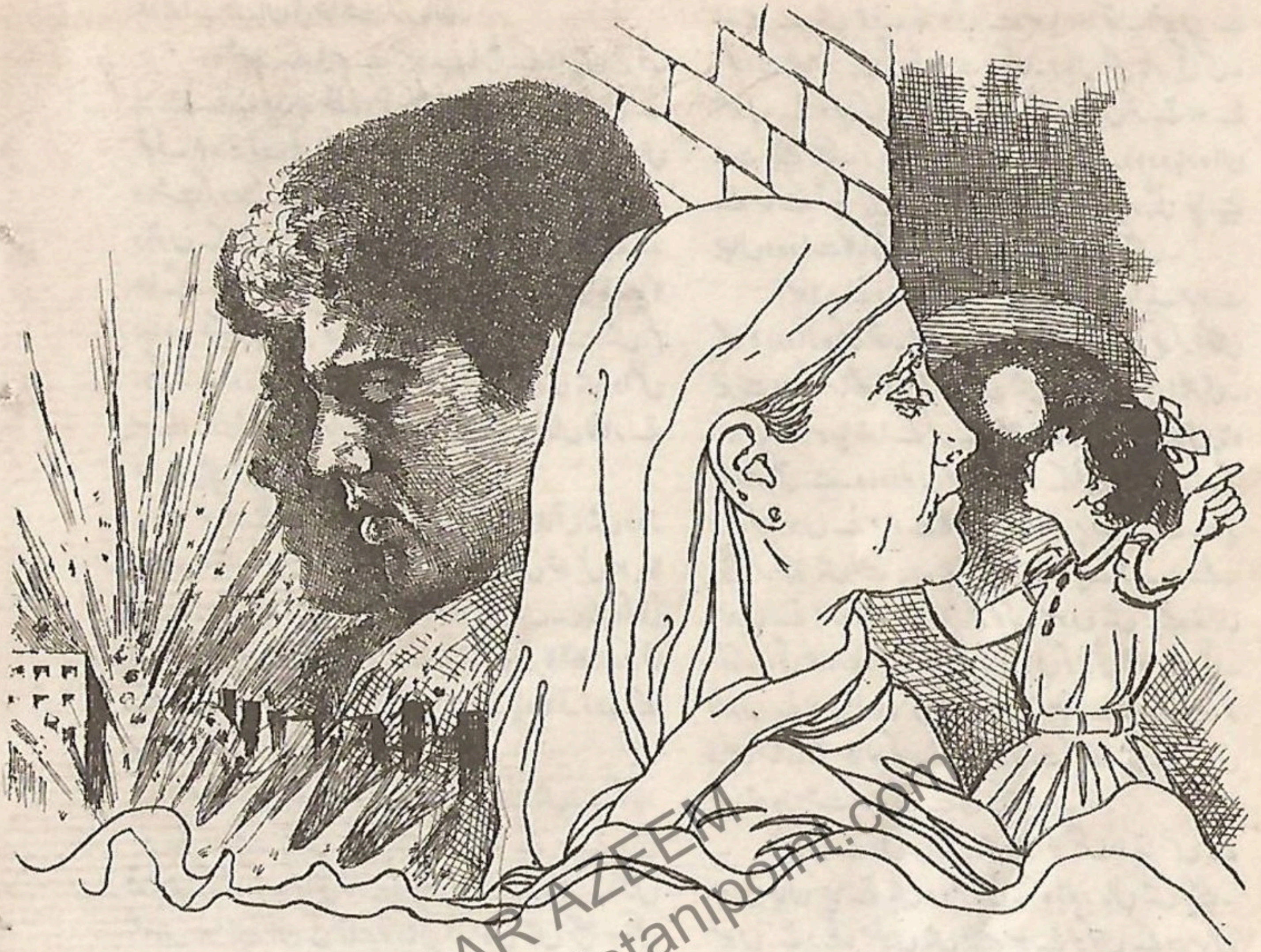
"نہیں آنٹی! پلیز!" سلطانہ کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

"تو اُسے اٹھا کر اپنے پرس میں تو رکھ لو۔"

سلطانہ نے خط اٹھایا۔ ایک نظر رضا جان کی طرف دیکھا اور پھر خط آتش دان میں پھینک دیا۔ کاغذوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔ سلطانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے خط کے شعلوں میں رضا جان کا عکس جھلملا اٹھا ہو اور اس عکس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا ہو "شکریہ بیٹی! مرنے کے بعد تم نے مجھے رسوائیوں سے بچالیا!"

شعلے بجھ گئے۔ رضا جان کا اعتراف نامہ خاکستر ہوگیا۔

سلطانہ نے اپنی گود میں پڑے ہوئے لفافے پر نظر ڈالی۔ ذرا دیر پہلے اس لفافے میں اس کا ماضی بند تھا لیکن اب وہ لفافہ خالی تھا' اس کے "حال" کی طرح! سلطانہ نے اسے اٹھا کر تہ کیا اور اپنے پرس میں رکھ لیا۔



چہرہ در چہرہ

ایچ اقبال

دھماکا کرنے والا ایک ہوتا ہے مگر نشانہ بے شمار لوگ ہوتے ہیں... ایسے لوگ جن کا کوئی قصور نہیں ہوتا مگر وہ دھماکا ان کی زندگوں میں کچھ نئے عناصر کا پیامبر بن جاتا ہے... محرومی، دکھ اور بے بسی تو عام سی باتیں ہیں اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ رونما ہوتا ہے... ہر دھماکے کے جلو میں کئی اور تخریب کاریوں کے سلسلے چھپے ہوتے ہیں... ایچ اقبال نے اس کہانی میں ایک دھماکے سے پہلے اور بعد کے واقعات کو اپنی نظر سے دیکھا اور آپ کے لیے الفاظ کی صورت کہانی کی شکل میں ڈھال دیا ہے... خیال کی نصرت اور تخیل کی پرواز نے زیر نظر کہانی کو سسپنس کے آخری صفحات کی زینت بننے کا اعزاز بخشا ہے... اور موجودہ حالات میں شاید اس کہانی کا اثر بھی کئی گنا زیادہ ہوگا۔

ایک دھماکے کے بعد بکھر جانے والے بدقسمت خاندان کا فسانہ عبرت اثر


ٹھوکر در ٹھوکر
ایرج اقبال

حجلۂ عروسی میں بیٹھی ہوئی دلہن کے چہرے پر تو شادابی اور ایک نئی دنیا کے بارے میں جو تجسس ہوتا ہے، ماہ زیب کا چہرہ اس سے عاری تھا۔ اس کے برخلاف وہ حزن و ملال کی تصویر بنی تھی۔ دماغ میں چکراتے ہوئے خیالات اسے اذیت پہنچا رہے تھے۔

ایک خفیف سا کھٹکا جو اگر دروازے کی طرف ہوا ہوتا تو وہ ہرگز نہ چونکتی لیکن وہ کھٹکا کھڑکی کی طرف ہوا تھا جو بیرونی رخ پر کھلتی تھی۔ ماہ زیب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

کھڑکی کا ایک پٹ نہ جانے کیسے کھلا رہ گیا تھا۔ ماہ زیب کو یوں محسوس ہوا جیسے وہاں کوئی ہے۔ کھڑکی کا پٹ خود بہ خود تو نہیں کھل سکتا تھا، اسے یقیناً کسی نے آہستگی سے کھولا تھا۔

کھٹکے کی آواز اور کھڑکی کے کھلے ہوئے پٹ کی وجہ سے ماہ زیب کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا پھر اس کا منہ بھی تھوڑا سا کھلا، وہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اسے کھڑکی کی گرل کے پیچھے ایک خوف ناک چہرہ دکھائی دیا تھا، اس کے پس منظر میں تاریکی تھی۔ وہ کمرے کی روشنی کے باعث دکھائی دیا تھا لیکن صرف ایک پل کے لیے۔ ماہ زیب کی نظر اس طرف اٹھتے ہی وہ چہرہ غائب ہوگیا تھا۔ ماہ زیب کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

کون تھا وہ؟ کوئی چور؟

ماہ زیب سوچتی ہوئی غیر ارادی طور پر بستر سے اتر آئی۔ وہ آنکھیں پھاڑے کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن اب وہاں کوئی نظر نہیں آرہا تھا، باہر صرف تاریکی تھی۔

ماہ زیب کو خیال آیا کہ وہ اس کا وہم تو نہیں تھا؟

دل و دماغ اس سوال کا جواب انکار میں دینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ کھڑکی میں ضرور کوئی تھا مگر کون؟ کوئی چور؟ لیکن کھڑکی میں مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔ کوئی اس طرف سے اندر نہیں آسکتا تھا۔

ماہ زیب دھڑکتے دل کے ساتھ، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے، کھڑکی کے قریب گئی۔ قریب پہنچتے ہی اس نے بہ عجلت کھڑکی کا پٹ بند کردیا۔ اس کے بعد وہ مڑ مڑ کر کھڑکی کی طرف دیکھتی ہوئی پھر بستر پر آبیٹھی۔ اپنی ہی ڈھارس بندھانے کے لیے اس نے خود کو باور کرانا چاہا کہ وہ اس کا وہم تھا۔

اسی وقت پھر ایک آواز سنائی دی جو دروازے کی طرف سے آئی تھی۔ وہ کوئی بچہ تھا۔ ''امی! امی!'' لہجے میں بے تابانہ پکار تھی۔

ماہ زیب جیسے تڑپ کر بستر سے اٹھی لیکن پھر یک لخت حالت ہوگئی۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا، میرے کمرے میں رہنا!'' ڈانٹنے کا سا انداز تھا۔ آواز نسوانی لیکن کسی حد تک بھاری تھی۔

''امی!'' بچہ جیسے روہانسا ہوگیا۔

''میرے ساتھ آؤ!'' نسوانی آواز نے بہت سختی سے کہا۔

''نہیں! نہیں! امی!'' بچہ جیسے مچلنے لگا۔

تڑاخ! یہ ایک تھپڑ کی آواز تھی۔

ماہ زیب کو ایسا لگا جیسے اس کے دل پر گھونسا لگا ہو۔

باہر سے بچے کے رونے کی آواز آئی جو دور ہوتی چلی گئی۔ اسے گود میں اٹھا کر یا شاید گھسیٹ کر وہاں سے لے جایا جا رہا تھا۔

ماہ زیب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کا رواں رواں آہیں بھرنے لگا تھا۔ اس کیفیت میں وہ بستر پر جیسے گر ہی پڑی۔

''یہ میرا مقدر ہے۔'' ماہ زیب جیسے خود سے بولی۔ ''مجھے صبر تو کرنا پڑے گا!''

بچے کی آواز معدوم ہوچکی تھی۔ ماہ زیب خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ بہت کچھ سوچ کر اس نے خود کو سمجھایا۔

پھر چند منٹ گزرے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ماہ زیب نے اچٹتی سی نظر سے اس طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر اس طرح ساکت ہوگئی جیسے پتھرا گئی ہے۔

کمرے میں داخل ہونے والا ایک خوب رو نوجوان تھا۔ شیروانی اور چوڑی دار پاجامے میں ملبوس اس کے گلے میں ایک ہار پڑا تھا۔ کمرے میں آکر اس نے دروازہ بولٹ کیا اور پھر گلے میں پڑا ہوا ہار اتار کر مڑا۔ اس کی نظر پہلے دلہن بنی ماہ زیب پر نہیں۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ بستر کی طرف بڑھنا شروع کیا اور ماہ زیب نے قریب آتے ہوئے قدموں کی آواز سنی تو اس کے رگ و پے میں خوف کی لہریں دوڑنے لگیں۔

''یہ نہیں ہونا چاہیے تھا! نہیں ہونا چاہیے تھا!'' اس کے دماغ میں شور برپا ہوگیا۔

لیکن وہ شور اس کے لیے اب اجنبی نہیں رہا تھا۔ اس کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی جب اس کی شادی کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کی راتیں تو اس شور سے بے خواب ہوہی گئی تھیں لیکن دن بھی پرسکون نہیں رہے تھے۔ [illegible] وہ شور اس کے

دماغ میں برپا ہوتا ہی رہتا تھا۔

☆☆☆

قدرت زمین پر کہیں نہ کہیں کچھ غیر معمولی کھیل بھی کھیلتی رہتی ہے۔ انہی کھیلوں میں سے ایک کھیل کا ایک کردار ماہ زیب بھی تھی۔ وہ اور مشہود ایک ہی اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ مشہود اس سے تین سال بڑا تھا۔ ماہ زیب چھٹی اور مشہور آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ کلاسز کے درمیانی وقفے میں وہ ایک دوسرے سے ضرور ملا کرتے تھے کیونکہ اسکول سے ہٹ کر بھی ان کا ایک رشتا تھا۔

مشہود کے والد محسن علی بینائی اور ماہ زیب کے والد احسن علی بینائی سگے بھائی تھے۔ دونوں کے اپنے اپنے کاروبار تھے۔ وہ ساتھ تو نہیں رہتے تھے لیکن دونوں میں محبت بہت تھی۔ شاید ان کے ساتھ نہ رہنے کا سبب یہ تھا کہ محسن علی بینائی کی اہلیہ عتیقہ بیگم خاصے کھردرے مزاج کی مالک تھیں اور اپنے شوہر پر ان کا دباؤ بہت تھا۔ اس کے برخلاف احسن علی بینائی کی بیگم اختر جہاں حد درجہ سیدھی سادی تھیں۔ ان دونوں گھروں کے افراد کا ایک دوسرے کے یہاں آنا جانا تو تھا مگر کم کم!

اسی رشتے کے باعث ماہ زیب اور مشہود ایک دوسرے کو اس وقت سے جانتے تھے جب ان کے شعور کی آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔

اسکول میں ساتھ ساتھ پڑھتے ہوئے وہ دونوں عمر کی اس منزل پر پہنچے جہاں دل و دماغ میں کچھ اور جذبات بھی سرسرانے لگتے ہیں۔ مشہود کیونکہ بڑا تھا، اس لیے اس کے ساتھ پہلے ایسا ہوا پھر ماہ زیب جیسے جیسے بڑی ہوئی، اس کا دل بھی مشہود کے دل کی تپش محسوس کرنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے اسیر ہوگئے۔ زبان سے اظہارِ محبت نہیں کیا لیکن آنکھوں سے عہد و پیماں ہوگئے۔

میٹرک کر کے مشہود نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ ماہ زیب اسکول ہی میں رہی کیونکہ وہ اس وقت آٹھویں جماعت میں تھی۔ مشہود کا چھوٹا بھائی مسعود بھی اسی اسکول میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ماہ زیب سے ایک سال چھوٹا تھا لیکن اسکول کے نہایت تیز و طرار طالب علموں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس نے اپنے بھائی اور ماہ زیب کی محبت بھانپ لی تھی۔ جب مشہود کالج چلا گیا تو ماہ زیب اسکول کے وقفے میں کھوئی کھوئی سی نظر آنے لگی۔ ایسے موقعوں پر مسعود کبھی کبھی ماہ زیب پر کوئی فقرہ کس دیتا تھا مگر اس کے کسی بھی لفظ سے بدتمیزی ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ بس چھیڑ چھاڑ کا انداز ہوتا تھا اور ماہ زیب زیرِ لب مسکرا کر رہ جاتی تھی۔

مسعود کے مزاج کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ تیز و طرار ہونے کے باوجود کبھی کبھی بڑی معصومیت سے بھی کوئی بات کہہ جاتا تھا۔ اس کے انہی معصومانہ فقروں سے بڑوں کے کان کھڑے ہوئے اور پھر ذرا سا کھوج لگانے پر ماہ زیب اور مشہود کی محبت سب پر آشکارا ہوگئی۔

''اب تو زمانے کے ساتھ ہی چلنا پڑے گا بینائی صاحب!'' محسن علی بینائی نے اپنے دل سے کہا۔

دوسرے لوگ بھی انہیں عموماً ''بینائی صاحب'' ہی کہا کرتے تھے۔

''احسن میاں!'' بینائی صاحب نے موقع ملتے ہی چھوٹے بھائی سے کہا۔ ''مشہود اور ماہ زیب کی جوڑی تو اچھی ہے!''

''جی...... جی بھائی صاحب!'' احسن صاحب سٹپٹا کر بولے۔ ''بھابی صاحبہ سے بات کرلی ہے آپ نے؟''

''ان سے تو کرلیں گے۔ پہلے تم تو وعدہ کرلو! ماہ زیب اب ہماری ہوئی۔''

احسن صاحب نے ادب سے کہا ''کیا میں نے کبھی آپ کے کسی حکم سے سرتابی کی ہے؟''

''وہ اور بات ہے احسن میاں!'' بینائی صاحب نے کہا ''یہاں بات لڑکے اور لڑکی کی ہے۔''

''دونوں آپ ہی کے ہیں بھائی صاحب!''

''بس تو ہم آج ہی عتیقہ بیگم سے بھی بات کرلیں گے۔''

اگرچہ عتیقہ بیگم دونوں گھروں میں زیادہ قربت پسند نہیں کرتی تھیں لیکن اس موقع پر ان کی رضامندی کا سبب شاید یہ بنا کہ احسن صاحب کاروبار کے میدان میں بینائی صاحب سے زیادہ کامیاب تھے۔ اس کے علاوہ ماہ زیب ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ان کے بعد سبھی کچھ اسی کا ہوتا۔

لیکن قدرت نے تو ایک نرالے ہی کھیل کا آغاز کیا تھا۔ ملک کے حالات میں کچھ ایسی ابتری آئی کہ بینائی صاحب کا کاروبار تو ایک شدید بحران ہی کا شکار ہوا لیکن احسن صاحب بالکل تباہ ہوگئے اور کسی باعث نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ ایک ادائیگی کے لیے اپنا سب کچھ بیچ دیں یا اپنے ہاتھ میں ہتھکڑیاں لگوالیں۔

بینائی صاحب جو خود بحران کا شکار تھے، اس موقع پر عزیز بھائی کے لیے کچھ نہ کرسکے۔ تمام ادائیگیوں کے بعد احسن صاحب کے پاس صرف ایک گھر رہ گیا جس میں وہ

رہتے تھے۔ گزر اوقات کے لیے انہیں نہ صرف ملازمت کرنا پڑی بلکہ انہوں نے گھر کا ایک حصہ بھی کرائے پر اٹھا دیا۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے کسی کی زندگی اتنی بدل جائے!

ماہ زیب اس وقت میٹرک کر چکی تھی۔ فرسٹ ایر میں اس کا داخلہ ایک معمولی کالج میں کرایا جا سکا۔ اسے اعلیٰ ترین درس گاہوں میں پڑھانے کا خواب احسن صاحب کی زندگی کے انقلاب میں کہیں بکھر چکا تھا۔

بینائی صاحب نے اس موقع پر حتی المقدور تعاون یا امداد سے گریزاں رہنے کا راستہ ہرگز تلاش نہیں کیا لیکن احسن صاحب کو یہ گوارا نہیں تھا۔ خودداری یوں کچھ اور بڑھ گئی تھی کہ بیٹی کو بینائی صاحب کے گھر میں جانا تھا۔

مشہود اور ماہ زیب جو ابتدا میں بہت خوش تھے اور جن میں زبانی عہد و پیماں بھی ہو چکا تھا، اس انقلاب سے مرجھا کر رہ گئے۔

''اب بڑی اماں یہ رشتا نہیں کریں گی مشہود!'' ماہ زیب نے ایک دن مشہود سے کہا۔

وہ عتیقہ بیگم کے مزاج سے خوب واقف تھی۔ خود مشہود بھی سہما ہوا سا تھا۔ وہ اور مسعود بہت چھوٹے تھے، تبھی انہیں ماں کی سخت گیری کا احساس ہو گیا تھا۔ ان کی عمر بڑھتی رہی تو بھی وہ احساس ختم نہیں ہو سکا۔ ماں کے سامنے دم مارنے کی جسارت وہ اب بھی نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن جب وقت آیا تو زندگی میں پہلی بار بینائی صاحب عتیقہ بیگم کے سامنے ڈٹ گئے۔

''سمجھنے کی کوشش کیجیے بیگم!'' انہوں نے کہا۔ ''ایک تو ہم اپنے چھوٹے بھائی کو برسوں پہلے زبان دے چکے ہیں۔ بات لوگوں میں بھی پھیل چکی ہے۔ سبھی مجھ پر تھو تھو کریں گے کہ بھائی پر برا وقت پڑا تو بینائی نے اپنی بات کی لاج بھی نہ رکھی۔ آج کل احسن بیمار بھی رہنے لگا ہے۔ ہمارے طرف سے انکار کا صدمہ اسے اور لے بیٹھے گا۔''

عتیقہ بیگم نے بہت آنکھیں نکالیں مگر اس مرتبہ بینائی صاحب نے میدان سے نہ ہٹنے کی شاید قسم کھالی تھی۔

انہی دنوں میں مسعود نے میٹرک کا امتحان دیا تھا۔ ماہ زیب بی اے کر چکی تھی۔ مشہود نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔

مشہود اور ماہ زیب کو غیر متوقع طور پر خوشی نصیب ہوئی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شنا سا جہیز دیکھ کر حیران رہ گئے۔ خود بینائی صاحب اور عتیقہ بیگم کو بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ احسن صاحب کے حالات ایسے نہیں رہے تھے کہ وہ بیٹی کی شادی اتنی دھوم دھام سے کر سکتے۔

شادی کی رات مشہود نے ماہ زیب سے پوچھا۔ ''چچا جان نے یہ سب کچھ کیسے کیا ماہ زیب؟''

''میں خود حیران ہوں مشہود!'' ماہ زیب نے جواب دیا۔ ''اس بارے میں اماں جان کو بھی کچھ نہیں معلوم! میں نے پوچھا تھا ان سے!''

''شاید تمہاری شادی کے نام کا پیسا انہوں نے شروع ہی سے الگ رکھ چھوڑا ہوگا!'' مشہود نے قیاس کیا۔

''شاید۔''

''اچھا خیر! فی الحال یہ باتیں چھوڑو۔'' مشہود نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں اپنی زندگی کی اس سب سے بڑی کامیابی کا جشن منانا چاہیے۔ میں بڑا خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسی خوب صورت بیوی مل گئی۔''

''آپ کیا کم خوب صورت ہیں!'' ماہ زیب نے نظریں جھکاتے ہوئے حجاب آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اگر آپ خوب صورت نہ ہوتے تو جانتے ہیں کیا ہوتا؟''

''کیا ہوتا؟''

''آپ میرے لیے تڑپتے رہ جاتے۔ میں آپ کی ''

''لاحول ولاقوۃ!'' مشہود بولا۔ ''ہم پھر سنجیدہ باتوں میں پڑ گئے۔''

''تو پھر کیا باتیں کریں؟''

''میں بتاتا ہوں۔'' مشہود اس پر جھکا۔

ماہ زیب نے کچھ گھبرا کے، کچھ شرما کے آنکھیں بند کر لیں۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب ان کو نیند آئی۔

یہ عقدہ ان کی شادی کے دو دن بعد کھلا کہ احسن صاحب نے بیٹی کی شادی اتنی دھوم دھام سے کیسے کی تھی۔ انہوں نے اپنا وہ بنگلا فروخت کر دیا تھا جس کے آدھے حصے میں وہ رہتے تھے اور آدھا حصہ کرائے پر دے رکھا تھا۔ خریدنے والے نے رقم قبضے سے بیس دن پہلے اس لیے دے دی تھی کہ وہ احسن صاحب کو اچھی طرح جانتا تھا اور ان پر بھروسا کرتا تھا۔

احسن صاحب نے اسی رقم سے ایک چھوٹا سا مکان اپنے رہنے کے لیے خرید لیا تھا اور باقی ساری رقم بیٹی کی شادی پر خرچ کر دی تھی۔ یہ سب کچھ خود انہوں نے ہی بتایا۔

شریک زندگی بننے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔'' ماہ زیب کے ہونٹوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔

''اچھا!'' مشہود دھیرے سے ہنس پڑا۔

ماہ زیب بولی۔ ''ہاں! جو لوگ خوب صورت نہیں ہوتے، ان پر دوسری نظر بھی میں نہیں ڈال پاتی اور بدصورت لوگوں سے تو مجھے ہول آتا ہے۔''

''یہ خوب صورتی ہمیں ورثے میں ملی ہے۔'' مشہود نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں ہی کے والدین خوب صورت ہیں۔'' پھر وہ ہنسا۔ ''مسعود جب چھوٹا تھا تو مجھ سے کہا کرتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے۔''

''بہت شریر ہے۔'' ماہ زیب نے کہا۔ ''اسکول میں مجھ پر فقرے کسا کرتا تھا لیکن وہ بدتمیز ہرگز نہیں ہے۔''

''بس ذرا پڑھائی میں اس کا دل کچھ زیادہ نہیں لگتا۔ چھٹی جماعت سے پہلے تک تو وہ ایک سال فیل ہو کر دوسرے سال پاس ہوا کرتا تھا۔ اب کہیں جا کے میٹرک میں پہنچا ہے۔ اگر وہ جلدی بی اے کر لیتا تو میں ابا جان سے کہہ دیتا کہ اب وہ گھر میں آرام کریں، ہم دونوں بھائی سنبھال لیں گے کاروبار۔''

''بعض بچے چھٹی تو کیا، ساتویں آٹھویں جماعت کے بعد پڑھائی کے معاملے میں سنجیدہ ہوتے ہیں۔''

''اور بعض اس کے بعد بھی نہیں ہوتے!''

''وہ اپنی ساری زندگی ہی میں ناکام رہتے ہیں۔''

مینائی صاحب نے یہ جاننے کے بعد چھوٹے بھائی پر اپنی خفگی کا اظہار کیا لیکن اب وہ ایک بے سود سی بات تھی۔ جو کچھ ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اگر مینائی صاحب کو پہلے سے اس کا علم ہو جاتا تو وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دیتے۔

ماہ زیب کو بھی بہت دکھ ہوا جب اس نے وہ گھر دیکھا جہاں اب اس کے والدین کو رہنا تھا۔ انہوں نے بنگلے کا قیمتی سامان فروخت کر کے اس گھر کی مناسبت سے معمولی سامان خرید لیا تھا۔

''اب آپ کے اخراجات کیسے چلیں گے ابو!'' ماہ زیب نے افسردگی سے کہا۔ ''بنگلے کے آدھے حصے کا بھی اچھا خاصا کرایہ آ جاتا تھا۔''

''جب اخراجات بھی تو زیادہ تھے۔'' احسن صاحب نے شفقت سے ماہ زیب کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی تھیں ہمارے ساتھ، تمہاری تعلیم کا خرچ بھی تھا۔ ہم میاں بیوی کا گزارا تو اب ہو جائے گا۔ ملازمت تو میں کر ہی رہا ہوں نا!''

میٹھا سالن

اس چائے کو تو خیر ہم نے میٹھا سالن عرض کیا ہے لیکن لوگ چائے کو سچ مچ سالن بنا کر استعمال کرتے ہیں یعنی نمکین چائے پیتے ہیں اور اس نمکین چائے کو جس وقت شیرمال ڈال کر پیتے نہیں بلکہ کھاتے ہیں اس وقت بالکل یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیرمال نہاری سے کھائی جا رہی ہے اور واقعی وہ لوگ چائے کو نہاری کا بدل سمجھتے ہیں ورنہ کہاں چائے، کہاں اس میں نمک اور کہاں شیرمال سے اس کو کھانا۔ ہم کو تعجب ہے کہ یہ لوگ چائے میں گوشت ڈال کر باقاعدہ چائے کا سالن کیوں نہیں پکاتے اور جو ذرا سی کسر رہ گئی ہے اس کو بھی کیوں نہیں پورا کر دیتے۔

بحرِ تبسم از شوکت تھانوی سے اقتباس

مرسلہ: رفعت رضا، کراچی

ماہ زیب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''آپ کی صحت گرتی جا رہی ہے۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' احسن صاحب نے کہا لیکن ماہ زیب کا دل نہیں مان رہا تھا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

سال بھر بعد ماہ زیب ایک بیٹی کی ماں بنی۔ عتیقہ بیگم کا منہ بن گیا۔ ماہ زیب اسپتال سے گھر آ گئی تو بھی انہوں نے پوتی کو ایک بار بھی اپنی گود میں نہیں لیا۔ اس کا نام بھی مینائی صاحب نے رکھا۔ ماہ رخ! وہ خود بھی خوش تھے۔ انہوں نے عتیقہ بیگم سے کہا۔ ''بیٹی تو خدا کی رحمت ہوتی ہے عتیقہ بیگم! اور دلہن سے تو آپ خوامخواہ ناراض ناراض سی ہیں۔ اس بے چاری کا تو اس میں کوئی قصور نہیں!''

عتیقہ بیگم کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں لیکن وہ کچھ بولیں نہیں۔ مینائی صاحب نے بھی مزید کچھ کہنا غیر ضروری سمجھا۔

''تم کیوں افسردہ رہنے لگی ہو ماہ زیب!'' مشہود نے ایک دن کہا۔

ماہ زیب کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بڑی اماں نے ماہ رخ کو ایک بار بھی گود میں نہیں لیا!''

''آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائیں گی۔'' مشہود نے اس کی ڈھارس بندھانے کی کوشش کی۔

مسعود تو اتنا خوش تھا کہ کالج سے آتے ہی ماہ رخ کو ماہ

زیب سے لیتے ہوئے کہتا۔ ''بس بھابی جان! اب گڑیا ایک گھنٹے کے لیے میری ہوئی۔''
اور پھر وہ ماہ رخ کو گود میں لیے سارے گھر میں پھرتا رہتا۔
مشہود کی طرف سے ماہ زیب کی دل جوئی کی کوششیں مسلسل جاری رہتیں۔ وہ اس سے مذاق اور چھیڑ چھاڑ کرتا رہتا۔ ایک دن بولا۔ ''آج روبی ملی تھی ایک کیفے میں!''
ماہ زیب پھیکے سے انداز میں مسکرادی کچھ بولی نہیں۔
وہ روبی سے واقف تھی۔ وہ اسکول کی ان چند لڑکیوں میں سے ایک تھی جو مشہود کو بہت پسند کرتی تھیں۔
''ڈاکٹر بن گئی ہے اب وہ۔'' مشہود نے مزید کہا۔ ''تمہیں بہت پوچھ رہی تھی۔ کسی دن بلالوں اسے چائے پر؟''
''بلا لیجیے! میں نے اس سے کبھی جلن محسوس نہیں کی۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ دوسری لڑکیوں کی تو میں بات نہیں کروں گی لیکن وہ واقعی آپ کو چاہتی تھی۔ جب میں اور وہ آٹھویں جماعت میں پہنچی تھیں تو اسے محسوس ہوگیا تھا کہ آپ میری طرف ملتفت ہیں۔ اس کے بعد وہ آپ سے دور دور رہنے لگی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نوعمری کے جذباتی ابال کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ سوچنا سمجھنا آتا تھا اسے!''
''وہ تو اسے اب بھی نہیں آیا۔'' مشہود نے سنجیدگی سے کہا۔
''کیا نہیں آیا؟''
''سوچنا سمجھنا۔''
''کیا مطلب؟''
''غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہوگئی ہے اب وہ! شادی نہیں کی اس نے! اشارتاً یہ بھی بتایا تھا کہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی۔''
''اوہ!'' ماہ زیب کے منہ سے نکلا اور وہ سنجیدگی سے مشہود کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ......'' نہ جانے کیوں اس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔
''ہاں ماہ زیب!'' مشہود نے کہا۔ ''کچھ ایسا ہی معاملہ لگتا ہے۔ میں بھی اس سے کھل کر تو بات کر نہیں سکتا تھا۔ بس اشاروں ہی میں کہہ سکا کہ زندگی میں کسی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے تو اسے زندگی بھر کا روگ نہیں بنانا چاہیے؟''
یہ بات اس لیے آگے نہیں بڑھ سکی کہ بینائی صاحب آگئے تھے۔ ان کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہورہی تھی۔ ماہ زیب کا دل بڑی زور سے دھڑکا۔ یہ اس کے علم میں تھا کہ بینائی صاحب اس کے والد اور والدہ سے ملنے گئے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ اتوار کی شام کو وہ ضرور جایا کرتے تھے۔
''کیا بات ہے ابا جان؟'' مشہود بھی باپ کی حالت سے پریشان ہوگیا۔
بینائی صاحب نے اسے جواب دینے کے بجائے ماہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بروقت پہنچ گیا احسن سے ملنے۔ وہاں ڈاکٹر آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ احسن کو فوراً اسپتال لے جانا چاہیے۔''
''کیا ہوا ابو کو؟'' ماہ زیب گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔
''گھبراؤ نہیں، گھبراؤ نہیں دلہن!'' بینائی صاحب نے کہا۔ ''میں احسن کو اسپتال میں داخل کرا کے آرہا ہوں۔ وہیں سے فون اس کے لیے نہیں کیا کہ تم اور زیادہ گھبرا جاتیں۔ اب تم میرے ساتھ چلو۔''
اس وقت مشہود نے ماہ زیب کو سنبھالا ورنہ وہ گر ہی پڑتی۔
سب لوگ کار میں اسپتال روانہ ہوئے۔ ماہ زیب کی حواس باختگی کا یہ عالم تھا کہ وہ ننھی ماہ رخ کو بھی بھولے ہوئے تھی۔ اسے مسعود اپنی گود میں لے کر کار میں بیٹھا تھا۔ عتیقہ بیگم بھی سب کے ساتھ تھیں مگر ان کے چہرے پر وہ پریشانی نہیں تھی جس پریشانی سے باقی افراد دوچار تھے۔
اسپتال میں ماہ زیب کی والدہ اختر جہاں بیٹھی رو رہی تھیں۔ احسن صاحب انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں تھے۔
وہ وارڈ احسن صاحب کی زندگی کی آخری منزل ثابت ہوا۔ وہاں سے ان کی لاش ہی گھر واپس گئی۔ اختر جہاں اور ماہ زیب پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ ننھی ماہ رخ کو اس وقت بھی مسعود ہی گود میں لیے ہوئے تھا۔ اختر جہاں اور ماہ زیب کو سنبھالنے کی کوشش تنہا مشہود کو کرنا پڑ رہی تھی۔ عتیقہ بیگم تو اس طرح باتیں کررہی تھیں جیسے کسی غیر کو صبر کرنے کی رسمی تلقین کی جاتی ہے۔
☆☆☆
ماہ زیب کے لیے وہ زندگی کا پہلا بڑا صدمہ تھا جس سے وہ بہ مشکل سنبھلی ہی تھی کہ اس کے دل پر ایک اور چرکا لگا۔ اس کی والدہ اختر جہاں بھی دنیا سے چل بسیں۔ شوہر کی موت نے انہیں اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ لیا تھا۔ اس وقت یہ دوسرا عقدہ بھی کھلا کہ وہ جس مکان میں رہتی تھیں، وہ بھی کرائے کا تھا۔ احسن صاحب صرف بھائی خفگی سے بچنے کے لیے یہ جھوٹ بولنے پر مجبور ہوئے تھے کہ یہ مکان انہوں

نے خرید لیا تھا۔

اب ماہ زیب خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی اگر اسے مشہود کی رفاقت اور مینائی صاحب کی شفقت حاصل نہ ہوتی۔ مسعود بھی اس کے دل کا بوجھ کم کرنے کے لیے سرتاپا ''بھابی جان کا خادم'' بن گیا۔

ماں کی وفات پر ماہ زیب کچھ دن بیمار رہی تھی تو مسعود نے کالج سے چھٹی لے لی تھی اور خود کو نہ صرف اس کی تیمار داری کے لیے وقف کر دیا تھا بلکہ اس دوران میں ننھی ماہ رخ بھی اس کی گود میں ہی رہی تھی۔

جب ماہ رخ کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولنے کے قابل ہوئی تو اسے بتایا جانے لگا کہ مسعود اس کا چچا جان، مشہود اس کا پاپا، ماہ زیب اس کی امی جان، مینائی صاحب اس کے دادا جان اور عقیقہ بیگم اس کی دادی جان ہیں۔

یہ الفاظ ماہ رخ کی زبان سے ٹوٹ پھوٹ کر نکلتے تھے۔ جس دن اس نے ''چچان'' کا لفظ ادا کیا، مسعود کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ وہ ماہ رخ کے لیے اپنی پاکٹ منی سے ڈھیروں کھلونے خرید لایا۔

عقیقہ بیگم کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں مسعود کی یہ حرکتیں بھی گراں گزرتی تھیں اور ماہ زیب سے مینائی صاحب کی بڑھتی ہوئی شفقت بھی بری لگتی تھی۔ شاید وہ نہایت قاہر و جابر روایتی ساس ثابت ہوتیں اگر ماہ زیب کو تین ''سہارے'' حاصل نہ ہوئے۔ مشہود، مسعود اور مینائی صاحب!

مشہود اسے تنہائی میں سمجھایا کرتا۔ ''امی صاحبہ کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے ماہ زیب کہ ابا جان نے بھی شروع ہی سے ان کی باتوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ تم بھی اپنے دل پر بوجھ نہ لیا کرو۔''

اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ ماہ زیب کے دل پر لگے ہوئے زخم مندمل ہوتے چلے گئے۔ مسعود تھرڈ ایر میں پہنچ چکا تھا۔ ماہ رخ تین سال کی ہونے والی تھی اور اب بھی مسعود کا دل پسند کھلونا تھی۔ ماہ رخ کو بھی کالج سے مسعود کی واپسی کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ وہ اپنے ''چچان'' سے اتنی ہی مانوس ہو چکی تھی۔

ایک دن مسعود نے بڑی شرارت سے ماہ زیب کو چھیڑا۔ ''میری گڑیا کے لیے بھیا کب لائیں گی بھابی جان؟''

''بدتمیز!'' ماہ زیب نے آنکھیں نکالیں۔ ''پٹو گے کیا میرے ہاتھ سے!''

''بڑا مزہ آئے گا آپ سے پٹنے میں!'' مسعود ہنسا۔

''شرم نہیں آئے گی؟ تیئس چوبیس سال کے ہو گئے ہو!''

''بڈھا ہو جاؤں گا، تب بھی آپ سے پٹنے میں مزہ آئے گا۔ میری بات کا جواب دیں آپ! اگلے سال بی اے کرنے کے بعد میں دفتر جانا شروع کر دوں گا۔ کون کھیلا کرے گا پھر میری گڑیا کے ساتھ؟ ایک بھیا تو ہوا اس کا!''

''تمہارے بھائی جان ابھی نہیں چاہتے۔'' ماہ زیب جواب دیتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اسے توقع تھی کہ مسعود یہ بات عقیقہ بیگم تک پہنچا دے گا۔ عقیقہ بیگم اس حوالے سے اشاروں کنایوں میں کوئی نہ کوئی جملہ کہہ کر ماہ زیب کو پن چبھویا کرتی تھیں۔

اگلے سال جب مسعود نے فائنل ایر کے امتحانات کی تیاری شروع کی تو ماہ زیب نے ماہ رخ کو سمجھایا کہ اب وہ کچھ دن تک مسعود سے اپنی شرارتیں بند کرے اور مسعود کو سکون سے پڑھنے دے لیکن جب ماہ رخ مسعود کے کمرے میں نہیں گئی تو مسعود خود اسے لینے آ گیا۔

''میں نے روکا ہے اسے!'' ماہ زیب نے اسے بتایا۔

''کیوں بھابی جان! نہیں، یہ نہیں چلے گی۔'' مسعود نے ماہ رخ کو گود میں اٹھانا چاہا۔

''مسعود! چھوڑ دو اسے!'' ماہ زیب نے سخت لہجے میں کہا۔ ''جب تمہارے پرچے ختم ہو جائیں تو لاڈ کرنا اس سے!''

''کوئی فرق نہیں پڑے گا بھابی جان! یہ میرے پاس بس بیٹھی رہے گی۔'' مسعود نے ماہ رخ کو گود میں اٹھا لیا۔

''نہیں۔'' ماہ زیب نے اسے مسعود کی گود سے تقریباً چھینتے ہوئے کہا۔ ''جو کہہ رہی ہوں، وہ کرو۔ بڑی ہوں میں تم سے! میری ہر بات مذاق میں نہ اُڑایا کرو۔''

ماہ زیب کے لہجے کی سختی سے مسعود افسردہ ہو کر کمرے سے چلا گیا۔

ماہ رخ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماہ زیب اسے بہلانے لگی لیکن اب اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس نے مسعود سے بہت سخت لہجے میں بات کی تھی اور ایسا پہلی بار ہوا تھا۔

ماہ رخ کو بہلانے کے بعد ماہ زیب گھر کے کام کاج میں لگی مگر اس کا دماغ مسعود میں الجھا رہا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے مسعود سے بہت سخت لہجے میں بات کی ہے۔ مسعود کا افسردہ چہرہ بار بار اس کے تصور میں ابھرتا رہا۔ وہ رہ نہ سکی اور ماہ رخ کو گود میں اٹھا کر مسعود کے کمرے میں پہنچی۔

مسعود نے سر اٹھا کے اس کی طرف دیکھا۔

''کوئی کام ہے بھابی جان!'' اس نے سنجیدگی سے

پوچھا۔

''ہاں۔'' ماہ زیب مسکراتی ہوئی اس کے قریب بیٹھ گئی۔

مسعود سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

ماہ زیب سنجیدہ ہوگئی اور بولی۔''بہت بڑے ہوگئے ہو اب تم! ذرا سا سخت لہجے میں بات کی تو ناراض ہوکر چلے آئے!''

''نہیں تو بھابی جان!'' مسعود نے جلدی سے کہا۔''میں تو آپ سے ناراض ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔''

''اب بھی تمہارا چہرہ کہہ رہا ہے کہ خوش نہیں ہو۔لو، سنبھالو اپنی گڑیا!'' ماہ زیب نے ماہ رخ کو اس کی گود میں بٹھادیا۔''نہ کرو امتحان کی تیاری۔''

''گڑیا سے میری تیاری میں کوئی فرق نہیں پڑسکتا بھابی جان!'' مسعود نے خوش ہوکر ماہ رخ کو پیار کیا۔''بلکہ یہ میرے قریب نہیں ہوگی تو تیاری نہیں کرسکوں گا۔ میں اس ایک گھنٹے میں ذرا بھی نہیں پڑھ سکا۔ آخر پہلے بھی میں امتحان دیتا رہا ہوں اور گڑیا میرے ساتھ رہی ہے۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔ یہ کھلونوں میں لگی رہتی تھی۔ اب اس کی زبان بہت چلنے لگی ہے۔ یہ تمہارا دماغ کھائے گی تو کیا خاک پڑھو گے؟''

''یہ میرا کہنا مانتی ہے بھابی جان! میں اس سے کہہ دوں کہ یہ چپ رہے تو یہ چپ رہے گی۔ کیوں گڑیا؟'' مسعود نے ماہ رخ سے پوچھا۔

ماہ رخ نے ماہ زیب کی طرف دیکھ کر کہا۔''میں تو چچان کی ہر بات مانتی ہوں امی۔''

ماہ رخ کو اب ''چچان'' کہنے کی عادت پڑ چکی تھی۔

ماہ زیب دھیرے سے ہنس دی پھر مسعود کی طرف دیکھ کر بولی۔''دو ایک سال بعد میں بھی تمہارا امتحان لوں گی جب شادی کے بعد باپ بنو گے نا، تب دیکھوں گی کہ تم اپنے بچوں سے زیادہ محبت کرو گے یا اپنی اس گڑیا سے!''

''یہ بھی دیکھ لیجیے گا بھابی جان! ویسے ابھی دو چار سال تک میرا کوئی ارادہ نہیں ہے شادی کا!''

''اتنے عرصے تک تو تمہیں آزاد نہیں چھوڑا جائے گا گڈے میاں!''

مسعود ہنس پڑا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ماہ زیب نے اسے ''گڈے میاں'' کہا تھا۔

''یہ اچھا لگا بھابی جان!'' وہ بولا۔''آپ مجھے گڈے میاں ہی کہا کیجیے!''

ماہ زیب ہنسی۔''لڈو میاں نہ کہا کرو؟''

''نہیں۔'' مسعود بھی ہنسا۔''گڈے میاں ہی ٹھیک رہے گا۔''

ماہ زیب کھڑی ہوگئی۔''اچھا مجھے تو گھر کے کچھ کام دیکھنا ہیں۔اب تم جانو اور تمہاری گڑیا!''

مسعود نے ماہ رخ سے کہا۔''گڑیا! تم دوڑ کر اپنی کتابیں تو لے آؤ۔!''

''ابھی لائی چچان!'' ماہ رخ نے کہا اور دوڑتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ وہ خوش ہوگئی تھی۔

ماہ زیب بولی۔''اب اسے پڑھاؤ گے یا خود پڑھو گے؟''

''کوئی سبق دے دوں گا اسے۔'' مسعود نے کہا۔''میں اپنی پڑھائی کرتا رہوں گا، وہ اپنا سبق یاد کرتی رہے گی۔''

مسعود نے ماہ رخ کو اسی وقت سے پڑھانا شروع کردیا تھا جب اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلنے لگے تھے۔ مسعود کے اس خیال سے مشہود نے بھی اتفاق کیا تھا کہ ماہ رخ کو ابتدائی تعلیم گھر پر ہی دی جائے۔ مسعود نے کہا تھا کہ ماہ رخ آٹھ سال کی عمر تک اس قابل ہوجائے گی پھر اسکول میں داخل ہونے کے بعد کم عمری ہی میں میٹرک کرلے گی۔

مسعود نے اپنے امتحان کی تیاری اس طرح کی کہ ماہ رخ اس کے قریب بیٹھی اپنا سبق یاد کرتی رہتی تھی۔

مسعود کے پرچے ختم ہوگئے تو مشہود نے اس سے کہا۔''اب تم میرے ساتھ دفتر چلنا شروع کردو۔''

''ابھی سے بھائی جان؟'' مسعود بولا۔''میرا نتیجہ تو آجانے دیں!''

''آجائے گا وہ بھی، پاس بھی ہوجاؤ گے تم...... مجھے یقین ہے۔ آٹھویں کلاس سے اب تک تم کبھی فیل نہیں ہوئے۔''

''لیکن دفتر......!''

''ابھی بس ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے چلے چلا کرو۔'' مشہود نے کہا۔''آہستہ آہستہ وقت بڑھانا۔ مجھے اندازہ ہے تمہارے مزاج کا۔ باقاعدگی سے دفتر جانے کی عادت پڑنے میں کچھ وقت لگ جائے گا تمہیں!''

ماہ زیب نے ہنس کر مسعود سے کہا۔''گڑیا سے دور رہنے کی عادت ڈالنے کے لیے بھی تو تمہیں کچھ وقت چاہیے۔''

''اس کا ایک اہم پہلو بھی ہے مسعود!'' مشہود نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ ابا جان کو اب گھر بٹھا دیا جائے اور کاروبار ہم دونوں سنبھالیں۔ ابا جان اب تھکے تھکے سے نظر آنے لگے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم دونوں اب انہیں آرام کرنے دیں۔''

''مجھے بھی تو ابھی ایک مہینے آرام کر لینے دیں۔'' مسعود نے مسمسی صورت بنائی۔ مشہود نے اسے گھور کر دیکھا پھر ماہ زیب سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اب تم ہی سمجھاؤ اپنے لاڈلے کو!''

پھر وہ کمرے سے چلا گیا۔

''گڈے میاں!'' ماہ زیب نے مسعود کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ مسکرا کر پچکارنے والے انداز میں کہا۔ ''بڑے بھائی کی بات ماننا چاہیے تمہیں!''

مسعود نے منہ بنایا۔ ''ہاں، اب آپ بھی انہی کی طرف داری کیجیے! گھٹنا تو پیٹ ہی کی طرف جھکے گا نا!''

ماہ زیب ہنس پڑی۔ ''تم زیادہ قریبی گھٹنا ہو مشہود کا!''

مسعود نے جواب دینے کے بجائے ماہ رخ کا ہاتھ پکڑا۔ ''چلو گڑیا! کیرم بورڈ کھیلتے ہیں چل کر!''

ماہ رخ خوشی خوشی اس کے ساتھ جانے لگی۔ ماہ زیب مسکراتی ہوئی انہیں جاتے دیکھتی رہی۔

دوسرے دن سے مسعود نے بینائی صاحب اور مشہود کے ساتھ دفتر جانا شروع کر دیا اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بجائے لنچ تک دفتر میں رہنے لگا۔ اتنا وقت وہ اپنی ''گڑیا'' سے دور رہ کر کالج میں گزارا ہی کرتا تھا۔

بی اے میں مسعود نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ ماہ زیب نے اس خوشی میں گھر پر باقاعدہ جشن منایا۔ اسی دن اس نے مسعود کو چھیڑا۔

''تمہارے لیے ایک لڑکی دیکھ لی ہے میں نے!''

''ہرگز نہیں۔'' مسعود ایک دم بولا۔ ''یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ دو چار سال تک ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''دو چار میں سے چار گھٹا دو۔'' ماہ زیب نے مسکرا کر کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ بس دو سال کی مہلت دی جا سکتی ہے تمہیں!''

''چلیں دو سال تو گزارنے دیں پھر دیکھا جائے گا۔''

شاید مسعود نے سوچا ہوگا کہ دو سال بعد پھر کوئی اڑنگا لگا دے گا۔

دو ماہ بعد بینائی صاحب کو گھر بٹھا دیا گیا۔ مسعود نے باقاعدگی کے ساتھ مشہود کے ساتھ دفتر جانا اور اسی کے ساتھ واپس آنا شروع کر دیا تھا۔

''یہ تمہاری بدولت ہوا ہے، دلہن!'' بینائی صاحب نے ماہ زیب سے کہا۔ ''مشہود کی بات تو مسعود اتنی جلدی نہیں مانتا۔''

''ایسا نہیں ہے ابا جان!'' ماہ زیب نے کہا۔ ''بڑے بھائی کی بہت عزت ہے مسعود کے دل میں!''

''لیکن اس سے زیادہ وہ تمہاری عزت کرتا ہے۔ جب بھی اس سے میری کوئی بات ہوئی ہے تو تمہارا ذکر کرتے ہوئے اس کے لہجے میں احترام ہی کا جذبہ پایا ہے میں نے!''

اسی وقت عقیقہ بیگم نے بہ ظاہر سپاٹ سے لہجے میں کہا۔ ''ان سے چھیڑ چھاڑ بھی خوب رہتی ہے اس کی۔''

بینائی صاحب نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تو ہر جگہ ہوتا ہے عقیقہ بیگم! دیور بھاوج کا رشتا ہی ایسا ہے۔''

وہ تینوں اس وقت لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہیں ماہ رخ قالین پر کھلونا ٹرین کی پٹری بچھا رہی تھی۔ ٹی وی سے خبریں نشر ہو رہی تھیں۔ بینائی صاحب نے بات اس وقت چھیڑی تھی جب خبرنامے میں موسم کے بارے میں بتایا جانے لگا تھا۔

''چلو اب بند کر دو ٹی وی!'' بینائی صاحب نے ماہ زیب نے کہا۔ ''ہاں اگر تم دیکھنا چاہو تو دیکھو۔ میں تو اب جا کے ذرا لیٹوں گا۔ کیوں عقیقہ بیگم! آپ کا کیا ارادہ ہے؟''

''مجھے کپڑوں کی الماری صاف کرنا ہے۔'' عقیقہ بیگم کھڑی ہو گئیں۔

ماہ زیب نے ٹی وی بند کرنے کے لیے اپنے قریب رکھا ہوا ریموٹ اٹھایا ہی تھا کہ ٹی وی سے وہ مخصوص موسیقی سنائی دی جو کسی ''تازہ ترین'' خبر سے پہلے سنوائی جاتی ہے۔

''ٹھہرو، ٹھہرو!'' بینائی صاحب نے ماہ زیب کو ٹی وی بند کرنے سے روکا۔ ''ذرا سن لیں، کیا خبر آ رہی ہے۔ ویسے یہ پرائیویٹ چینلز چھوٹی موٹی خبروں کو بھی اسی طرح دیتے ہیں جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔''

لیکن اس وقت ٹی وی نے جو خبر نشر کی وہ کوئی چھوٹی موٹی خبر نہیں تھی۔ شہر کے ایک بڑے ہوٹل کے دروازے کے قریب زوردار دھماکا ہوا تھا۔ ابتدائی طور پر دو آدمیوں کی ہلاکت اور آٹھ آدمیوں کے زخمی ہونے کی اطلاع کے ساتھ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ اس تعداد میں اضافے کا امکان ہے۔

☆☆☆

مسعود نے وہ خبر اپنے دفتر میں سنی اور اس کے پسینے چھوٹ گئے، پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی اور دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

صرف آدھے گھنٹے پہلے کی بات تھی جب مشہود اپنے ایک کاروباری ملاقاتی کو کھانا کھلانے کے لیے اسی ہوٹل میں لے گیا تھا جس کے قریب دھماکا ہوا تھا۔ اس کاروباری شخصیت کا چیف اکاؤنٹنٹ بھی ساتھ گیا تھا۔

مسعود نے اپنا موبائل اٹھایا۔ اس کے دونوں ہاتھ لرز رہے تھے۔ اس نے مشہود سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔ دوسری طرف موبائل بند تھا۔ مسعود نے اضطراب کے عالم میں کئی بار کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوسکا۔

ایک امکان یہ تو تھا کہ مشہود نے اپنا موبائل بند کردیا ہو کیونکہ کھانے کے دوران میں بھی کچھ اہم کاروباری گفتگو ہونا تھی اور اسی لیے مشہود اپنے ساتھ ایک فائل بھی لے گیا تھا لیکن یہ امکان پیش نظر ہونے کے باوجود مسعود میں صبر کا یارا نہ رہا اور وہ ہوٹل کی طرف جانے کے ارادے سے دفتر سے نکل پڑا۔

گھر میں تین کاریں ہونے کے باوجود دونوں بھائی ساتھ ہی دفتر آتے جاتے تھے، اس لیے دو کاریں گھر ہی پر رہتی تھیں۔ مسعود کو اس وقت وہ سوزوکی استعمال کرنا پڑی جو صرف دفتری کام کاج کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ وہ نہایت تیز رفتاری سے روانہ ہوا۔ اس رفتار سے وہ پندرہ منٹ سے بھی کم وقت میں ہوٹل پہنچ جاتا لیکن اس سڑک پر وہ ٹریفک میں پھنس گیا جو سیدھی اس ہوٹل ہی کی طرف جاتی تھی۔ اس دھماکے کے باعث وہ راستہ بند کردیا گیا تھا، اس لیے ٹریفک جام ہوگیا تھا۔

''لعنت ہے۔'' مسعود ہانپتا ہوا بڑبڑایا اور اس نے موبائل نکال کر ایک بار پھر مشہود سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ناکامی اسے اس بار بھی ہوئی۔

ٹریفک جام ہونے کے علاوہ پیدل آنے جانے والے بھی ہراس و پریشانی میں نظر آرہے تھے۔

مسعود نے سوزوکی وہیں چھوڑی لیکن اس مقفل نہیں کیا تاکہ ٹریفک پولیس کو اسے ہٹانے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ دوسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ پولیس اسے اٹھا کر لے جاتی لیکن اس وقت مسعود کو ایسی کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ وہ کسی طرح فٹ پاتھ پر پہنچا اور ہوٹل کی طرف دوڑنے لگا۔ اس پر وحشت سی طاری تھی لیکن وحشت میں بھی وہ دعا کررہا تھا کہ اس کے بھائی کو کچھ نہ ہوا ہو۔

خبر کے مطابق دھماکا ہوٹل کے دروازے پر لیکن باہر ہی ہوا تھا، اس لیے توقع کی جاسکتی تھی کہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگ اس کے اثرات سے محفوظ رہے ہوں گے لیکن مسعود کو اس وقت تک سکون نہیں مل سکتا تھا جب تک وہ اپنے بھائی کو زندہ سلامت اور صحیح حال میں نہ دیکھ لیتا۔

دوڑتے میں بہت سے خیالات بھی اس کے دماغ میں چکراتے رہے۔ شاید گھر پر بھی سب نے یہ خبر سن لی ہو۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے والد کھانے کے بعد ایک یا دو بجے کی خبریں ضرور سنتے تھے لیکن یہ بات ان کے یا گھر کے کسی بھی فرد کے علم میں نہیں ہوسکتی تھی کہ مشہود اس وقت اس ہوٹل میں ہوگا جہاں دھماکا ہوا ہے۔

دوڑتے ہوئے اردگرد کے لوگوں کی آوازیں بھی مسعود نے کان میں پڑتی رہیں۔ کسی کے خیال کے مطابق وہ پلانٹڈ بم کا دھماکا تھا اور کوئی اسے خودکش واردات قرار دے رہا تھا۔ ایمبولینس اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن بھی سنائی دے رہے تھے۔

مسعود کو ہوٹل سے کچھ فاصلے پر رکنا پڑا۔ پولیس نے وہاں گھیرا ڈال کر لوگوں کو آگے جانے سے روک دیا تھا۔ وہاں شوروشین کی آوازیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ یہ لوگ تھے جنہیں شبہ یا یقین تھا کہ ان کا کوئی پیارا بھی اس سانحے کی زد میں آیا ہوگا۔ ان لوگوں میں کچھ عورتیں بھی تھیں۔

بہ مشکل مسعود کو معلوم ہوسکا کہ لاشیں اور زخمی دو اسپتالوں میں بھیجے جاچکے تھے۔ وہاں اب صرف پولیس کارروائی جاری تھی۔

مسعود نے وہاں سے واپس دوڑنا شروع کیا۔ دس بارہ منٹ گزر چکے تھے۔ ٹریفک اب جام نہیں تھا۔ مسعود کی سوزوکی سڑک کے کنارے لگادی گئی تھی۔ دو ٹریفک کانسٹیبل بھی وہاں موجود تھے۔ وہ مسعود پر بگڑ گئے کہ وہ اپنی گاڑی بیچ سڑک پر چھوڑ گیا تھا۔

مسعود نے اپنی بپتا سنانے یا بحث میں وقت ضائع کرنے کی بجائے چالان کروالیا اور سوزوکی میں بیٹھ کر ان اسپتالوں میں سے ایک کی طرف روانہ ہوا جہاں لاشیں یا زخمی بھیجے گئے تھے۔ یکایک اسے کچھ خیال آیا تو اس نے سوزوکی سڑک کے کنارے روک کر موبائل پر ایک بار پھر مشہود سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ ناکام ہونے کے بعد اس نے دفتر سے رابطہ کرکے مشہود کی سیکریٹری سے بات کی۔ اسے معلوم ہوا کہ مشہود ابھی تک واپس نہیں پہنچا تھا۔

مسعود کو خیال آیا کہ گھر پر فون کر کے بھی پوچھ لے مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کی دانست میں یہ امکان ایک فیصد بھی نہیں تھا کہ مشہود گھر چلا گیا ہو۔ ایسی صورت میں وہ گھر فون کر کے ان لوگوں کو بھی پریشانی میں ڈال دیتا۔ بہتر یہی تھا کہ جب تک وہ خود کچھ معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہو، گھر والوں سے رابطہ نہ کرے۔

موبائل جیب میں ڈال کر وہ سوزوکی پھر حرکت میں لے آیا۔ جب وہ اسپتال پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں بھی لوگ معلومات حاصل کرنے کے لیے جمع تھے۔ فوری طور پر انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں دی جارہی تھی۔ اس کا جواز یہ بتایا جارہا تھا کہ لوگ اندر داخل ہوں گے تو ان کی ہڑبونگ سے ڈاکٹروں کے کام میں خلل پڑے گا جو زخمیوں کو طبی امداد پہنچارہے تھے۔

''تو ایک ایک آدمی کو اندر جانے دیجیے!'' مسعود ایک سب انسپکٹر سے الجھ گیا۔

سب انسپکٹر نے تحمل سے جواب دیا۔ ''پہلے کسے بھیجیں؟ ہر شخص یہ چاہے گا کہ پہلے اسے بھیجا جائے!''

مسعود نے جھلا کر کہا۔ ''تو کب تک روکا جائے گا ہمیں؟''

''جب تک اسپتال کی اندرونی صورتِ حال معمول پر نہ آجائے!''

''کب تک معمول پر آئے گی؟'' مسعود کی جھلاہٹ میں اضافہ ہوا۔

''یہ تو ڈاکٹرز ہی بتا سکتے ہیں۔'' سب انسپکٹر نے اپنا تحمل برقرار رکھا۔

''تو ڈاکٹرز سے پوچھ کر آیئے نا آپ!''

''دیکھیے جناب!'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آپ کے دل پر بلکہ یہاں جمع ہونے والے سبھی لوگوں پر کیا بیت رہی ہوگی لیکن آپ کو صورتِ حال کی نزاکت سمجھنا چاہیے۔ آپ پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔''

سب انسپکٹر کی تحمل مزاجی سے مسعود کی جھلاہٹ کچھ کم ہوئی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹتا ہوا بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ دفعتاً اسے ایک خیال آیا۔ وہ چونک کر دوبارہ سب انسپکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔

''جہاں دھماکا ہوا تھا، وہاں کاریں بھی تھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میں وہاں نہیں گیا....'' سب انسپکٹر نے جواب دیا۔ ''لیکن میرے علم میں آیا ہے کہ وہاں چند گاڑیاں بھی تباہ ہوئی ہیں۔ دھماکا بھی ایک گاڑی میں ہوا ہے۔''

مسعود تیزی سے مڑا۔ اسے خود پر غصہ بھی آیا۔ اسے جائے واردات پر ہی کسی سے کار کے بارے میں پوچھنے کی کوشش کرنا چاہیے تھی۔

سوزوکی میں وہ برق رفتاری سے جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ پولیس نے اب بھی گھیرا ڈال رکھا تھا اور لوگوں کو آگے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں اب لوگوں کی تعداد بھی کم تھی۔ سبھی غالباً اسپتالوں کا رخ کر چکے تھے۔

مسعود نے ایک کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''یہاں کاریں بھی تباہ ہوئی ہیں؟''

''ہاں۔'' کانسٹیبل اسے گھورنے لگا۔

مسعود نے کار کا نمبر بتاتے ہوئے پوچھا کہ اس نمبر کی کوئی کار تو نہیں تھی وہاں؟

کانسٹیبل نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''اتنی جلدی یہ سب کچھ نہیں معلوم ہوسکتا!''

کچھ فاصلے پر ایک ڈی ایس پی اپنے کچھ ماتحتوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ چونک کر مسعود کی طرف دیکھنے لگا پھر وہیں کھڑے کھڑے اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ ''کیا نمبر بتایا آپ نے؟''

مسعود نے جلدی سے نمبر دہرایا۔

ڈی ایس پی نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا کہ وہ مسعود کو آگے آنے دے۔

مسعود جھپٹ کر ڈی ایس پی کے پاس پہنچ گیا۔

''اس نمبر کی کوئی کار تباہ ہوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرے ساتھ آیئے!'' ڈی ایس پی کہتے ہوئے مڑا۔

مسعود نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس کے ساتھ قدم بڑھائے۔

''آپ کا نام؟'' ڈی ایس پی نے پوچھا۔

''مسعود۔'' اس نے جواب دیا۔

''جو نمبر آپ نے بتایا ہے، وہ کس کی کار ہے؟''

''ہمارے گھر کی ہے۔''

''میرا مطلب ہے، اس کار میں یہاں کون آیا تھا؟''

''میرے ..... میرے بڑے ..... بھائی .....'' مسعود کی آواز اس کے حلق میں اٹکنے لگی۔

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ یہاں آئے تھے؟''

''مجھے..... بتا کر آئے تھے۔''

ان چند جملوں کی گفتگو کے دوران وہ دونوں اس ہوٹل کے احاطے میں داخل ہوگئے جہاں تباہی و بربادی پھیلی ہوئی تھی۔ جلی ہوئی کاریں اور موٹر سائیکلیں...... بعض جگہ سے اب بھی دھواں اٹھ رہا تھا۔ بعض گاڑیاں مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھیں۔ کچھ گاڑیوں کو کم نقصان پہنچا تھا۔ بعض کے صرف شیشے ٹوٹے تھے۔ زمین پر جگہ جگہ خون پھیلا تھا۔

ہوٹل کا صدر دروازہ بھی تباہ تھا۔ مسعود نے دیکھا کہ دھماکے کے اثرات ہوٹل کے اندر تک پہنچے تھے۔ کچھ میز کرسیوں کی حالت اس کی غمازی کررہی تھی۔

احاطے میں پولیس کے آدمی جگہ جگہ کسی نہ کسی کارروائی میں مصروف تھے۔

ڈی ایس پی جس جگہ رکا، وہاں کھڑی ہوئی ایک کار اس طرح تباہ ہوئی تھی کہ اس کا ڈھانچا بھی صحیح سلامت نہیں رہا تھا۔

''دھماکا اس گاڑی میں ہوا تھا۔'' ڈی ایس پی نے بتایا۔

قرب وجوار میں کھڑی ہوئی کاریں بری طرح تباہ ہوئی تھیں۔ ڈی ایس پی نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ''ان میں سے کسی کو پہچان سکتے ہیں آپ؟''

''کیا یہ...... اس قابل ہیں؟ انہیں پہچانا جاسکتا ہے؟''

''یہ؟'' ڈی ایس پی نے خصوصاً ایک طرف اشارہ کیا۔

اس تباہ شدہ کار کا رنگ سیاہ پڑ چکا تھا لیکن بعض جگہ سیاہی مائل نیلے دھبے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ غائب تھا۔ اسٹیئرنگ کی حالت ایسی تھی جیسے اسے کسی آہنی شکنجے نے توڑ مروڑ ڈالا ہے۔ نشستوں کے گدے بالکل جل چکے تھے۔

مسعود کے دل کی دھڑکنیں بہت تیز ہوگئیں اور وہ ہیجانی انداز میں بولا۔ ''اس میک کی کاریں تو یہاں اور بھی ہوں گی۔''

''جی ہاں۔ ایک اور بھی ہے۔'' ڈی ایس پی نے غور سے مسعود کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مسعود پھر بولا۔ ''اور دھماکے کے وقت تو بھائی جان ہوٹل میں ہوں گے۔''

ڈی ایس پی جواب دینے کے بجائے پھر ایک طرف مڑا۔ ''میرے ساتھ آئیے!''

مسعود نے چلتے چلتے اس کار کی نمبر پلیٹ دیکھنا چاہی۔ آگے کی پلیٹ تو اس طرح تباہ ہوئی تھی کہ اس کا نمبر غائب ہو چکا تھا اور پچھلی طرف کی نمبر پلیٹ غائب تھی۔

اس مرتبہ ڈی ایس پی، مسعود کو ہوٹل میں لے گیا۔ داخلے کے لیے اس نے صدر دروازے کے بجائے ایک اور راستہ استعمال کیا تھا۔

منیجر کے کمرے میں پولیس کے لوگ نظر آئے۔ پولیس نے اپنا مرکز تفتیش یا ہیڈ کوارٹر اسی کمرے کو بنا رکھا تھا۔

''تشریف رکھیے!'' ڈی ایس پی نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ مجھے کچھ بتا کیوں نہیں رہے ہیں؟'' مسعود چیخ پڑا۔

وہاں پولیس کے جو لوگ تھے، سبھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

ڈی ایس پی بولا۔ ''آپ اس کار کے نمبر اور اپنے بھائی کے حوالے سے اپنا بیان قلم بند کروا دیجیے!''

مسعود پھر پاگلوں کی طرح چیخ پڑا۔ ''میرا بھائی کہاں ہے ڈی ایس پی؟''

''دیکھیے مسٹر مسعود!'' ڈی ایس پی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔ ''اس کار کے بارے میں ہمارے پاس ایک عینی شاہد کا بیان موجود ہے۔ قریب کی ایک اور عمارت کی دوسری منزل پر ایک شخص کھڑا تھا جب دھماکا ہوا' اس کا بیان ہے جس وقت دھماکا ہوا، کوئی شخص اس کار کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول چکا تھا۔ ضروری نہیں ہے کہ وہی آپ کے بھائی ہوں لیکن......''

''بھائی جان اکیلے نہیں تھے۔'' مسعود جلدی سے بول پڑا۔

ڈی ایس پی نے اپنی بات پوری کی۔ ''لیکن اس کار کا نمبر وہی ہے جو آپ نے بتایا ہے... نہ جانے کیسے نمبر پلیٹ اس قابل رہ گئی کہ اس کے نمبر پڑھے جاسکتے ہیں۔ وہ ٹوٹ کے جھول ضرور گئی تھی۔ اب وہ ہماری تحویل میں ہے۔''

''بھائی جان اکیلے نہیں تھے ڈی ایس پی صاحب!'' مسعود کی آواز بری طرح بھرا گئی اور آنکھیں نم ہوگئیں۔

''اسی لیے میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ آپ کے بھائی کی لاش ہوگی۔'' ڈی ایس پی نے کہا ''ہوسکتا ہے وہ کوئی اور ہو۔ ممکن ہے آپ کے بھائی صرف زخمی ہوئے ہوں۔ اس بارے میں چھان بین کر کے ہی آپ کو کچھ بتایا جائے گا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنا بیان قلم بند کروا دیں۔ اس طرح ہمیں تفتیش میں آسانی ہوجائے گی اور یہ بھی ہوسکتا ہے مسٹر مسعود کہ وہ کسی وجہ سے کار یہیں چھوڑ کر گھر چلے گئے

ہوں۔"
"کار چھوڑ کر وہ کیوں جائیں گے؟" مسعود کی کانپتی ہوئی آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی تھی۔
"کبھی کبھی کچھ بھی ہو جاتا ہے مسٹر مسعود!" ڈی ایس پی نے کہا۔ "ممکن ہے کسی وجہ سے انہوں نے اپنی کار کسی اور کو دے دی ہو۔ وہ خود کسی اور کے ساتھ چلے گئے ہوں۔"
مسعود سوچنے لگا، ہاں یہ ممکن تو ہے۔ مشہود جس شخص کو کھانا کھلانے لایا تھا، وہ کسی دوسرے شہر سے آیا تھا اور اسے یہاں دو دن رکنا تھا۔ شاید مشہود نے کار اخلاقاً اسے دے دی ہو اور خود ٹیکسی میں یا اتفاقاً مل جانے والے کسی شناسا کی کار میں یہاں سے چلا گیا ہو۔
یہ ساری سوچ "تنکے کا سہارا" کے مصداق تھی۔ مشہود دھماکے سے صرف آدھے گھنٹے پہلے دفتر سے روانہ ہوا تھا۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد وہ اتنی جلدی وہاں سے رخصت نہیں ہو سکتا تھا۔
ڈی ایس پی کے کہنے پر مسعود نے آس باندھی اور اپنا موبائل نکال کر دفتر رابطہ کیا۔ اسے خیال تھا کہ مشہود واپس جائے گا تو دفتر جائے گا۔ ابھی گھر جانے کا وقت نہیں ہوا تھا۔
دفتر سے معلوم ہوا کہ مشہود وہاں واپس نہیں پہنچا ہے۔ شاید کسی وجہ سے گھر ہی چلے گئے ہوں، مسعود نے سوچتے ہوئے گھر رابطہ کیا۔
یہ بھی بس اپنی آس بندھانے والی بات تھی۔ مشہود کو گھر واپس جانا ہوتا تو دفتر فون کر کے اپنی سیکریٹری کو ضرور اطلاع دیتا۔
ٹیلی فون کا ریسیور مینائی صاحب نے اٹھایا۔
"ابا جان!" مسعود نے پوچھا۔ "بھائی جان ہیں گھر پر؟"
"گھر پر!" مینائی صاحب کے لہجے میں حیرت تھی۔ "اسے اس وقت گھر پر ہونا چاہیے یا دفتر میں؟ اور تم اس وقت کہاں ہو؟"
"میں... میں کہیں... میں کہیں اور ہوں۔"
"اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"
"آپ نے... خبریں سنیں؟"
"ہاں وہ کہیں دھماکا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں خبریں اس وقت بھی جاری ہیں۔ کیا تم وہیں ہو؟ خیریت تو ہے؟"
"جی وہ...... میں ...... میں یہاں بھائی جان کو تلاش کر رہا ہوں۔"
"وہاں؟" مینائی صاحب چیخ اٹھے۔
"جی۔" مسعود کی آواز زیادہ کانپنے لگی۔ "وہ یہاں کھانا کھانے آئے تھے۔ مجھے بتا کر نکلے تھے دفتر سے۔"
مسعود پچھتایا کہ وہ کیوں گھر پر فون کر بیٹھا تھا۔
"اب مشہود کہاں ہے؟" مینائی صاحب نے تیزی سے پوچھا۔
"میں یہاں انہی کو تلاش کر رہا ہوں۔"
"اوہ، خدا!" مینائی صاحب کی آواز ایسی تھی جیسے ان کی جان نکلنے لگی ہو۔
"کیا ہوا ابا جان؟" مسعود نے ماہ زیب کی گھبرائی ہوئی آواز سنی۔ اب مسعود کی بھی جان نکلنے لگی۔ ماہ زیب سے بات کرنا اس کے لیے اور مشکل ہوتا۔ اضطراری طور پر اس نے موبائل بند کر دیا۔
"غالباً وہ گھر بھی نہیں پہنچے۔" ڈی ایس پی نے مسعود کی باتوں سے اندازہ لگا کر کہا۔ "بہر حال آپ اپنا بیان قلم بند کروا دیں اور اپنے گھر چلے جائیں۔ پولیس دو ڈھائی گھنٹے بعد آپ سے رابطہ کرے گی۔ عین ممکن ہے کہ آپ کو پھر بلایا جائے۔"
"میں کہیں نہیں جاؤں گا۔" مسعود نے ہیجانی انداز میں کہا۔ "آپ بیان لکھ لیں میرا۔ جاؤں گا میں اس وقت تک نہیں جب تک آپ مجھے میرے بھائی کے بارے میں کچھ بتا نہیں دیتے۔"
ڈی ایس پی نے اس کی طرف ہمدردی اور تشویش سے دیکھا۔

☆☆☆

گھر پر مسعود کی کال ٹی وی لاؤنج ہی کے ٹیلی فون پر ریسیو کی گئی تھی۔ ماہ زیب اور نفیسہ بیگم صوفوں ہی پر بیٹھی رہی تھیں لیکن مینائی صاحب کے منہ سے مشہود کا نام سن کر وہ دونوں چونک پڑی تھیں۔ ماہ زیب تو اٹھ کر تیزی سے مینائی صاحب کی طرف گئی تھی اور اس وقت اس کی آواز دوسری طرف مسعود نے سنی تھی۔
مینائی صاحب کو تو ایسا لگا تھا جیسے ان کی ٹانگوں کی جان نکلنے لگی ہو۔ ان سے کھڑا نہیں رہا جا سکا تھا اور وہ فرش پر بیٹھ گئے۔
"کس کا فون ہے ابا جان؟" ماہ زیب نے جلدی سے پوچھا۔
"مسعود کا۔" مینائی صاحب نے بہ مشکل جواب دیتے ہوئے ریسیور ماہ زیب کی طرف بڑھا دیا۔

اس وقت عتیقہ بیگم بھی گھبرائی ہوئی قریب آئیں۔

"کیا ہوگیا؟" وہ ہانپنے لگیں۔

ماہ زیب انہیں جواب دینے کے بجائے ماؤتھ پیس میں بولی۔ "ہیلو! مسعود!"

فوراً ہی اسے معلوم ہوگیا کہ لائن ڈسکنکٹ ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ چیخ پڑی۔ "مسعود!"

ظاہر ہے کہ اسے جواب نہیں مل سکتا تھا۔ ماہ زیب کی ایک انگلی جلدی جلدی ڈائل گھمانے لگی۔ وہ مسعود سے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔

"کیا ہوگیا ہے مشہود کو؟" عتیقہ بیگم نے ہراساں لہجے میں بینائی صاحب سے پوچھا۔

بینائی صاحب ہمت کر کے آہستہ آہستہ کھڑے ہورہے تھے۔

ماہ رخ اب چار سال کی ہو چکی تھی۔ اس نے بھی محسوس کرلیا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ اپنی کھلونا ٹرین چھوڑ کر ان تینوں کے قریب پہنچ گئی۔

"مسعود نے اپنا موبائل ہی بند کردیا ہے۔" ماہ زیب حواس باختگی کے عالم میں بینائی صاحب کی طرف دیکھنے لگی جو ہمت کر کے کھڑے ہو چکے تھے۔

"آپ بتاتے کیوں نہیں؟" عتیقہ بیگم نے ان کا شانہ پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ "کیا بتایا ہے مسعود نے؟"

"مشہود وہیں تھا!" بینائی صاحب نے پھٹی پھٹی سی آواز میں کہا۔

"کہاں؟" ماہ زیب چیخی۔ "جہاں دھماکا ہوا ہے؟"

عتیقہ بیگم کو چکر آگیا اور وہ خود کو بہ مشکل سنبھال سکیں۔

خود بینائی صاحب کی حالت تو غیر ہو چکی تھی مگر انہوں نے عتیقہ بیگم اور ماہ زیب سے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ خدا نخواستہ کوئی ویسی خبر نہیں ملی ہے مشہود کے بارے میں! انشاء اللہ ہمارا بیٹا ٹھیک ہوگا۔ مسعود وہاں پہنچ گیا ہے۔"

"تو موبائل کیوں بند کردیا مسعود نے؟" ماہ زیب نے ہراس کے عالم میں پوچھا۔

"بند نہیں کیا ہوگا۔" بینائی صاحب نے کہا۔ "بند ہوگیا ہوگا اتفاق سے!"

ریسیور اب بھی ماہ زیب کے ہاتھ میں تھا۔ وہ جلدی جلدی پھر ڈائل گھمانے لگی۔

بینائی صاحب نے خود کو سنبھالنے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور اب عتیقہ بیگم کو سہارا دے کر صوفے کی طرف لے جارہے تھے۔ عتیقہ بیگم کا چہرہ سفید پڑنے لگا تھا۔

"کیا ہوا امی؟" ماہ رخ، ماہ زیب کی ٹانگوں سے لپٹی ہوئی تھی۔

ماہ زیب نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ مسعود کا موبائل بند ملنے کے بعد اس نے مشہود کے موبائل سے رابطہ کرنا چاہا تھا۔ اس میں بھی ناکامی ہونے کے بعد وہ روہانسی ہونے لگی تھی۔ اسی حالت میں اس نے مشہود کے دفتر رابطہ کیا۔ مشہود کی سیکریٹری سے بات کی۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ دھماکے سے آدھے گھنٹے پہلے مشہود اپنے دو مہمانوں کے ساتھ دفتر سے کہیں گیا تھا۔ سیکریٹری کو اس نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد لوٹے گا۔

"ٹیلی فون چھوڑو دلہن!" ماہ زیب کو بینائی صاحب کی آواز سنائی دی۔ عتیقہ بیگم کو ایک صوفے پر بٹھا کر بینائی صاحب اس کے قریب آگئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "یہاں کھڑے کھڑے کب تک فون کرتی رہوگی؟ چلو چل کر وہاں بیٹھو!" ان کا اشارہ صوفے کی طرف تھا۔ "موبائل تو ہے نا تمہارے پاس؟"

"جی۔" ماہ زیب نے تھوک نگلا۔

بینائی صاحب نے دیکھ لیا تھا کہ ماہ زیب کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔

ماہ رخ کو ماں سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ بینائی صاحب سے لپٹ گئی۔ "چچا جان اور پاپا کہاں ہیں دادا جان؟" وہ ان لوگوں کی باتوں میں مشہود اور مسعود کے نام سن چکی تھی۔

"ابھی آجائیں گے بیٹا! ابھی آجائیں گے۔" بینائی صاحب نے اسے جواب دیا۔ اس وقت ان کی حالت قابلِ رحم تھی۔ کوئی ان کی ہمت بندھانے والا نہیں تھا لیکن باقی افراد کو سنبھالنے کا فرض انہی کو سرانجام دینا تھا۔

ماہ زیب ایک صوفے پر بیٹھ کر اب موبائل پر مسعود سے رابطہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھی۔

ٹی وی اب بھی کھلا ہوا تھا۔ خبریں جاری تھیں۔ نیوز ریڈر نے ٹیلی فون پر ڈی آئی جی سے رابطہ کر کے اس سے حادثے کی تفصیلات معلوم کی تھیں۔ اس وقت کسی سوال پر ڈی آئی جی کہہ رہا تھا۔

"اسپتالوں میں ڈاکٹرز بھی ہنگامی طور پر مصروف ہیں اور پولیس بھی جلد از جلد اپنی کارروائی مکمل کرلینا چاہتی ہے۔ بعض زخمیوں اور مرنے والوں کے بارے میں ابھی تک کچھ پتا نہیں چل سکا ہے لیکن جن کے بارے میں پتا چل جائے گا، ان کے ناموں کی فہرست اسپتالوں میں لگا دی جائے گی۔ اس

میں ابھی دو تین گھنٹے اور لگ سکتے ہیں۔''
''یہ تو بہت زیادہ وقت ہے ڈی آئی جی صاحب!'' نیوز ریڈر نے کہا۔ ''متعلقین بہت پریشان ہو چکے ہیں۔''
''ہمیں اس کا پورا پورا احساس ہے۔'' ڈی آئی جی نے جواب دیا۔ ''لوگوں کو ہماری مجبوری سمجھنا چاہیے۔ تمام معلومات حاصل ہو جانے کے بعد ہی اس حادثے کے متاثرین کے ناموں کی فہرست جاری کی جاسکتی ہے۔''
ماہ زیب یکایک اچھلی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی سنائی دی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی ٹیلی فون کی طرف گئی۔ بینائی صاحب، عتیقہ بیگم اور ماہ رخ بھی اس کے پیچھے آئے۔ ماہ زیب نے ریسیور اٹھایا اور چیخنے کے سے انداز میں بولی۔ ''ہیلو!''
''اوہ!'' دوسری طرف سے آنے والی مسعود کی آواز سے ایسا لگا جیسے وہ پریشانی ہو گیا ہو۔ اسے شاید توقع ہو گی کہ ریسیور بینائی صاحب اٹھائیں گے۔
''تم نے موبائل کیوں بند کر دیا تھا؟'' ماہ زیب کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔
''پولیس میرا بیان لکھ رہی تھی بھابی جان!'' مسعود نے جواب دیا۔
''مشہود کہاں ہیں؟''
''ابھی کچھ پتا نہیں چلا ہے۔ دو ڈھائی گھنٹے لگ جائیں گے۔''
''مسعود!'' ماہ زیب نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مشہود تمہارے ساتھ گئے تھے۔ میں اپنا مشہود تم ہی سے لوں گی۔'' ماہ زیب پر وحشت سی طاری ہو گئی۔ ''سن رہے ہونا؟ میں اپنا مشہود تم ہی سے لوں گی۔''
''میں انہیں لیے بغیر گھر نہیں آؤں گا بھابی جان!'' مسعود کی آواز اس کے حلق سے بہ مشکل ہی نکل رہی تھی۔
''اچھا میں خود آتی ہوں وہاں۔'' ماہ زیب نے کہا۔
''نہیں دلہن!'' بینائی صاحب بولے۔ ''تم نہیں جاؤ گی۔''
''مجھے جانے دیں ابا جان!'' ماہ زیب گھگھیائی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔
''نہیں دلہن! یہ مناسب نہیں ہوگا۔ وہاں بہت لوگ جمع ہوں گے۔ ذرا ہمت سے انتظار کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مسعود ہے نا وہاں!'' بینائی صاحب کی آواز رندھ جاتی اگر انہوں نے جدوجہد سے اپنے جذبات قابو میں نہ رکھے ہوتے۔ انہوں نے ریسیور ماہ زیب سے لے لیا اور بولے۔ ''ہاں مسعود! لائن پر ہونا؟''

ماہ زیب دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر روتی ہوئی ایک صوفے پر جا بیٹھی۔ ماں کو روتے دیکھ کر ماہ رخ بھی رونے لگی اور ماہ زیب سے لپٹ گئی۔
''ہم سے رابطہ کرتے رہنا۔'' بینائی صاحب نے مسعود سے کہا اور ریسیور رکھ کر عتیقہ بیگم کا بازو پکڑتے ہوئے بولے۔ ''میں نے آپ سے کہا تھا نہ کہ صوفے پر بیٹھی رہیے!''
عتیقہ بیگم کچھ نہیں بولیں۔ ان کے ہونٹ لرز رہے تھے اور اب ان کی آنکھیں بھی اشک بہانے لگی تھیں۔ بینائی صاحب انہیں سہارا دے کر صوفوں کے قریب لے گئے اور انہیں بٹھاتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''اگر تم سب اسی طرح روتے رہے تو میری ہمت بھی جواب دے جائے گی۔ آخر تم لوگوں نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ مشہود کو کچھ ہو گیا ہے۔ تم دیکھنا، مسعود اسے لے کر ہی آئے گا۔''

☆☆☆

بینائی صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مسعود جب آیا تو اس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو چکی تھیں۔ جب ایمبولینس سے ایک تابوت اتارا گیا تو ماہ زیب ایک لرزہ خیز چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ عتیقہ بیگم کی حالت تو اتنی بگڑی کہ ان کے لیے ایک ڈاکٹر بلانا پڑ گیا۔
ایمبولینس اور پھر وہ شوروشین سن کر آس پاس رہنے والی عورتیں اور مرد بھی گھر میں آ گئے۔ ماہ زیب کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے کر اسے ہوش میں لایا گیا تو بھی وہ حواس میں نہیں آئی۔ اس نے چیخ چیخ کر پوچھنا شروع کر دیا کہ مشہود کا تابوت کہاں رکھا گیا ہے۔ آس پاس رہنے والی عورتیں جمع نہ ہو چکی ہوتیں تو اسے سنبھالنا ممکن نہ ہوتا۔
مسعود ماہ رخ کو لپٹائے آنسو بہا رہا تھا۔
بینائی صاحب سکتے کی سی حالت میں تھے۔ وہ اپنے گرد جمع پڑوسیوں سے بار بار بس ایک ہی جملہ کہے جا رہے تھے۔ ''میرا ایک بازو کٹ گیا۔ میرا ایک بازو کٹ گیا.... میرا ایک......''
ماہ زیب یکایک جھپٹ کر مسعود کے قریب پہنچی اور اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتی ہوئی چیخی۔ ''اس طرح لائے ہو تم میرے مشہود کو؟ اس طرح لائے ہو؟''
مسعود بلک بلک کر رونے لگا۔ ماہ رخ بھی چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔
ڈاکٹر کی وجہ سے عتیقہ بیگم کی حالت سنبھلی تو انہیں خواب آور دوا دے کر سلا دیا گیا تھا۔

کچھ عورتوں نے مسعود کو بہ مشکل ہی ماہ زیب سے چھڑایا تو وہ ایک دیوار سے سر ٹکرانے لگی۔ عورتوں کے لیے اسے سنبھالنا اچھا خاصا مسئلہ بنا۔

گھر میں برپا اس قیامت نے اس وقت اور زور پکڑا جب قبرستان لے جانے کے تابوت اٹھایا گیا۔

''کہاں لے جا رہے ہو میرے مشہود کو؟'' ماہ زیب چیخی۔

''خدا کے لیے بھابی جان! خدا کے لیے!'' مسعود اس کا ہاتھ پکڑ کر گڑگڑایا۔ ''خدا کے لیے خود کو سنبھالیے! خدا کو یہی منظور تھا بھابی جان! صبر کیجیے......'' آنسو اس وقت بھی مسعود کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

دفعتاً ماہ زیب ساکت ہوگئی اور مسعود کو گھورنے لگی۔

''صبر کروں!'' وہ بڑبڑائی۔ اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو جیسے مشینی طور پر رک گئے تھے۔ وہ بولی ''صبر کرلوں؟''

''ہاں بھابی جان!'' مسعود کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔ ''اب ہم سب ہی کو صبر کرنا ہے۔''

''اچھا!'' ماہ زیب کے ہونٹ لرزنے لگے ''مجھے آخری بار ان کا چہرہ تو دکھادو۔''

اس وقت آس پاس کھڑی ہوئی عورتوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انہیں لاش کے بارے میں بتایا جاچکا تھا جو اس قابل نہیں رہی تھی کہ دیکھی جاسکتی۔

''نہیں بھابی جان!'' مسعود نے ماہ زیب کو جواب دیا۔ ''ان کا چہرہ کسی کو بھی نہیں دکھایا گیا۔''

''کیوں نہیں دکھایا گیا؟'' ماہ زیب کے سپاٹ ہو جانے والے چہرے پر وحشت کے آثار پیدا ہوئے۔

اس سوال کا جواب دینا مسعود کے لیے ممکن نہیں تھا۔ خود اس پر غشی طاری ہوگئی تھی جب اس نے لاش دیکھی تھی۔ لاش کیا تھی، لوتھڑے سے آپس میں چپکے ہوئے تھے۔ جسم کے بعض عضو باقی بھی نہیں رہے تھے۔ چہرہ بالکل مسخ تھا۔ سر کے سارے بال جل گئے تھے اور کھوپڑی بھی ایک جگہ سے چٹخ گئی تھی۔ اسے مشہود تسلیم کرنا مسعود کے لیے اس طرح ممکن ہوا تھا کہ لاش کے قریب مشہود کا فاؤنٹین پین ٹوٹا ہوا ملا تھا۔ ایک عینی شاہد کے مطابق دھماکا اس وقت ہوا تھا جب وہ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا۔ نمبر پلیٹ کی وجہ سے یہ بات بھی طے تھی کہ وہ اسی کی کار ہے۔ کار کے اندر کاغذ کے چند جلے ہوئے ٹکڑے ملے تھے جو اسی فائل کے تھے جسے مشہود اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ فائل مسعود کی نظروں سے کئی بار گزر چکی تھی۔

مشہود اکیلا کیوں تھا؟ بس یہ بات مسعود کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ قیاس ہی کیا جاسکتا تھا کہ وہ دونوں ٹیکسی سے چلے گئے ہوں اور کسی وجہ سے کھانے کا پروگرام ختم ہوجانے کے باعث ہوٹل میں گئے ہی نہ ہوں۔ دفتر سے تو تینوں صرف آدھے گھنٹے پہلے نکلے تھے۔ اس لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ کھانا کھا کر ہوٹل سے نکلے ہوں۔

لاش کے جسم پر کپڑے بھی نہیں تھے۔ سب جل کر خاک ہوگئے تھے اور وہ خاک کہیں کہیں جسم سے چپکی رہ گئی تھی۔

ایسی لاش کو دیکھنے کے لیے ماہ زیب کا اصرار مسعود کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ اس کے انکار پر ماہ زیب کی وحشت بڑھی اور اس نے چیخ کر کہا ''میں دیکھوں گی انہیں۔''

پھر وہ پاگلوں کی طرح ان لوگوں کی طرف جھپٹی جو تابوت اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ اس وقت کئی عورتوں نے ماہ زیب کو پکڑا۔ وہ اس وقت اتنی وحشت زدہ ہوگئی تھی کہ دو ایک عورتوں کے تو بس میں آتی ہی نہیں۔

جنازہ اٹھتے وقت عتیقہ بیگم کو بھی سوتا رہنے دیا گیا ''بیٹے کا آخری دیدار'' ماں کے لیے ممکن نہ ہوتا۔

ماہ رخ مسلسل روتے روتے تھک چکی تھی اور اس وقت غشی کی سی حالت میں پڑوس کی ایک لڑکی کی گود میں تھی۔ ماہ زیب کو اپنا ہی ہوش نہیں تھا تو بیٹی کا خیال کیسے آجاتا۔

جنازے کے ساتھ مسعود اور بینائی صاحب بھی چلے گئے۔ گھر میں صرف عورتیں رہ گئیں جو عتیقہ بیگم، ماہ رخ اور ماہ زیب کا خیال رکھ رہی تھیں۔ جب عتیقہ بیگم خواب آور دوا کے اثر سے باہر آئیں تو انہیں بھی بتادیا گیا کہ ان کے بیٹے کی تدفین کی جاچکی ہے۔ اس وقت بینائی صاحب نے ان کی دل جوئی کی حتی المقدور کوشش کی حالانکہ خود ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ان کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ انہیں اپنی اس ذمے داری کا احساس تھا کہ وہ ایک مرد اور اس گھر کے بڑے تھے۔

پڑوس کے لوگوں نے ہر طرح سے بینائی صاحب کے گھر کا خیال رکھا۔ رات کے گیارہ بجے کے بعد ہی وہاں سناٹا ہوا۔ ماہ زیب اپنے کمرے میں بستر کی پشت سے ٹیک لگائے اپنی سیدھی پھیلی ہوئی ٹانگوں پر چادر ڈالے گم صم ایک طرف دیکھے جارہی تھی۔ مسعود وہیں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ ماہ رخ اس کی گود میں سوچکی تھی۔

بینائی صاحب عتیقہ بیگم کے ساتھ تھے۔

جب کسی گھر میں ایسا کوئی سانحہ ہوجائے اور اس کے

بعد سکوت طاری ہو تو گھر کے در و دیوار بھی سوگ میں ڈوبے ہوئے سے لگتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی مسعود کو بھی محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی نظر ماہ زیب کی طرف اٹھتی تو ماہ زیب کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی اس کے دل میں چبھنے لگتی۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ماہ زیب کے دل پر اس وقت کیا گزر رہی ہوگی۔

جب بارہ بجنے لگے تو ماہ زیب کے ساکت چہرے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے مسعود کی گود میں سوئی ہوئی ماہ رخ کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی۔

''مسعود!'' ماہ زیب کی آواز دھیمی تھی لیکن مسعود کو ایسا لگا جیسے اس سکوت میں کوئی دھما کا ہو گیا ہو۔

''جی!......جی بھابھی جان!'' وہ جلدی سے بولا۔

''اب تم بھی جا کر لیٹو۔ ماہ رخ کو میرے قریب لٹادو۔''

''جی بہتر۔''

مسعود نے اٹھ کر ماہ رخ کو بستر پر لٹا دیا اور کمرے سے چلا گیا۔

ماہ زیب نے آہستگی سے ماہ رخ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور بہ زبان خاموشی کہنے لگی ''میری یتیم بچی! اب تم کسے پاپا کہوگی؟''

ماہ زیب کی پلکیں پھر بھیگنے لگیں۔ ہونٹوں میں لرزش پیدا ہوگئی۔ اس نے اپنے ان امنڈتے ہوئے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اسے خود کو سنبھالنا ہی تھا۔ چاہے سسک سسک کر جیے مگر اسے جینا تھا۔ بیٹیوں کی خاطر مائیں اس کے لیے مجبور ہوتی ہیں۔ وہ بھی خود کو مجبور پا رہی تھی ورنہ مشہود کے بعد اس کے لیے زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

مسعود دوبارہ کمرے میں آیا تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ایک جگ میں پانی اور گلاس لے کر آیا تھا۔ وہ اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیے۔ پھر اس نے جیب سے ایک پڑیا نکالی۔ اس میں سے ایک گولی نکال کر۔ گلاس میں پانی بھرا اور دونوں چیزیں ماہ زیب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ گولی کھالیں بھابھی جان!''

ماہ زیب نے سوالیہ نظروں سے مسعود کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی ''خواب آور دوا؟''

''شاید کوئی مسکن چیز ہے۔'' مسعود نے جواب دیا ''ڈاکٹر نے کہا تھا کہ یہ آپ کو سوتے وقت کھلا دی جائے۔''

ماہ زیب نے وہ گولی کسی تذبذب کے بغیر کھالی۔ وہ خود بھی صبح ہونے تک اس قابل ہو جانا چاہتی تھی کہ ماہ رخ کو سنبھال سکے۔ مسعود اسے کب تک لیے پھرتا!

مسعود چلا گیا۔

ماہ زیب نے دل دوز آہ بھرنے کے سے انداز میں ٹھنڈی سانس لی اور نیچے کھسک کر سیدھی لیٹ گئی۔ کبھی کبھی اس کا ہاتھ بے اختیاری میں ماہ رخ پر چلا جاتا۔ وہ اسے اتنی آہستگی سے تھپکتی کہ اس کی آنکھ نہ کھل جائے۔

گولی کھانے کے باوجود ماہ زیب کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ مشہود کے بغیر وہ محسوس کر رہی تھی جیسے کسی اجنبی بستر پر لیٹی ہوئی ہو۔

پھر بہت دیر میں آنکھ لگنے کے باوجود صبح معمول کے مطابق اس کی آنکھ کھل بھی گئی۔

جب آدمی جاگتا ہے تو دو ایک پل کے لیے اس کا شعور پوری طرح بیدار نہیں ہوتا۔ ماہ زیب نے اس کیفیت میں دوسری طرف کروٹ لیتے ہوئے اپنا ہاتھ پھیلایا اور پھر چونک گئی۔ اس کا شعور پوری طرح بیدار ہو گیا تھا۔ اس کا ہاتھ مشہود کے سینے پر نہیں خالی بستر پر تھا۔ اس کے دل سے ہوک سی اٹھی اور پانی بن کر اس کی آنکھوں میں آ گئی۔ شاید وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتی لیکن اس نے دانت پر دانت جما کر خود پر قابو پایا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے رونے کی آواز سن کر ماہ رخ بیدار ہو۔

ماہ زیب کی کیفیت وہی عورتیں سمجھ سکتی ہیں جنہیں اچانک معلوم ہوا ہو کہ وہ بیوہ ہو گئی ہیں۔

ماہ زیب نے خود کو قابو میں رکھتے ہوئے اپنی آنکھیں خشک کیں اور اپنے ہونٹ بڑی آہستگی سے ماہ رخ کے گال پر رکھ دیے۔

یکایک کمرے کے باہر سے کچھ ایسی آوازیں آئیں کہ ماہ زیب کچھ ہڑبڑا کر بستر سے اٹھی۔ جلدی سے آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھولا۔ وہاں اسے بینائی صاحب اور مسعود دکھائی دیے۔

''جاؤ' اپنے کمرے میں جا کر لیٹو۔'' بینائی صاحب نے نرم لہجے میں مسعود سے کہا۔

''کیا ہوا ابا جان؟'' ماہ زیب بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

''یہ'' بینائی صاحب نے ٹھنڈی سانس بھر کر مسعود کی طرف اشارہ کیا ''یہیں فرش پر دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔''

''کیوں مسعود؟'' ماہ زیب نے اس کی طرف دیکھا۔

''رات کو میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنے کمرے میں جاؤ۔''

مسعود اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ وہ آہستہ سے بولا ''مجھے گڑیا کا خیال تھا بھابھی جان! اگر وہ جاگ جاتی تو آپ کو اٹھانے کی کوشش کرتی۔ میں اس کی آواز سن لیتا تو کمرے میں آکر اسے سنبھال لیتا۔''

ماہ زیب کا دل بھر آیا۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولی ''اپنی گڑیا کو اتنی محبت نہ دو مسعود! اسے اب محرومی کی عادت پڑنی چاہیے!''

''ایسی باتیں نہ کرو دلہن۔'' بینائی صاحب جذباتی ہوگئے۔ ''ہمارے ہوتے ہوئے اسے محرومی کا احساس کبھی نہیں ہوگا۔''

مسعود سر جھکائے چلا گیا۔

ماہ زیب نے اپنی آنکھوں کے گوشے خشک کیے اور بولی۔ ''امی صاحبہ کی طبیعت اب کیسی ہے ابا جان؟''

''سو رہی ہیں ابھی تو۔'' بینائی صاحب نے جواب دیا۔ ''میں تمہیں اور گڑیا کو دیکھنے کے لیے اِدھر نکل آیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا ہے کہ تم نے خود کو خاصی حد تک سنبھال لیا ہے۔''

''ماہ رخ کے لیے جینا ہے مجھے ابا جان!'' ماہ زیب نے نظریں جھکالیں۔

''ابھی جاگی نہیں وہ؟''

''جی نہیں میں سوچ رہی تھی کہ وہ جاگ جائے تو امی جان کو دیکھنے آؤں۔''

بینائی صاحب نے شفقت سے ماہ زیب کے سر پر ہاتھ رکھا اور چلے گئے۔ ماہ زیب نے دیکھا کہ اس کی طرف پیٹھ ہو جانے کے بعد وہ اپنی آنکھوں کے گوشے خشک کرنے لگے تھے جو اچانک بھر آئی ہوں گی۔

ماہ زیب افسردہ نگاہوں سے انہیں جاتے دیکھتی رہی پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر کمرے میں آگئی۔

ماہ رخ اب کلبلانے لگی تھی۔

☆☆☆

مشہود کے حواس بے دار ہوئے تو اس نے محسوس کیا جیسے اس کے جسم کے بیشتر حصوں میں آگ بھری ہوئی ہے۔ وہی تپش اس کے چہرے پر بھی تھی۔ اگرچہ وہ اسپتال کا ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے ہوئے تھا لیکن اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے جسم کے بیشتر حصوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ پورا چہرہ اور سر بھی پٹیوں سے خالی نہیں تھا البتہ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھ سکتا تھا اور اس نے جو کچھ دیکھا، وہ فوری طور پر اس کے سمجھ میں نہیں آسکا۔

وہ کسی اسپتال میں تھا۔ جسم میں غذا پہنچانے والی نلکی اس کے حلق میں داخل تھی اور دکھائی دینے والے ایک اسٹینڈ سے خون کی بوتل اور دوسرے اسٹینڈ سے شاید گلوکوز کی بوتل لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے جسم کے کئی حصوں میں سوئیاں پیوست تھیں اور ارد گرد کچھ مشینیں اپنا کام کر رہی تھیں۔

جیسے ہی مشہود نے آنکھیں کھولی تھیں، کمرے میں دو تین افراد کی نقل و حرکت ہوئی تھی۔ کچھ دھیمی آوازیں سنائی دیں۔ مگر الفاظ مشہود کی سمجھ میں نہیں آسکے تھے۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

یہ سب کیا ہے؟ اس کے دماغ میں سوال ابھرنے لگے، کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟ میں اسپتال میں کیوں ہوں؟

معطل دماغ دھیرے دھیرے کام کرنے لگا۔ اسے ایک خوف ناک دھماکا یاد آیا۔ وہ ایک ہوٹل میں تھا۔ دھماکا ہوتے ہی وہ کرسی سمیت کافی اوپر تک اچھل گیا تھا۔ اس کے بعد ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

اب مشہود کو پوری طرح احساس ہوگیا کہ وہ کسی پلانٹڈ یا کسی خودکش دھماکے کی زد پر آگیا تھا۔ شہر میں اس سے پہلے بھی ایسے کئی واقعات ہو چکے تھے۔

مشہود کا دل تھرّا گیا۔ اس قسم کے دھماکوں کی زد پر آنے والوں کی کیا حالت ہوتی ہے، وہ اس سے خوب واقف تھا۔ اس کے چہرے اور جسم پر بندھی ہوئی پٹیوں نے بھی اسے احساس دلا دیا کہ اس کی کیا حالت ہو چکی ہے۔ جسم کی تپش بھی بتا رہی تھی کہ اس کے جسم کا بیشتر حصہ زخمی ہو چکا تھا۔ وہ اس خیال سے لرز گیا کہ اس کا چہرہ بہت بھیانک ہوگیا ہوگا۔

''یہ ابھی نیند ہی کے زیر اثر ہے۔'' اس مرتبہ مشہود کو ایک آواز صاف سنائی دے گئی ''بہرحال اب تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ کوئی ڈاکٹر ہی ہو سکتا تھا۔

''اس کے ورثا میں سے اب تک کوئی نہیں آیا۔ نہ جانے کون ہے یہ بدقسمت!'' یہ نسوانی آواز کسی نرس کی ہو سکتی تھی۔

مشہود نے آنکھیں بند ہی رکھیں۔ اسے ان لوگوں کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ دھماکے کے بعد کیا ہوا تھا۔ اس کے ورثا نے اب تک اس کی خبر نہیں لی تھی۔ اس کا سبب اسے معلوم ہوگیا۔ اس کے کپڑے جل گئے تھے۔ اس کا شناختی کارڈ یا ایسی کوئی چیز بھی نہیں ملی تھی جو اس کی شخصیت کے بارے میں نشان دہی کرسکتی اور اس کا چہرہ دیکھ کر بھی کوئی

اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔
''اب اس کے بارے میں چھان بین کرنا پولیس کا کام ہے۔'' مشہود نے ایک آواز سنی۔ ''یا یہ جاگنے کے بعد خود اپنے بارے میں کچھ بتائے گا' تبھی اس کے ورثا سے رابطہ کیا جاسکے گا۔''
مشہود کو اپنا دل بیٹھتا محسوس ہوا۔ اسے اپنی ماہ زیب یاد آئی' ماہ رخ یاد آئی' مسعود کا خیال آیا' والدین کا خیال آیا۔ وہ سب ابھی تک بے خبر تھے کہ وہ کس سانحہ کا شکار ہو چکا ہے۔ اس کی طرف سے بے خبری کے باعث ان پر نہ جانے کیا گزر رہی ہوگی۔ اس نے جو آوازیں سنی تھیں' ان سے وہ جان چکا تھا کہ اس کی زندگی کو اس سانحے کا شکار ہوئے بائیس گھنٹے گزر چکے تھے۔
اچھا ہے کہ میرے بارے میں کوئی کچھ نہیں جان سکا' اس نے اپنے دل میں کہا' یہ بھیانک چہرہ لے کر میں اپنے پیاروں کے سامنے کیسے جاسکتا ہوں؟
مشہود کو برسوں پہلے کی کچھ باتیں یاد آئیں۔ شادی کی رات ماہ زیب نے اس سے کہا تھا ''اگر آپ خوب صورت نہ ہوتے تو جانتے ہیں کیا ہوتا؟''
''کیا ہوتا؟'' مشہود نے پوچھا تھا۔
''آپ میرے لیے تڑپتے رہ جاتے۔ میں آپ کی شریک زندگی بننے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔''
''اچھا!''
''ہاں۔'' ماہ زیب نے جواب دیا تھا ''جو لوگ خوب صورت نہیں ہوتے ان پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالی پاتی اور بدصورت لوگوں سے تو مجھے ہول آتا ہے۔''
یہ باتیں یاد آئیں تو مشہود کے تپتے ہوئے جسم میں کرب کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اب ماہ زیب اسے دیکھتی تو ڈر جاتی' اسے ہول آجاتا۔
''میں اب نہیں جاؤں گا اس کے سامنے۔'' مشہود نے فیصلہ کیا۔
اس فیصلے کے ساتھ ہی مشہود کو خیال آیا کہ اس طرح وہ سب ہی بچھڑ جائے گا۔ اپنے ماں باپ سے' اپنی بیٹی سے' اپنے بھائی سے!
مشہود کا دل رو پڑا' کیسی دردناک صورتِ حال سے دوچار ہوگیا تھا وہ! زندہ رہتے ہوئے بھی وہ اپنے لوگوں سے دور ہوجاتا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ وہ اس حادثے میں مرہی جاتا لیکن اسے زندہ رہنا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی آواز سنی تھی کہ اب تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔

مشہود کا دل رو دیا تو اس کے اثرات اس کی آنکھوں تک پہنچے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن گوشوں سے آنسو بہ نکلے تھے۔
''یہ رو رہا ہے ڈاکٹر!'' چونک کر غالباً کسی نرس نے کہا۔
''شاید خواب میں رو رہا ہے۔''
مشہود نے اس طرف دھیان نہیں دیا کہ وہ لوگ اس کے ساتھ کیا کررہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند ہی رکھی تھیں۔ وہ ایک سنگین اور اذیت ناک فیصلے تک پہنچ رہا تھا۔
اس کی شناخت نہیں ہوئی تھی، اس لیے وہ لوگ اسے اس کے ورثا تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔
لیکن اس سے پوچھ گچھ تو ہوگی' اسے خیال آیا کہ وہ انہیں کیا جواب دے گا؟
مشہود نے ایک فیصلہ کرلیا۔ وہ ظاہر کرے گا کہ اس کی یادداشت چلی گئی ہے۔
کسی نے اس کے آنسو پونچھ دیے۔
''میرا خیال ہے کہ یہ اب جاگنے والا ہے۔'' کسی نے کہا۔
''کیا پولیس والوں کو اطلاع دی جائے؟''
''ابھی نہیں، پہلے یہ اندازہ تو ہوجائے کہ یہ بیان دے سکتا ہے یا نہیں!''
مشہود نے سمجھ لیا کہ پولیس والے اس کا بیان لینے کے لیے اس کے کمرے کے باہر موجود تھے۔
جذبات کے بھنور میں ہونے کے باوجود مشہود یہ اٹل فیصلہ کرچکا تھا کہ اپنے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولنے لگا۔ ایک بار پوری آنکھیں کھولنے کے بعد اس نے جلدی جلدی دو تین بار پلکیں جھپکائیں پھر اس طرح بھینچ لیں جیسے تکلیف محسوس کررہا ہے۔ تکلیف اسے بہرحال تھی لیکن وہ ناقابلِ برداشت نہیں تھی۔
''تم کیا محسوس کررہے ہو دوست؟'' کسی نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔
مشہود نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ وہاں ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں تھیں۔ مشہود ڈاکٹر کا چہرہ تکنے لگا۔
''اب تم ٹھیک ہو!'' ڈاکٹر نے کہا ''ہم نے تمہیں بچالیا ہے۔''
جواب میں کہنے کے لیے مشہود کے دل میں بڑی تلخ بات آئی تھی جسے اس نے زبان تک نہیں آنے دیا۔

''تم...... تم لوگ...... تم لوگ کون ہو؟'' اس نے رک رک کر پوچھا۔

''ہم ڈاکٹر ہیں۔ تم اسپتال میں ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تم زندہ بچ گئے۔ اس دھماکے نے بہت سے لوگ ہلاک کیے ہیں۔''

''دھماکا؟'' مشہود نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ایک دھماکا ہوا تھا؟''

''دھماکا۔'' مشہود اس طرح بڑبڑایا جیسے ''کچھ'' یاد کرنے کی کوشش کررہا۔

ڈاکٹر اور نرسیں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

''مجھے کیا ہوگیا ہے؟'' مشہود نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا ''مجھے تکلیف کیوں ہورہی ہے؟ میرا جسم کیوں جل رہا ہے؟''

''کیا زیادہ تکلیف ہورہی ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

مشہود نے اثبات میں جواب دیا۔

ڈاکٹر نے ایک نرس کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً ایک انجکشن تیار کرنے لگی۔

ڈاکٹر نے مشہود سے کہا کہ اسپتال میں دھماکے سے ہلاک اور زخمی ہونے والوں کے ورثا کا ہجوم ہے لیکن تمہاری تلاش میں کوئی نہیں آیا۔ تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟ تم کہاں رہتے ہو؟

''گھر؟'' مشہود نے اس طرح کہا جیسے پھر اپنے دماغ پر زور دینے میں لگا ہو۔ اپنے فیصلے پر عمل کرنے کے لیے یہ اداکاری ضروری تھی۔

نرس اس کے بازو میں انجکشن لگانے لگی۔

''ذرا دیر میں تمہاری تکلیف کم ہوجائے گی۔'' ڈاکٹر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''لیکن تمہیں پوری طرح ٹھیک ہونے میں ڈیڑھ ماہ لگ سکتا ہے۔ تمہارا شناختی کارڈ نہیں ملا ورنہ تمہارے گھر والوں کو خبر کردی جاتی۔ کیا تم کسی اور شہر سے آئے تھے؟''

''شہر؟...... نہیں...... مجھے نہیں معلوم!'' بڑبڑانے کا سا انداز تھا۔

ڈاکٹر اور نرسوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر پھر مشہود کی طرف متوجہ ہوا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''نام!...... نام!'' مشہود پھر بڑبڑایا۔ ''کیا نام ہے میرا؟'' اس بار مشہود تقریباً چیخ پڑا اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ہی اس کے سارے بدن میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

''لیٹے رہو!'' ایک نرس نے جلدی سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔

اگر نرس ایسا نہ کرتی تو بھی مشہود کے لیے اٹھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔

''ابھی تم اس قابل نہیں ہو کہ اٹھ سکو۔'' ڈاکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرا نام کیا ہے! میرا نام کیا ہے!'' مشہود پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بڑبڑانے لگا۔ وہ ہر قیمت پر ان لوگوں کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ وہ اپنی یادداشت کھو چکا تھا۔

یکایک اس نے محسوس کیا کہ اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگی ہیں۔

جو انجکشن اسے لگایا گیا تھا، وہ صرف ''پین کلر'' ہی نہیں، غالباً خواب آور بھی تھا۔

غنودگی کے عالم میں اس نے ڈاکٹر کی آواز سنی۔

''یہ اپنی یادداشت کھو چکا ہے۔''

اس جملے نے غنودگی میں بھی مشہود کو سکون پہنچایا اور شاید اس سکون ہی کی وجہ سے نیند نے اسے فوراً دبوچ لیا۔

☆☆☆

ماہ زیب اپنی زندگی کے بکھرے ہوئے دن سمیٹتی رہی۔ گزرتے ہوئے دن' بچھڑنے والوں کا غم کرتے چلے جاتے ہیں۔ زخموں کا اندمال ہوتا ہی چلا جاتا ہے لیکن ماہ زیب کے ساتھ یہ فطری یا قدرتی عمل پیش آنے میں دشواری رہی کیونکہ ماہ رخ اپنے باپ کو کسی طرح نہیں بھول رہی تھی۔ وہ بار بار سوال کرتی رہی۔

''پاپا کب آئیں گے امی؟''

''پاپا کہاں چلے گئے؟''

''چچا ان وہ بڑا سا ڈبا لے کر آئے تھے تو سب کیوں روئے تھے امی جان؟''

ماہ رخ نے تابوت کبھی نہیں دیکھا تھا، اس لیے وہ اسے بڑا سا ڈبا کہتی تھی۔ بیٹی کے یہ سوالات ماہ رخ کے زخمی دل کے اندمال میں رکاوٹ بنتے رہے۔ ویسے بھی وہ سمجھتی تھی کہ مشہود کو یکسر بھلا دینا اس کے لیے کبھی بھی ممکن نہیں ہوگا۔

مسعود نے چند دن گھر میں گزار کر دفتر جانا شروع کردیا تھا۔ بڑے بھائی کے بعد اس کی ذمے داریاں اور بڑھ گئی تھیں۔ مینائی صاحب تو اس حادثے کے بعد جیسے ڈھیر ہوکر رہ گئے تھے۔ ان کی صحت تیزی سے گری تھی۔ وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ دوبارہ کاروبار میں دلچسپی لیتے اور مسعود پر پڑا ہوا اضافی بوجھ بانٹ لیتے۔

البتہ عتیقہ بیگم نے ماں ہونے کے باوجود اتنا زیادہ اثر نہیں لیا تھا۔ دو ماہ گزرنے کے بعد وہ بڑی حد تک معمول کی زندگی گزارنے لگیں۔ ماہ زیب کے لیے اب ان کے جملوں میں زیادہ کاٹ آ گئی تھی۔ ان کا انداز ہ ایسا ہو گیا جیسے وہ اس معاملے میں ماہ زیب کو قصور وار سمجھنے لگی ہیں۔

ماہ زیب اس قسم کے جملے سنتی تو اس کا دل اور کٹ کر رہ جاتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔ کسی جملے سے دل پر کچھ زیادہ ہی چوٹ پڑتی تو وہ سب سے اور خصوصاً ماہ رخ سے چھپ کر کچھ دیر رو لیتی تو اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جاتا۔

عتیقہ بیگم کی ان باتوں پر بینائی صاحب کبھی کبھی دبے الفاظ میں ان کے خلاف کچھ کہتے تو وہ اور زیادہ بپھر جاتیں۔ بینائی صاحب کو خاموشی اختیار کر لینی پڑتی۔ اب تو وہ کم زور بھی ہو گئے تھے لیکن جب ایسا نہیں تھا تب بھی وہ عتیقہ بیگم سے دب کر ہی رہتے تھے۔

ماہ زیب بے بسی کا بھی شکار تھی۔ کئی بار اس کے دل میں گھر چھوڑ دینے کا خیال آیا مگر عملاً یہ اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ پانچ سال کی ماہ رخ کو لے کر وہ کہاں جاتی۔ اکیلی اور جوان عورت کے لیے ہی مشرقی معاشرے میں کوئی جگہ نہیں بنتی۔ جب اس کے دل میں اس قسم کے خیالات ابھرتے تو اسے اپنے ماں باپ کی یاد بڑی شدت سے آتی۔ وہ اگر اس دنیا میں ہوتے تو وہ ان کے پاس چلی جاتی۔

مسعود اب بھی اس کا خیال رکھتا تھا‘ اس کی دل جوئی کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا تھا۔ اس سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی کہ عتیقہ بیگم اب ماہ زیب کے معاملے زیادہ سخت ہو گئی ہیں۔ ماہ رخ سے وہ خوش تو کبھی بھی نہیں رہی تھیں۔ مشہود سے ماہ زیب کی شادی کے معاملے میں بینائی صاحب زندگی میں پہلی بار عتیقہ بیگم کے سامنے ڈٹ گئے تھے ورنہ ان کی شادی بھی نہ ہو پاتی۔

اتوار کا دن چھٹی کا ہوتا ہے۔ اس روز مسعود عتیقہ بیگم سے چھپ کر زیادہ سے زیادہ وقت ماہ زیب اور ماہ رخ کے ساتھ گزارنے کی کوشش کرتا لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔

’’مسعود سے اب بہت گھلنے ملنے لگی ہیں دلہن بیگم!‘‘ ایک دن عتیقہ بیگم نے بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں بینائی صاحب سے کہا۔

بینائی صاحب نے جواب دیا ’’دیور بھابھی میں شروع ہی سے لگاؤ رہا ہے عتیقہ بیگم!‘‘

’’اب کچھ بڑھتا جا رہا ہے۔‘‘ عتیقہ بیگم نے کہا۔

’’دلہن کو اس کی ضرورت بھی ہے۔‘‘ بینائی صاحب نے جواز پیش کیا ’’بہت بڑا صدمہ ہے اس کو۔‘‘

’’خوب!‘‘ عتیقہ بیگم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا ’’تو آپ کو خیال ہے کہ دلہن کو اس کی ضرورت بھی ہے۔‘‘

’’کیوں؟ کیا یہ خیال نہیں ہونا چاہیے؟‘‘

’’ہونا چاہیے‘ مجھے بھی ہے۔‘‘ عتیقہ بیگم نے کچھ عجیب لہجے میں کہا ’’دلہن صاحبہ کی عمر ابھی زیادہ تو نہیں ہوئی ہے۔ انتیس تیس سال میں جذبات ٹھنڈے تو نہیں ہو جاتے......!‘‘

بینائی صاحب چونکے ’’کیا مطلب؟‘‘

’’شوہر نہ رہے تو خواہشات مر نہیں جاتیں۔‘‘

اب بینائی صاحب نے عتیقہ بیگم کا اشارہ سمجھا۔ وہ کانپ گئے ’’آپ کو اس طرح نہیں سوچنا چاہیے عتیقہ بیگم!‘‘ ان کی آواز بھی کانپ گئی۔

’’کیوں نہیں سوچنا چاہیے!‘‘ عتیقہ بیگم نے تیوریاں چڑھائیں۔ ’’ہر عمر کے کچھ تقاضے تو ہوتے ہیں۔‘‘

بینائی صاحب بل کھا کر بولے ’’بہتر ہوگا اس قسم کی باتیں آپ آئندہ مجھ سے نہ کریں۔‘‘

عتیقہ بیگم انہیں تیکھی نظروں سے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔ ’’میں سوچ رہی ہوں کہ مسعود کی شادی کر دی جائے۔ ایک لڑکی ہے میری نظر میں۔‘‘

’’کر دیجیے!‘‘ بینائی صاحب نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ’’اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے!‘‘

’’دفتر سے آ جائے وہ۔ آج ہی بات کروں گی اس سے!‘‘

بینائی صاحب خاموش رہے۔

مسعود معمول کے مطابق چھ بجے دفتر سے آ گیا لیکن عتیقہ بیگم نے اسے رات کے کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بلوایا۔

’’کیا بات ہے امی صاحبہ؟‘‘ وہ آتے ہی کچھ پریشان سے لہجے میں بولا۔

عتیقہ بیگم نظریں جھکا کر کچھ سوچنے لگیں۔ مسعود نے بینائی صاحب کی طرف دیکھا۔ بینائی صاحب نے اس سے نظریں چرا لیں۔ اس سے مسعود کی پریشانی کچھ بڑھی۔ اسے یقین ہونے لگا کہ ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔

’’میں نے ایک لڑکی دیکھی ہے۔‘‘ عتیقہ بیگم نے سر اٹھا کر دیکھا ’’اچھی‘ پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ تم سے چار سال چھوٹی ہے۔ میں اس سے تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہی

ہوں۔"

مسعود چونکا اور پھر سٹپٹا کر بولا "میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا امی صاحبہ!"

"کیوں؟" عتیقہ بیگم کی پیشانی پر بل پڑ گئے "کیا تم ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو جو تم سے کچھ بڑی ہو؟"

مسعود ان کا طنز نہیں سمجھا اور بولا "میں نے کہا ناں امی صاحبہ! میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"ابھی نہیں کرو گے تو کیا بڑھاپے میں کرو گے؟"

مسعود نے پہلو بدلا۔

"جواب دو۔" عتیقہ بیگم نے کچھ توقف سے کہا۔

"امی صاحبہ!" مسعود نے تذبذب سے کہا "ڈر لگتا ہے مجھے اپنی شادی سے۔"

"شادی سے ڈر؟" عتیقہ بیگم نے طنزیہ کہا۔

"دراصل آپ کو وہ خیال نہیں ہے جو مجھے ہے۔"

"تو تم سمجھادو؟" عتیقہ بیگم کے لہجے میں چبھن میں اضافہ ہوا۔

مسعود نے کہا "میری شادی سے اس گھر میں دیورانی جٹھانی کی چپقلش کا امکان ہے۔ خیر بھابھی جان کا مزاج تو میں جانتا ہوں مگر جو لڑکی اس گھر میں آئے گی، اس کا مزاج نہ جانے کیسا ہو!"

"اچھا!" عتیقہ بیگم نے تیکھے لہجے میں کہا "کیا زندگی بھر شادی نہیں کرو گے؟"

مسعود اثبات میں جواب دینا چاہتا تھا لیکن ماں کے سامنے وہ اس کی ہمت نہ کر سکا۔ اس نے کہا "آپ مجھے سوچنے کے لیے کچھ مہلت دیجیے!"

"یہ کوئی بہت بڑا مسئلہ تو ہے نہیں۔ تم مجھے کل تک جواب دے دو تاکہ میں لڑکی والوں سے سلسلہ جنبانی کر سکوں۔"

"جی، بہتر۔" مسعود کوئی اور جواب نہیں دے سکا۔

بینائی صاحب اس دوران میں سر جھکائے بیٹھے رہے تھے۔

مسعود اپنے کمرے میں آ گیا اور ٹہلنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی شادی اس گھر کا سکون درہم برہم کر دے گی۔ شاید اپنی بھابھی اور بھتیجی کی خوشیاں اسے بہت عزیز تھیں۔

ماں کو صاف جواب دینے کی مسعود میں ہمت نہیں تھی، اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ بینائی صاحب سے بات کرے گا۔ مشکل یہ تھی کہ اسے صرف ایک دن کا وقت دیا گیا تھا اور ممکن تھا کہ اسے اتنی جلدی بینائی صاحب سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع نہ ملتا۔ اسے ایک تدبیر سوجھی کہ دفتر سے فون پر بینائی صاحب سے بات کرے۔

دوسرے دن اس نے دفتر سے گھر کے ٹیلی فون کے بجائے بینائی صاحب کے موبائل سے رابطہ کیا اور خود بھی اپنا موبائل یا ٹیلی فون استعمال کرنے کے بجائے دفتر کے ایک شخص کا موبائل لے لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دفتر یا اس کے موبائل کا نمبر بینائی صاحب کے موبائل پر جائے اور عتیقہ بیگم اسے دیکھ لیں۔

"ہیلو!" رابطہ قائم ہونے پر اس نے بینائی صاحب کی آواز سنی۔

مسعود نے جلدی جلدی کہا "اگر امی صاحبہ آپ کے پاس ہوں تو رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیجیے گا ابا جان!"

"رانگ نمبر۔" جواب ملا اور رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ عتیقہ بیگم اس وقت بینائی صاحب کے قریب ہی تھیں۔

مسعود بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب آدھے گھنٹے بعد فون کرے گا لیکن پندرہ منٹ بعد ہی اسے اپنے موبائل پر بینائی صاحب کی کال موصول ہوئی۔

"تم مجھ سے ضرور کوئی خاص بات کرنا چاہتے ہو مسعود!" بینائی صاحب نے اس کی آواز سننے کے بعد کہا۔ "عتیقہ بیگم سے وہ بات چھپانا چاہتے ہو، اس لیے موبائل بھی کسی اور کا استعمال کیا ہے۔"

"جی ہاں ابا جان!" مسعود نے کہا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ تم بہت بے چین ہو گے، اس لیے ابھی کمرے سے عتیقہ بیگم کے جاتے ہی تمہیں فون کر لیا۔"

"کیا آپ کو امی صاحبہ سے اتفاق ہے ابا جان؟"

بینائی صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہ مسعود کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے کہا "بات اتفاق یا نااتفاقی کی نہیں ہے مسعود! تم آخر کب تک شادی نہیں کرو گے؟"

مسعود نے ہچکچاتے ہوئے کہا "زندگی بھر نہیں کروں گا۔"

بینائی صاحب کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ مسعود کا جواب سن کر وہ پریشان ہو گئے ہوں گے۔

مسعود نے کچھ رک کر کہا "ابا جان! میں نے بھائی جان سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو میں زندگی بھر ان کی بیوی اور بیٹی کا خیال رکھوں گا لیکن اب وہ اس دنیا میں نہیں رہے تو چھوٹے بھائی کی حیثیت سے میں اسے اپنا فرض سمجھ رہا ہوں۔"

''تمہاری یہ سوچ نا قابلِ تحسین ہے بیٹا لیکن ضروری تو نہیں کہ تمہاری ہونے والی بیوی تمہاری بدمزاج ہی ہو!''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میرے دل میں ڈر تو ہے۔''

وہ تو ٹھیک ہے بیٹا لیکن.....'' مینائی صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں کیا کہنا چاہیے۔

''میں نے آپ کو صرف ایک ہی وجہ سے فون کیا ہے۔'' مسعود بولا ''امی صاحبہ سے یہ بات کہنے کی مجھے ہمت نہیں ہو سکے گی۔ میرا یہ جواب آپ ہی ان تک پہنچا دیجیے گا۔''

مینائی صاحب نے ذرا سا سوچ کر جواب دیا ''تم کہتے ہو تو میں انہیں بتا دوں گا لیکن اس کے بعد بھی وہ تم سے بات تو کریں گی!''

''میرا جواب ان تک پہنچ جائے گا تو باقی بات کرنے کی ہمت مجھے ہو جائے گی۔''

''اچھا!'' مینائی صاحب نے ٹھنڈی سانس لی۔

''مجھے خود بھی اندازہ ہے کہ آج دفتر سے گھر لوٹتے ہی مجھے امی صاحبہ کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

مسعود کا اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو عتیقہ بیگم غصے سے بل کھا رہی تھیں۔ انہوں نے مسعود کو فوری طلب کر لیا۔ مسعود ان کے سامنے گیا اور مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

عتیقہ بیگم کڑک کر بولیں ''اپنا بے ہودہ جواب تم مجھے نہیں دے سکتے تھے؟''

''ہمت نہیں ہو رہی تھی امی صاحبہ!'' مسعود کی آواز بہت دھیمی تھی۔

''تمہارے اس بے ہودہ فیصلے کی وجہ کیا ہے؟''

''میں بھابھی جان کی زندگی کو اور زیادہ بے سکون نہیں کرنا چاہتا۔''

''تو اس سے کہہ دو کہ وہ کسی سے شادی کر کے چلی جائے یہاں سے۔''

''یہ..... یہ آپ کہہ رہی ہیں!'' مسعود کی آواز کانپ گئی۔

''دوسرا راستہ بس یہی ہے۔'' عتیقہ بیگم نے کہا۔

مسعود نے مینائی صاحب کی طرف دیکھا جو نظریں جھکائے بیٹھے تھے۔

''امی صاحبہ!'' مسعود بھرائی ہوئی آواز میں بولا ''یہ تو ایسا ہی ہوگا کہ ہم ان سے گھر سے نکل جانے کے لیے کہیں!''

''اسے اب اپنا دوسرا گھر بسانا ہی چاہیے۔'' عتیقہ بیگم نے کہا ''ابھی وہ انتیس سال سے زیادہ کی نہیں ہوئی ہے۔ باقی پہاڑ جیسی زندگی آخر کس طرح گزارے گی؟ اس عمر میں عورت بیوہ ہو جائے تو دوسری شادی کر ہی لیتی ہے۔''

''گڑیا کا کیا ہوگا امی صاحبہ؟''

''اسے ہم اپنے پاس رکھ لیں گے اور اگر وہ چاہے تو اسے بھی لے جائے!''

اس موقع پر مینائی صاحب نے چونک کر سر اٹھایا ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں عتیقہ بیگم! پوتی یا پوتے کے لیے شاید کوئی دادی بھی اس طرح نہیں سوچ سکتی۔''

''میں بھی نہیں سوچ رہی ہوں۔'' عتیقہ بیگم تلخی سے بولیں ''مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آخر کار ہونا تو کچھ اور ہی ہے۔''

''اور کیا ہونا ہے امی صاحبہ؟'' مسعود بول پڑا۔

''پہلے یہ بات ہو جائے تو میں یقین کر لوں کہ میں نے صحیح سوچا ہے۔''

''آخر کیا خیال ہے آپ کے دماغ میں؟''

''ابھی تمہارا جواب ملا ہے مجھے۔ اس کا جواب مل جائے تو خیال ظاہر کروں گی۔''

''تو آپ ہی بات کر لیجیے ان سے۔'' مسعود نے دھیمی آواز میں کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' عتیقہ بیگم نے فیصلہ کن انداز میں کہا ''میں کر لوں گی۔''

مسعود اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ خاصا مشتعل تھا لیکن عتیقہ بیگم کے سامنے مخالفت کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

عتیقہ بیگم گھر میں جو کھچڑی پکا رہی تھیں، ماہ زیب اس سے قطعی بے خبر تھی، تاہم اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ کوئی خاص بات ہو رہی تھی۔ اسے ملازمہ سے معلوم ہو چکا تھا کہ گزشتہ رات عتیقہ بیگم نے مسعود کو اپنے کمرے میں بلایا تھا اور اس روز دفتر سے آتے ہی اس کی طلبی ہو گئی تھی۔

ماہ زیب کا سارا وقت اپنے کمرے میں ہی گزرتا تھا۔ ماہ رخ کبھی کبھی مینائی صاحب کے پاس چلی جاتی تھی۔ بچوں کو لگاؤ اسی سے ہوتا ہے جو ان سے محبت کرتا ہو۔ عتیقہ بیگم کو اس سے اتنا لگاؤ نہیں تھا جتنا مینائی صاحب کو تھا۔ اس وقت وہ ماہ زیب ہی کے ساتھ تھی۔

''چچا جان آج مجھے پڑھانے کیوں نہیں آئے امی؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

مسعود کا معمول تھا کہ دفتر سے آنے کے بعد چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے ماہ رخ کو پڑھانے آ جایا کرتا تھا۔

ماہ زیب نے اسے جواب دیا ''تمہارے چچا ن کو تمہاری دادی جان نے کسی کام سے بلالیا ہے چندا! ان سے بات کر کے آئیں گے وہ!''

لیکن مسعود اس کے بعد بھی نہیں آیا۔

ملازمہ نے آکر ماہ زیب کو اطلاع دی ''آپ کی مہمان آئی ہیں چھوٹی بیگم!''

ماہ زیب حیران رہ گئی۔

''میری مہمان؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''جی ہاں۔''

''نام نہیں پوچھا؟''

''ٹھیک سے یاد نہیں رہا'' ملازمہ نے جواب دیا ''زوبی یا شاید روبی۔''

ماہ زیب چونک پڑی۔ وہ روبی نام کی ایک لڑکی کو جانتی تھی جو اسکول میں اس کے ساتھ پڑھتی تھی اور مشہود کو چاہتی تھی۔ دھماکے کے حادثے سے پہلے مشہود نے ماہ زیب کو بتایا بھی تھا کہ وہ اسے کسی ریسٹورنٹ میں ملی تھی۔

ماہ زیب کا ذہن ایک دم الجھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ روبی اس سے ملنے کیوں آئی ہے۔ کیا اسے مشہود کے بارے میں علم ہو چکا تھا؟ کیا وہ اسے پرسہ دینے آئی تھی؟

ملازمہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بولی ''وہ بتا رہی تھی کہ اسکول میں وہ آپ کے ساتھ پڑھتی تھیں۔''

''مشہود کا نام نہیں لیا اس نے؟'' ماہ زیب نے پوچھا۔

''جی نہیں۔''

''اچھا!'' ماہ زیب نے سوچتے ہوئے کہا ''یہیں لے آؤ۔''

ملازمہ چلی گئی۔

''کون آیا ہے امی؟'' ماہ رخ نے پوچھا۔

''کوئی ہے..... تم پڑھتی رہو۔''

ماہ رخ کتابیں کھولے بیٹھی تھی۔ یہ اس کا معمول تھا۔ دفتر سے مسعود کی واپسی کا وقت ہوتا تھا تو وہ پہلے ہی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتی تھی اور اپنا پچھلا سبق دہرانے لگتی تھی۔

ملازمہ نے روبی کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔

''چھ سات برس کے بعد دیکھ رہی ہوں آپ کو!'' روبی نے آتے ہی مسکراتے ہوئے کہا ''لیکن آپ کچھ زیادہ نہیں بدلیں!''

''آپ تو شاید مجھ سے بھی کم بدلی ہیں۔'' ماہ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ اس نے روبی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ کر سوچا تھا کہ یہ پرسہ دینے کا انداز تو نہیں ہو سکتا۔

''بیٹھیے۔'' اس نے روبی سے کہا ''چند مہینے پہلے مشہود نے آپ کا ذکر کیا تھا۔ ان سے ملاقات ہوئی تھی آپ کی!''

''جی ہاں۔'' روبی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم رہی۔ ''میری خواہش تھی کہ آپ سے ملوں۔ مشہود نے کہا تھا کہ وہ مجھے فون کر کے کسی دن بلالیں گے۔ ممکن ہے انہوں نے مجھے فون بھی کیا ہو لیکن میرا موبائل میرے پاس نہیں رہا جس کا نمبر میں نے انہیں دیا تھا۔'' روبی ہنسی ''شاپنگ کر رہی تھی میں' کوئی حضرت میرا پرس چھین کر بھاگ گئے۔ موبائل پرس میں ہی تھا۔''

ماہ زیب پھیکے سے انداز میں مسکرا دی۔

روبی بولی ''میں نے مشہود سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو یہ بھی نہیں ہو سکا۔ مجھے خیال آیا کہ شاید ان کا موبائل بھی کوئی لے اڑا ہوگا۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ آج بن بلائے ہی مہمان بن جاؤں۔''

ماہ زیب کو اب قطعی شبہ نہیں رہا کہ روبی اس سانحہ سے بے خبر تھی۔ اس کا دل بھر آیا۔ وہ بہ مشکل بولی۔

''ملازمہ نے آپ نے مشہود کے بارے میں کیوں نہیں کہا؟ مجھ سے ملنے کی بات کیوں کی؟''

''مشہود نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی والدہ کا مزاج کچھ ایسا ہی ہے لہٰذا میں نے ان کا نام لینے کے بجائے.....'' روبی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا اور پھر سنجیدگی سے بولی ''آپ کے چہرے سے مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ آپ کو میرا آنا شاید اچھا نہیں لگا!''

اب خود پر قابو رکھنا ماہ زیب کے لیے ممکن نہیں رہا۔ اس کے آنسو چھلک پڑے۔

''کیا..... کیا..... کیا بات ہے!'' روبی بوکھلا سی گئی۔

ماہ رخ جو اپنی کتابوں کے پاس بیٹھی ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی' یکا یک اپنی جگہ سے اٹھی۔

''مشہود صاحب اس دنیا میں نہیں روبی!'' ماہ زیب نے سسکی لے کر کہا۔

روبی کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

''وہ..... وہ..... دھماکے میں.....'' ماہ زیب اتنا ہی کہہ سکی۔

ماہ رخ دوڑتی ہوئی آکر ماں سے لپٹ گئی۔

''نہیں..... نہیں.....'' روبی کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں ''یہ..... کیسے..... نہیں.....'' ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے

اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔
''ہاں۔'' ماہ زیب نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی ''وہ مجھے چھوڑ گئے روبی!''
روبی کے چہرے سے صاف ظاہر ہونے لگا کہ خود پر قابو رکھنا اس کے لیے مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ یکا یک وہ اٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔
ماہ زیب کے لیے روبی کا یہ ردعمل تعجب خیز نہیں تھا۔ اسے علم تھا کہ روبی بھی مشہود کو چاہتی ہے۔ محبت میں اپنی ناکامی کے باعث اس نے شادی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔
ماہ رخ' ماہ زیب سے لپٹ کر رونے لگی لیکن ماہ زیب نے خود کو بہت تیزی سے سنبھالا تھا۔ اس نے ماہ رخ کو گود میں اٹھا لیا اور اسے چپ کرانے لگی۔
ملازمہ کچھ گھبرائی ہوئی سی کمرے میں آئی۔
''کیا ہوا چھوٹی بیگم؟'' اس نے پوچھا ''وہ آپ کی مہمان......''
''کیا ہوا انہیں؟''
''وہ بھاگتی ہوئی کیوں گئیں؟'' ملازمہ حیران تھی ''اپنی کار بھی انہوں نے تیزی سے چلائی تھی کہ میری تو دیکھ کر چیخ نکل گئی۔ چوکیدار نے بڑی جلدی پھاٹک کھولا تھا نہیں تو ان کی کار پھاٹک سے ہی ٹکرا جاتی۔''
ماہ زیب نے دل ہی دل میں روبی کے لیے دعائیں مانگی کہ وہ کہیں حادثے کا شکار نہ ہو بیٹھے۔
''ہاں اسے اچانک کوئی خاص کام یاد آ گیا تھا۔'' ماہ زیب نے ملازمہ سے کہا ''وہ بڑی جلدی میں گئی ہے۔''
''اتنی بھی کیا جلدی چھوٹی بیگم! وہ تو......''
''تم جاؤ۔'' ماہ زیب نے اس کی بات کاٹی اور ماہ رخ کو بستر پر لٹا دیا۔
''آپ کیوں رونے لگی تھیں امی؟'' ماہ رخ نے معصومیت سے پوچھا۔
''کچھ بھی نہیں۔'' ماہ زیب نے مسکرانے کی کوشش کی ''میں ٹھیک تو ہوں۔''
ماہ رخ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ شاید اس کے معصوم دماغ میں یہ سوال ہو کہ اس کی ماں کو اچانک کیا ہو گیا تھا۔
''تم لیٹی رہو' میں آتی ہوں۔'' ماہ زیب نے کہا اور اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ منہ دھو کر باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ ماہ رخ بستر پر بیٹھی کچھ سوچ رہی ہے۔
''کیا بات ہے چندا؟'' ماہ زیب نے اسے گود میں اٹھا لیا۔
''چچان ابھی تک نہیں آئے!''
''کوئی کام ہو گا انہیں، چلو آج میں تمہیں پڑھا دیتی ہوں۔''
''میں دیکھ آؤں چچان کو؟''
ماہ زیب تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی ہی تھی کہ عتیقہ بیگم دروازہ کھول کر اندر آئیں۔
ماہ رخ ٹھٹکی پھر اس نے پوچھا ''چچان کہاں ہیں دادی جان؟''
''اپنے کمرے میں ہو گا، وہیں چلی جاؤ۔'' عتیقہ بیگم نے کہا۔
ماہ رخ دوڑتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔
ماہ زیب پریشان ہو گئی تھی۔ برسوں بعد یہ پہلا موقع تھا کہ عتیقہ بیگم اس کے کمرے میں آئی تھیں۔
''کیا ہوا امی صاحبہ!'' ماہ زیب کے منہ سے نکلا۔ ''مجھے کیوں نہیں بلا لیا آپ نے؟''
''تم سے کچھ بات کرنا ہے۔'' عتیقہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارے ابا جان چاہتے تھے کہ وہ بات میں ان کے سامنے نہ کروں۔''
اس جواب سے ماہ زیب کی پریشانی کچھ اور بڑھی۔ ''بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہو گی مجھ سے؟'' عتیقہ بیگم تلخی سے مسکرائیں۔
''آپ...... بیٹھیے!'' ماہ زیب ہکلا گئی ''معاف کیجیے گا' مجھے خیال نہیں رہا۔ عجیب سا لگا آپ کو دیکھ کر!''
''ہاں، شاید آج پہلی بار دیکھا ہے!'' عتیقہ بیگم نے طنز کیا۔
''جی... جی ہاں... میرا مطلب ہے... اس کمرے میں......'' ماہ زیب بوکھلا گئی، کہنا کچھ چاہتی تھی' زبان سے کچھ نکل رہا تھا۔ اس نے خاموش ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔
عتیقہ بیگم بیٹھ کر کچھ سوچنے لگیں۔ ماہ زیب کھڑی ہی رہی۔
''تم بھی بیٹھو' کھڑی کیوں ہو!'' عتیقہ بیگم بولیں۔
''جی!'' ماہ زیب نے جلدی سے کہا اور بیٹھ گئی۔
''تمہاری عدت ختم ہونے میں شاید اب ایک مہینا رہ گیا ہے!'' عتیقہ بیگم بولیں۔
ماہ زیب ان کا منہ دیکھنے لگی۔
''ہے ناں؟'' عتیقہ بیگم نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔
''جی...... لگ بھگ۔'' ماہ زیب نے آہستہ سے کہا۔

''اس کے بعد کیا کرو گی؟'' عتیقہ بیگم نے پوچھا۔
ماہ زیب پریشان ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ یہ سوال کرتے ہوئے عتیقہ بیگم کے دماغ میں کیا بات ہے۔

''یہ پہاڑ سی زندگی آخر کیسے گزارو گی؟'' عتیقہ بیگم نے دوسرا سوال کیا۔

ماہ زیب کا دل بھر آیا۔ اب بھی عتیقہ بیگم کا مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ شکستہ سی آواز میں بولی ''ماہ رخ کی پرورش کرتے ہوئے گزار دوں گی۔''

عتیقہ بیگم نے کہا ''تمہاری عمر کے تقاضے کچھ اور بھی ہیں۔ ساری زندگی اس طرح کیسے گزاری جا سکتی ہے؟''

ماہ زیب چونک کر غور سے عتیقہ بیگم کی طرف دیکھنے لگی۔ اب اسے کچھ شبہ ہوا تھا کہ عتیقہ بیگم کیا کہنا چاہتی ہیں۔

''سمجھ رہی ہو میرا مطلب؟'' عتیقہ بیگم نے پوچھا۔

ماہ زیب کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔

عتیقہ بیگم پھر بولیں ''تمہیں دوسری شادی کر لینی چاہیے۔''

ماہ زیب پر جیسے بجلی گر پڑی۔

''نہیں۔'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اور کوئی راستہ نہیں ہے۔'' عتیقہ بیگم نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں نہیں چاہتی کہ لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع ملے۔ جوان بیوہ بہو گھر میں بیٹھی رہے تو لوگوں کو نہ جانے کیا کیا خیال آنے لگتے ہیں۔''

ماہ زیب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اسے چکر بھی آ گیا تھا۔ وہ عتیقہ بیگم کی پوری بات بھی شاید نہیں سن سکی۔ اس نے گڑگڑانے کے سے انداز میں کہا ''مجھے اس گھر سے نہ نکالیے امی صاحبہ!''

''تم اپنا ایک نیا گھر بسا لو!''

''نہیں امی صاحبہ نہیں۔'' ماہ زیب کے آنسو تیزی سے بہنے لگے ''میں اپنے مشہود کے گھر سے کہیں جا بھی نہیں سکتی۔ دنیا میں آپ لوگوں کے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے۔''

''تو تم اس گھر سے نہیں جانا چاہتیں؟''

''جی امی صاحبہ! مجھے آپ اس کمرے کے بجائے کسی کونے میں ڈال دیجیے۔ میں ملازمہ کی طرح اس گھر میں زندگی گزار دوں گی۔'' ماہ زیب نے سسکی لی ''میں وہ گھر نہیں چھوڑ سکتی امی صاحبہ جس کے کونے کونے میں میرے مشہود کی یادیں پھیلی ہوئی ہیں۔''

''تو میرا خیال ٹھیک نکلا۔'' عتیقہ بیگم کے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ تھی۔

ماہ زیب آنسو بہاتی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھی کہ عتیقہ بیگم کے دماغ میں کیا خیال ہے۔

عتیقہ بیگم کچھ سوچتے سوچتے اٹھیں اور مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے چلی گئیں۔

ماہ زیب دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر ہچکیوں اور سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ اس سے پہلے کبھی اسے اپنے بے سہارا ہو جانے کا احساس اتنی شدت سے نہیں ہوا تھا۔

''مشہود!'' یہ پکار اس کے دل سے ہوک کی طرح اٹھی اور پھر اس نے خود کو بستر پر گرا دیا۔

☆☆☆

روبی اپنے بستر پر لیٹی چھت کو تکے جا رہی تھی اس کا میک اپ آنسوؤں سے دھل چکا تھا اور آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ مشہود کے لیے اس کے دل میں جو محبت تھی' اس کی شدت کا اندازہ کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس محبت میں ناکامی کے بعد اس نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا اور دل کو بڑی مشکل سے سمجھایا تھا کہ وہ محبت ہی کیا جو صلہ بھی چاہے، تاہم اس نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وہ رات اس پر قیامت کی طرح گزری۔ اس زمانے کی یادیں اسے تڑپاتی رہیں جب وہ اسکول میں پڑھا کرتی تھی۔ مشہود اس کے خوابوں کا شہزادہ بن گیا تھا اور اس وقت وہ صدمے سے کئی دن بیمار رہی تھی جب اسے معلوم ہوا تھا کہ مشہود کے خوابوں کی شہزادی ماہ زیب ہے۔

ان یادوں کے ساتھ اس کے دماغ میں وہ دھماکا بھی چکراتا رہا جس کی خبریں وہ اخبار میں پڑھتی رہی تھی۔ اس وقت اس کے سان گمان میں بھی نہ آیا تھا کہ اس کا مشہود بھی اس حادثے کا ایندھن بن گیا ہوگا۔

اس قسم کے دھماکے شہر میں پہلے بھی ہوئے تھے لیکن جب مشہود سے روبی کی ملاقات ہوئی تھی' اس کے بعد اس قسم کا ایک ہی دھماکا ہوا تھا۔ اسی لیے روبی اسی دھماکے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس دھماکے کے بعد روبی نے خدمتِ خلق کے جذبے کے تحت ایک اسپتال کے کئی مریضوں کو اپنے اسپتال میں بھی منتقل کرایا تھا۔

ڈاکٹر بننے کے بعد اس نے سرجری کی تعلیم بھی حاصل کی تھی اور اپنا ایک چھوٹا سا اسپتال بھی کھول لیا تھا۔ چھوٹا سا اسپتال ہونے کے باوجود وہاں وہ سب چیزیں موجود تھیں جو کسی ترقی یافتہ ملک میں مریضوں کو ہر قسم کی سہولت بہم پہنچاتی

ہیں۔ اتنے زیادہ اخراجات وہ اس لیے کرسکی تھی کہ اس کا باپ ایک دولت مند شخص تھا۔

روبی کی ماں چار سال پہلے دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ ایک سال بعد ہی روبی کے باپ نے ایک جوان عورت سے دوسری شادی کرلی تھی۔ روبی کو یہ بہت برا لگا تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی سوتیلی ماں سے ''سمجھوتا'' کرنے پر آمادہ تھی لیکن اس عورت کو سوتیلی بیٹی کا ساتھ گوارا نہیں تھا۔ وہ روبی کے باپ کو اس کی شادی کرنے پر مجبور کرنے لگی لیکن اس معاملے میں روبی کا فیصلہ اٹل تھا۔ وہ زندگی بھر شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح سوتیلی ماں بیٹی کی چپقلش میں اتنا اضافہ ہوا کہ باپ نے اپنی بیٹی کو ایک الگ فلیٹ دلا دیا۔ اسے ایک ملازمہ بھی دے دی جو بیوہ ہونے کے بعد اپنے دو سالہ بیٹے کے ساتھ دس سال سے ان کے گھر میں کام کررہی تھی۔ اب اس کا بیٹا بارہ سال کا تھا۔ روبی کو ان دونوں کی وجہ سے بڑی سہولت حاصل ہوگئی۔ ملازمہ جو بے حد نیک نیت تھی۔ فلیٹ کی صفائی ستھرائی کے علاوہ کھانا بھی اچھا پکاتی تھی۔ باہر کے کام کاج کے لیے اس کا لڑکا موجود تھا۔ روبی کو تھوڑی سی فکر یہ ضرور لاحق رہی کہ لڑکا جب جوان ہوجائے گا تو اسے فلیٹ میں اپنے ساتھ رکھنا مناسب نہیں ہوگا لیکن اس نے سوچا تھا کہ ابھی اس میں بہت دیر تھی۔ وقت آنے پر وہ کوئی فیصلہ کرلے گی۔

روبی کو اس فلیٹ میں رہتے ہوئے دو سال گزر چکے تھے۔

اس رات ملازمہ نے کئی بار آکر اس سے کھانے کے لیے پوچھا لیکن جو اندوہناک اطلاع اسے ماہ زیب سے ملی تھی، اس کے بعد اس کی بھوک اُڑ چکی تھی۔ بس حلق زیادہ خشک ہوتا تھا تو وہ سرہانے سے پانی کا فلاسک اٹھا کر دو ایک گھونٹ پی لیتی تھی۔

کئی بار اسے ماہ زیب کا بھی خیال آیا۔ دوسری صبح اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اپنے کمرے سے بھی نکلے مگر ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ اپنے فرائض سے غفلت برتنے کا جرم نہیں کرسکتی تھی۔ تیار ہوکر اس نے جیسے تیسے ناشتا کیا اور اسپتال روانہ ہوگئی۔ وہ افسردہ اب بھی تھی لیکن اس نے اپنے ہیجان پر قابو پالیا تھا۔ اس نے گزشتہ شام جیسی ڈرائیونگ نہیں کی۔ اسے تعجب تھا کہ وہ گزشتہ شام کسی حادثے سے بچ ہے۔

اسپتال کی خوب صورت عمارت کے دروازے پر کھڑے ہوئے گارڈ نے روبی کو سلام کیا۔ وہ اشارے سے جواب دیتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ جونرسیں اور وارڈ بوائز اس کے سامنے آئے، وہ انہیں بھی اشارے سے جواب دیتی ہوئی اپنے کمرے میں پہنچی۔

صبح جب وہ اسپتال پہنچتی تو کچھ خاص مریضوں کی فائلیں اس کی میز پر پہلے سے موجود ہوتی تھیں۔ روبی نے ان فائلوں میں سے ایک فائل نکال کر کھولی۔ وہ فائل ان چند مریضوں میں سے ایک کی تھی جنہیں روبی دھماکے کے حادثے کے بعد اپنے اسپتال میں لائی تھی۔ اس مریض کے علاوہ باقی لوگ ٹھیک ہوچکے تھے جنہیں پولیس کے سپرد کردیا گیا تھا اور پولیس نے کاغذی کارروائی کرکے انہیں ان کے ورثا کے حوالے کردیا تھا۔

فائل دیکھنے کے بعد روبی نے ایک ڈاکٹر کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ نمبر پانچ اب بالکل ٹھیک ہوچکا ہے۔''

''جی ہاں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اب پولیس کو اطلاع دے دینا چاہیے کہ وہ آکر اسے لے جائے۔''

''اس کا کوئی وارث سامنے نہیں آیا ہے۔'' روبی نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔ ''اور وہ اپنی یادداشت بھی کھو چکا ہے۔ پولیس شاید اسے کسی ٹرسٹ کی تحویل میں دے دے۔''

''امکان تو یہی ہے۔''

''اور ٹرسٹ والے اس کی یادداشت واپس لانے کے لیے نہ تو کسی بڑے دماغی معالج سے رابطہ کریں گے اور نہ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کرنے کے بارے میں سوچا جائے گا۔''

''یہ تو ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اور شاید اسے قید تنہائی میں رکھا جائے۔ وہ اتنا بھیانک ہے کہ لوگ اس سے ڈریں گے۔ ٹرسٹ والوں کو اپنے لوگوں کا خیال بھی تو رکھنا پڑے گا۔''

''ایک انسان کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوگی۔'' روبی نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے اس سے بہت ہمدردی ہے۔''

''کس کس سے ہمدردی کیجیے گا آپ!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس دھماکے میں اور اس سے پہلے ہونے والے دھماکوں میں کئی افراد کا اتنا ہی برا حال ہوچکا ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' روبی نے کہا۔ ''لیکن ہمدردی اسی سے ہوتی ہے جو سامنے ہو۔ تین ماہ سے میں اور آپ لوگ اس کا علاج کررہے ہیں۔ میں خود اس کے چہرے کے کئی آپریشن کرچکی ہوں۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ نے وہ آپریشن نہ کیے ہوتے تو

وہ اور زیادہ بھیانک ہوتا۔''

''میں سوچ رہی ہوں کہ اسے پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے اس کی یادداشت واپس لانے کی کوشش کی جائے۔ کچھ ماہرین سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے۔''

''آپ اس کی اتنی ہمدرد ہیں اور وہ آپ سے بات تک نہیں کرتا!'' ڈاکٹر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ہاں، یہ بڑی عجیب بات ہے۔ آپ سبھی سے بات کرتا ہے لیکن میرے سامنے چپ سادھ لیتا ہے۔ شاید یہ بھی کسی نفسیاتی گرہ کا معاملہ ہو۔''

اس مرتبہ ڈاکٹر ہنسا۔ ''کسی ماہرِ نفسیات کے لیے یہ شاید ایک انوکھا کیس ہوگا کہ مریض کسی ایک ہی فرد سے اپنی آواز چھپائے!''

''آواز چھپانا بلاشبہ ایک انوکھا کیس ہوگا۔''

یہ جواب دیتے دیتے اچانک روبی کے دماغ میں سوال ابھرا کہ وہ کوئی ایسا شخص تو نہیں جو اسے جانتا ہو اور کسی باعث اپنی آواز اس سے چھپانا چاہتا ہو!

روبی مضطربانہ انداز میں کھڑی ہوگئی۔ اسے مشہود کا خیال آیا تھا۔

ڈاکٹر نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا احساس ہوتے ہی روبی جلدی سے بیٹھ گئی۔ وہ اپنے اسپتال میں ملازمت کرنے والے ڈاکٹروں کی نظر میں تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔

''آپ جائیے!'' وہ ڈاکٹر سے بولی۔ ''پندرہ منٹ بعد پھر آئیے گا۔ میں اس پہلو پر ذرا دیر سوچنا چاہتی ہوں۔''

ڈاکٹر نے کچھ عجیب سی نظروں سے روبی کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں، اٹھ کر چلا گیا۔

یہ کچھ مضحکہ خیز خیال ہے، روبی نے سوچا، پولیس اپنا اطمینان کیے بغیر کسی کی لاش ورثا کے حوالے نہیں کرتی۔ اس کا یہ مریض مشہود نہیں ہوسکتا۔

لیکن یہ سوچ لینے کے باوجود روبی کا اضطراب کم نہیں ہوسکا۔ اس نے اس بارے میں چھان بین کرنے کا فیصلہ کیا اور ٹیلی فون اٹھا کر ایک پولیس افسر سے رابطہ کیا۔ وہ پولیس افسر کچھ تشفی بخش جواب نہیں دے سکا تو روبی نے ایک اور افسر سے رابطہ کیا۔ آخر کار وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی کہ ایک عینی شاہد کے بیان اور کچھ دوسری شہادتوں کے باعث پولیس نے ڈی این اے ٹیسٹ کروانا ضروری نہیں سمجھا تھا اور لاش مسعود کے حوالے کردی تھی۔

پولیس کی اس غیر ذمے دارانہ حرکت پر روبی کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے ریسیور بڑی زور سے کریڈل پر پٹخا لیکن غصے کے باوجود اس خیال سے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں کہ اس کا یہ مریض شاید مشہود ہی ہو!

مشہود کا چہرہ کیونکہ بھیانک ہوگیا تھا، اس لیے وہ خود کو اس سے چھپانا چاہتا ہوگا، روبی یہ سوچتی ہوئی اپنی کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

پولیس کی غیر ذمے دارانہ حرکت سے قطع نظر، کسی مضبوط جواز کے بغیر روبی کا دل یہ ماننے پر آمادہ ہورہا تھا کہ اس کا وہ مریض مشہود ہی ہے۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے روبی کو چونکایا۔ ڈاکٹر کو رخصت ہوئے پندرہ منٹ گزر چکے تھے۔ امکان تھا کہ روبی ہی کی ہدایت پر وہ دوبارہ آیا ہوگا۔

روبی نے اپنی کرسی پر بظاہر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد کچھ بلند آواز میں کہا۔ ''آجائیے!''

دروازہ کھول کر وہی ڈاکٹر کمرے میں آیا۔ روبی سے بیٹھنے کا اشارہ ملنے کے ساتھ ہی وہ کرسی پر بیٹھا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں اس مریض کی آواز سننا چاہتی ہوں۔'' روبی نے اس سے کہا۔

''لیکن وہ تو آپ کے سامنے بولتا ہی نہیں ہے۔''

''میں چھپ کر سنوں گی۔ آپ دروازہ تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیجیے گا۔ اگرچہ یہ ایک معیوب سی حرکت کہی جاسکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایک ڈاکٹر اور ایک مریض کے معاملے میں اسے معیوب نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''جی ہاں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس معاملے میں یہ معیوب بات نہیں ہوگی۔''

''تو آپ جائیے اس کے پاس! اس سے کہیے گا کہ اس کے ٹخنے کے اوپر جو معمولی سا زخم رہ گیا ہے، اس کی ڈریسنگ شام کو کی جائے گی اور اس کے بعد یہ ضروری نہیں رہے گا کہ اسے اسپتال میں رکھا جائے۔''

''بہتر ہے۔''

ڈاکٹر چلا گیا۔ روبی کرسی سے اٹھی تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ مشہود! مشہود! اس کا رواں رواں پکار رہا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد وہ ''مریض'' کے کمرے کے تھوڑے سے کھلے ہوئے دروازے پر کھڑی اندر سے آنے والی آوازیں سن رہی تھی اور خوشی سے اس کا رواں رواں جھوم اٹھا

تھا۔ اس کے دل نے یہ باور کرنے میں غلطی نہیں کی تھی کہ اس کا وہ مریض مشہود ہی ہے۔

ڈاکٹر ایک نرس کے ساتھ کمرے سے نکلا اور دروازہ بند کر کے سوالیہ نظروں سے روبی کی طرف دیکھنے لگا۔

''آپ جائیے!'' روبی نے اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر اور نرس چلے گئے۔ روبی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ اگرچہ وہ تین ماہ سے مشہود کا نہایت مسخ چہرہ دیکھتی رہی تھی لیکن اس وقت وہ چہرہ دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔

مشہود خالی خالی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

روبی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے بستر کے قریب گئی اور کچھ دیر تک خاموش کھڑی اپنے اُمنڈتے ہوئے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس دوران میں مشہود اسے الجھی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ روبی اس کے قریب آکر اس طرح خاموش کیوں کھڑی ہوگئی تھی۔

''سنو!'' روبی اپنے جذبات پر پوری طرح قابو پانے کے بعد مضبوط لہجے میں بولی۔ ''تم میرے سامنے خاموش کیوں رہتے ہو؟''

مشہود چپ چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''تمہیں ڈر ہے کہ میں تمہاری آواز پہچان لوں گی!''

اس مرتبہ روبی کی آواز خفیف سی کپکپا گئی۔

مشہود کی آنکھوں سے ظاہر ہوا کہ وہ چونکا تھا۔ اس کا چہرہ تو اب اس حد تک مسخ ہو چکا تھا، اس پر کسی قسم کے تاثرات آ ہی نہیں سکتے تھے۔

''اب...'' روبی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنے کی کوشش کی۔ ''یہ بات بھی اب ثابت ہوگئی ہے کہ اس دھماکے نے تمہاری یادداشت پر کوئی اثر نہیں ڈالا ہے۔ کسی وجہ سے تم خود کو چھپانے کے لیے یہ ڈراما کر رہے ہو مشہود!''

مشہود جو لیٹا ہوا تھا، گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔

''میں نے چھپ کر تمہاری آواز سن لی ہے مشہود!''

اس مرتبہ روبی کی آواز کپکپانے لگی۔ ''پہچان گئی ہوں میں تمہیں!''

''نہیں!'' مشہود کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ ''نہیں۔''

''ہاں مشہود!'' روبی آب دیدہ ہوگئی۔ ''میں نے پہچان لیا ہے تمہیں!''

مشہود کے ہونٹ لرزے اور آنکھیں بھیگنے لگیں۔ وہ جلدی سے لیٹ کر بستر پر اوندھا ہوگیا اور اپنا چہرہ تکیے میں چھپانے لگا۔

''خدا کے لیے روبی!'' مشہود کی ہانپتی ہوئی سی آواز میں حواس باختگی تھی۔ ''خدا کے لیے کسی کو بتانا مت!''

''میری طرف دیکھو مشہود!'' روبی کی آنکھیں ڈبڈبانے لگیں۔

''نہیں۔'' مشہود کی آواز کانپ رہی تھی۔ ''میرا یہ بھیانک چہرہ نہ دیکھو روبی!''

''وہ تو میں تین مہینے سے دیکھ رہی ہوں مشہود!'' دو آنسو روبی کے گالوں پر ڈھلک گئے۔

اس مرتبہ مشہود کچھ نہیں بولا۔ اس کا جسم اس طرح ہلکے ہلکے جھٹکے کھانے لگا جیسے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ہے۔

''ہمت سے کام لو مشہود!'' روبی نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''مرد ہو تم! ہر قسم کے حالات کا سامنا تمہیں مردانہ وار ہی کرنا چاہیے۔''

''نہیں! نہیں روبی!'' مشہود روتا رہا۔ ''دنیا کو سمجھ لینے دو کہ میں مر چکا ہوں۔''

''ماہ زیب تمہارے لیے تڑپ رہی ہے مشہود!'' روبی نے کہا۔

مشہود جیسے تڑپ کر اٹھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم۔'' اس کا چہرہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ فوراً اسے خیال آیا وہ اضطراب میں اٹھ بیٹھا تھا۔ اب روبی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔ اس کے ہاتھ بھی نہایت بدنما ہو چکے تھے۔

روبی بستر پر اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''تم وہ چہرہ کیوں چھپا رہے ہو جو اب میرے لیے اجنبی نہیں۔''

مشہود نے سسکی لی۔ ''اسی چہرے کو پسند کرتی تھیں نا تم؟''

''اب بھی پسند کرتی ہوں۔''

''مجھ سے ڈر نہیں لگے گا تمہیں؟''

''اتنے دن سے ڈر نہیں لگا تو اب کیا لگے گا؟ میں ایک سرجن ہوں مشہود! حادثوں کا شکار ہونے والے ایسے چہرے پہلے بھی میرے سامنے آتے رہے ہیں۔ آج تو یہ چہرہ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ یہ میرے مشہود کا چہرہ ہے۔'' روبی نہایت جذباتی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے خود مشہود کے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹائے اور بولی۔ ''اپنے آنسوؤں کو روکو

مشہود!''

مشہود نے ایک جھٹکے سے سسکی لی تو اس کا منہ تھوڑا سا کھل گیا۔ اس کے کئی دانت بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ نظریں جھکا کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔

''یہ ڈراما تم نے کیوں کیا مشہود؟'' روبی نے پوچھا۔

''میں اپنا یہ چہرہ کسی کو کیسے دکھاؤں روبی؟'' مشہود نے بڑے کرب سے کہا۔ ''تم نے ابھی ماہ زیب کی بات کیوں کی تھی؟''

''میں اس سے ملنے گئی تھی۔''

''کب؟'' مشہود نے بے اختیار نظریں اٹھا کر روبی کی طرف دیکھا لیکن جلدی سے پھر سر جھکا لیا۔

''میری طرف دیکھ کر بات کرو مشہود!'' روبی بولی۔

''ہمت نہیں ہے روبی!'' مشہود کا لہجہ بے حد شکستہ تھا۔

''مرد ہو تم! ہمت ہونا چاہیے تم میں! آخر میں بھی تو تمہاری طرف دیکھ رہی ہوں۔''

مشہود ڈرے ہوئے سے انداز میں آہستہ آہستہ سر اٹھانے لگا۔

''ہاں۔'' روبی اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ مسکرائی۔ ''میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔''

مشہود سر اٹھا کر اس طرح روبی کی طرف دیکھنے لگا جیسے شدید بے بسی محسوس کر رہا ہے۔

''میں کل ہی گئی تھی تمہارے گھر۔'' روبی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''میری ماہ زیب کیسی ہے روبی؟'' مشہود نے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے پوچھا۔

جواب میں روبی نے سب کچھ بتا دیا۔ اس نے یہ بتایا کہ مشہود کے بارے میں اسے اچانک شک کیوں ہوا تھا۔

''تمہیں اب بھی مجھ سے اتنی محبت ہے روبی؟'' مشہود کا لہجہ دردناک حد تک یاس انگیز تھا۔

''محبت کبھی نہیں مرتی مشہود!'' روبی نے کہا۔ ''میری زندگی کی آخری سانس بھی تمہارے ہی نام ہوگی لیکن اب میں تمہیں صرف ماہ زیب ہی کا دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''نہیں۔'' مشہود نے ہذیانی انداز میں کہا۔ ''میں اس کا دشمن نہیں ہوں۔ میں اسے قتل نہیں کر سکتا۔ تم نہیں جانتیں روبی! یہ بھیانک چہرہ دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں رک جائیں گی، مر جائے گی وہ!''

''خام خیالی ہے تمہاری! وہ تمہیں بہت چاہتی ہے۔''

''اسی لیے تو مر جائے گی۔''

''وہم ہو گیا ہے تمہیں!''

''نہیں روبی، نہیں! میں جانتا ہوں نا اسے۔ میرا یہ بھیانک چہرہ اسے اتنا دہشت زدہ کر دے گا کہ اس کی حرکتِ قلب بند ہو جائے گی۔ وہ خود ایک مرتبہ کہہ چکی ہے۔''

''کیا کہہ چکی ہے؟''

مشہود نے اپنی اور ماہ زیب کی وہ باتیں دہرا دیں۔

روبی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں، یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔ یہ جان کر وہ خوش ہو جائے گی کہ تم زندہ ہو۔ وہ آج بھی تمہیں اپنے خیالوں میں بسائے ہوئے ہے۔ وہ تمہیں آج بھی یاد کر کے روتی ہے۔''

مشہود نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے نا، دھیرے دھیرے اسے صبر آ ہی جائے گا۔ وہ مجھے بھول ہی جائے گی۔''

''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔''

''تب بھی۔'' مشہود کا لہجہ یکایک مستحکم ہو گیا۔ ''تب بھی میں یہ بھیانک چہرہ لے کر اس کے سامنے نہیں جاؤں گا۔''

روبی کے چہرے پر گہری سوچ بچار کے آثار پھیل گئے۔

مشہود کچھ توقف سے بولا۔ ''ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ آج مجھے اسپتال سے رخصت کر دیا جائے گا۔''

''نہیں۔'' روبی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اب ایسا نہیں ہوگا۔ جب تم اپنے گھر نہیں جانا چاہتے تو کہاں جاؤ گے؟''

''کہیں بھی! کہیں بھی چلا جاؤں گا۔'' مشہود دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ ''کہیں بہت دور! بہت دور!''

''اپنی ماہ زیب سے دور؟''

مشہود جیسے تڑپ گیا۔ ''ایسی بات زبان پر نہ لاؤ روبی کہ میں رونے لگوں!''

''تم کہیں نہیں جاؤ گے مشہود!'' روبی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آج سے تم میرے پاس ماہ زیب کی امانت ہو۔ یہ میرے دل کی پکار ہے کہ میری محبت اپنا فرض ادا کرے۔ ماہ زیب کو اس کی امانت میں ضرور لوٹاؤں گی۔''

''نہیں روبی، نہیں! پلیز!'' مشہود روہانسا ہو گیا۔ ''میں یہ چہرے لے کر ماہ زیب کے سامنے نہیں جا سکتا۔''

''ہاں۔'' روبی مسکرائی۔ ''تم یہ چہرے لے کر ماہ زیب کے پاس نہیں جاؤ گے۔ تمہیں اپنا اصل چہرہ واپس مل

جائے گا۔''

مشہود حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے روبی؟''

''ممکن ہے۔'' روبی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ''تمہارے چہرے کی پلاسٹک سرجری ہوگی۔ چہرے ہی کی نہیں، سارے جسم کی! تم بالکل ویسے ہی بن جاؤ گے جیسے تھے۔''

مشہود کی آنکھوں میں حیرت کا تاثر زیادہ گہرا ہوگیا۔

☆☆☆

دفتر سے مسعود کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ ملازمہ کو ہدایت کردی گئی تھی کہ مسعود آئے تو اسے عتیقہ بیگم کی خدمت میں حاضر ہونے کا پیغام دے دیا جائے۔ مسعود کو اندازہ بھی تھا کہ پیشی آج بھی ہوگی۔ پیغام ملنے پر وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر عتیقہ بیگم کے کمرے میں پہنچا اور اس نے فوراً ہی محسوس کرلیا کہ ماحول گزشتہ روز سے زیادہ گمبھیر تھا۔ مینائی صاحب متفکر چہرے کے ساتھ نظریں جھکائے بیٹھے تھے اور عتیقہ بیگم ٹہل رہی تھیں۔ مسعود نے دونوں کو سلام کیا۔ جواب دونوں ہی نے اشارے سے دیا۔ مسعود سوالیہ نظروں سے عتیقہ بیگم کی طرف دیکھنے لگا۔

''میں نے کل بات کی تھی دلہن سے۔'' عتیقہ بیگم نے کوئی تمہید ضروری نہیں سمجھی۔ ''وہ اسی گھر میں رہنے پر اصرار کر رہی ہے۔''

''جی!'' مسعود نے نظریں جھکالیں۔ ''یہ اندازہ مجھے پہلے ہی تھا۔''

''ہاں ہاں!'' عتیقہ بیگم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''تم سے زیادہ صحیح اندازہ اور کون لگا سکتا ہے!''

''جی!'' مسعود ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''دلہن کے لیے اب اسی گھر میں تو کشش ہے۔'' عتیقہ بیگم نے کہا۔ ''تو پھر اب یہ کشش کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہنا چاہیے۔ آس پاس رہنے والوں سے وہ ڈھکی چھپی رہی بھی نہیں ہے۔ اب اس کا اعلان ہی کردیا جائے تو اچھا ہے۔ ماہ زیب کی عدت کے دن ختم ہوتے ہی اس کی اور تمہاری شادی کردی جائے گی۔''

مسعود پر جیسے بجلی گر پڑی۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ!'' وہ تیزی سے بولا۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ جب تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو تو پھر یہ علی الاعلان ہونی چاہیے۔''

مسعود کی سانسیں تیزی سے چلنے لگی تھیں۔ وہ بولا۔ ''محبت تو میں آپ سے بھی کرتا ہوں امی صاحبہ!''

''بدتمیز!'' عتیقہ بیگم گرجیں۔ ''بے ہودہ لڑکے! میں تمہاری ماں ہوں۔''

''وہ میری بھابی ہیں۔'' مسعود کی آواز کانپ گئی۔

''اسی لیے چھیڑ چھاڑ کا بہت شوق ہے تمہیں اس سے!''

''یہ رشتا تو ایسا ہی ہوتا ہے امی صاحبہ!''

''میں نے تمہیں دلیلیں سننے کے لیے نہیں بلایا۔'' عتیقہ بیگم نے تیز لہجے میں کہا۔ ''یہ میرا فیصلہ ہے۔''

''میں یہ نہیں کرسکتا امی صاحبہ!'' مسعود کا جسم کانپنے لگا۔

''تو شادی کے بغیر ہی تم دونوں اپنی محبت کا کھیل جاری رکھنا چاہتے ہو؟''

''امی صاحبہ!'' مسعود کے لہجے میں شدید احتجاج تھا۔

''میں آس پاس رہنے والوں کی طنزیہ نگاہیں برداشت نہیں کرسکتی۔'' عتیقہ بیگم نے کہا۔ ''لوگ دیکھتے رہے ہیں کہ تم اسے شاپنگ کرانے لے جاتے رہے ہو۔''

''جب بھائی جان زندہ تھے امی صاحبہ!'' مسعود نے کہا۔ ''دفتر کی زیادہ ذمے داریاں انہوں نے ہی اپنے سر لے رکھی تھیں۔ بھابی جان کو اگر دن میں ہی کچھ شاپنگ کرنا ہوتی تھی تو بھائی جان مجھے دفتر نہیں لے جاتے تھے۔ انہی سے مجھے ہدایت ملتی تھی کہ بھابی کو شاپنگ کرا لانا۔''

''یہ بھی ایک غلطی تھی مشہود کی۔'' عتیقہ بیگم نے کہا۔ ''تم دونوں کو ایک دوسرے سے بے تکلف ہونے کا موقع ملتا چلا گیا۔ مشہود کے بعد اب تو تم دونوں خوب کھل کھیلو گے! اسی لیے تو وہ اس گھر سے نہیں جانا چاہتی!''

''یہ آپ کیسی باتیں کررہی ہیں!'' مسعود روہانسا ہوگیا۔ ''میں نے ہمیشہ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کی ہے امی صاحبہ لیکن یہ میں نہیں کرسکتا۔''

''تو پھر میں کہیں سے زہر لاکے کھالوں گی۔'' عتیقہ بیگم نے غصے سے کہا۔ ''زہر نہیں مل سکا تو جا کے سمندر میں ڈوب مروں گی۔ یہ بھی نہ ہوا تو گھر کی چھت سے کود کر جان دے دوں گی۔ اگر تمہیں بھائی کے بعد ماں کی لاش اٹھانے کا بھی شوق ہے تو یہ بھی پورا کرلینا۔''

مسعود کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھا اور عتیقہ بیگم سے لپٹ گیا جو اس وقت ایک صوفے پر بیٹھ گئی تھیں۔

"ایسی باتیں نہ کریں امی صاحبہ! ایسی باتیں نہ کریں۔" مسعود نے روتے ہوئے اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکرایا۔ "میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ ہاں اس پر دل ضرور کڑھتا رہا ہے کہ آپ سے ہم بھائیوں کو وہ محبت نہیں ملی جو ملنا چاہیے تھی۔"

"ہاں۔" عتیقہ بیگم نے بل کھا کر کہا۔ "میں تمہاری سوتیلی ماں ہوں نا!"

"یہ میں نے کب کہا ہے امی صاحبہ!"

"تو جو میں کہہ رہی ہوں، وہ تمہیں کرنا ہوگا۔"

اب مسعود کچھ نہیں بولا، بس روتا رہا۔ عتیقہ بیگم بھی خاموش بیٹھی رہیں، روتے ہوئے مسعود پر انہوں نے ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ بینائی صاحب اس وقت سپاٹ چہرے کے ساتھ چھت کو تکنے لگے تھے۔ آہستہ آہستہ خود ہی مسعود کے آنسو تھمے۔ وہ عتیقہ بیگم کے قریب بیٹھا رہا اب اس کا آنسوؤں میں بھیگا ہوا چہرہ پتھرا سا گیا تھا۔ اس کی پلکیں بہت کم جھپک رہی تھیں اور وہ ماں کو دیکھے جا رہا تھا۔

عتیقہ بیگم کچھ دیر بعد بولیں۔ "اب تم جاؤ۔ ایک مہینے بعد تمہاری شادی کردی جائے گی۔"

مسعود خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اب بھی پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

"کیا تم نے سنا نہیں؟" وہ کچھ توقف سے بولیں۔

مسعود نے شاید واقعی کچھ نہیں سنا تھا۔ وہ بڑبڑایا۔ "بھابی جان کو معلوم ہوگا تو وہ اپنی جان پر کھیل جائیں گی۔"

عتیقہ بیگم نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ "ایسا سوانگ تو وہ نہیں رچائے گی۔ خواہش اس کی بھی یہی ہوگی کہ......"

مسعود سے ان کی پوری بات نہیں سنی گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

بینائی صاحب نے ایک نظر دیکھا اور پھر چھت کو تکنے لگے۔ کچھ دیر تک کمرے پر ایک بوجھل سکوت رہا۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں!" عتیقہ بیگم کی آواز نے وہ سکوت توڑا۔

بینائی صاحب نے آہستگی سے ان کی طرف سر گھمایا ایک ٹھنڈی سانس لی پھر کہا۔ "آپ نے مسعود سے اپنے بارے میں طنزاً سوتیلی ماں کی بات کہی تھی لیکن آپ کے اس رویے کے باعث میرے علاوہ کوئی بھی آپ کو سوتیلی ماں سمجھ سکتا ہے۔"

عتیقہ بیگم نے تلخی سے جواب دیا۔ "اگر میں سوتیلی ماں ہوتی تو اس گھر میں پھیلی ہوئی بیماری کا یہ علاج نہ سوچتی اور نہ مجھے ان باتوں پر شرم آتی جو آس پاس کے گھر میں کی جارہی ہیں!"

"آخر کیا باتیں کی جارہی ہیں، یہ تو کوئی ایسی اہم بات نہیں کہ وہ دلہن کو شاپنگ کرانے لے جاتا تھا!"

"لوگوں نے اپنے گھروں کی کھڑکیوں سے ان دونوں کو لان میں بھی ہنسی مذاق کرتے ہوئے دیکھا ہے اور ان سب باتوں سے ایک نتیجہ بھی نکال لیا ہے۔ آپ تو گھر سے نکلتے ہی نہیں ہیں۔ جب دفتر جایا کرتے تھے، تب بھی کم نکلتے تھے۔ ویسے بھی مردوں میں اس قسم کی باتیں نہیں ہوتی۔ سرگوشیاں تو عورتیں کرنے لگی ہیں۔ جان محمد صاحب کی بیوی نے تو مجھے صاف صاف بتایا ہے کہ اب تو کھل کر کھیل شروع ہونے کی باتیں کی جانے لگی ہیں۔"

"جان محمد صاحب کی بیوی بہت ہمدرد ہیں آپ کی!" بینائی صاحب کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

عتیقہ بیگم جیسے بل کھا گئیں اور بولیں۔ "ان کے منہ سے میں نے کبھی کوئی جھوٹ نہیں سنا!" پھر انہوں نے ترش رخ کر کہا۔ "کم از کم اس معاملے میں تو آپ کو مجھ پر طنز نہیں کرنا چاہیے۔ میں اس گھر کی بھلائی ہی سوچ سکتی ہوں، اس گھر کو رسوا ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

بینائی صاحب خاموش رہے۔

عتیقہ بیگم ذرا دیر کچھ سوچتی رہیں پھر بڑبڑانے والے انداز میں بولیں۔ "ماہ زیب سے بھی مجھے ابھی بات کرلینی چاہیے۔"

"آپ اب کبھی کبھی اسے دلہن کے بجائے ماہ زیب کہنے لگی ہیں!"

"ہاں۔" عتیقہ بیگم نے کہا۔ "دلہن تو عادت کی وجہ سے منہ سے نکل جاتا ہے ورنہ اب وہ صرف ایک لڑکی ہے جس سے میں اپنے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

بینائی صاحب نے پھر خاموشی اختیار کرلی۔ کبھی کبھی وہ اس بات پر بری طرح تلملا جاتے تھے کہ عتیقہ بیگم ابتدا ہی سے ان پر چھائی رہی تھیں۔ ایک آدھ موقع کے علاوہ ان سے زیادہ اختلاف کرنے کی ہمت بینائی صاحب میں نہیں ہوسکی تھی۔

"آج ہی میں اس سے بات کروں گی؟" عتیقہ بیگم نے بینائی صاحب کو گھورتے ہوئے کہا۔

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔" بینائی صاحب نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اگر آپ اسے بلائیں گی تو میں باہر چلا

جاؤں گا۔"
عتیقہ بیگم منہ بنا کر اٹھیں۔ "میں ہی چلی جاتی ہوں۔"
بینائی صاحب چپ رہے۔
عتیقہ بیگم ماہ زیب کے کمرے طرف قدم بڑھاتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبی نظر آرہی تھیں۔ ان کے مزاج کی سخت گیری کا سبب ان کی شادی تھی۔ شادی سے پہلے انہوں نے سنا تھا کہ بینائی صاحب دل پھینک شخصیت تھے۔ انہوں نے سخت گیری اس لیے اپنائی تھی کہ شادی کے بعد بینائی صاحب کے قدم نہ بہک سکیں۔ اپنی دانست میں انہوں نے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے بینائی صاحب کے بارے میں "بی جمالو" قسم کی عورتوں سے جو کچھ سنا تھا، وہ قطعی غلط تھا۔
مشہود سے ماہ زیب کی شادی کے بعد ایک روایتی ساس بن گئی تھیں۔ انہیں مسعود اور ماہ زیب کا تعلق ہمیشہ ہی گراں گزرا تھا اور مشہود کے بعد وہ ایک بار پھر "کانوں کی کچی" ثابت ہوئی تھیں۔ جو کچھ بھی انہوں نے دو ایک عورتوں سے سنا تھا، اس پر ایمان لے آئی تھیں۔ مسعود اور ماہ زیب کی شادی کا فیصلہ ان کی دانست میں صحیح تھا۔ وہ خود کو ذرا بھی غلط نہیں سمجھ رہی تھیں۔
بستر پر لیٹی اور سوچ میں ڈوبی ہوئی ماہ زیب اس وقت بوکھلائے ہوئے سے انداز میں اٹھی جب اس نے عتیقہ بیگم کو کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس نے جلدی سے سلام کیا جس کا جواب اشارے سے دیا گیا۔
"چچان آج بھی نہیں آئے دادی جان!" ماہ رخ بولی جو اپنی کتابیں کھولے بیٹھی تھی۔
"چچان!" عتیقہ بیگم نے تلخی سے کہا۔ "بس چچان یاد رہتے ہیں تمہیں! سلام کرنے کا خیال نہیں رہتا!" پھر وہ ماہ زیب سے بولیں۔ "یہ تربیت کررہی ہو تم اس کی!"
ماہ زیب نے جلدی سے کہا۔ "اس کا دھیان بٹا ہوا ہے نا امی صاحبہ! وہ اسی سوچ میں تھی کہ مسعود اسے پڑھانے نہیں......"
عتیقہ بیگم نے اس کی بات کاٹی۔ "اس نے مجھے کل بھی سلام نہیں کیا تھا۔"
"کل بھی اسے یہی الجھن تھی۔" ماہ زیب نے جواب دیا اور پھر ماہ رخ کی طرف دیکھتے ہوئے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ "کوئی بات کرنے سے پہلے، بڑوں کو سلام کیا جاتا ہے۔"
ماہ رخ نے کچھ سہمے ہوئے انداز میں عتیقہ بیگم کو سلام کیا۔
جواباً عتیقہ بیگم نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ کہا پھر بلند آواز میں بولیں۔ "اپنی کتابیں لے کر تم خود چلی جاؤ اس کے کمرے میں۔ وہیں جا کر پڑھ لیا کرو اس سے! اب وہ ایک مہینے تک اس کمرے میں نہیں آئے گا۔"
"کیوں دادی جان؟"
"میں نے تم سے جو کہا ہے، وہ کرو۔" عتیقہ بیگم سختی سے بولیں۔ "کتابیں اٹھاؤ اپنی اور جاؤ۔"
ماہ رخ کچھ سہم گئی اور اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔ عتیقہ بیگم کی یہ بات ماہ زیب کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ مسعود اب ایک ماہ تک اس کمرے میں کیوں آئے گا لیکن وہ عتیقہ بیگم سے اس بارے میں کوئی سوال کرنے کی ہمت نہیں کرسکی۔
"بیٹھیے امی صاحبہ!" وہ دھیمی آواز میں بولی۔
عتیقہ بیگم بیٹھ گئیں۔
ماہ رخ نے کتابیں اٹھا کر کمرے سے جاتے ہوئے ایک نظر عتیقہ بیگم کو اور ایک نظر ماہ زیب کو دیکھا اور چپ چاپ چلی گئی۔
ماہ زیب کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوچکی تھیں۔ اسے گزشتہ شام کی باتیں یاد آگئی تھیں۔ کل سے اب تک وہ اسی بارے میں سوچتی رہی تھی۔ اسے یہ بھی عجیب سا لگا تھا کہ مسعود ماہ رخ کو پڑھانے نہیں آیا تھا۔ گزشتہ شام ماہ رخ اس کے پاس سے آئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ مسعود کو اس دن اپنے دفتر کے کچھ کام تھے جو وہ گھر پر کرنا چاہتا تھا۔ ماہ زیب کو وہ بات عجیب سی لگی تھی پھر صبح وہ ناشتے کی میز پر بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس روز اسے اتنی جلدی تھی کہ وہ اپنے کمرے ہی میں ایک پیالی چائے کی پی کر بہت عجلت میں دفتر چلا گیا تھا۔ ماہ زیب کو یہ بات ملازمہ سے معلوم ہوئی تھی۔
عتیقہ بیگم کی گزشتہ شام کی باتوں کے باعث ماہ زیب کو یہ سب کچھ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا اور اب عتیقہ بیگم دوسرے دن بھی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔
"کل سے اب تک کچھ سوچا تم؟" عتیقہ بیگم غور سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔
ماہ زیب کے ہونٹ لرزنے لگے۔ وہ آہستہ سے بولی۔ "میں اس گھر سے کہاں جاسکتی ہوں امی صاحبہ؟"
"اچھا۔" عتیقہ بیگم نے کہا۔ "تو پھر اس گھر میں تمہارے مستقل رہنے کا کوئی جواز بھی ہونا چاہیے۔"
ماہ زیب ان کا منہ دیکھنے لگی۔
عتیقہ بیگم پھر بولیں۔ "یہ بات قدرتی یا فطری بھی ہے

کہ جب ایک سہولت تمہیں اسی گھر میں میسر آ گئی ہے تو اِدھر اُدھر کیوں بھٹکو!''

''میں ...... میں سمجھی نہیں۔'' ماہ زیب کے منہ سے نکلا۔

''مسعود تمہیں بہت پسند ہے نا؟''

''جی؟'' ماہ زیب ٹھٹک سی گئی۔ اس کا انداز ہ سوالیہ تھا۔

''میں جواب مانگ رہی ہوں۔'' عتیقہ بیگم نے کہا۔

''جی ہاں۔'' ماہ زیب بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''وہ مجھے ہمیشہ ہی سے بہت عزیز رہا ہے اور اس نے بھی ہمیشہ میرا خیال رکھا ہے۔ جو کچھ کل آپ نے کہا تھا، مجھے یقین ہے کہ مسعود ہرگز نہیں کہے گا۔''

''میں جانتی ہوں، وہ نہیں کہے گا۔'' عتیقہ بیگم نے تلخی سے کہا۔ ''وہ بھی اس پر آمادہ نہیں ہوگا کہ تم اس گھر سے کہیں چلی جاؤ یا کسی اور سے شادی کرلو۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم دونوں کی شادی کردی جائے!''

''جی!'' ماہ زیب ہکابکا رہ گئی۔

شادی کی بات سن کر جو حالت مسعود کی ہوئی تھی، وہی حال ماہ زیب کا ہوا تھا۔

عتیقہ بیگم بولیں۔ ''تم دونوں ایک دوسرے کو بہت عزیز ہو۔ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو...... لہٰذا مناسب یہی ہوگا کہ یہ بات دنیا والوں سے نہ چھپائی جائے۔''

ماہ زیب کانپ گئی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی صاحبہ؟''

''وہی کہہ رہی ہوں جو تم دونوں چاہتے ہو۔'' عتیقہ بیگم نے کہا۔

''نہیں!'' ماہ زیب ہذیانی انداز میں چیخ پڑی۔ ''یہ نہ مسعود چاہ سکتا ہے، نہ میں!''

''آہستہ بولو!'' عتیقہ بیگم نے غصے سے کہا۔ ''تماشا نہ بنواؤ۔''

''تماشا تو آپ بنوانا چاہتی ہیں!'' ماہ زیب یکا یک بپھر گئی۔

''تمیز سے بات کرو ماہ زیب!'' عتیقہ بیگم کا غصہ بڑھا۔ ''یہ میرا فیصلہ ہے کہ جو کچھ ہو، وہ جائز طریقے سے ہو۔ میں تم دونوں کو اس گھر میں کوئی گھناؤنا کھیل جاری نہیں رکھنے دوں گی۔''

''امی صاحبہ!'' ماہ زیب پھر چیخ پڑی۔

''دھیمی آواز میں بات نہیں کروگی تم؟'' عتیقہ بیگم غصے سے کھڑی ہوگئیں۔

ماہ زیب کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا سارا جسم بخار سے تپنے لگا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے عتیقہ بیگم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ بات یہاں تک بھی پہنچ سکتی ہے۔

یکا یک عتیقہ بیگم بڑی تیزی سے دروازے کی طرف گئیں اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ باہر کھڑی ملازمہ بوکھلا گئی۔ عتیقہ بیگم نے غالباً اس کی آہٹ محسوس کرلی تھی۔

''یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' عتیقہ بیگم اس پر برسیں۔

''وہ ...... وہ ...... میں نے ...... چیخنے کی آواز......'' ملازمہ بالکل حواس باختہ ہوچکی تھی۔

''جاؤ یہاں سے!'' عتیقہ بیگم نے گرج کر کہا۔

ملازمہ جیسے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ عتیقہ بیگم نے زور دار آواز کے ساتھ دروازہ بند کیا اور پلٹ کر نہایت اشتعال میں بولیں۔ ''کروالیا تماشا؟''

ماہ زیب کچھ نہیں بولی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر دیوار کو تک رہی تھی۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ سنسناہٹ سارے جسم میں بھی پھیلی ہوئی تھی۔

عتیقہ بیگم بولیں۔ ''اب بھی زور سے کچھ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھ گئیں؟''

ماہ زیب اس وقت کچھ سمجھنے کی حالت ہی میں نہیں تھی۔ اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا اور وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔

''اب زیادہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عتیقہ بیگم نے نہایت تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں نے کوئی ایسا فیصلہ نہیں سنایا ہے جس کی تمہیں تمنا نہ ہو۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ تم دنیا والوں کی نظر میں شوہر پرست بننا چاہتی ہو۔ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتی ہو کہ ساری زندگی مرحوم شوہر کی یاد میں ہی گزار دوگی۔ نہیں ماہ زیب بیگم! میں اپنے گھر میں یہ کھیل نہیں ہونے دوں گی۔ میں نے مسعود سے بھی کہہ دیا ہے۔ تمہاری طرح وہ بھی ڈراما کررہا ہے لیکن اپنا فیصلہ میں اسے بھی سنا چکی ہوں۔ اگر وہ ایک گھناؤنا کھیل کھیلنے ہی پر اڑا رہا تو اسے اپنی ماں کی لاش کو کندھا دینے کے لیے بھی تیار رہنا پڑے گا۔''

''بس! ...... بس کیجیے امی صا......'' ماہ زیب کی آواز اس کے حلق میں گھٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن اس کے سپاٹ چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ان آنسوؤں سے بے خبر تھی۔

عتیقہ بیگم نے اس پر دھیان نہیں دیا اور کہا۔ ''مسعود میرا بیٹا ہے۔ وہ ہرگز نہیں چاہے گا کہ میری لاش دیکھے۔ تم کل

تک مجھے جواب دے دو کہ عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہو یا میں دیکھتی رہوں کہ لوگوں کی طنزیہ نگاہیں میرے گھر کی طرف اٹھتی رہیں! یہ دوسری بات میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے اور اگر تم ثابت کرنا چاہتی ہو کہ مسعود سے تمہارا کوئی تعلق نہیں تو میں تمہاری شادی کہیں اور کردوں گی۔ اس صورت میں ماہ رخ ہمارے ساتھ رہے گی۔ وہ اس گھر کی پوتی ہے، اسے اسی گھر میں رہنا ہوگا۔'' عتیقہ بیگم اس کے کمرے سے چلی گئیں۔

ماہ زیب بستر پر گر کر روتی رہی۔

قدرت اسے زندگی کے ایک انتہائی اذیت ناک موڑ پر لے آئی تھی۔ مسعود کو شوہر کی حیثیت سے قبول کرنا اس کے لیے ایک بہت بڑا عذاب تھا۔ شاید وہ اپنی جان ہی دے دیتی اگر اسے اپنی عزیز بیٹی ماہ رخ کا خیال نہ ہوتا۔ اس گھر سے جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اس معاشرے میں ایک خوب صورت اور جوان عورت کے لیے کسی کے سہارے کے بغیر باعزت زندگی گزارنا ممکن نہیں ہوتا وہ بوالہوس نگاہوں کا ہدف بن جاتی۔ گندگی کا ڈھیر بن جانا ہی اس کا مقدر بنتا اور اس کے بعد اس کی بیٹی بھی اسی آگ کا ایندھن بننے پر مجبور ہوتی۔

کسی اور سے شادی کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ماہ رخ اس سے چھن جاتی۔ اس کے کلیجے کا ٹکڑا اس سے الگ کردیا جاتا۔ وہ ساری زندگی اس کے لیے تڑپتی رہتی۔

ان خیالات میں نہ جانے کتنا وقت گزرا کہ اس نے کمرے کی طرف دوڑ کر آتے ہوئے قدموں کی آواز سنی جو اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر واش روم میں داخل ہوئی اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماہ رخ اسے اس حالت میں دیکھے۔

آئینے میں اس نے خود کو دیکھا۔ اس کے بال بکھر گئے تھے، چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔

باہر سے دروازہ کھلنے اور ماہ رخ کے کمرے میں آنے کی آواز سنائی دی۔

ماہ زیب واش بیسن پر جھک کر منہ پر پانی کے چھپکے مارنے لگی۔ اس وقت اسے اپنے امنڈتے ہوئے جذبات پر قابو پانے کے لیے شدید جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ ماہ رخ سے اپنی حالت چھپانا اس کے لیے ضروری تھا ورنہ وہ معصومانہ سوالات کا نشانہ بنتی کہ اس کے لیے اپنے جذبات پر قابو پانا مشکل ہوجاتا۔

''امی!'' ماہ رخ نے اسے پکارا۔

''ابھی آتی ہوں چندا! ذرا منہ دھولوں!'' جواب دیتے ہوئے ماہ زیب کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ابھی اس کے جذبات پوری طرح قابو میں نہیں آئے تھے۔ تمام خیالات کو دماغ سے جھٹک دینا ممکن بھی نہیں تھا مگر اسے ان خیالات کے باوجود اپنی ظاہری حالت ایسی رکھنا تھی کہ ماہ رخ کو معمول کے مطابق نظر آئے۔

اپنی دانست میں خود کو معمول پر لانے کے بعد وہ واش روم سے نکلی۔ اپنے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ بھی لے آئی۔

''چچاجان کو کیا ہوگیا ہے امی؟'' ماہ رخ اس سے لپٹ گئی۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' ماہ زیب اسے اپنے ساتھ بستر کی طرف لے جانے لگی۔

''مجھے پڑھا کر کہنے لگے کہ جاؤ اب مجھے کام کرنا ہے۔ پہلے تو وہ میرے ساتھ لوڈو کھیلتے تھے، کبھی کیرم کھیلتے تھے۔''

''کبھی کبھی کام زیادہ ہوجاتا ہے میری جان!'' ماہ زیب نے بستر پر بیٹھ کر اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ممکنہ حد تک اس کا چہرہ ماہ رخ کے سامنے نہ رہے۔

اس کے بعد بھی ماہ رخ کے سوالات کا سلسلہ جاری رہا' اس نے اپنی دادی جان کے بارے بھی سوالات کیے۔ اس چھوٹی سی بچی کو بھی احساس تھا کہ اس کمرے میں کبھی قدم نہ رکھنے والی عتیقہ بیگم وہاں کیوں آنے لگی تھیں اور ماہ زیب سے ان کی کیا باتیں ہوئی تھیں۔

ان سب سوالات کا جواب دینا ممکن نہیں تھا لیکن ماہ زیب کسی نہ کسی طرح ماہ رخ کو بہلانے میں کامیاب ہوگئی۔

اس رات جب ماہ رخ سوگئی تو اس کی طرف دیکھتے ہوئے ماہ زیب کی آنکھوں میں پھر آنسو تیرنے لگے۔ وہ اس زہریلے مادے سے پیچھا چھڑا ہی نہیں سکتی تھی جو عتیقہ بیگم اس کے دماغ میں بھر گئی تھیں۔ خیالات کا سلسلہ کسی لمحے بھی رکا نہیں تھا۔

کئی اقدام ماہ زیب کے دماغ میں آئے تھے لیکن اس نے انہیں خود ہی روک دیا۔ اگر وہ کسی اور سے شادی پر آمادگی ظاہر کر کے عتیقہ بیگم کے قدموں میں گر کر کسی طرح یہ منوا بھی لیتی کہ ماہ رخ کو اس سے نہیں چھینا جائے گا تو بھی مستقبل کسی طرح بھی اندیشوں سے خالی نہ رہتا۔ یہ بات طے تھی کہ اس سے کوئی غیر شادی شدہ شخص شادی نہیں کرتا۔ وہ یا تو کسی کی دوسری بیوی بنتی یا وہ کوئی ایسا شخص ہوتا جس کی بیوی مر چکی ہوتی اور اس کے دو ایک بچے بھی ہوتے۔ ماہ رخ کو ان بچوں کے برابر کا درجہ نہیں ملتا اور اگر اس کے بچے نہ بھی ہوتے تو جب ماہ زیب اس کے بچوں کی ماں بنتی تو اس شخص کو وہ بچے

ماہ رخ سے زیادہ عزیز ہوتے۔

ماہ زیب اب تک دوبارہ کوئی بچہ جنم نہیں دے سکی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ دوبارہ ماں نہیں بن سکتی تھی۔ دراصل مشہود ہی یہ چاہتا تھا کہ جب تک ماہ رخ پانچ چھ سال کی نہ ہوجائے، اس وقت تک کوئی دوسرا بچہ ہو۔

اور اب وہ وقت آیا تھا تو!

ماہ زیب کے آنسو تکیے میں جذب ہوتے رہے اور بہت رات گزرنے کے بعد کسی وقت اسے نیند آئی۔

پھر دوسرا دن بھی سوچتے ہوئے ہی گزرا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔

چھ بجے ماہ رخ اپنی کتابیں لے کر مسعود کے کمرے میں چلی گئی۔ گزشتہ روز مسعود نے اس سے یہی کہا تھا کہ وہ پڑھنے کے لیے اس کے کمرے میں آجایا کرے۔

ماہ زیب پر یہ بات بالکل واضح ہوگئی تھی کہ حالات کی اس کروٹ کے باعث وہ اس کا سامنا کرنے سے گریز کررہا تھا۔

عتیقہ بیگم اس کے کمرے میں اسی وقت آئیں جب ماہ رخ مسعود کے کمرے میں جاچکی تھی۔

ماہ زیب ان کے سامنے نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

''کیا فیصلہ کیا تم نے؟'' آخر عتیقہ بیگم بولیں۔

''میں کیا فیصلہ کرسکتی ہوں امی صاحبہ!'' ماہ زیب نے جواب دیتے ہوئے بھی نظریں جھکائے رکھیں۔ ''اس گھر میں وہی ہوتا ہے جو آپ چاہتی ہیں۔ آپ حاکم ہیں۔''

ماہ زیب کے لہجے میں بھری ہوئی تلخی عتیقہ بیگم نے شدت سے محسوس کی۔ ان کی پیشانی پر پڑنے والی سلوٹیں اس کی غماز تھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئیں۔

''ٹھیک ہے۔'' انہوں نے فیصلہ سنایا۔ ''عدت پوری ہونے کے تین دن بعد تمہاری اور مسعود کی شادی کردی جائے گی پھر تم دونوں اپنے دل کے ارمان نکالنے کے لیے آزاد ہوگے۔''

ماہ زیب کا چہرہ اتنا سرخ ہوگیا جیسے اس کے سارے وجود میں آگ بھڑک اٹھی ہے۔

عتیقہ بیگم کمرے سے چلی گئیں۔

☆☆☆

دو دن گزر گئے۔ مشہود کو ماہ زیب، ماہ رخ ہی نہیں، گھر کے بھی افراد شدت سے یاد آرہے تھے لیکن وہ اپنے مسخ چہرے کے ساتھ ان کے سامنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ علاج کے دوران میں تو اس کے شب و روز بڑی اذیت میں گزرے تھے لیکن اب اس کی اذیت میں کچھ کمی آئی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ روبی کی باتوں سے اس کی کچھ امید بندھی تھی۔ روبی نے اسے یقین دلایا تھا کہ سرجری کے بعد وہ بالکل ویسا ہوجائے گا جیسا تھا۔ اس کے بعد اسے اپنے ''پیاروں'' سے ملنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔

اپنی یادداشت کھو جانے کا کھیل اس نے بدستور جاری رکھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اسے اپنے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتانا پڑتا اور پولیس مزید چھان پھٹک کرنے کے بعد گھر والوں کو اس کے بارے میں اطلاع دے دیتی۔ مشہود کو اپنے اسی مسخ چہرے کے ساتھ ان کے سامنے جانا پڑتا اور اس کے خیال کے مطابق اس کا مسخ چہرہ دیکھ کر ماہ زیب کی حرکت قلب بند ہوسکتی تھی۔

''وہ زندہ تو رہے۔'' مشہود نے کرب سے گزرتے ہوئے روبی سے کہا۔ ''میں اس سے دور رہ کر بھی کسی نہ کسی طرح جی ہی سکتا ہوں۔''

مشہود کی اسی ضد کی وجہ سے روبی نے اسے یادداشت کھو جانے کا کھیل جاری رکھنے دیا تھا۔

مشہود کے وہ دن اس بے قراری میں گزرے کہ روبی اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکے گی یا نہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ سرجری کے لیے اسے امریکا لے جانے کے سلسلے میں جو قانونی دشواریاں تھیں، انہیں ختم کرنے کے لیے وہ حکام بالا سے بات چیت کررہی تھی۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ اس کا پاسپورٹ نہیں تھا اور نیا پاسپورٹ شناختی کارڈ کے بغیر نہیں بن سکتا تھا۔ ہاں اگر وہ پولیس کو سب کچھ بتا دیتا اور اس کی شخصیت آشکارا ہوجاتی تو اس کے پرانے شناختی کارڈ کی ڈپلی کیٹ نکل آتی اس کارڈ کے لیے مشہود کو اپنی نئی تصویر کھنچوانا پڑتی لیکن وہ اس کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

تیسرے دن روبی نے کچھ مایوس انداز میں اس سے کہا۔ ''مشہود! تم اپنی شخصیت تو بے شک چھپا سکتے ہو لیکن شناختی کارڈ بنوانے کے لیے تمہیں نئی تصویر تو کھنچوانا پڑے گی۔ حکام سے میری بات چیت ابھی کسی فیصلہ کن موڑ پر تو نہیں آئی ہے لیکن ایک بات مجھے پریشان کررہی ہے۔ پاسپورٹ کے بغیر امریکی ویزا تمہیں نہیں مل سکتا۔ ہمارے حکام تمہارے لیے انسانیت کے نام پر قانون میں کہیں کوئی لچک لانے پر آمادہ ہوبھی جائیں تو امریکی حکومت اس کے لیے تیار نہیں ہوگی۔''

''ہم اکیسویں صدی میں داخل ہوچکے ہیں روبی!''

مشہود نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہمارے ملک میں پلاسٹک سرجری کا میدان ابھی تک خالی ہے؟''

''نہیں مشہود!'' روبی نے کہا۔ ''یہ کام یہاں بھی ہوسکتا ہے لیکن تمہارے معاملے میں جس مہارت کی ضرورت ہے، اس کے لیے میرے دماغ میں صرف ایک ہی نام آسکا ہے۔ سرجن اوکلے اس میدان میں بہت نام ور ہیں۔ وہ تمہاری سرجری کریں گے تو کوئی معمولی سی کسر بھی نہیں رہے گی۔ تم ہو بہو ویسے ہی ہو جاؤ گے جیسے تم تھے۔ میں تمہارے بارے میں مکمل ریکارڈ تیار کر رہی ہوں جو انہیں پہلے سے بھیجنا ہوگا۔'' وہ مسکرائی۔ ''اس ریکارڈ میں تمہاری تصویریں بھی ہوں گی جو ہر زاویے سے کھینچی گئی ہیں۔''

''تصویریں؟'' مشہود حیرت سے بولا۔ ''ایسی تصویریں تمہیں کہاں سے مل گئیں؟''

''تمہیں یاد ہوگا! کچھ عرصے پہلے جب ہم ایک کیفے میں ملے تھے تو موبائل مستقل طور پر میرے ہاتھ میں تھا۔''

''تو؟'' مشہود کی حیرت برقرار رہی۔

''میں اس سے تمہاری وڈیو بناتی رہی تھی اور اس کا خیال رکھا تھا کہ تمہیں اس کا پتا نہ چل سکے۔ باتوں کے دوران میں تم اِدھر اُدھر بھی دیکھتے رہے تھے۔ اس لیے ہر زاویے سے تمہاری تصویریں موجود ہیں۔'' روبی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ تصویریں اس موقع پر کام آئیں گی۔ میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ جب میرا جی چاہے، تمہاری تصویر دیکھ لیا کروں۔''

مشہود کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ''اتنی محبت کرتی رہی ہو تم مجھ سے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اب بھی کرتی ہو لیکن میں تمہیں صرف درد ہی دے سکا اور اب بھی تم میرے لیے اتنا کچھ کرنا چاہ رہی ہو۔''

روبی ہنسی۔ ''محبت کی تسکین تو اسی طرح ہوتی ہے۔''

''کاش میں ......'' مشہود ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''اِدھر اُدھر کے خیالات دماغ میں نہ لاؤ۔'' روبی نے کہا۔ ''فی الحال صرف اس مسئلے کے بارے میں سوچو جو ہمارے سامنے ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمہارے بارے میں حکومت سے میرے مذاکرات ناکام نہیں رہیں گے لیکن پاسپورٹ کے معاملے میں ہمیں ابھی سے تیار ہو جانا چاہیے۔''

''میں اس بھیانک چہرے کے ساتھ تصویر کیسے کھنچواؤں روبی۔'' مشہود نے بڑی اذیت سے کہا۔

''یہ تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا مشہود! کیا تم اپنی ماہ زیب سے کبھی نہیں ملنا چاہتے؟''

مشہود تڑپ گیا۔ روبی نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''روبی!'' وہ جیسے کراہ اٹھا۔

''ماہ زیب کی خاطر!'' روبی نے کہا ''یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا۔''

مشہود نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے تو اسی تصور سے ہول آتا ہے کہ میں اسپتال سے باہر نکلوں گا تو لوگ میرا چہرہ دیکھ کر ڈریں گے۔''

''تمہیں وہم ہو گیا ہے کہ تم بہت بھیانک ہوگئے ہو لیکن اگر بات صرف اسپتال سے نکلنے کی ہے تو یہ مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔ میں کسی فوٹو گرافر کو یہیں بلالوں گی۔''

مشہود نے مایوسی سے سر ہلایا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''اچھا! ایسا کرلو۔ یہیں بلوالو فوٹو گرافر کو۔''

''گڈ!'' روبی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''اب تو رات ہوگئی ہے۔ کل یہ کام ہو جائے گا۔''

''کیا کیا کروگی میرے لیے!'' مشہود نے افسردگی سے کہا۔

''وہ سب جو کرسکتی ہوں۔'' روبی نے مسکرا کر کہا۔ ''وہ تو ظاہر ہے کہ نہیں کروں گی جو کر نہیں سکتی۔''

مشہود یکایک پوچھ بیٹھا۔ ''میری سرجری میں وقت کتنا لگے گا روبی؟ تم نے اتنا تو بتایا تھا کہ اس میں کافی دن لگیں گے لیکن کافی دن سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

روبی سنجیدہ ہوگئی۔ ''تمہیں ہمت اور صبر سے کام لینا پڑے گا مشہود! اس میں ایک سال سے زیادہ بھی لگ سکتا ہے۔''

''ایک سال!'' مشہود نے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس کیا۔

''یہ کوئی عام سا کیس نہیں ہوگا مشہود! تمہیں بالکل ویسا ہی بننا ہے جیسے تھے۔ اس کے لیے مہارت اور وقت، دونوں ہی کی اہمیت ہے۔''

''لیکن یہ مدت، کوئی کم مدت تو نہیں ہے۔ میرا ایک ایک لمحہ اس تڑپ میں گزرے گا کہ میں کب اپنے پیاروں سے ملوں گا۔''

''اسے تم دوسری طرح سوچو۔'' روبی نے کہا۔ ''تم نے تو فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنے گھر سے تمہارا ناتا زندگی بھر کے لیے ٹوٹ گیا۔ اب تو وہ عرصہ صرف ایک سال میں سمٹ گیا ہے۔''

مشہود نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''تم مجھے وہاں چھوڑ کر واپس آجاؤ گی نا؟''
''نہیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ میں بھی وہیں رہوں گی؟''
''اور یہ اسپتال؟''
''یہ چلتا رہے گا۔ یہاں اور بھی ڈاکٹر ہیں۔''
''لیکن تم سرجن ہو۔''
''ایک اور سرجن بھی ہے۔'' روبی نے کہا۔ ''اور اگر ضروری ہوا تو ایک سرجن اور ہائر بھی کیا جا سکتا ہے۔''
''تمہارا والد کو معلوم ہے یہ سب کچھ؟''
''ابھی تو نہیں معلوم! جب وقت آئے گا تو بتا دوں گی۔''
''وہ کیا سوچیں گے؟ میرے لیے تم اتنا سب کیوں کر رہی ہو؟''
''میری نئی والدہ صاحبہ انہیں کچھ زیادہ سوچنے کا موقع نہیں دیتیں۔ میں تمہیں سب کچھ تو بتا چکی ہوں۔'' روبی نے تلخی سے کہا۔
''ہوں۔'' مشہود نے اس طرح سر جھکا لیا جیسے کچھ سوچنے لگا ہو۔
روبی بولی۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ میرے پاس کام کے بعد جو بھی وقت ہو، وہ اسی کمرے میں تم سے باتیں کرتے ہوئے گزارا کروں لیکن اس صورت میں یہ ڈر ہے کہ اسپتال میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں گی۔ ابھی سب حیران ہیں کہ میں تمہارے لیے یہ سب کچھ کیوں کرنا چاہتی ہوں۔''
''میرے ساتھ زیادہ وقت گزارنا تمہارے لیے آسان تو نہیں ہوتا ہوگا روبی!''
''کیوں؟''
مشہود نے افسردگی سے کہا۔ ''میرا یہ چہرہ اس قابل رہا کہاں ہے کہ اسے زیادہ دیر تک دیکھا جا سکے!''
''مشہود!'' روبی چیخ سی پڑی پھر جلدی سے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کی آواز سن کر کوئی اندر نہ آجائے!
مشہود نے نظریں جھکالیں۔
روبی نے کچھ توقف سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''دوبارہ یہ بات زبان پر کبھی نہ لانا۔ محبت اگر صرف حسن پرستی سے عبارت ہو تو وہ محبت نہیں، اسے کچھ اور ہی کہنا چاہیے۔''
مشہود نے اس کی طرف دیکھا اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''تمہارے سوچنے کا انداز بہت غیر معمولی ہے۔''
روبی نے کہا۔ ''اچھا اب تم آرام کرو، میں چلتی ہوں۔ کل فوٹو گرافر کا بندوبست کرلوں گی۔''
''وہ تو خیر تم کر ہی لوگی۔ یہ بتاؤ کہ میری سرجری پر اخراجات تو بہت زیادہ ہوں گے نا؟''
''تمہیں یہ سب سوچنے کی ضرورت کیا ہے؟''
''ضرورت تو ہے......'' مشہود نے کہا۔ ''مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا کہ تم میری وجہ سے اتنی زیر بار ہو۔ اسے تم مجھ پر قرض سمجھ لینا۔ ٹھیک ہو جانے کے بعد میں وہ قرض ادا کردوں گا۔''
''ابھی میں ان باتوں میں نہیں پڑنا چاہتی۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا''
روبی چلی گئی اور مشہود اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسی لڑکیاں دنیا میں شاید دو چار ہی ہوں۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتی تھی کہ اس نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ اب بھی یہی چاہتی تھی کہ سرجری کے بعد جب وہ پہلے جیسا ہو جائے تو وہ اسے ماہ زیب کو لوٹا دے۔ وہ اسے اپنے پاس ماہ زیب کی امانت سمجھ رہی تھی۔
مشہود چاہتا تھا کہ روبی اپنی ساری زندگی اس طرح ویرانی کی نذر نہ کرے لیکن ایسی کوئی صورت اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس سے یہ اصرار بے سود ہوتا کہ وہ کسی کو اپنا جیون ساتھی بنالے۔ وہ اس پر ہرگز آمادہ نہ ہوتی۔ مشہود کو اس کا یقین ہو چکا تھا۔
دوسرے دن روبی ایک فوٹو گرافر لے آئی۔ مشہود کو اپنی تصویر کھنچوانا ہی پڑی۔ روبی نے کسی طرح اس کا شناختی کارڈ بھی جلد ہی بنوالیا۔ اس کے بعد جب پاسپورٹ بنوانے کی نوبت آئی تو ایک پولیس افسر مشہود سے ملنے آیا۔ اس کی آمد ان مذاکرات کی کڑی تھی جو اس کے معاملے میں روبی متعلقہ حکام سے کر رہی تھی۔ اس ملاقات کے وقت کچھ دیر روبی بھی ان کے ساتھ رہی۔
اس نے پولیس افسر سے کہا۔ ''ممکن ہے کہ علاج سے ان کی یادداشت واپس آجائے اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو سرجری کے بعد جب یہ پہلے جیسے ہو جائیں گے تو ان کی تصویریں اخبارات میں شایع کرادی جائیں گی۔ ممکن ہے کہ ان کے ورثا وہ تصویریں دیکھ کر ہم سے رابطہ کریں۔''
''یہ پہلے جیسے کس طرح ہو جائیں گے ڈاکٹر روبی؟'' پولیس افسر نے پوچھا۔ ''اس کے لیے ان کی پہلے کی تصویر ہونا

چاہیے!''

اس بات پر مشہود کا دل دھڑک اٹھا لیکن روبی نے فوراً جواب دیا۔ ''میں نے آپ کو سرجن اوکلے کے بارے میں بتایا تو ہے کہ وہ اس پیشے کے نہایت ماہر شخص ہیں۔ وہ ان کے چہرے کی ہڈیوں سے یہ اندازہ لگانے میں بڑی حد تک کامیاب ہوسکتے ہیں کہ یہ پہلے کیسے ہوں گے۔ انہیں اس طرح سو فیصد کامیابی تو شاید نہیں ہوسکے گی لیکن وہ ستر فیصد بھی کامیاب ہوگئے تو اپنے پہلے چہرے سے کافی حد تک مشابہہ ہوں گے اور اگر اس صورت میں ان کے ورثا انہیں نہ پہچان سکے تو بھی میں اسے اپنی ایک نیکی سمجھوں گی کہ ایک شخص عام لوگوں میں گھل مل کر ایک نئی زندگی کا آغاز کرسکے گا۔ ان کی موجودہ ہیئت برقرار رہی تو لوگ ان سے دور بھاگیں گے۔''

افسر کے چہرے پر الجھن کے تاثرات اس کے بعد بھی برقرار رہے۔ غالباً وہ ان باتوں سے مطمئن نہیں ہوا تھا۔

اس کے چلے جانے کے بعد روبی نے مشہود سے کہا۔ ''حکام سے تمہارے بارے میں مذاکرات میں دیر اسی لیے لگ رہی ہے۔ دراصل انہیں شبہ ہورہا ہے کہ تم کوئی ایسے جرائم پیشہ شخص ہو جس سے میں نے کوئی بہت بڑی رشوت لی ہے اور میں باہر لے جا کر تمہارا چہرہ بدلوانا چاہتی ہوں۔ تم اس حادثے میں اپنا اصل چہرہ کھو چکے ہو اور اس کے بعد تمہیں خیال آیا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تم اپنے پرانے چہرے سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو۔''

مشہود نے سر جھٹکا۔ ''عجیب سوچ ہے یہ!''

''پولیس اسی انداز میں سوچتی ہے۔ شک کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جس شخص سے میرا کوئی ناتا نہیں، اس کے لیے میں یہ سب کچھ کیوں کررہی ہوں۔ اگر تم اپنی اصل شخصیت ظاہر کردیتے تو یہ دشواری پیش نہیں آتی۔''

مشہود نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''تب تو وہ اس معاملے میں سرجن اوکلے سے بھی رابطہ کرسکتے ہیں!''

''میں اس معاملے میں سرجن اوکلے کو اپنے اعتماد میں لے چکی ہوں۔ وہ بھرپور تعاون کریں گے۔ میں جب پڑھنے کے لیے امریکا گئی تھی تو وہ میرے استاد تھے۔ وہ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔''

مشہود ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

پاسپورٹ بننے میں دیر لگی۔ روبی کے خیال کے مطابق حکام اس کی باتوں سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے تھے، اس لیے پاسپورٹ بننے میں رکاوٹ ڈال رہے تھے۔

اس میں لگ بھگ ایک مہینا گزر گیا۔

''بن گیا پاسپورٹ۔'' آخر ایک دن روبی نے پُرمسرت لہجے میں اس سے کہا اور پاسپورٹ اس کے سامنے ڈالتے ہوئے بولی۔ ''بس اب ویزا لینا ہے تمہارا۔ سفارت خانے کے کچھ لوگ مجھے جانتے ہیں۔ سرجن اوکلے کی معاونت بھی حاصل رہے گی۔ مجھے امید ہے کہ یہ کام دو ایک دن میں ہوجائے گا۔ اس کے بعد بس ٹکٹ لے کر روانگی۔''

مشہود چپ رہا۔

''کیوں؟'' روبی بولی۔ ''تم خوش نہیں ہوئے؟''

''میں کچھ اور سوچ رہا۔''

''کیا؟''

''تم نے بتایا تھا کہ میری سرجری میں ایک سال لگ سکتا ہے۔ ایک بار تم نے بھی کہا تھا کہ یہ تمہارا اندازہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ شاید اس سے بھی زیادہ وقت لگے یا کم لگے تو بھی خاصا عرصہ ہوگا۔ میں اتنے دن کے لیے یہ شہر چھوڑنے سے پہلے ایک مرتبہ.....'' مشہود کی آواز بھرا گئی۔

روبی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بولو!'' وہ سنجیدہ ہوگئی۔

''وہ ایک نظر.....'' مشہود نے رک رک کر کہا۔ ''ماہ زیب اور ماہ رخ کو بلکہ اپنے سبھی گھر والوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

روبی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم ان سے ملوگے؟''

''نہیں نہیں.....'' مشہود نے جلدی سے کہا۔ ''کہیں سے چھپ کر دیکھ لوں گا۔''

''کیسے!'' ماہ زیب کی حیرت برقرار رہی۔

''اندھیرا ہونے کے بعد گھر کے آس پاس چکر لگاؤں گا۔ آتے جاتے سبھی نظر آتے رہیں گے۔ ماہ رخ تو کبھی کبھی پھاٹک تک آجاتی ہے۔ مسعود اور ابا جان کسی وقت گھر سے نکلتے ہی ہوں گے۔ ماہ زیب اور امی صاحبہ برآمدے میں کھڑی نظر آسکتی ہیں۔'' مشہود نے وضاحت سے کہا۔ ''ویزا ملنے میں دو تین دن لگ سکتے ہیں پھر ٹکٹ لینا اور تیاری کرنا۔ اگر میں اس دوران گھر کے آس پاس منڈلاتا رہوں تو امید ہے کہ سبھی کو دیکھ لوں گا۔''

روبی سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ''دوسرے لوگ بھی تو تمہیں دیکھیں گے! میرا مطلب ہے وہاں بالکل سناٹا تو ہوتا نہیں اور تم خود کو ہر ایک کی نظر سے بچانا چاہتے ہو۔''

''ہلکی ہلکی سردی تو پڑنے ہی لگی ہے۔'' مشہود نے

کہا۔ ''گردن میں مفلر ڈال کر اسے منہ تک کرلوں گا۔ وہ تم ہی لاکر دینا۔ کوئی اس قسم کی ٹوپی بھی ہو جو کچھ آگے کی طرف جھکائی جاسکے۔ لباس کسی قسم کا بھی ہو، چل جائے گا۔''

''اسپتال کے لوگوں سے چھپ کر کس طرح نکلو گے؟'' روبی نے کہا پھر خود ہی بولی۔ ''ہاں اس کی ایک صورت ہوسکتی ہے۔ تم میرے ساتھ ہی چلنا۔ میں ظاہر کردوں گی کہ تمہیں کسی ماہرِ نفسیات کے پاس لے جارہی ہوں۔ تین چار دن اس طرح کہا جاسکتا ہے، تم کب جانا چاہتے ہو؟''

''اگر ہوسکے تو آج ہی!'' مشہود نے جلدی سے کہا۔ ''ابھی چار ہی بجے ہیں۔ اگر تم فوری طور پر مفلر، ٹوپی اور لباس کا بندوبست کرسکو تو میں آج ہی جاسکتا ہوں۔''

روبی نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، میں ابھی جا کر لے آتی ہوں یہ چیزیں۔''

''شکریہ روبی!''

روبی نے اسے گھور کر دیکھا۔ مشہود پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ ''معاف کرنا۔ بے ساختہ نکل گیا منہ سے۔ تم جو کچھ میرے لیے کررہی ہو، اس کا شکریہ ادا کرنے کے تو مجھے الفاظ بھی نہیں مل سکیں گے۔''

''پھر وہی!'' روبی نے بگڑ کر کہا۔

''چلو وعدہ رہا، اب بھی نہیں کہوں گا۔''

روبی کھڑی ہوگئی۔

مشہود اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ اب اس کی عادت بن گئی تھی۔ روبی جب بھی اس سے مل کر جاتی، وہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اس وقت اس کے دل میں یہ خواہش بھی تھی کہ کاش آج وہ اپنے گھر کے سبھی لوگوں کو دیکھ لے!

لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی۔ روبی اسے اپنی کار میں لے گئی تھی اور اسے اس کے گھر سے ایک فرلانگ دور اتار دیا تھا۔ یہ بات راستے میں طے ہوگئی تھی کہ دو گھنٹے بعد روبی اس جگہ مشہود کا انتظار کرے گی۔

مشہود کے جسم پر گرم پتلون اور شرٹ تھی۔ سر پر سرمائی ٹوپی کے آگے کے کنارے اس نے بھنوؤں تک گھسیٹ لیے تھے۔ گلے میں پڑا مفلر نچلے ہونٹ کو چھپائے ہوئے تھا۔ پیروں میں جوتوں کی وجہ سے اسے کچھ بے قراری رہی کیونکہ بہت دن بعد پہنے تھے۔

بنگلے کے گرد دو گھنٹے تک منڈلاتے رہنے کے بعد وہ اسی جگہ مایوس لوٹا جہاں روبی نے اسے اتارا تھا۔ وہ وہاں پانچ منٹ پہلے ہی آگئی تھی۔

''مایوس سے نظر آرہے ہو تم!'' روبی نے کار حرکت میں لاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' مشہود نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''آج تو کوئی بھی دکھائی نہیں دیا۔''

''پھر؟''

''جب تک امریکا کی طرف روانگی نہیں ہوجاتی، میں یہی معمول رکھوں گا۔'' روبی چپ ہوگئی۔

دوسری شام بھی اندھیرا پھیلنے کے بعد مشہود اسی جگہ روبی کی کار سے اترا اور اپنے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ دور سے ہی اس نے دیکھا کہ بنگلے کے سامنے سڑک کے کنارے کنارے کئی گاڑیاں کھڑی ہوئی ہیں۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ چھ سات کاریں اسی کے گھر کے سامنے کیوں کھڑی تھیں۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔

وہ بنگلے کے سامنے سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ پھاٹک کھلا ہوا ہے۔ وہاں سے لان میں لگا ہوا ایک چھوٹا سا شامیانہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ عورتیں اور مرد بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے چند چہرے صاف اور واضح نظر آئے۔ وہ اس کے والد مینائی صاحب کے واقف کاروں میں سے تھے۔

گھر میں شاید کوئی تقریب ہے! وہ سوچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

تھوڑا سا آگے بڑھنے کے بعد وہ رکا۔ وہاں ایک بنگلے کا چوکی دار کھڑا تھا۔ روشنی اتنی کم تھی کہ چوکیدار کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مشہود نے سلام کیا۔

''وعلیکم سلام صاحب!'' جواب ملا۔

''اس بنگلے میں آج کچھ چہل پہل نظر آرہی ہے۔ کوئی تقریب ہے کیا؟''

''ہاں صاحب!'' چوکی دار نے جواب دیا۔ ''شادی ہے۔''

مشہود کا دل اچھل پڑا۔ چوکی دار سے زیادہ بات کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھ گیا۔ کس کی شادی ہے؟ دماغ میں ابھرنے والے اس سوال کے جواب میں مشہود کو مسعود کے علاوہ کسی کا خیال نہیں آسکا۔ اس کے گھر میں کوئی اور ایسا تھا ہی نہیں جس کی شادی ہوسکتی۔

مبارک ہو بھیا! مشہود نے دل ہی دل میں کہا۔

کچھ آگے بڑھ کر وہ ایک گلی مڑا اور چکر لگا کر پھر بنگلے کے سامنے کی طرف آیا۔ اسی وقت ایک کار وہاں آکر رکی۔

اس میں سے جو لوگ اترے، وہ بھی بینائی صاحب کے واقفکاروں میں سے تھے۔
مشہود کے دل میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ ان لوگوں کے پیچھے پیچھے وہ بھی پھاٹک میں داخل ہوگیا۔ چند گز کے فاصلے پر اس کا چوکی دار کھڑا تھا۔ اس نے مشہود کو دیکھ کر یہی سمجھا ہوگا کہ وہ انہی لوگوں کے ساتھ ہے جو اس وقت اندر داخل ہوئے تھے۔
مشہود کو شامیانے کے قریب پھولوں کے ایک کنج کی آڑ مل گئی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کافی تیز ہوچکی تھیں۔ اسے ڈر تھا کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟ شاید اسے چور سمجھ کر پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔
اب جو بھی ہو، مشہود نے اپنا سر جھٹکا اور شامیانے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ شامیانے کے سرے پر ایک تخت بچھا تھا۔ مشہود نے وہاں ماہ زیب کے علاوہ اپنے سبھی پیاروں کو دیکھ لیا۔ اس کے والد، اس کی والدہ اور ماہ رخ مسعود کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ مسعود باقاعدہ دولہا بنا تو نہیں تھا۔ گلے میں ہار ڈالے وہ بہت چپ چپ سا بیٹھا تھا۔
مشہود کو ماحول کچھ عجیب سا لگا۔ شادی میں جو گہماگہمی ہوتی ہے، وہ سرے سے مفقود تھی۔ آپس میں باتیں کرنے والے بس مسکرا رہے تھے۔ ان میں سے ہنستا ہوا کوئی نہیں دکھائی دیا۔
پڑوس میں رہنے والی کچھ عورتیں اور مرد بھی مہمانوں میں موجود تھے لیکن بچہ کوئی نہیں تھا جبکہ اس قسم کی تقریبات میں بچوں کا نہ ہونا ایک عجیب سی بات تھی۔
اپنے پیاروں کو دیکھ کر مشہود کے رگ و پے میں مسرت کی جو لہریں دوڑی تھیں، ان کو اس الجھن نے خاصا متاثر کیا کہ وہاں شادمانی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ ایک بات اسے یہ بھی کھٹکی تھی کہ ماہ زیب وہاں نہیں تھی۔
کہیں اس کی طبیعت خراب نہ ہو! یہ اندیشہ مشہود کے ذہن میں ابھرا تو وہ خاصا بے چین ہوگیا۔
پھاٹک کی طرف سے دو افراد آرہے تھے۔ ان کی نظر سے بچنے کے لیے مشہود نے خود کو اور زیادہ سمیٹنے کی کوشش کی۔
آنے والوں افراد میں سے ایک کو مشہود پہچانتا تھا۔ وہ مسعود کا دوست تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے کی وضع قطع ایسی تھی جیسے وہ کوئی نکاح خواں ہو......
ہوں، مشہود نے سوچا، نکاح تو لڑکی والوں کے گھر میں ہوتا ہے۔ بارات یہاں سے ابھی کہیں جائے گی۔
لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ قاضی ہی تھا۔ نکاح کے مراحل وہیں طے ہوئے۔ تین افراد گھر میں گئے جیسے دلہن گھر ہی میں ہو اور اس سے ایجاب و قبول کے لیے تین افراد کو بھیجا گیا تھا۔
دلہن گھر ہی میں کیوں ہے؟ مشہود کے دماغ میں یہ سوال اٹھنا ایک فطری بات تھی لیکن دماغ پر بہت زور ڈالنے کے باوجود وہ اس کا جواب نہیں سوچ سکا۔
شادی بھی بڑی سادگی سے کی جارہی ہے، مشہود نے سوچا کیا مسعود اپنے بڑے بھائی کے نہ ہونے کی وجہ سے دھوم دھام نہیں چاہتا؟
دماغ میں سوال پر سوال اٹھتے رہے جن کا مشہود کو کوئی جواب نہیں مل سکا۔
نکاح کے بعد مہمانوں کی تواضع مشروبات سے کی گئی جس کے بعد لوگوں نے بتدریج رخصت ہونا شروع کیا۔
مشہود اس دوران میں فیصلہ کر چکا تھا کہ لان تک آچکا ہے تو اب گھر میں ضرور داخل ہوگا۔ وہ اب یہ دیکھے بغیر نہیں جانا چاہتا تھا کہ ماہ زیب کس حال میں تھی جو اس تقریب میں شریک نہیں ہوسکی۔ ایک اچٹتا سا خیال اس کے دماغ میں یہ ضرور آچکا تھا کہ شاید وہ دلہن کے ساتھ بیٹھی ہو۔
لیکن دلہن گھر میں کیوں تھی؟ یہ سوال اس کے دماغ میں مسلسل چبھتا رہا تھا۔
مہمان رخصت ہوتے ہی شامیانہ اکھاڑنے والے آگئے۔ غالباً انہیں ہدایت کی جاچکی ہوگی کہ وہ اس کام میں دیر نہ لگائیں۔
اس دوران میں مشہود سرکتے سرکتے لان کے ایک کونے میں چلا گیا تھا جہاں مکمل تاریکی تھی۔
جلد ہی وہاں سناٹا چھا گیا۔ اس دوران میں ڈیڑھ گھنٹا گزر چکا تھا۔ مشہود کو اب جلدی بھی تھی۔ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں رہا تھا جب روبی اس کا انتظار کرتی۔
دفعتاً مشہود کو خیال آیا کہ ماہ زیب کے علاوہ اس نے سب کو دیکھ لیا تھا۔ بس ماہ زیب اور مسعود کی دلہن ہی رہ گئی تھی۔ وہ مسعود کی بیوی کو امریکا سے آنے کے بعد بھی دیکھ سکتا تھا۔ بے قرار وہ صرف ماہ زیب کو دیکھنے کے لیے تھا اور اس کے لیے اسے بنگلے میں گھسنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے اور ماہ زیب کے کمرے کی ایک کھڑکی بنگلے کے عقبی حصے کی طرف تھی۔ مشہود کو وہاں سے کمرے میں جھانکنے کا موقع مل سکتا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق ماہ زیب کو وہیں ہونا چاہیے تھا۔
شامیانہ اکھاڑنے والے اپنے کام میں مصروف تھے

کہ مشہود بنگلے کے عقبی حصے میں پہنچ گیا۔ کھڑکی اس کی جانی پہچانی تھی۔ وہ اس کے قریب گیا تو اسے شیشے بالکل تاریک نظر آئے۔

اتنی جلدی اندھیرا کیوں کرلیا اس نے؟

یہ سوچتے ہوئے مشہود کی نظر اس کھڑکی کی طرف گئی جو مسعود کا کمرا تھا۔ وہاں شیشے روشن تھے۔ مشہود دبے قدموں اس کھڑکی کے قریب پہنچ گیا۔ اندر تیز روشنی تھی لیکن پٹ اس طرح بند کہ معمولی سی جھری بھی نہیں تھی۔

شاید ماہ زیب ابھی دلہن ہی کے پاس بیٹھی ہو، ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید کسی پٹ کی چٹخنی نہ لگی ہو۔ کبھی کبھی ایسی بھول چوک ہر ایک سے ہوجاتی ہے۔

اس وقت مشہود کے دل کی دھڑکنوں میں کچھ اور تیزی آگئی جب اس کی کوشش سے ایک پٹ آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔

خدا کرے ماہ زیب یہاں ضرور ہو، وہ دل ہی دل میں دعا کررہا تھا۔

اس کی یہ دعا قبول ہوئی لیکن اس طرح کہ اس کا دل چیر گئی۔ حجلۂ عروسی میں دلہن بنی ماہ زیب تھی۔

اس کا صریح مطلب یہ تھا کہ مسعود کی شادی ماہ زیب ہی سے ہوئی تھی۔ بہت سے گھروں میں ایسا ہوتا ہے کہ بڑا بھائی مرجائے تو اس کی بیوی سے چھوٹے یا بڑے بھائی کی شادی کردی جاتی ہے۔

مشہود کا وجود لرز گیا۔ اسے مردہ سمجھ لینے کے بعد ماہ زیب کی شادی مسعود سے ہوگئی تھی۔ مشہود کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے بعد ایسا ہوجائے گا۔ اس وقت اس کے دماغ کو ایسا جھٹکا لگا کہ کھڑکی کا پٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس سے ہلکے سے کھٹکے کی آواز ہوئی۔

☆☆☆

وہی کھٹکا سن کر ماہ زیب چونکی اور اس نے کھڑکی بند کی۔ اسے ایک چہرے کی جھلک دکھائی دی تھی جسے اس نے اپنا وہم قرار دیا تھا۔ دوبارہ بستر پر بیٹھنے کے بعد اس نے ماہ رخ کی پکار بھی سنی تھی اور اس کے منہ پر پڑنے والے تھپڑ کی آواز بھی جس سے اس کے دل پر گھونسا لگا تھا۔ وہ یقیناً عتیقہ بیگم ہی ہوسکتی تھیں جو مچلتی ہوئی ماہ رخ کو وہاں سے لے گئی تھیں۔

ماہ زیب کا وجود کرب و اذیت میں ڈوب گیا تھا اور وہ اسی کیفیت میں تھی جب اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی اور مسعود کو کمرے میں آتے دیکھا۔ بڑھتے ہوئے اس کے قدموں کی آہٹ اس کے لیے لرزہ خیز بھی تھی اور اس کا رواں رواں چیخ اٹھا تھا۔

یہ نہیں ہونا چاہیے! یہ نہیں ہونا چاہیے!

مسعود اس پکار سے بے خبر بستر کے قریب پہنچ گیا۔ اپنے گلے سے اس نے جو ہار اتارا تھا، وہ اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس نے بستر پر ایک طرف ڈال دیا۔

''جو ہوگیا، وہ میں بھی نہیں چاہتا تھا۔'' مسعود نے دھیمی آواز میں کہا۔

لیکن اب جو ہونا ہے، وہ تو نہ ہو۔ ماہ زیب کی یہ خواہش اس کے دل سے ہوک کی طرح اٹھی۔ مسعود سے اس کا جو رشتا استوار ہوچکا تھا، وہ اس رشتے تقاضوں سے گریز چاہتی تھی۔ اس کے دل و دماغ مسعود کو اس طرح قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے جس طرح اس نے مشہود کو قبول کیا تھا۔ اس کے جسم میں ایسی لرزش پیدا ہوگئی تھی جیسے کوئی خزاں رسید پتا!

''آپ ......'' مسعود نے کچھ کہنا چاہا پھر رک گیا اور کچھ توقف سے دوبارہ بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں آپ کو کس طرح مخاطب کروں۔ اس نئے رشتے کے بعد پرانے رشتے کا اندازِ تخاطب ممکن نہیں رہا ہے اور اتنی سکت مجھ میں ہے نہیں کہ آپ کو آپ کے نام سے مخاطب کرسکوں۔''

ماہ زیب کی نظریں جھکی رہیں اور دل دھڑکتا رہا۔ وہ مسعود کی باتوں کا مقصد سمجھنے سے قاصر رہی تھی۔

''میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔'' مسعود نے کچھ رک کر کہا۔ ''لیکن یہ میں نہیں جانتا کہ وہ درست ہے یا غلط! میں آپ کو اپنے لیے عملاً وہ نہیں بنانا چاہتا جو دنیا والوں نے بنایا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میرے دماغ میں بہت سی باتیں تھی جو میں آپ سے کہنا چاہتا تھا لیکن یہاں آیا ہوں تو وہ سب باتیں میرے دماغ سے نکل گئی ہیں۔ میں اب صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ہی کمرے میں رہنا تو ہماری مجبوری ہے لیکن آپ کے بستر سے میرا فاصلہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ میرے دل و دماغ نے بھائی جان کی جگہ لینے سے انکار کردیا ہے۔''

بے چین و بے قرار ماہ زیب کو سکون محسوس ہوا۔ مسعود کی زبان پر بالکل وہی الفاظ آئے تھے جو وہ خود بھی سوچ رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ بھی مسعود کو اس طرح قبول کرنے آمادہ نہیں تھے۔

مسعود نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں وہاں سوجایا کروں گا۔'' پھر فوراً ہی اس پر عمل بھی کیا۔ اس کے قدم صوفے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

ماہ زیب کو اس حد تک سکون محسوس ہوا کہ اس کا جسم

بے جان سا ہو گیا۔ وہ بہ مشکل خود کو سنبھال سکی ورنہ بستر پر کسی طرف ڈھلک جاتی۔

مسعود نے اپنی شیروانی اتار کر صوفے ہی پر ڈال دی اور خود بھی صوفے پر لیٹ گیا۔ ماہ زیب نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ مسعود کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ وہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ ماہ زیب اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے سوچ میں ڈوبی رہی۔ وہ خوش ضرور تھی کہ مسعود نے بھی وہی چاہا تھا جو وہ چاہتی تھی۔

نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ بہت ہلکی سی آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ اس نے مسعود کی طرف دیکھا۔ اس نے کروٹ لی تھی۔ اس کا رخ ماہ زیب ہی کی طرف تھا۔ اس کی آنکھیں بند نظر آئیں لیکن یہ اندازہ لگانا ماہ زیب کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں یا وہ سو گیا تھا۔

ماہ زیب نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی، تب اسے پتا چلا کہ مسعود کو صوفے پر لیٹے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ گویا وہ دو گھنٹے تک خیالات میں کھوئی رہی تھی۔ اب اسے احساس ہوا کہ اس کی کمر دکھنے لگی ہے۔ وہ اتنی آہستگی سے لیٹی کہ آواز بالکل نہ ہو۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ذرا سی بھی آواز مسعود کی نیند میں خلل ڈالے۔

جب دیوار گیر کلاک سے اندازہ ہوا کہ ایک گھنٹا اور گزر گیا ہے پھر ماہ زیب کو یقین ہو گیا کہ مسعود سو گیا ہے لیکن اس نے نہ تو سلیم شاہی جوتے اتارے تھے، نہ اس کے سر کے نیچے تکیہ تھا۔ تکیہ نہ ہونے کے باعث اس کی گردن ایک طرف مڑی ہوئی سی تھی۔

بہت بے چین ہو گا نیند میں۔ ماہ زیب نے محبت سے سوچا۔ وہ ویسی ہی محبت تھی جو شوہر کے ہوتے ہوئے بھی اس کے دل میں مسعود کے لیے تھی۔ وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بستر سے اٹھی۔ اس نے بستر سے ایک تکیہ اٹھایا اور دبے قدموں مسعود کے قریب گئی۔ ہچکچاہٹ اس کے چہرے پر اب بھی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ مسعود کی آنکھ اس وقت نہ کھل جائے جب وہ اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھ رہی ہو۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ مسعود کا سر تھوڑا سا اوپر کر کے تکیہ اس کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ مسعود کی آنکھ نہ کھلی۔ وہ بہت گہری نیند سو رہا تھا۔

تکیہ رکھ کر ماہ زیب مسعود کے پیروں کی طرف گئی، آہستگی سے اس کی سلیم شاہی جوتیاں اتاریں اور مسعود کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے اب بھی یہ ڈر تھا کہ مسعود کی آنکھ نہ کھل جائے۔

پھر وہ اپنے بستر پر آ گئی۔

رات نہ جانے کتنی ڈھل چکی تھی کہ نیم دراز حالت میں ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔ پھر وہ اس وقت ہڑبڑا کر اٹھی جب کسی آواز نے اسے جگایا۔ اس نے مسعود کو قریب ہی کھڑا دیکھا۔ وہ غسل کر کے کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔

صبح ہو چکی تھی۔ کھڑکی کے شیشوں سے دھوپ کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

''شاید آپ دیر سے سوئی تھیں۔'' مسعود بولا۔ ''لیکن بہتر ہو گا کہ آج آپ نیند پوری کیے بغیر ہی اٹھ جائیں۔ شاور لے لیں۔''

اس نے کنایتاً ایک اور بات بھی کہی۔ کم از کم عتیقہ بیگم کو ان دونوں کے حلیے سے یہی اندازہ لگانا چاہیے کہ انہوں نے ایک ''خوش گوار'' رات گزاری تھی۔

ماہ زیب نظریں جھکائے باتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ باہر نکلی تو مسعود کمرے میں نہیں تھا۔ وہ تیار ہو کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ باہر نکلے یا ''نئی نویلی دلہن'' کی طرح وہیں بیٹھی رہے؟ عتیقہ بیگم کو اس سے نہ جانے کیا توقع ہو!

دروازے پر دستک ہوئی۔ آنے والی ملازمہ تھی۔ اس نے ماہ زیب کو عتیقہ بیگم کا پیغام پہنچایا۔ گھر کے سب لوگ ناشتے کی میز پر اس کے منتظر تھے۔

ماہ زیب اٹھ کر کمرے سے نکلی اور ڈائننگ روم کی طرف بڑھی۔ اسے اپنے قدم بڑے بوجھل محسوس ہو رہے تھے۔ اسے بینائی صاحب کا سامنا کرنے کے خیال ہی سے حجاب محسوس ہو رہا تھا۔

ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی اس نے اچٹتی سی ایک نظر سے سب کو دیکھ لیا اور نظریں جھکائے آگے بڑھی۔

ماہ رخ اپنے دادا کی گود میں بیٹھی تھی، وہ جلدی سے اتری اور ماہ زیب سے لپٹ گئی۔

''امی!'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

ماہ زیب نے اسے جلدی سے گود میں اٹھا لیا۔ ''کیا ہوا چندا!!''

''اب کوئی شکایت نہ کرو ماں سے!'' عتیقہ بیگم نے ماہ رخ کو ڈانٹا۔ ''اگر ایک رات دادا دادی کے ساتھ سو گئیں تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹ پڑی تم پر۔ سمجھا چکی ہوں تمہیں کہ بس ایک رات کی بات ہے۔ اب تم اپنی ماں ہی کے ساتھ سویا کرنا۔''

اس ڈانٹ سے ماہ رخ سہم گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

ماہ زیب کا دل تڑپ گیا لیکن اس نے ماہ رخ کو ہی سمجھایا۔

''نہیں نہیں، بری بات ہے۔'' وہ ماہ رخ کی آنکھیں صاف کرتی ہوئی بولی۔ ''بڑے اگر ڈانٹتے ہیں تو اس پر اچھے بچوں کو رونا نہیں چاہیے۔''

ماہ رخ اس کے بعد بھی بسورتی رہی۔

اس موقع پر مینائی صاحب نے عتیقہ بیگم پر ایک نظر ڈالی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر جھکالیا۔ ماہ زیب جب ماہ رخ کو گود میں لیے کرسی پر بیٹھنے لگی تو مسعود بولا۔ ''ماہ رخ! تم میرے پاس آجاؤ۔''

اس نے خود اٹھ کر ماہ رخ کو ماہ زیب کی گود سے لیا۔

ماہ رخ نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''کل تو آپ نے پڑھایا بھی نہیں چچاجان!''

اس سے پہلے کہ مسعود کوئی جواب دیتا، عتیقہ بیگم بول پڑیں۔ ''اب چچاجان نہ کہا کرو تم مسعود کو! پاپا کہا کرو!''

ماہ رخ کا چہرہ کچھ عجیب سا ہوگیا۔ ایک مرتبہ اس نے ماہ زیب کی طرف دیکھا اور پھر مسعود کا چہرہ تکنے لگی۔

اس موقع پر مینائی صاحب نے فراست سے کام لیا اور بولے۔ ''بھئی بچی ہے وہ! اتنی بڑی تبدیلی کو ابھی نہیں سمجھ سکتی۔'' پھر انہوں نے براہِ راست ماہ رخ سے کہا۔ ''مسعود کو تم چھوٹے پاپا کہا کرو۔''

عتیقہ بیگم کی پیشانی پر ایک شکن تو ابھری لیکن وہ کچھ بولیں نہیں۔

ماہ رخ کے معصوم ذہن کے لیے ''چھوٹے پاپا'' کے الفاظ قابلِ قبول تھے۔ وہ کئی ایسے بچوں کو جانتی تھی جو اپنے چچا کو ''چھوٹے پاپا'' یا ''چھوٹے ابو'' کہا کرتے تھے۔

☆☆☆

دوپہر ہوچکی تھی۔ مشہود اسپتال میں اپنے کمرے میں گم صم لیٹا تھا۔ رات کے بعد سے ابھی تک روبی سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ رات اس نے روبی کو صرف دو ہی باتیں تفصیل سے بتائی تھیں۔ ایک یہ کہ ماہ زیب سے مسعود کی شادی ہوگئی ہے اور دوسرے یہ کہ بنگلے سے نکلنے میں اسے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ شامیانہ اور کرسیاں اٹھا کر لے جانے والوں کے پیچھے پیچھے وہ بھی بنگلے سے نکل آیا تھا۔

ماہ زیب اور مسعود کی شادی کی بات سن کر روبی دم بہ خود رہ گئی تھی۔ اس نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مشہود نے بھی اس کے بعد کوئی بات نہیں کی تھی۔ روبی اسے اسپتال پہنچا کر اپنے گھر چلی گئی تھی۔

تین بجے کے قریب روبی اس کے کمرے میں آئی۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ وہ بولی۔ ''میں صبح اس لیے نہیں آسکی کہ آج دو آپریشن کرنے تھے۔ اس کے بعد میں ٹکٹ لینے چلی گئی تھی۔''

''لے آئیں؟'' مشہود نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں۔''

''واپس کردو۔''

''کیوں؟'' روبی نے بہت غور سے مشہود کی طرف دیکھا۔

''اب مجھے سرجری کرانے کی ضرورت کہاں رہی روبی!'' مشہود نے بڑی اذیت اور حسرت سے کہا۔

روبی نے نظریں جھکالیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ مشہود بھی چپ چاپ ایک طرف دیکھتا رہا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ماہ زیب تم سے بے وفائی کرے گی۔'' روبی کے لہجے میں ملال تھا۔ ''اور تمہارے بھائی نے بھی تمہاری پیٹھ میں چھرا گھونپا۔''

''نہیں روبی! مسعود کو دوش نہ دو۔ اس سے کہا گیا ہوگا کہ وہ ماہ زیب سے شادی کرلے اور اس نے ماہ زیب کو سہارا دینے کے لیے اس شادی پر آمادگی ظاہر کردی ہوگی۔ انکار تو ماہ زیب کو کرنا چاہیے تھا۔ میں اگر ان لوگوں کے لیے مرچکا تھا تو اس سے کیا! ماہ زیب میری یادوں کے سہارے بھی زندگی گزار سکتی تھی۔''

روبی نے ذرا سوچنے کے بعد کہا۔ ''لیکن تم سرجری کیوں نہیں کروانا چاہتے؟''

''اب میں اصلی چہرے کے ساتھ سامنے آکر اپنے بھائی اور ماہ زیب کی زندگی میں ہلچل کیوں مچاؤں روبی؟''

''تم زندہ ہو، اس لیے وہ شادی جائز نہیں ہے۔''

''ان لوگوں نے مجھے مردہ سمجھ لیا تھا۔ اس لیے ان سے یہ غلطی ہوگئی اور نادانستگی میں ایسی غلطیاں اور لوگوں سے بھی ہوجاتی ہوں گی جو کبھی سامنے نہیں آتیں۔ تو پھر میں ان کی غلطی سامنے کیوں لاؤں؟ اور اگر میں نے ایسا کیا تو اس گھر پر ایک قیامت اور گزر جائے گی۔ نہیں روبی! میں ایسا نہیں کروں گا۔''

''تم اپنی بیٹی کو..... اپنی ماہ رخ کو، اور اپنے والدین کو بھی بھلادوگے؟''

اس سوال نے مشہود کو ایسی اذیت پہنچائی کہ اس کی

آنکھیں بھیگنے لگیں۔

روبی بولی۔ ''تمہیں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ ایک بار اچھی طرح سوچ لو۔ میں ابھی دو ایک دن تک ٹکٹ کینسل نہیں کراؤں گی۔ سیٹیں بھی تین دن بعد کی فلائٹ میں مل سکی ہیں۔''

روبی کے جانے کے بعد مشہود سوچتا رہا۔ وہ روبی کے آنے سے پہلے بھی سوچتا رہا تھا۔ گزشتہ رات اس کے حواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ سامنے آئے بغیر بھی صرف فون کرکے اپنی زندگی کے بارے میں بتا دیتا تو مسعود اور ماہ زیب کی شادی فسخ ہو جاتی لیکن اب تو رات گزر چکی تھی۔ مشہود کی دانست میں مسعود اور ماہ زیب ''ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔'' ایک گناہ ہو چکا تھا۔ وہ دونوں آئندہ بھی گناہ کی یہ زندگی گزارتے رہتے مگر انہیں اپنے اس گناہ کا علم نہیں ہوتا۔ مشہود خود کو ظاہر کر کے ہی انہیں اس گناہ سے آگاہ کر سکتا تھا لیکن اس طرح صرف انہی دونوں پر نہیں، سارے گھر پر قیامت گزر جاتی۔ دوسرے لوگ بھی اس سے واقف ہو جاتے۔ صرف مسعود ہی نہیں، ماہ زیب بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔ اس کے والدین کی اذیت کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ ان سب باتوں کے اثرات ماہ رخ کی زندگی پر بھی پڑتے۔

مشہود کی یہ سوچ درست ہو یا غلط لیکن انہی سب خیالات کے باعث وہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہا کہ اسے ان لوگوں پر اپنی زندگی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔

روبی نے اسے سوچنے کے لیے زیادہ مہلت دی تھی لیکن مشہود نے دوسرے ہی دن یہ بات چھیڑ دی۔ اس نے کچھ اور بھی سوچ لیا تھا۔

''ٹھیک ہے روبی! میں سرجری کروالوں گا۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے امریکا جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام یہیں کروالیا جائے!''

''لیکن تم بالکل ویسے ہی بننا چاہتے ہو جیسے تھے۔''

''یہ اب پرانی بات ہوگئی۔'' مشہود نے کہا۔ ''اب میری سرجری ایسی ہونی چاہیے کہ پرانے نقش ونگار کا شائبہ تک نہ رہے۔ میں اب ایک نیا انسان بن کر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ کوئی مجھے مشہود کی حیثیت سے پہچان ہی نہ سکے۔''

''اس طرح کیا تم اپنے پیاروں کو بھول جاؤ گے؟''

''اس کی ایک تدبیر سوچی ہے میں نے۔ میرا خیال ہے کہ ماہ زیب سے تم دوبارہ بھی مل سکتی ہو۔ اس سے تعلقات بڑھا بھی سکتی ہو۔ اس طرح مجھے بھی کبھی کبھی وہاں لے جا سکتی ہو۔ ان لوگوں کو دیکھتے رہنے کا موقع ملتا رہے گا مجھے۔ میرے لیے اتنی تسکین بھی کافی ہوگی۔ مسعود بھی تمہیں جانتا تو ہوگا؟''

''ظاہر ہے۔'' روبی نے کہا۔ ''وہ بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ بعد میں بھی دو ایک بار سر راہ آمنا سامنا ہوا ہے۔''

''اس لیے بھی تعلقات بڑھ سکتے ہیں۔'' مشہود نے کہا۔ ''تم اسے اور ماہ زیب کو اپنے گھر پر مدعو کر سکتی ہو۔ ماہ رخ بھی ان دونوں کے ساتھ ضرور آئے گی۔'' مشہود نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''اب اسی طرح زندگی گزارنا ہے مجھے!''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟'' روبی نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، تم اب مشہود نہیں بننا چاہتے؟''

''ہاں۔'' مشہود نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اب یہی فیصلہ ہے میرا۔''

روبی مشہود کا چہرہ تکتی رہ گئی۔ وہ خود یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ مشہود کا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط؟

☆☆☆

مسعود اس رات بھی صوفے پر لیٹنے لگا تو ماہ زیب چپ نہ رہ سکی۔

''مسعود!''

''جی۔'' مسعود نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم صوفے پر سوتے رہو۔ تم یہاں بستر پر سو جایا کرو۔ میں نیچے بستر بچھا لیا کروں گی۔ میں اور ماہ رخ نیچے سو جایا کریں گے۔''

''مجھے صوفے پر کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔'' مسعود نے کہا۔ ''کل رات تو آپ نے میرے سر کے نیچے تکیہ بھی رکھ دیا تھا۔ خیر وہ کوئی خاص بات نہیں لیکن آپ نے مجھے شرمندہ بھی کیا ہے۔ آپ نے میری جوتیاں اتاری تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں جوتیاں اتارے بغیر لیٹ گیا تھا اور مجھے نیند آ گئی تھی۔''

ماہ زیب نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے حیرت ہے مسعود! کل رات تو تمہیں اتنی جلدی نیند نہیں آنا چاہیے تھی۔ جو بوجھ میرے دماغ پر تھا، وہ تمہارے دماغ پر بھی ہوگا۔ پھر تمہاری آنکھ اس وقت بھی نہیں کھلی جب میں نے تمہارے سر کے نیچے تکیہ رکھا اور اس کے بعد.....''

مسعود نے جلدی سے کہا۔ ''دراصل میں نے خواب آور گولی کھالی تھی۔''

ماہ زیب نے چند لمحے کچھ سوچا، اس کے بعد موضوع بدل دیا۔ ''اب آج تو ماہ رخ سو گئی ہے۔ اسے اٹھانا ٹھیک نہیں رہے گا۔ کل میں نیچے ایک بستر لگالوں گی۔ میں اور ماہ رخ اس پر سو جایا کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔ بستر آپ لگا دیجیے گا لیکن یہ مناسب نہیں رہے گا کہ آپ نیچے سوئیں۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آج بھی آپ میرے لیے محترم ہیں۔ مجھے کچھ اور خیال ہے۔ آپ ماہ رخ کے ساتھ نیچے سوئیں گی تو ماہ رخ کو بہت عجیب لگے گا۔ وہ آپ سے اتنے سوالات کرے گی کہ آپ کے لیے جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔''

جواز بہت صحیح تھا۔ ماہ زیب کو اس کی بات ماننا پڑی۔ اس رات تو مسعود صوفے پر ہی سویا لیکن اگلی رات ماہ زیب نے قالین پر اس کے لیے نہایت آرام دہ بستر لگا دیا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ ماہ رخ بہت خوش تھی کہ اب اسے مسعود کی زیادہ قربت حاصل ہو گئی ہے۔ مسعود سے پڑھنے اور کھیلنے کے لیے بھی اسے کچھ زیادہ وقت مل جاتا تھا۔ اس کے معصوم ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کی ماں کا نکاح مسعود سے ہو چکا ہے۔ وہ کیونکہ اسکول میں نہیں پڑھتی تھی، اس لیے تیز وطرار لڑکیوں کے ساتھ رہ کر ان جیسی نہیں ہوئی تھی ورنہ اس کے دماغ میں یہ کھٹک ضرور پیدا ہو جاتی کہ اب وہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے چچا کے کمرے میں کیوں سوتی تھی۔

ابتدا میں مسعود کے لیے اس کے منہ سے ''چھوٹے ابو'' بہت کم نکلتا تھا۔ وہ بے اختیار ''چچاجان'' ہی کہہ جاتی تھی لیکن بار بار ٹوکے جانے کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ ''چھوٹے ابو'' کہنے کی عادی ہو گئی۔

چھ ماہ گزر گئے۔ ایک بات ماہ زیب اکثر سوچا کرتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی سوچ میں شدت آتی چلی گئی۔ صرف اس کی وجہ سے مسعود ایک شادی شدہ زندگی کی خوشیوں سے محروم ہو گیا تھا۔ ایک رات جب ماہ رخ سو چکی تھی تو ماہ زیب بستر سے اتر کر نیچے مسعود کے بستر پر بیٹھی۔ مسعود کچھ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

''ایک بات کہنا ہے تم سے!'' ماہ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ ''زندگی میں کبھی تمہیں کوئی لڑکی پسند تو آئی ہوگی!''

مسعود نے بے اختیار ایک طویل سانس لی اور اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے کہا۔ ''میں آپ کو بتانا چاہتا تھا۔ بس قدرت نے موقع ہی نہیں دیا۔ ان دنوں بھائی جان دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد چند ہی مہینے گزرے تھے کہ حالات نے وہ سنگین کروٹ لی جو آپ بھی جانتی ہیں۔''

''گویا ہے کوئی لڑکی؟'' ماہ زیب خفیف سا مسکرائی۔

''جی۔'' مسعود نے نظریں جھکالیں۔ ''صفورا نام ہے اس کا؟''

''تمہارے لیے اس کے کیا جذبات ہیں؟''

''شادی کرنا چاہتی ہے مجھ سے۔ میں ہی کسی نہ کسی طرح ٹال رہا ہوں۔''

''کیوں ٹال رہے ہو؟ شادی کرلو اس سے!''

''جی!'' مسعود نے چونک کر ماہ زیب کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''یہاں کسی کو نہ بتاؤ۔ چپکے سے کرلو۔ اسے کہیں اور رکھو یا ڈنکے کی چوٹ پر کرو اس سے شادی۔ یہیں لاؤ اسے۔ میں کہہ دوں گی کہ میں نے تمہیں اجازت دے دی ہے۔''

مسعود نے اضطراب میں پہلو بدلا'' میں نے اسے ابھی تک اپنے اور آپ کے معاملے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔''

''تو بتا دو۔''

میرا خیال ہے کہ وہ برداشت نہیں کر سکے گی۔''

''اگر وہ تم سے سچی محبت کرتی ہے تو برداشت کرلے گی۔ اسے تمام حالات سے آگاہ کر کے بتا دینا کہ میں نے اور تم نے ایک سمجھوتا کیا ہے، شادی نہیں کی۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے اسے کچھ بتاتے ہوئے۔''

''ڈر نکال دو اپنے دل سے۔''

مسعود نے قدرے توقف سے ٹھنڈی سانس لی پھر کہا۔ ''اچھا، کوشش کروں گا۔''

لیکن وہ کوشش کر نہیں سکا، ڈرتا ہی رہا۔ ایک مہینا! دو مہینے! تین مہینے! یہاں تک کہ چھ مہینے گزر گئے۔ ماہ زیب برابر پوچھتی رہی کہ صفورا سے بات ہوئی یا نہیں۔ مسعود کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتا رہا۔

''اب میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔'' ایک دن ماہ زیب نے اس سے کہا۔ ''اگر تم بات نہیں کر سکتے تو مجھے اس کا بتا دو۔ میں جا کر بات کرلوں گی۔''

''دو دن سے وہ اپنے گھر پر ہے ہی نہیں۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ مری گئی ہے۔ ایک ماہ کے لیے۔''

''تو میں ایک مہینے بعد اس سے مل لوں گی۔ تم مجھے اس کا فون نمبر ہی دے دو۔ اگر وہ موبائل بھی اپنے ساتھ رکھتی ہو تو وہ نمبر دے دو۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' مسعود بے بسی سے مسکرایا۔ ''اسے آجانے دیں۔ اس بار میں اس سے بات کر ہی لوں گا۔''
''پکی بات؟''
''پکی!''

ماہ زیب نے اس طرح ہاتھ بڑھایا جیسے وعدہ پکا کر لینا چاہتی ہے۔ سال بھر سے کچھ زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد وہ شاید بھول ہی گئی تھی کہ اس نے اور مسعود نے ایک دوسرے کے درمیان ایک غیر مرئی دیوار حائل کر رکھی تھی۔ مسعود کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس کا انداز ویسا ہی تھا جیسا مشہود کے زمانے میں ہوتا تھا۔ ان دونوں کی وہی بے تکلفی عقیقہ بیگم کو ہمیشہ کھٹکتی رہی تھی۔

مسعود نے ہچکچاتے ہوئے اپنا ہاتھ ماہ زیب کے ہاتھ پر رکھا اور فوراً ہٹا لیا۔

''مجھے اس دن بے حد خوشی ہوگی جب تم صفورا کو اس گھر میں لاؤ گے۔'' ماہ زیب نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

مسعود خاموش رہا۔

ماہ زیب بستر پر جالیٹی۔ اب اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب تھی۔ بہت عرصے بعد اس کے ہونٹوں نے دوسروں کے لیے مسکرانا سیکھ لیا تھا لیکن اکیلے میں وہ اب بھی اداس ہی رہتی تھی۔ مشہود کی یادیں اب بھی اس کے لیے ایک تازہ زخم کی طرح تھیں اور اس کا خیال تھا کہ ساری زندگی وہ اسی طرح تڑپ تڑپ کر گزارے گی، مشہود کو کبھی نہیں بھول سکے گی۔ اس نے جو چند برس مشہود کے ساتھ گزارے تھے، کسی دن کا کوئی ایک واقعہ بھی وہ آج تک نہیں بھول سکی تھی۔ وہ سب کچھ اسے ایسا لگتا تھا جیسے ابھی کل کی بات ہو۔

ایک مہینا اور گزر گیا۔

اس دن ماہ زیب چونک گئی جب روبی کی کال آئی۔ ایک برس سے زیادہ وقت گزر جانے کے بعد وہ کال غیر متوقع تھی۔

''کیسی ہیں آپ ماہ زیب؟ میں روبی بول رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

ماہ زیب نے ایک طویل سانس لی۔ ''میں تو سمجھی تھی کہ آپ مجھے بھول ہی گئی ہوں گی۔ ایک بار ملنے آئیں اور پھر ایسی گئیں کہ دوبارہ خبر ہی نہ لی۔ مجھے آپ کا کئی بار خیال آیا لیکن میرے پاس آپ کا نمبر ہی نہیں تھا۔ آپ کو میرا نمبر کیسے ملا؟''

''مسعود صاحب سے۔'' روبی نے جواب دیا۔ ''انہیں بھی میں اسکول ہی کے زمانے سے جانتی ہوں۔ آج میں ایک کام سے اسی عمارت میں گئی تھی جہاں ان کا دفتر ہے۔ لفٹ میں اتفاق سے ہم دونوں ہی تھے۔ مختصر سی بات ہوسکی میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ کسی دن آپ کو لے کر میرے گھر آئیں۔ انہوں نے مجھے آپ کا نمبر دیا تھا اور کہا کہ آپ سے بات کر کے پروگرام طے کرلوں۔''

ماہ زیب کو ایک بات کھٹکی تھی۔ اس نے کہا۔ ''آپ نے مجھے اور مسعود کو ساتھ بلانے کے بارے میں کیسے سوچ لیا؟''

''ایسی باتیں تو کیا، ہر قسم کی بات پر لگا کر اُڑتی ہے۔ ایک نے دوسرے سے کہا، دوسرے نے تیسرے کو بتایا۔ اس طرح ہر بات پھیلتی ہی رہتی ہے۔ مجھے ابھی کوئی پندرہ دن پہلے کسی سے معلوم ہوا تھا۔ مسعود صاحب سے اس کی تصدیق بھی ہوگئی۔''

ماہ زیب نے کچھ خجالت محسوس کی کہ روبی کو اس کا علم ہوگیا تھا۔

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا ماہ زیب!'' روبی پھر بولی۔ ''یہ پہاڑ سی زندگی یوں ہی گزار دینا بہت مشکل ہوتا ہے۔''

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا!'' ماہ زیب نے کہا۔ ''آپ نے بھی تو زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔''

''وہ فیصلہ ٹوٹ چکا ہے ماہ زیب!'' روبی نے جواب دیا۔ ''میں نے شادی کرلی ہے۔''

''اوہ!'' ماہ زیب کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

روبی بولی۔ ''آپ مجھے شرف میزبانی بخشیں گی تو میرے شوہر سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔''

''کب کی آپ نے شادی؟'' ماہ زیب نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''چند مہینے پہلے کی بات ہے۔'' روبی نے کہا۔ ''آپ سے مشہود کے سانحے کی خبر سن کر تو اس شہر سے میرا دل ہی اچاٹ ہوگیا تھا۔ شہر کیا، اس ملک میں ہی وحشت ہونے لگی تھی۔ میں امریکا چلی گئی تھی۔ وہیں میری ملاقات نادر صاحب سے ہوئی۔ وہ ہیں تو یہیں کے باشندے، بس تفریح کے غرض سے امریکا کا رخ کر بیٹھے تھے۔ وہ مجھے پسند کرنے لگے۔ خیر اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن میں ان کی طرف اس لیے مائل ہوگئی کہ ان کی آواز بالکل ویسی ہے جیسی مشہود کی آواز تھی۔''

''اچھا!'' ماہ زیب کا دل یکبارگی بڑی تیزی سے دھڑکا۔

''تو پھر کب آ رہے ہیں آپ لوگ؟''
''کل اتوار ہے۔ کل شام کو آجائیں گے۔''
''ساڑھے چار بجے آجائیں۔'' روبی نے کہا۔''سردیوں کے دن ہیں۔ رات جلدی ہی ہو جاتی ہے۔''
''آپ کا گھر؟''
''میں نے مسعود صاحب کو کارڈ دے دیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے زیادہ دن کے بجائے کل ہی آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اور ہاں! ماہ رخ کو ضرور لائیے گا۔''
ماہ زیب نے دوسرے ہی دن آنے کا وعدہ اس لیے کر لیا تھا کہ وہ روبی کے شوہر کو دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئی تھی۔ اسے اس شخص کو دیکھنے کی بے قراری ہونا ہی چاہیے تھی کہ اس شخص کی آواز بقول روبی بالکل مشہود کی آواز جیسی تھی۔

☆☆☆

''مشہود کی آواز جیسی آواز کا مالک'' خود مشہود ہی تھا لیکن اب کوئی بھی اسے دیکھ کر مشہود تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ پلاسٹک سرجری نے اسے بالکل بدل دیا تھا، تاہم وہ ایک خوب صورت شخص نظر آتا تھا۔ روبی اس کی ایسی سرجری کرا ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ خوب صورت دکھائی نہ دے۔ اس کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کی جگہ اب مصنوعی دانت تھے لیکن ایسے کہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکیں۔
اتوار کی شام ساڑھے چار بجے کے قریب وہ بڑی بے چینی سے روبی کے اپارٹمنٹ کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ روبی کی پسند کے رنگ اور اچھی تراش کے سوٹ میں ملبوس اس کی شخصیت کچھ اور زیادہ نکھر آئی تھی۔
چار بج کر چالیس منٹ پر اپارٹمنٹ کے انٹر کام نے اپنی مخصوص موسیقی چھیڑ دی۔
دروازہ کھولنے کے لیے ملازمہ یا اس کا لڑکا بھی جا سکتا تھا لیکن روبی خود بڑی تیزی سے دروازہ کھولنے کے لیے گئی۔ مشہود ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے کے قریب ریشمی پردے کی آڑ میں کھڑا تھا۔
روبی کے ساتھ ماہ زیب اور ماہ رخ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ اپنی دانست میں ماہ زیب کو ''بے وفا'' سمجھنے کے باوجود مشہود کا دل بھر آیا اور ماہ رخ کو دیکھ کر وہ اسے گود میں لینے کے لیے بے قرار ہو گیا۔
روبی نے ان دونوں کو بٹھا... بعد دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا ''آپ کہاں رہ گئے نادر! ہمارے مہمان آ گئے ہیں بھئی!''
مشہود ذرا سا رک کر دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ماہ زیب جلدی سے کھڑی ہو گئی۔
''بیٹھیے، بیٹھیے!'' مشہود نے جلدی سے کہا پھر روبی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مسعود صاحب نہیں آئے؟''
''بس آدھے گھنٹے میں آجائیں گے۔'' ماہ زیب نے جواب دیا۔ ''ابھی بتا چکی ہوں میں روبی کو۔ دراصل وقت تو میں نے طے کیا تھا۔ مسعود کو اس کا علم بعد میں ہوا۔ انہیں اس وقت کسی سے ملنا تھا۔ وہ مجھے یہاں چھوڑتے ہوئے گئے ہیں۔ کچھ دیر میں واپس آجائیں گے۔''
''چلیں کوئی بات نہیں ہے۔'' مشہود نے کہا اور قریب جا کر ماہ رخ کو اپنی گود میں اٹھاتا ہوا بولا۔ ''بڑی پیاری بچی ہے آپ کی!''
ماہ رخ نے اسے ''انکل'' کہہ کر سلام کیا۔
مشہود کے دل کو ایک دھچکا لگا۔ اس کی بیٹی نے اسے ''پاپا'' کے بجائے ''انکل'' کہا تھا۔
''چائے تو منگوالی جائے۔'' روبی نے ماہ زیب سے کہا۔
''مسعود کو آجانے دیں۔''
''ابھی بس ایک ایک پیالی ہو جائے۔ سردیوں کے دن ہیں۔ مسعود صاحب کے آنے کے بعد باقاعدہ دور چل جائے گا۔''
''باقاعدہ۔'' ماہ زیب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دہرایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے خاصے تکلف سے کام لیا ہے۔''
''اس میں تکلف کیا!'' روبی نے کہا۔ ''چائے کے ساتھ کچھ تو ہوتا ہی ہے۔'' روبی نے جواب دیا اور بلند آواز میں ملازمہ کو پکار کر اس سے چائے لانے کے لیے کہا۔
مشہود ماہ رخ کو گود میں لے کر بیٹھ چکا تھا اور چور نظروں سے ماہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ماہ زیب نے بڑی سادگی اختیار کر لی ہے۔ وہ زیورات اور اچھے لباس کی بے حد شوقین تھی لیکن اس وقت ایک انگوٹھی اور کانوں میں ہلکے سے رنگ کے علاوہ گلے میں لاکٹ یا چین تک نہ تھی۔ ساری بھی اس نے بہت سادہ سی باندھ رکھی تھی۔
مشہود یہ سب کچھ سوچتے ہوئے دائیں ہاتھ سے اپنے کوٹ کا ایک بٹن اضطراری طور پر اِدھر سے اُدھر گھمانے لگا تھا۔
روبی نے ماہ زیب کی کسی بات پر اپنے پیشے سے متعلق کوئی دلچسپ قصہ سنانا شروع کر دیا تھا۔

مشہود نے اپنی گود میں بیٹھی ہوئی ماہ رخ سے پوچھا۔ ''آپ نے اب کہاں تک پڑھ لیا ہے بیٹے!''

''میں نا!...... وہ ...... پانچویں کلاس کی کتابیں پڑھ رہی ہوں انکل! مجھے چھوٹے ابو پڑھاتے ہیں۔''

مشہود کے دل کو پھر دھچکا لگا۔ ماہ رخ نے ''چچا جان'' کی بجائے ''چھوٹے ابو'' کہا تھا۔

''چھوٹے ابو کون؟'' مشہود بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔ اس کی آواز لرز گئی تھی۔

''چھوٹے ابو۔'' ماہ رخ ہنسی۔ ''وہ بس چھوٹے ابو ہیں۔''

''اچھا! اچھا!'' مشہود سر ہلاتے ہوئے ہنسا...... اس کی ہنسی میں بھی کرب تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''پڑھنے کے علاوہ آپ کیا کرتی ہیں؟ کوئی کھیل تو کھیلتی ہوں گی جیسے لوڈو یا کیرم بورڈ!''

''میں تو دونوں کھیلتی ہوں۔ چھوٹے ابو کھیلتے ہیں میرے ساتھ۔'' ماہ رخ نے جواب دیا اور پھر معصومیت سے پوچھا۔ ''آپ بھی کسی سے کھیلتے ہیں انکل؟''

''نہیں بیٹا!'' مشہود کے منہ سے جیسے ''آہ'' نکلی پھر اس نے کہا۔ ''کام سے فرصت ہی نہیں ملتی لیکن تم کبھی کبھی آجایا کرو۔ تمہارے ساتھ کھیلا کروں گا۔''

ماہ زیب بولی۔ ''میرے پاس آؤ ماہ رخ! کب تک انکل کی گود میں چڑھی رہو گی۔''

مشہود نے جلدی سے کہا۔ ''بیٹھا رہنے دیجیے! کیوں اٹھانا چاہتی ہیں اسے؟''

''ہاں امی!'' ماہ رخ بولی۔ ''مجھے تو اچھا لگ رہا ہے انکل کی گود میں۔''

''عجیب بات ہے۔'' ماہ زیب نے غور سے مشہود کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بار یہ کسی سے ملتی ہے تو اس کی گود میں نہیں بیٹھتی۔''

''میں بھی کسی کو اپنی گود میں نہیں بٹھاتا لیکن آپ کی بچی مجھے بہت پیاری لگی ہے۔'' مشہود نے ماہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ملازمہ چائے کی ٹرالی لے آئی۔

''لاؤ میں بناتا ہوں چائے!'' مشہود نے ملازمہ سے کہا۔

''ارے نہیں۔'' روبی بولی۔ ''میں بنا لیتی ہوں۔''

مشہود ہنسا۔ ''میں بھی کچھ بری چائے نہیں بناتا۔''

ملازمہ ٹرالی اس کے قریب لے آئی۔

ماہ رخ بولی۔ ''میں اب آپ کی گود سے اتر جاؤں انکل؟''

''نہیں نہیں۔ بیٹھی رہو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

روبی ہنس کر ماہ زیب کی طرف متوجہ ہوئی۔ ''چلیں انہی کو بنانے دیتے ہیں چائے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ...... پتا نہیں کیا کہہ رہی تھی۔''

''آپ کسی آپریشن کے بارے میں بتا رہی تھیں۔'' ماہ زیب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میری ہی وجہ سے آپ کی بات کٹی تھی۔ میں ماہ رخ کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔''

''آپ میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہی ہیں؟''

''ہرگز نہیں۔ آپ کی باتوں سے تو میری معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔''

مشہود چائے بنانے میں مصروف ہو چکا تھا۔ ماہ رخ معصومانہ انداز میں مشہود کو بتاتی رہی کہ لوڈو کھیلتے ہوئے اس کے چھوٹے ابو بے ایمانی کرتے ہیں تو وہ ان کی بے ایمانی پکڑ لیتی ہے۔

مشہود اس سے باتیں کرنے کے دوران میں چائے بناتا رہا۔ چائے بنانے کے بعد اس نے روبی سے کہا۔ ''لو روبی! اپنی اور اپنی مہمان کی پیالیاں تو اٹھا لو۔''

روبی اٹھ کر اس کے قریب آئی اور ٹرالی سے دو پیالیاں اٹھا لیں۔

جب وہ لوگ چائے پی چکے تھے تو انٹر کام کی آواز آئی۔ اس بار بھی روبی ہی اٹھ کر دروازہ کھولنے گئی۔ آنے والا مسعود ہی تھا۔ مشہود نے ماہ رخ کو گود سے اتارا۔ مسعود سے ملتے ہوئے وہ بہت گرم جوش تھا۔ اس نے مسعود کو گلے لگا کر اس کی پیٹھ دو مرتبہ تھپکی۔

پھر سب بیٹھ گئے۔ ماہ رخ اب ماہ زیب کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔ چند رسمی باتوں کے بعد روبی نے ملازمہ کو آواز دی۔ اس مرتبہ ملازمہ جو ٹرالی لے کر آئی، وہ خاصی بڑی تھی۔

''لوازمات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔'' مسعود مسکرایا۔

''پہلا موقع ہے نا!'' روبی نے ہنس کر کہا۔ ''بعد میں کنجوسی بھی چل جائے گی۔''

''میں تو کنجوسی کا قائل ہی نہیں ہوں۔'' مشہود بولا۔

''آپ کی آواز حیرت انگیز طور پر میرے بڑے بھائی کی آواز جیسی ہے۔'' مسعود نے اس سے کہا۔ ''آپ کا گلے ملنا بھی مجھے بہت اچھا لگا۔ عجیب اتفاق ہے کہ میرے مرحوم بھائی جان جب کبھی مجھے گلے لگاتے تھے تو میری پیٹھ دو

مرتبہ تھپکا کرتے تھے۔ آپ نے بھی دو ہی مرتبہ تھپکی۔"

مشہود کا دل دھک سے رہ گیا۔ اب اسے خیال رکھنا چاہیے کہ اپنی مخصوص عادتوں سے گریز کرے۔

روبی نے مسعود کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"یہ جو میرے شوہر نامدار ہیں، نادر صاحب...... ان کی عادتیں کچھ اسپیشل ہیں۔ عام حالات میں دو بار تھپکی! کسی کی ڈھارس بندھانا ہو تو تین تھپکیاں! مجھے ذاتی طور پر اس کا تجربہ ہے۔"

"مجھے تو انکل نے ایک بار بھی نہیں تھپکا!" ماہ رخ بول پڑی۔

سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ مشہود کی آنکھوں سے بہت زیادہ پیار چھلک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب "مہمان" رخصت ہوگئے تو روبی نے غیر معمولی سنجیدہ لہجے میں مشہود سے کہا۔ "تم نے اس کا برا تو نہیں مانا کہ تمہیں میں نے اپنا شوہر ظاہر کیا؟"

"یہ تو تم مجھے پہلے ہی بتا چکی ہو۔ ماہ زیب سے تم نے فون پر ہی یہ کہہ دیا تھا!"

"یہ جھوٹ بولنا مجبوری تھی ورنہ وہ لوگ سوچتے کہ تم میرے اپارٹمنٹ میں کیوں ہو!"

"خوامخواہ اپنے دماغ پر بوجھ نہ لیا کرو۔ یہ بات میں پہلے ہی سمجھ چکا ہوں۔"

روبی بولی۔ "آج اتنے عرصے بعد ماہ رخ کو اپنی گود میں بٹھا کر تمہیں بہت سکون ملا ہوگا!"

"بہت۔" مشہود نے کہا۔ "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ اسے بیان کرسکوں!"

"اور ماہ زیب کو دیکھ کر کیسا لگا؟"

مشہود نے ٹھنڈی سانس لی۔ "وہ بیان کرنا تو میرے لیے بہت ہی مشکل ہوگا۔ بڑے متضاد سے احساسات تھے۔ ہاں مسعود سے مل کر مجھے بڑی طمانیت ملی۔ اسے میں قصوروار نہیں سمجھتا کہ اس نے ماہ زیب سے شادی کرلی۔"

روبی نے کچھ سوچتے ہوئے سر ہلایا پھر کہا۔ "اب تمہیں اس پر غور کرلینا چاہیے کہ آئندہ زندگی کس طرح گزارو گے اور ایک خیال یہ بھی رکھو کہ اگر تمہیں خود کو ان لوگوں سے پوشیدہ رکھنا ہے تو اپنی پرانی عادتیں ترک کرو۔"

"ہاں۔" مشہود نے اثبات میں سر ہلایا۔ "شاید مجھ سے یہی ایک غلطی ہوگئی کہ میں نے مسعود کی پیٹھ پر دو مرتبہ تھپکی۔"

☆☆☆

مشہود نے لفظ "شاید" کا استعمال بالکل درست کیا تھا۔ اس سے ایک نہیں، بہت سی غلطیاں ہوئی تھیں جن کی وجہ سے ماہ زیب کے دماغ میں ہیجان برپا ہوگیا تھا۔ وہ خود کو بڑی مشکل سے اپنے قابو میں رکھ سکی تھی۔ واپس گھر لوٹتے ہوئے بھی اس نے مسعود کی وجہ سے خود کو قابو میں رکھا لیکن رات کو جب ماہ رخ اور مسعود سو چکے تھے تو وہ بستر پر بیٹھی اپنی کنپٹیاں اپنے دونوں ہاتھوں سے پوری قوت کے ساتھ دبا رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کی کنپٹیاں چیخ جائیں گی۔

مشہود! مشہود! اس کا دل چیخ رہا تھا، وہ مشہود ہے۔

ماہ زیب کو مشہود کی ساری عادتیں یاد تھیں۔ جب وہ مضطرب ہوتا تھا تو غیر ارادی طور پر اپنے کوٹ یا قمیص کا کوئی بٹن اِدھر اُدھر گھمانے لگتا تھا۔ بالکل ایسا ہی روبی کے شوہر نے بھی کیا تھا۔ جب کوئی کسی بچے سے اس کی تعلیم کے بارے میں جاننا چاہتا ہے تو اس سے اس کے اسکول کے بارے میں پوچھتا ہے لیکن روبی کے شوہر نے یہ جاننا چاہا تھا کہ ماہ رخ کہاں تک پڑھ چکی تھی۔ گویا اسے معلوم تھا کہ ماہ رخ اسکول میں نہیں گھر میں پڑھتی ہے۔ جب اس نے ماہ رخ کے منہ سے "چھوٹے ابو" کے الفاظ سنے تو اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ روبی سے باتیں کرتے ہوئے ماہ زیب کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتی اور سب کچھ سنتی رہی تھی۔ سنتی رہی تھی اور بے چین ہوتی رہی تھی۔ ماہ رخ سے کھیل کود کے حوالے سے کیرم بورڈ اور لوڈو کا حوالہ دیا گیا تھا اور ماہ رخ صرف یہی دونوں کھیل کھیلتی تھی۔ گویا روبی کے شوہر کو یہ بھی معلوم تھا۔ ماہ رخ بہت دیر تک اس کی گود میں بیٹھی رہی تھی اور خود وہ بھی اسے بٹھائے رکھنا چاہتا تھا۔ ماہ رخ کبھی کسی اجنبی کی گود میں نہیں بیٹھتی تھی مگر اس کی گود میں بیٹھ کر خوش تھی۔ کیا اسے خون کی کشش نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔

عورت اور مرد کسی جگہ جمع ہوں تو عموماً چائے کوئی عورت ہی بناتی ہے لیکن اس معاملے میں مشہود خود پہل کیا کرتا تھا۔ بالکل ایسا ہی روبی کے شوہر نے بھی کیا تھا پھر مسعود سے گلے ملتے وقت اس نے مسعود کی پیٹھ دو مرتبہ تھپکی تھی اور مشہود بھی دوبارہ ہی تھپکی دینے کا عادی تھا۔ اس کی اس حرکت نے مسعود کو بھی اپنے بڑے بھائی کی یاد دلادی تھی۔

یہ سارے خیالات ماہ زیب کے دماغ میں برابر چکرا رہے تھے۔ اس نے خوب محسوس کیا تھا کہ اس ملاقات کے دوران میں روبی کے شوہر پر اضطرابی سی کیفیت مسلسل طاری رہی تھی اور وہ اسے دبانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ ماہ رخ کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جو چمک آجاتی تھی

اور جو پیار امنڈ تا تھا، ماہ زیب اسے بھی محسوس کر چکی تھی۔

یہ سب خیالات اپنی جگہ لیکن ماہ زیب کشمکش کا بھی شکار تھی۔ اس کی سمجھ میں کسی طرح نہیں آرہا تھا کہ اگر وہ مشہود ہے تو اس کا چہرہ کیسے بدل گیا؟ اور وہ لاش کس کی تھی جو پولیس نے مسعود کے حوالے کی تھی؟ کیا وہ کسی اور کی لاش تھی؟ کیا پولیس کو اس معاملے میں غفلت کا شکار سمجھا جا سکتا تھا؟

ایک ہی سوال مختلف انداز میں ماہ زیب کے دماغ پر ضربیں لگا تا رہا۔

ماہ زیب کے دماغ میں ایک افسانوی سی بات یہ بھی آئی تھی کہ مشہود اس سانحے میں ہلاک نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی آڑ لے کر ''روپوش'' ہو گیا تھا۔ روبی شدت سے اس کی پرستار تھی اور مشہود آخر کار اس سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے کچھ عرصے روپوشی اختیار کرنے کے بعد روبی سے شادی کر لی تھی۔ اپنے ماں باپ، اپنے بھائی، اپنی بیوی، اپنی بیٹی، سبھی کو اس نے فراموش کر دینا چاہا تھا لیکن ایسا کر نہیں سکا تھا۔ ان سب کو دیکھنے کی تڑپ اس کے دل میں رہی اور آخر اس نے روبی کے ذریعے انہیں اپنے گھر میں بلایا تھا۔

لیکن چہرہ؟

ماہ زیب کے خیالات کی سوئی اس جگہ آکر بار بار اٹکی تھی کہ مشہود کا چہرہ کیسے بدل گیا؟

دماغی خلفشار سے وہ اس وقت چونکی جب اس نے مسعود کی آواز سنی۔ ''کیا آپ رات بھر جاگتی رہیں؟''

ماہ زیب نے دیکھا کہ کھڑکی کے شیشے دھوپ سے چمک رہے تھے۔ صبح ہو چکی تھی۔ اپنے خلفشار میں اسے رات گزر جانے کا بھی احساس نہیں ہو سکا تھا۔

وہ سرہانے سے ٹیک لگائے نیم درازسی حالت میں تھی۔ مسعود نے اسے چونکایا تو وہ بوکھلا کر اٹھی۔

''صبح ہو گئی؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''آپ کو اس کا بھی پتا نہیں چلا؟'' مسعود کے لہجے میں حیرت تھی۔

''وہ......وہ ......دراصل بہت جلدی آنکھ کھل گئی تھی آج'' ماہ زیب نے جلدی سے کہا۔

''آپ کیا بیٹھی سوچتی رہیں؟''

''کچھ نہیں ...... کچھ بھی تو نہیں ...... بس ایسے ہی۔''

مسعود اسے پُر تشویش نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ ''کل جب ہم روبی کے گھر سے آرہے تھے، تب آپ الجھی الجھی سی نظر آرہی تھیں۔ گھر آنے کے بعد بھی آپ کی وہی حالت رہی، رات کو آپ نے مجھ سے کوئی بات بھی نہیں کی۔ جب بھی میں نے کچھ کہا، آپ ہوں ہاں کر کے خاموشی اختیار کیے رہیں۔''

ماہ زیب کو اتنا احساس ضرور تھا کہ گزشتہ رات گھر آتے آتے اس کی وحشت بہت بڑھ گئی تھی لیکن یہ اسے یاد نہیں آسکا کہ مسعود نے اسے مخاطب کیا تھا اور اس سے کوئی بات کی تھی۔

''سچ بتایئے!'' مسعود پھر بولا۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ نادر صاحب کی آواز سن کر آپ......''

ماہ زیب کو بہانہ سوجھ گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے مسعود کی بات کاٹ۔ ''ہاں، تم ٹھیک سمجھے ہو۔ کل سے تمہارے بھائی جان بہت شدت سے یاد آرہے ہیں۔''

یہ جواب سن کر مسعود کے چہرے پر بھی اداسی نظر آنے لگی۔ اس نے بھی ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''کل رات آپ کو میں یہ بتانا چاہ رہا تھا صفورا واپس آگئی ہے۔ آج کسی وقت اس سے ملاقات ہوگی۔''

''اچھا اچھا۔ بتانا واپس آکر، کیا بات ہوئی!''

مسعود سر ہلا کر باتھ کی طرف بڑھ گیا۔

ماہ زیب ماہ رخ کی طرف متوجہ ہوئی جو کلبلانے لگی تھی۔ ماہ زیب اپنی وحشت پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

سب کے ساتھ ناشتا کرنے کے بعد ماہ زیب اپنے کمرے میں آگئی۔ مسعود دفتر چلا گیا تھا۔ بینائی صاحب ناشتا کرنے کے بعد ماہ رخ کو اپنے ساتھ اٹھا لے گئے۔ کبھی کبھی پہلے بھی ایسا ہوتا رہتا تھا۔ وہ ماہ رخ کو بہت چاہتے تھے۔

تنہائی ملی تو پھر وہی خیالات تھے اور ماہ زیب کا دماغ ان کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ وہ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی۔ نہ جانے کب اس کے دماغ پر اندھیرا چھا گیا۔ وہ اتنی گہری نیند سوئی کہ شام کو اٹھی۔ اسے ماہ رخ نے جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگایا تھا۔ ماہ زیب کے نہ اٹھنے سے وہ روہانسی ہونے لگی تھی۔ ماہ زیب نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور اسے بہلانے لگی۔

ماہ رخ ہمیشہ کی طرح جلد ہی بہل بھی گئی۔ اسی نے ماہ زیب کو بتایا کہ مسعود اس روز ابھی تک دفتر سے نہیں آیا تھا۔

صفورا سے ملنے گیا ہوگا، ماہ زیب نے سوچا۔

تھوڑی دیر بعد ماہ رخ اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ گئی۔ ماہ زیب نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے رکھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کھانے کی میز پر بینائی صاحب یا نفیسہ بیگم کی طرف سے اس کی حالت پر کوئی استفسار ہو۔

بینائی صاحب نے اسے بتایا کہ مسعود نے انہیں فون کیا تھا۔ کسی کام کی وجہ سے آج اس کی واپسی دیر میں ہوگی۔

اسے اتنی دیر ہوئی کہ اس کے آنے سے پہلے ماہ رخ سو چکی تھی۔

تنہائی میں ماہ زیب پھر اپنے پریشان کن خیالات میں الجھنے لگی۔ الجھنے کیا لگی، الجھتی ہی چلی گئی۔ مسعود آیا تو تو اس کی طرف بھی توجہ نہیں دے سکی۔ مسعود کے چہرے سے پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ماہ زیب نے اس بارے میں کوئی استفسار ہی نہیں کیا۔ وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ اس روز مسعود صفورا سے ملا ہوگا۔ مسعود کپڑے تبدیل کر کے لیٹ گیا۔ شاید وہ توقع کر رہا ہو کہ ماہ زیب اس سے پوچھے گی تو وہ اسے کچھ بتائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

رات اسی طرح گزر گئی جیسے گزشتہ رات گزری تھی۔ صبح مسعود نے اسے جاگتا ہوا دیکھا لیکن کچھ نہیں بولا۔ خاموشی سے باتھ روم میں چلا گیا۔

ناشتے کی میز پر بینائی صاحب نے مسعود کی پریشانی محسوس کی تو اسے استفسار کیا۔ مسعود نے کسی کاروباری الجھن کا ذکر کر کے بات ختم کر دی۔

رات کی طرح ماہ زیب کا دن بھی گزشتہ دن کی طرح گزرا۔ اس روز تو کئی بار اس کا جی چاہا کہ گھر سے نکل کر روبی کے گھر پہنچے اور چیخ چیخ کر پوچھے کہ اس نے اس سے اس کا مشہود کیوں چھین لیا؟

ماہ زیب بہ مشکل خود کو قابو میں رکھ سکی اور اسے یہ خیال بھی آیا کہ اس کی بڑھتی ہوئی وحشت اسے پاگل پن کی طرف دھکیل رہی ہے۔

رات گئے مسعود کے آنے پر بھی وہ نہ چونکتی اگر مسعود زمین پر بچھے ہوئے بستر پر دھڑ سے گرا نہ ہوگا۔

''کیا ہوا؟'' ماہ زیب بوکھلا کر اٹھی۔

مسعود اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ماہ زیب نے جلدی سے قریب جا کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ مسعود بیٹھ گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں سرخ تھیں۔ اس نے غصے سے ماہ زیب کی طرف دیکھا اور اس کے دونوں بازو اتنی زور سے پکڑے کہ ماہ زیب تکلیف سے کراہ اٹھی۔

''کیا ملا تمہیں؟'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''میری صفورا مجھ سے کیوں چھین لی تم نے؟''

ایک عجیب سی بو کا بھبکا اس کے منہ سے نکلا تھا۔

''مسعود!'' ماہ زیب حواس باختہ سی ہوگئی۔ ''کیا تم نے شراب پی ہے؟''

''ہاں۔'' مسعود نے جھٹکے سے کہا۔ ''نہ پیتا تو کیا کرتا۔ اسے اپنی آنکھوں سے دفن ہوتا دیکھ کر آیا ہوں۔''

''کیا؟ کیا؟'' ماہ زیب کے منہ سے نکلا۔

''ہاں۔'' مسعود نے ماہ زیب کے بازوؤں کو جھٹکا دیا۔ ''کل میں نے اسے اپنے اور تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ناراض ہو کر چلی گئی تھی۔ آج دوپہر کو میں نے اسے فون کیا۔ میں اسے کسی منانا چاہتا تھا لیکن وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔ رات ہی کو اس نے خودکشی کر لی تھی۔''

ماہ زیب نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکی۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا ہی رہ گیا۔ وہ پلکیں جھپکانا بھی جیسے بھول گئی تھی۔

''اور اس کی ذمے دار تم ہو...!'' مسعود نے دانت پیسے۔ ''تم ہی نے زور دیا تھا کہ میں اسے سب کچھ بتا دوں۔ بتا دیا میں نے اسے۔ وہ برداشت نہیں کر سکی کہ میں نے اس

کے بجائے تم سے شادی کر لی ہے۔ بچھڑ گئی وہ مجھ سے۔ اب اس کی سزا صرف تمہی کو دی جاسکتی ہے۔ آج کے بعد تم بھی تڑپنا کہ تم اپنے مشہود کی نہ رہ سکیں۔''

مسعود پر جنون طاری تھا۔ اس نے ماہ زیب کا ایک بازو چھوڑ کر اپنے اس ہاتھ سے ماہ زیب کا گریبان پکڑا اور زور سے جھٹکا دیا۔ کپڑا پھٹتا چلا گیا۔

''مسعود!'' ماہ زیب نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ ''شراب نے پاگل کر دیا ہے تمہیں!''

''ہاں، پاگل تو ہو گیا ہوں میں۔''

''مجھے چھوڑو مسعود!'' ماہ زیب ہانپنے لگی۔ ''ورنہ میں چیخ پڑوں گی۔''

مسعود ہنسا۔ وہ ایک ہذیانی ہنسی تھی۔ اس نے کہا۔ ''چیخو! خوب چیخو! اس گھر میں سب جانتے ہیں کہ تم میری بیوی ہو۔ ہاں اگر تم یہ تماشا اپنی چھوٹی سی بیٹی کو دکھانا چاہو تو اور بات ہے۔''

''مسعود!'' ماہ زیب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''تم اپنے حواس کھو بیٹھے ہو۔ تمہیں احساس نہیں ہے کہ تم کیا کرنے جا رہے ہو!''

''سب احساس ہے مجھے! تمہی نے برباد کیا ہے مجھے۔ اب میں تمہارا احترام نہیں کر سکتا۔''

مسعود نے ایک جھٹکا دے کر ماہ زیب کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ کچھ کہنے کے لیے ماہ زیب کے ہونٹ کھلے لیکن وہ کچھ بول نہ سکی۔ مسعود نے اس کا منہ بند کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ماہ زیب کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم تیزی سے بے جان ہوتا چلا گیا ہو پھر وہ کوئی مزاحمت نہیں کر سکی اور وہ سب کچھ ہو گیا جو وہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ مصنوعی دیوار ریت ڈھے گئی جو خود مسعود نے کھڑی کی تھی۔ مسعود نے ہی وہ گرا دی۔

صبح ہوئی تو ماہ زیب خود کو چادر میں لپیٹے بستر پر بیٹھی مسعود کی طرف دیکھ رہی تھی جو بیدار ہو گیا تھا۔ ماہ زیب سپاٹ اور ویران سے چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

مسعود آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اس کی نظر ماہ زیب پر پڑی پھر وہ جیسے ٹھٹک گیا۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ کچھ یاد کر رہا ہو۔

''نشہ اتر گیا ہے اب۔'' ماہ زیب دھیمی آواز میں بولی۔ ''اور شاید ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا ہے کہ رات کو کیا کر بیٹھے ہو۔ میں تمہیں یاد دلاتی ہوں۔''

چائے نوش

ہم نے تو جتنے بھی ان چائے پینے والوں کو دیکھا ہے جو صحیح معنوں میں چائے نوش ہیں۔ سب کا یہی حال پایا کہ اس لپٹن والی کمپنی کے مرید ہو کر رہ گئے ہیں۔ بلکہ جس طرح آغا حشر کاشمیری نے بادہ خواروں کے متعلق فرمایا ہے کہ:

گلاسوں میں جو ڈوبے پھر نہ نکلے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے ان بوتلوں کے بند پانی میں

اسی طرح ہم چائے خواروں کے متعلق عرض کریں گے کہ:

جو ڈوبے پرچ، پیالی میں نہ نکلے زندگانی میں
ہزاروں بہہ گئے اس کیتلی کے گرم پانی میں

شوکت تھانوی کی کتاب بحرِ تبسم سے کھلکھلاتا انتخاب،

مرسلہ: رفعت رضا، کراچی

ماہ زیب نے اپنے جسم سے چادر ڈھلکا دی۔

مسعود نے جھٹکے کے ساتھ مڑ کر اپنی پیٹھ ماہ زیب کی طرف کر دی۔

''نہیں۔'' اس کی سرگوشی میں دہشت سی تھی۔

''اب بھی میری طرف دیکھو مسعود!'' ماہ زیب نے کہا۔ ''کچھ بھی تو اب تمہارے لیے اجنبی نہیں رہا۔''

''نہیں'' مسعود کی آواز کانپ گئی۔ ''یہ..... یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

''لیکن ہو چکا ہے۔'' ماہ زیب کے چہرے کی طرح اس کی آواز بھی پتھرائی ہوئی سی تھی۔

مسعود کچھ نہیں بولا۔ چند لمحے وہ بالکل ساکت کھڑا رہا پھر اس کے قدم دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ دھیرے دھیرے اٹھتے ہوئے وہ قدم ایسے تھے جیسے وہ خواب میں چل رہا ہو۔ وہ ننگے پیر تھا لیکن شاید اسے اس کا بھی احساس نہیں تھا۔

''مسعود!'' ماہ زیب نے دھیمی ہی آواز میں پکارا۔

مسعود مشینی انداز میں رک گیا لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا

''کہاں جا رہے ہو اس طرح؟'' ماہ زیب نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔'' مسعود کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔ ''بس جا رہا ہوں اور کبھی نہیں آؤں گا۔ آج کے بعد کوئی میرا سایہ بھی نہیں دیکھ سکے گا۔''

ماہ زیب چادر اوڑھتی ہوئی بستر سے اٹھی اور آہستہ

آہستہ چلتی ہوئی مسعود کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے پیچھے کھڑے کھڑے اس نے کہا۔

''اس طرح تو اب تم نہیں جا سکتے۔'' اس کے لہجے میں مضبوطی تھی۔

''مجھے جانا ہی ہوگا۔'' مسعود گم صم ہی سا رہا۔ ''صفورا کے بعد یہ دنیا میری نظروں میں ہیچ ہو گئی تھی۔ اب میں خود اپنی نظروں سے گر گیا ہوں۔''

''اس قسم کا اندیشہ انسان کو شراب پینے سے پہلے ہونا چاہیے۔''

مسعود نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے رکا پھر اس نے ایک قدم بڑھایا۔

''نہیں۔'' ماہ زیب نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی گرفت سخت تھی۔ وہ بولی۔ ''جو رات گزر گئی، اس کے بعد میں تمہیں اس طرح نہیں جانے دوں گی۔ مشہود تو مجھے دھوکا دے گئے۔ اب تم بھی مجھے بے سہارا چھوڑ کر چلے جانا چاہتے ہو؟''

ماہ زیب کی آواز بھرا گئی۔ اس کے دماغ میں اس وقت یہ خیال تھا کہ جسے وہ مشہود سمجھ رہی ہے، وہ اس کا مشہود نہیں رہا۔ وہ روبی سے شادی کر چکا تھا۔

مسعود نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ جانا چاہا لیکن ماہ زیب اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے سامنے آگئی۔ مسعود کو رکنا پڑا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

''میری طرف دیکھو!'' ماہ زیب نے کہا۔

''نہیں دیکھ سکتا۔'' مسعود کی آواز لرز گئی۔ ''ہمت نہیں رہی اب!''

''میں دلاؤں گی تمہیں ہمت!'' ماہ زیب نے کہا۔ اس کے لہجے میں بلا کا درد کا تھا۔ ''میرے سامنے اب اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔''

''پلیز!'' مسعود گڑگڑایا۔ ''مجھے جانے دیں۔''

''نہیں..... نہیں..... نہیں۔'' ماہ زیب نے کہا۔ ''میرے بارے میں نہیں تو اپنی گڑیا کے بارے میں سوچ لو۔ وہ دوبارہ یتیم ہو جائے گی۔''

مسعود کا سپاٹ نظر آنے والا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس کے ہونٹ لرزنے لگے۔ ذرا سا آگے جھک کر اس نے اپنا سر ماہ زیب کے شانے سے ٹکا دیا اور سسکنے لگا۔ ماہ زیب نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔ وہ بولی۔ ''ماہ رخ کو دوبارہ یتیم نہ کرو مسعود!''

مسعود کی سسکیاں بڑھ گئیں اور اس کے آنسو ماہ زیب کا شانہ بھگونے لگے۔

☆☆☆

سردیوں کی دھوپ بڑی خوش گوار تھی۔ مشہود اور روبی اپارٹمنٹ کی بالکونی میں بیٹھے تھے۔ ناشتا انہوں نے وہیں کیا تھا۔ مشہود کی نظر اخبار کی سرخیوں پر دوڑ رہی تھیں۔ روبی ناشتے کے برتن سمیٹ رہی تھی۔

''آج ملازمہ کہاں چلی گئی؟'' مشہود نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔ ''ناشتا بھی تم ہی نے تیار کیا!''

روبی ہنسی۔ ''اب خیال آیا ہے آپ کو؟''

''ہاں۔'' مشہود نے اخبار تپائی پر ڈالتے ہوئے روبی کی طرف دیکھا۔ ''بس ایک سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔''

''ماہ زیب کے خیال میں تو آپ ڈوبے ہی رہتے ہیں۔'' روبی نے کہا۔ ''ملازمہ کو آج بخار ہو گیا ہے۔ میں نے اسے دوا دے دی ہے۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں لیکن میں نے سوچا کہ جب مجھے جلدی نہیں ہے تو خود ہی ناشتا تیار کرلوں، اسے آرام کر لینے دوں۔''

''جلدی نہیں ہے؟'' مشہود نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا اسپتال نہیں جاؤ گی؟''

''جاؤں گی لیکن دیر سے جاؤں گی۔ ایک آپریشن کرنا ہے لیکن دو بجے۔ بارہ بجے تک نکلوں گی گھر سے۔''

''تب تو میں اسی وقت تم سے بات کرلوں۔ سوچ رہا تھا کہ اسپتال سے آجاؤ گی تو کروں گا۔''

''کوئی خاص بات؟'' روبی اسے غور سے دیکھنے لگی۔

''رات سے ہی سوچ رہا ہوں اس کے بارے میں۔'' مشہود نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی تم نے ماہ زیب کا نام لیا تھا لیکن بات اس کی نہیں ہے۔ وہ اور ماہ رخ تو ہر لمحہ میرے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ میں تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

روبی خفیف سا مسکرائی۔ ''میرے بارے میں کیا سوچ رہے تھے؟''

مشہود کی سنجیدگی قائم رہی۔ اس نے کہا ''تم نے میرے لیے بہت کچھ کر ڈالا روبی لیکن میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔''

اس بار روبی ہنس پڑی۔ اس نے کہا۔ ''صلے کے بارے میں سوچنا بھی محبت کی توہین ہے۔ مجھے تو یہ خیال پریشان کرتا رہتا ہے کہ ماہ زیب کی امانت اسے کس طرح لوٹاؤں!''

مشہود نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اب اس بارے میں سوچنے سے کچھ حاصل نہیں۔ مسعود سے اس کی شادی ہوچکی ہے۔ اب ان دونوں کی زندگی میں ہلچل لانا کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ اب مجھے صرف تمہارے بارے میں سوچنا ہے۔“

اس سے پہلے کہ روبی کچھ کہتی، انٹر کام کی آواز سنائی دی۔

”اس وقت کون آگیا۔“ روبی بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔

”دیکھو لو۔“ مشہود نے کہا اور اخبار اٹھا کر پھر اس کی سرخیوں پر نظر دوڑانے لگا لیکن دماغ میں جو خیال رات سے چکرا رہا تھا، وہ اب بھی چکراتا رہا۔

پھر اس وقت اس کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ کر فرش پر گر پڑا جب اس نے ماہ زیب کی چیختی ہوئی سی آواز سنی۔

”میں اس وقت صرف آپ کے شوہر سے ملنے آئی ہوں۔“

مشہود اٹھ کر تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف لپکا۔ آواز اسی طرف سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

”آپ بیٹھیے تو ماہ زیب!“ روبی نے سٹپٹائے ہوئے سے انداز میں اس وقت کہا جب مشہود ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہا تھا۔

”میں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔“ ماہ زیب کچھ بپھری ہوئی سی تھی۔

مشہود نے دیکھا کہ ماہ زیب کی ساری اس طرح گنجلک تھی جیسے وہ بستر پر لیٹے لیٹے اچانک اٹھ کر وہاں آگئی ہو۔ اس نے جیسے ہی مشہود کو دیکھا پھر بپھرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”ہاں! میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔“

”کیا بات ہے؟“ مشہود بوکھلا گیا تھا۔ ”کیا ہوا؟“

”جو کچھ ہوا، وہ تو میں سب بتاؤں گی۔“ ماہ زیب نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”لیکن پہلے آپ مجھے بتائیں۔ آپ کون ہیں؟“

”میں۔“ مشہود کی بوکھلاہٹ کم نہیں ہوئی۔ ”میں ہوں۔“

ماہ زیب تلخی سے مسکرائی۔ ”آپ کی گھبراہٹ بتا رہی ہے کہ آپ کچھ اور ہیں۔ آپ نے یہ کیسے جان لیا کہ ماہ رخ کو صرف لوڈو اور کیرم سے دلچسپی ہے۔“

مشہود کا منہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔ اسے یہ احساس شروع ہی سے تھا کہ بے خیالی میں اس سے کچھ غلطیاں سرزد ہوگئی ہوں گی۔



وہ مبارک و مسعود دن جس کی قدر ”شاہ داند یا بداند جوہری“ یعنی یا تو عیسائی سمجھ سکتے ہیں یا ہمارے ایسے ملازمت پیشہ، ان لوگوں کا یہاں ذکر ہی نہیں جو گھر بیٹھے۔ شنبہ، یکشنبہ، دوشنبہ سب کو ایک ہی لاٹھی ہانکا کرتے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہفتہ کے بعد کون سا دن آنے والا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ لوگ اتوار کی کیا قدر کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک جیسے بدھ اور منگل ویسے ہی اتوار۔ اس اتوار کی قدر تو کوئی ہمارے دل سے پوچھے کہ یہی وہ دن ہے۔

”دن گنے جاتے تھے جس دن کے لیے“

یقین کیجیے کہ اس دن کا انتظار پیر کے دن سے شروع ہوجاتا ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ہمارے ایسے بے چارے ملازمت پیشہ خدا کے بندے اپنی ذاتی زندگی کا دن تمام ہفتے میں صرف اتوار ہی کو سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام دن کو بندگی اور بے چارگی میں اس طرح گزارتے ہیں کہ ہم کو اپنے انسان ہونے کا ایک دفعہ بھی احساس نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مشین ہے۔ اگر لکھنے والا بٹن دبا دیا گیا تو لکھ رہے ہیں، اگر بیٹھنے والا پرزہ چل گیا تو بیٹھے ہوئے ہیں۔ مختصر یہ کہ صبح ہونے ہی دفتر آنا، دفتر میں ایک مقررہ خدمت انجام دینا، شام کو دفتر سے جانا سب کچھ اس طرح ہوتا ہے کہ:

اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

کی ایک متحرک تصویر معلوم ہوتے ہیں۔

بحر تبسم از شوکت تھانوی،

انتخاب: رفعت رضا، کراچی

”کوئی جواب نہیں ہے آپ کے پاس۔“ ماہ زیب کی تلخ مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ ”میں جب سے یہاں سے گئی ہوں، میرا دماغ سوچ سوچ کر پھٹنے لگا تھا۔ آپ کی اس خاموشی کے بعد اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ آپ مشہود ہیں۔“

مشہود اور روبی کو جیسے سکتہ ہوگیا تھا۔

ماہ زیب نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہاں آنے کا فیصلہ کرتے وقت مجھے خیال آگیا تھا کہ میں آپ کو وہ سب کچھ اپنی زبان سے نہیں بتا پاؤں گی، جذبات میں بہہ جاؤں گی۔ اسی لیے سب کچھ لکھ کر لائی ہوں۔ یہ پڑھ لیجیے!“ ماہ

زیب نے چند تہ کیے ہوئے کاغذ اپنے گریبان سے نکال کر مشہود کے قدموں میں پھینکے۔ ”ابھی آپ نے پوچھا تھا کہ کیا ہوا۔ یہ پڑھ کر آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ سولہ سترہ مہینوں کی ساری کہانی لکھ دی ہے میں نے۔ اس میں کوئی لفظ جھوٹ نہیں اور کوئی سچ میں نے چھپایا نہیں۔ ایک سچ ایسا بھی ہے جو اپنی زبان پر لانا میرے لیے ممکن بھی نہیں ہوتا۔“

مشہود اور روبی مجسموں کی طرح ساکت کھڑے رہے۔

”پڑھیے!“ ماہ زیب ہذیانی انداز میں بولی۔ ”یہ ایک بے وفا کی کہانی ہے۔ پڑھ کر بتایئے کہ وہ بے وفا کون ہے؟ اگر بتانا مشکل ہو تو نہ بتایئے گا۔ میں اصرار نہیں کروں گی۔“

مشہود ساکت کھڑا رہا۔ یہ اس کے لیے ایک کڑا امتحان بن گیا تھا کہ اپنے امنڈتے ہوئے جذبات کو قابو میں رکھے۔

روبی آہستگی سے آگے بڑھی۔ کاغذات اٹھاتے ہوئے اس نے ماہ زیب کی طرف دیکھا۔

”آپ بھی پڑھ لیں روبی!“ ماہ زیب کی آواز کانپنے لگی۔ ”آپ سے بھی مجھے کچھ نہیں چھپانا لیکن انہیں بھی میرے سامنے ہی پڑھنا ہوگا۔“

روبی نے کاغذات اٹھالی۔ مشہود اب نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ روبی نے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب کچھ پڑھنے کے دوران میں اس کے چہرے نے کئی بار رنگ بدلا۔ پھر آخری حصہ پڑھتے ہوئے تو اس کا چہرہ فق ہی پڑ گیا۔ اس نے کاغذات مشہود کی طرف بڑھائے تو اس کے ہاتھ میں لرزش تھی۔

”پڑھ لیجیے!“ اس کی آواز بہت دھیمی رہی۔

ماہ زیب خاموش کھڑی مشہود کی طرف دیکھتی رہی تھی۔

مشہود نے پڑھنا شروع کیا۔ جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا، اس کی بھی وہی کیفیت ہوتی رہی جو روبی کی ہو چکی تھی۔ آخر میں اس کے ہاتھ سے کاغذات قالین پر گر گئے۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے۔

”بے وفا کون؟“ ماہ زیب بولی۔ ”جواب دے سکیں گے آپ؟“

مشہود خاموش کھڑا رہا۔ روبی بھی چپ تھی۔

”بس اب میں جا رہی ہوں۔ میں نے ابھی کہا تھا نا کہ جواب کے لیے اصرار نہیں کروں گی۔ ہاں اگر آپ میں ہمت ہو سکے تو اسی طرح کا ایک خط مجھے لکھ دیجیے گا۔ ایک الجھن مجھے یہ بھی رہے گی کہ آپ نے اپنا چہرہ کیسے بدل لیا۔ چلتے چلتے میں ایک التجا بھی کروں گی۔ اب ہم لوگوں سے ملنے کی کوشش کبھی نہ کیجیے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ جو بات میں نے سمجھ لی، وہ مسعود بھی جان لے۔ اس نے جان لیا تو نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ میں نہیں چاہتی کہ ماہ رخ دوبارہ یتیم ہو جائے۔“

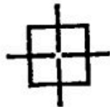
مشہود نے بڑے کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے تیزی سے جاتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنیں۔ جب وہ آواز معدوم ہو گئی تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہاں اب اس کے ساتھ صرف روبی ہی تھی۔

کچھ دیر کے بوجھل سکوت کے بعد مشہود بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”روبی!“

روبی نے اس کی طرف دیکھا۔

مشہود نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ ”جو کچھ ہوا، اس میں حالات کا قصور ہے یا قصوروار میں ہوں؟“

روبی نے نظریں جھکالیں۔ کوئی حتمی جواب دینا شاید اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔



زندگی سے بے زار نفرت کی چنگاریوں میں جھلستی ایک حسینہ کی انتقامی کارروائیاں

ازالہ

ایچ اقبال

کبھی کبھی انسان کو اس بات کا خیال ہی نہیں آتا کہ وہ اپنا چھوٹا سا فائدہ کرنے کے لیے دوسروں کا کتنا بڑا نقصان کر ڈالتا ہے... وہ بھی ایک ایسا ہی خودغرض باپ ثابت ہوا جس نے محض دولت کی چمک میں اپنے فرائض سے آنکھیں بند کر لیں لیکن... آنکھیں بند کر لینے سے نہ مصائب ٹلتے ہیں اور نہ ہی حقائق بدلتے ہیں... اور پھر وقت نے ایک مصیبت زدہ کو اپنی ٹھوکروں میں یوں رکھا کہ اس میں سوائے انتقامی زہر کے کچھ نہ بچا... اور جب اس کے رشتے کو کسی نے اہمیت نہ دی تو اس نے بھی رشتوں سے کھلواڑ شروع کر دیا... مگر قدرت کو شاید اس کا یہ کھیل پسند نہ آیا... اس کی ڈوری بھی کھینچ لی گئی اور یہ اس کے حق میں اچھا ہی ہوا کیونکہ اس طرح کسی کو ازالے کا موقع مل گیا... اور یوں ایک بھٹکے ہوئے مسافر کو درست سمت میں سفر کا اشارہ ملا جو اسے اس کی منزل تک لے جاتا تھا...



صبیحہ ایک بہت بڑے کاروبار کی مالک تھی جو اسے ورثے میں ملا تھا۔ اس سے پہلے یہ کاروبار اس کے مرحوم والدین مل کر چلایا کرتے تھے۔ صبیحہ ان کی اکلوتی اولاد تھی اس لیے اس کے والد نے اسے اعلیٰ تعلیم دلائی تھی تاکہ جب وہ اس دنیا میں نہ رہیں تو صبیحہ ان کے اس کاروبار کو بہ آسانی سنبھال سکے۔ وہ اپنے والدین کی توقع پر سو فیصد پوری بھی اتری۔ اس نے بہ حسن وخوبی سارا کاروبار اس وقت سنبھال لیا تھا جب وہ چھبیس سال کی تھی۔ اب اسے وہ کاروبار سنبھالے ہوئے تین سال گزر چکے تھے۔ اپنی آخری عمر میں اس کے والدین نے چاہا تھا کہ اس کی شادی کردیں لیکن وہ اس معاملے کو کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتی رہی تھی اور والدین کے انتقال کے بعد تو وہ اب خودمختار تھی۔ کوئی نہیں تھا جو شادی کے لیے اس پر دباؤ ڈال سکتا۔ صرف پروین تھی جو کبھی کبھی اسے اس معاملے میں چھیڑا کرتی تھی۔

''خاصی عمر ہوگئی ہے تمہاری۔'' پروین اس قسم کی باتیں کیا کرتی۔ ''آٹھ دس سال اور گزر گئے تو پھر کوئی تمہیں پوچھے گا بھی نہیں۔''

''یہی تو میں چاہتی ہوں۔'' صبیحہ اسی قسم کا جواب دیتی۔ ''میرا فیصلہ ہی یہ ہے کہ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گی۔''

''آخر کیوں؟''

''اچھے نہیں لگتے وہ مرد جو خود کو عورت سے برتر سمجھتے ہیں۔''

''لیکن کاروبار میں تمہارا سابقہ مختلف مردوں سے بھی پڑتا ہے۔''

''وہ اور بات ہے لیکن میں ان میں سے کسی کو اپنا شوہر تو نہیں بنانا چاہتی۔''

''شادی کرنے میں برائی کیا ہے؟''

''برائی بس یہ ہے کہ پھر عورت کو اپنے شوہر کے زیرنگیں رہنا پڑتا ہے۔ ہمارا معاشرہ مغربی معاشرہ تو ہے نہیں جہاں عورت شادی کے بعد بھی اپنی مرضی کی مالک ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں تو مرد یہ برداشت کرہی نہیں سکتا کہ اس کی بیوی کسی بھی معاملے میں اس سے آگے نکل جائے یا اس کے برابر ہو۔''

''انسان جس معاشرے میں رہتا ہے، اسے اس معاشرے کے تقاضے تو پورے کرنے پڑتے ہیں۔''

''یقیناً ایسا ہوتا ہے اور اسی لیے تو میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ پھر میں ان تقاضوں کا سامنا ہی کیوں کروں؟''

''شادی کرنا بھی اس معاشرے کا تقاضا ہے۔''

''وہ تو ہر معاشرے کا تقاضا ہے۔ شادی تو مغربی معاشرے میں بھی کی جاتی ہے۔'' صبیحہ جواب دیتے ہوئے یہ بھی کہتی۔ ''اور معاشرتی تقاضے تو بہت سے ہیں۔ کیا ہر شخص وہ تقاضے پورے کرتا ہے؟''

''تم سے بحث میں جیتا نہیں جاسکتا۔''

اس قسم کی بات پر صبیحہ ہنس کر خاموشی اختیار کرلیتی۔

صرف پروین ہی اس سے اس موضوع پر چھیڑ چھاڑ کرنے کی ہمت اس لیے کرسکتی تھی کہ وہ صبیحہ کی کالج کے زمانے کی بے تکلف دوست تھی۔ اگرچہ دونوں ہی کے سبجیکٹس مختلف تھے لیکن ایک کالج میں ہونے کی وجہ سے ان کی دوستی ہوگئی تھی اور دوستی بھی بہت گہری! اسی لیے اپنے والدین کے انتقال کے بعد جب اسے ملازمت کی تلاش ہوئی تو صبیحہ نے اسے اپنے ادارے میں اپنی خصوصی ماتحت بنالیا اور خصوصی ماتحت بھی اس لیے کہ تھوڑی بہت کاروباری سوجھ بوجھ پروین میں قدرتی طور پر تھی۔ بعض اوقات وہ صبیحہ کو بہت اچھے کاروباری مشورے دیا کرتی تھی۔ ویسے عام دفتری معاملات کے سلسلے میں صبیحہ نے ایک لڑکی فریدہ کو اپنی سیکریٹری کی حیثیت سے ملازم رکھا ہوا تھا۔

ادارے میں مرد ملازمین بھی تھے لیکن صبیحہ نے کاروبار سنبھالنے کے بعد جوان اور غیرشادی شدہ لوگوں کو دھیرے دھیرے الگ کیا تھا اور ان کی جگہ پختہ عمر کے شادی شدہ اور بچوں والے لوگوں کو رکھ لیا تھا۔ ان میں سے کسی کی عمر بھی چالیس سال سے کم نہیں تھی۔ صبیحہ کے اس طریقہ کار پر پروین ہنسا کرتی تھی۔

''بعض اوقات معمر لوگ بھی اپنی کسی خصوصیت کے باعث نوجوان یا جوان عورتوں کے دل میں جگہ بنالیتے ہیں۔'' اس نے ایک دن کہا۔

''میرے ساتھ یہ حادثہ ہرگز نہیں ہوگا۔'' صبیحہ نے جواب دیا۔

''تو کوئی خوب صورت جوان ہی دل میں اتر جائے گا۔''

''ابھی تک تو ایسا ہوا نہیں، ستائیس سال کی ہوچکی ہوں۔ کیا اس طویل عرصے میں کوئی خوب صورت شخص میرے سامنے نہیں آیا ہوگا؟''

''آیا تو ہوگا لیکن تم نے اپنی ضدی فطرت کی وجہ سے اس پر گہری نظر ڈالنے سے اجتناب کیا ہوگا۔ اگر اس سے کچھ دیر باتیں کرلیتیں اور وقتاً فوقتاً کرتی رہتیں تو تمہارے دل میں گدگدی ہونے لگتی۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتی۔''

دیر میں سارا قلعہ چھان مارا گیا مگر ہاشم بیگم نہ ملی۔ تب شہزادہ بختور سمجھ گیا کہ قلعے سے باہر جانے والے سایوں میں ایک ہاشم بیگم تھی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے چیخ چیخ کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ فوراً گھوڑوں پر سوار ہوکر باہر نکلیں۔ فوراً ہی آٹھ دس بہترین گھڑسوار اس کی قیادت میں قلعے سے باہر نکلے۔ شہزادے نے مختلف اطراف میں گھڑسواروں کو پھیلایا اور خود بھی دو سپاہیوں کے ساتھ ایک طرف گھوڑا دوڑاتے ہوئے روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

ہاشم بیگم اور سیفور خان گھوڑے دوڑاتے ہوئے دور نکل آئے تھے۔ اس وقت دونوں ایک پہاڑی راستے سے گزر رہے تھے۔ رات تاریک تھی اس لیے بڑی احتیاط سے کم رفتار سے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ یکایک وہ دونوں چونک پڑے۔ خاموش رات میں انہیں گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ دونوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آسمان پر چمکتے ہوئے تاروں کی مدھم روشنی میں پیچھے کچھ فاصلے پر چند گھڑ سوار اپنی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ دونوں کو ایسا لگا جیسے خون رگوں میں منجمد ہوگیا ہو۔ سیفور خان بولا۔

''شہزادی ہاشم! ایسا لگتا ہے ہمارے فرار کا پتا چل گیا ہے۔ آپ ہمت نہ ہاریں۔ ہم ان کے ہاتھ کبھی نہیں آئیں گے۔''

''تم بے فکر رہو، میں اتنی کمزور بھی نہیں ہوں۔'' ہاشم بیگم نے کہا۔

پیچھا کرنے والے تیزی سے قریب آتے جا رہے تھے۔ اب وہ چیخ چیخ کر انہیں رکنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ ہاشم بیگم کی رفتار کم تھی۔ جس کی وجہ سے دشمنوں سے فاصلہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ سیفور خان اپنا گھوڑا شہزادی کے گھوڑے کے قریب لا کر بولا۔ ''شہزادی صاحبہ! دشمن قریب آرہے ہیں۔ آپ اپنا گھوڑا چھوڑ کر میرے گھوڑے پر آجائیں۔''

شہزادی نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ دشمن بہت قریب آگئے تھے۔ وہ ایک لمحے کے لیے جھجکی۔ دوسرے لمحے اپنے گھوڑے کی باگیں چھوڑ کر سیفور خان کی کمر کو تھاما اور اس کے گھوڑے پر چھلانگ لگا کر پیچھے سوار ہوگئی۔ سیفور خان بڑی تیزی سے گھوڑا دوڑانے لگا لیکن دشمن بہت ہی قریب پہنچ گئے تھے۔ ان کا گھوڑا پتھروں کو پھلانگتا ہوا، تنگ سے پہاڑی راستے پر دوڑا جا رہا تھا۔ راستہ بہت ہی خطرناک تھا۔ ذرا سی لغزش سے گھوڑا ہزاروں فٹ کی گہری کھائی میں گر سکتا تھا۔ تعاقب کرنے والے اب اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ چابک سے انہیں مار سکتے تھے۔ ہاشم بیگم بڑی مضبوطی سے سیفور خان کی کمر پکڑے بیٹھی تھی۔

پہاڑی راستوں میں بڑی احتیاط سے چلنا پڑتا ہے۔ ایسی تاریکی ہو تو مزید ہوشیاری کی ضرورت ہوتی ہے مگر وہ تو دشمنوں سے بچنے کے لیے ہر فکر اور اندیشے سے بے نیاز ہوکر گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ اسی وقت کسی کے چلانے کی اور گھوڑے کے لڑھکنے کی آواز سنائی دی۔ ہاشم بیگم نے پلٹ کر دیکھا۔ تعاقب کرنے والوں کا ایک ساتھی گھوڑے سمیت ہزاروں فٹ گہری کھائی میں گر پڑا تھا۔ شہزادی کے رگ و پے میں بھی خوف سرایت کر گیا۔ اس نے جھرجھری سی لی اور مزید مضبوطی سے اپنے محبوب کو پکڑ لیا۔ پیچھا کرنے والوں میں سے ایک بہت قریب آگیا تھا، اس نے اپنا چابک لہرایا اور گھوڑے کی پشت پر دے مارا۔ اس اچانک چوٹ سے گھوڑا ابدکا۔ اس کی اگلی دونوں ٹانگیں راستے کے ایک پتھر سے ٹکرائیں۔ گھوڑا تیزی سے دوڑ رہا تھا، اس اچانک ٹھوکر سے سنبھل نہ سکا اور قلابازی کھا کر سامنے ایک چٹان سے ٹکرایا۔ گھوڑے نے اس قدر اچانک قلابازی کھائی تھی کہ ہاشم بیگم خود کو سنبھال نہ سکی اور زور سے اچھل کر، ایک بڑے پتھر سے جا ٹکرائی پھر وہاں سے لڑھکتی ہوئی، پتھروں سے ٹکراتی ہوئی کھائی کی گہرائی میں جانے لگی۔

وہ بہت نازوں میں پلی تھی۔ زمانے کی سختی کبھی نہیں جھیلی تھی مگر اس وقت پتھروں کی سختی اسے توڑ پھوڑ رہی تھی۔ کبھی اس کے پاؤں میں کانٹا چبھنے سے خون نہیں نکلا تھا مگر اس وقت لڑھکتی ہوئی پتھروں پر خون کے چھینٹے چھوڑتی اپنی محبت کو امر بنا رہی تھی مگر اس محبت پر اپنی جبر کی چادر ڈالنے والا نوجوان بختور بھی نہ صرف خالی ہاتھ رہ گیا بلکہ شہزادی کی طرح اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا کیونکہ اس کا گھوڑا بھی ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر جو ذرا لڑکھڑایا تو وہ بھی ڈھلان کی طرف لڑھکتا چلا گیا اور یہ ثابت ہوگیا کہ محبت زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ البتہ قربانی نہ چاہنے کے باوجود دینا پڑتی ہے۔

☆☆☆

ہاشم بیگم کی زندگی کی داستان اس گہری اندھی کھائی میں گر کر ختم ہوگئی مگر اس کے عشق کی کہانی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ روایات کے مطابق بہت مدت بعد تک چترال اور گوپس کے درمیان اس پہاڑی کے پاس ہاشم بیگم کی قبر موجود تھی۔ یہ محض مٹی کا ڈھیر نہیں، ایک ایسی دیوی کی پریم کہانی سناتی تھی جس نے محبت کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی جان دے دی۔ جس سے عشق کیا تھا، اس کے لیے چترال کی شاہانہ زندگی چھوڑ دی اور وفا کی انتہا کر دی۔



ہے۔خیر! یہ بتاؤ کہ فیلڈ بروک سے کیا بات ہوئی؟''
''براہِ راست فیلڈ بروک سے بات نہیں ہوئی۔ لائن پر اس کا سیکریٹری تھا اور تم سے فیلڈ بروک کی ملاقات کے لیے دن اور وقت مقرر کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کل رات ڈنر پر مدعو کرلیا ہے۔ بات میں نے اس طرح کی تھی جیسے میں ہی صبیحہ ہوں۔'' پروین نے اس ہوٹل کا نام بھی بتایا جہاں اس کے بیان کے مطابق فیلڈ بروک کو مدعو کیا گیا تھا پھر بولی۔''وہ ایک مقامی شخص ہے۔ نام احفاظ ہے۔ اسے فیلڈ بروک نے خاص طور سے ان ممالک کے لیے ملازم رکھا ہے جہاں اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے۔''
''اگر فیلڈ بروک اردو نہیں جانتا اور یقیناً نہیں جانتا ہوگا لیکن اس نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ میں انگریزی سے ناواقف ہوں گی اور اس کا سیکریٹری ٹرانسلیٹر کے فرائض انجام دے گا۔''
''یہ سوال اس سے میں نے بھی کیا تھا لیکن اس کی یہ بات درست ہے کہ غیر ملکیوں کو بعض مواقع پر اپنی ترجمانی کے لیے کسی مقامی آدمی کی ضرورت پڑسکتی ہے۔''
''ہوں۔'' صبیحہ نے سر ہلایا۔
''تو میں نے ٹھیک کیا نا؟'' پروین نے پوچھا۔
''مجھے فریدہ سے پوچھنا پڑے گا کہ میں کل رات کہیں اور تو مصروف نہیں ہوں؟......کبھی کبھی فنکشن میں بھی جانا ہوتا ہے۔''
''مجھے بے وقوف کیوں سمجھ رہی ہو؟'' پروین نے منہ بنایا۔''میں نے فریدہ سے پوچھ کر ہی سب کچھ طے کیا تھا۔ تو تم جاؤ گی نا؟''
''اب کیا ہے تم نے بے وقوفانہ سوال۔'' صبیحہ مسکرائی۔''جب تم میری... طرف سے دعوت دے چکی ہوتو کیا میں نہ جاکر بد اخلاق ہونے کا ثبوت دوں گی؟......لیکن اس کی شناخت......''
''اس معاملے میں مجھے بس تمہاری اجازت چاہیے۔''
''یعنی؟''
''اس سے میں نے ای میل ایڈریس لے لیا ہے۔'' پروین نے کہا۔''اور کہا ہے کہ اس ایڈریس پر اپنی تصویر بھیج دوں گی۔ اب یہ کام تمھی کو کرنا ہوگا۔ جواب میں وہ اپنی تصویر بھیج دے گا۔''
صبیحہ ہنس پڑی۔''اچھا طریقہ سوچا ہے تم نے۔ ویسے میں شاید فیلڈ بروک کو پہچان ہی لوں۔ نیویارک ٹائمز میں اس پر ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ تصویر بھی تھی اس کی لیکن جانے کب کی تھی۔ اب وہ بدل گیا ہوگا۔''
''امریکا کے ایک اخبار اور ایک میگزین میں تمہارے متعلق بھی آچکا ہے۔ تصویر بھی چھپی ہے لیکن شاید بروک کی نظر نہ پڑی ہو۔''
''یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے سیکریٹری احفاظ کو اس کا علم نہ ہو۔ خیر!...... میں بھیج دوں گی اپنی تصویر......تم اب مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ سکون سے کچھ کام کر لینے دو۔''
''میں بے سکون کرتی ہوں تمہیں!'' پروین نے آنکھیں نکالیں۔
صبیحہ نے ہنس کر ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا۔ پروین اپنے کمرے میں واپس آگئی۔
رات کو جب وہ اپنے گھر پر تھی تو صبیحہ کا فون آیا۔
''بھیج دی تھی میں نے اپنی تصویر۔ جواب میں بروک نے بھی تصویر بھیجی بلکہ اپنے سیکریٹری کی بھی بھیجی۔''
''سیکریٹری بھی بروک ہی کی طرح معمر ہوگا۔''
''نہیں، وہ جوان آدمی ہے۔''
''خوبصورت بھی ہے؟''
''پھر وہی بکواس شروع کردی تم نے!''
اس سے پہلے کہ پروین کچھ کہتی، دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کردیا گیا۔

☆☆☆

دوسری رات مقررہ وقت پر جب صبیحہ ہوٹل پہنچی تو پروین اس کے ساتھ تھی۔ پروین ہی نے ٹیبل ریزرو کروائی تھی اور اسی کے ایما پر صبیحہ نے ای میل کے ذریعے فیلڈ بروک کو ٹیبل نمبر سے آگاہ کیا تھا۔
ہوٹل کے صدر دروازے پر ہی صبیحہ نے احفاظ کو پہچان لیا۔ وہ بھی صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر دو قدم آگے آیا تھا۔
''یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں تمہارے استقبال کے لیے دروازے پر نہ آتا۔'' وہ انگریزی میں بولا۔ ''آئیں!'' وہ اندر جانے کے لیے قدرے اس طرح مڑا جیسے چاہتا ہو کہ صبیحہ اس کے آگے رہے۔
صبیحہ نے قدم آگے بڑھایا۔ اس کے دماغ میں سوال اٹھا تھا، کیا یہ شخص اردو نہیں جانتا؟
''کس طرف ہوگی ہماری ٹیبل؟'' صبیحہ نے پروین سے پوچھا۔
''ادھر ہے۔'' احفاظ نے کہا اور اشارہ بھی کیا۔''میں دیکھ چکا ہوں۔''

پروین نے اپنا سر صبیحہ کے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''ویری ویری ہینڈسم۔'' ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ احفاظ کی طرف تھا۔

صبیحہ نے اسے ایک پل کے لیے گھورا، پھر اس طرف دیکھنے لگی جس طرف بڑھ رہی تھی۔

میز پر پہنچنے کے بعد صبیحہ بیٹھنے سے پہلے ہی احفاظ سے اردو میں فیلڈ بروک کے بارے میں سوال کرنا ہی چاہتی تھی کہ احفاظ پھر انگریزی ہی میں بولا۔ ''پلیز! ٹیک اے سیٹ۔''

صبیحہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیا آپ اردو نہیں جانتے؟''

''جانتا ہوں۔'' احفاظ اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے مسکرایا۔ ''ہم اردو ہی میں بات کرتے رہے ہیں۔''

پروین نے صبیحہ کے برابر کی کرسی سنبھال لی تھی۔

صبیحہ حیرت سے بولی۔ ''اردو میں بات کرتے رہے ہیں؟''

''اتنی جلدی بھول گئیں؟'' احفاظ ہنسا۔ ''رات ہی کو تو بات ہوئی تھی۔''

''کیا فضول باتیں کر رہے ہیں آپ؟ میں نے آپ سے کب بات کی؟''

احفاظ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ''فیس بک پر جو تیزی دکھاتی رہی ہو، وہ اب اس وقت تو نہ دکھاؤ۔''

''فیس بک؟''

احفاظ ہنسنے لگا۔

''مسٹر!'' پروین بول پڑی۔ ''آپ نہ جانے کیا باتیں کر رہے ہیں...... یہ بتایئے کہ مسٹر فیلڈ بروک کہاں ہیں؟''

''فیلڈ بروک؟'' احفاظ نے سنجیدگی سے دہرایا۔ ''یہ کون صاحب ہیں؟''

''جن کے بارے میں آپ نے فون کیا تھا۔''

''فون؟'' احفاظ کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ ''کب، کسے فون کیا تھا؟''

''میں نے صبیحہ بن کر آپ سے بات کی تھی۔''

''کب بات کی تھی؟'' احفاظ نے حیرت کا اظہار کیا، پھر یکایک ہنس کر صبیحہ کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیا شرارت کر رہی ہو صبیحہ! تم نے اکیلے آنے کو کہا تھا۔ یہ اپنے ساتھ بھی کسی کو لے آئی ہو اور خود تم بھی مجھے پریشان کر رہی ہو۔''

صبیحہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ''احفاظ صاحب! آپ کے لہجے سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کسی کی شرارت کا نشانہ بن گئے ہیں۔ میں یہ تو جانتی ہوں کہ فیس بک کیا ہے لیکن فیس بک پر میرا کوئی اکاؤنٹ نہیں ہے۔''

اب احفاظ بھی سنجیدہ نظر آیا۔ ''لیکن میں بھی غلط نہیں کہہ رہا ہوں، اور اگر فیس بک پر آپ کا اکاؤنٹ نہیں ہے تو وہ کوئی شریر ہے جو آپ کے نام اور آپ کی تصویر کے ساتھ فیس بک پر ہے۔ اب آپ کا خیال مجھے ٹھیک ہی معلوم ہو رہا ہے کہ میں کسی کی شرارت کا نشانہ بن گیا ہوں اور غالباً آپ بھی۔ آپ یہاں کس سے ملنے آئی تھیں؟''

''میں بزنس کرتی ہوں۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''کل کسی نے میرے دفتر فون کیا تھا اور خود کو ایک امریکی تاجر فیلڈ بروک کا سیکریٹری بتایا تھا۔ اپنا نام احفاظ ہی بتایا تھا۔ ای میل کے ذریعے ہماری تصویروں کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔''

''میری تصویر بھی آپ کو بھیجی گئی؟'' احفاظ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''ورنہ میں آپ کو کیسے پہچانتی؟''

''کس ایڈریس سے آئی تھی میری تصویر؟''

''فیلڈ بروک کے ای میل سے۔'' صبیحہ نے جواب دے کر پروین کی طرف دیکھا جو بہت سنجیدگی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ''تم ہی نے دیا تھا نا مجھے اس کا ایڈریس؟''

''ہاں۔'' پروین نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''اور مجھے جس شخص نے دیا تھا، فون پر اس نے اپنا نام احفاظ ہی بتایا تھا اور یہ بھی کہ وہ مسٹر بروک کا سیکریٹری ہے۔''

''کیا اس کی آواز میرے جیسی تھی؟'' احفاظ پوچھ بیٹھا۔

''یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔'' پروین نے جواب دیا۔

''یقیناً وہ میں نہیں تھا صبیحہ صاحبہ!'' احفاظ نے صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو کچھ عجیب سا معاملہ ہے۔''

''عجیب بھی...... کچھ پراسرار بھی......'' صبیحہ کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا۔

احفاظ نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ''میری جسارت معاف کیجیے گا۔ کیا میں آپ کا پورا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''صبیحہ ملک۔'' صبیحہ نے جواب دیا۔

''بالکل یہی۔'' احفاظ نے پُرجوش ہوتے ہوئے اپنی جیب سے اسمارٹ موبائل فون نکالا۔ ''میں ابھی دکھاتا ہوں فیس بک پر آپ کا اکاؤنٹ۔''

''میں یقین کر لیتی ہوں کہ آپ جھوٹ نہیں بول رہے ہوں گے، تاہم میں یقیناً دیکھنا چاہوں گی۔''

پروین آہستہ سے بولی۔ ''ایک ویٹر متوقع نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔''

''ہاں تو اسے بلا لو۔ کافی کے لیے کہہ دو۔''

پروین نے اشارے سے ویٹر کو قریب بلایا اور اس

سے کافی کے لیے کہا۔ احفاظ اس دوران میں ان کی طرف متوجہ نہیں ہوا۔
''دیکھیے!'' اس نے ویٹر کے جاتے ہی موبائل صبیحہ کی طرف بڑھایا۔
صبیحہ نے موبائل ہاتھ میں لے کر دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ اس کی بہت خوب صورت تصویر تھی فیس بک کے ''کور'' کے ساتھ!
''میں اس کا استعمال زیادہ تو نہیں جانتی۔'' صبیحہ بولی۔ ''آپ کا اکاؤنٹ کیسے دیکھ سکتی ہوں؟''
''میں ان کا ان باکس کھولتی ہوں۔'' پروین نے کہا۔
پھر اس نے احفاظ کی اجازت کے بغیر اس کا ''ان باکس'' کھولا۔
''اسی میں سب کچھ لکھا جاتا ہے۔'' پروین نے کہا۔ ''آخری جملہ تمہارا ہے کہ میں ضرور آؤں گی۔ یہ ساری گفتگو دیکھی جاسکتی ہے۔''
''میں دیکھنا چاہوں گی۔'' صبیحہ نے کہا۔
''ضرور۔'' احفاظ بول پڑا۔ ''میں خود چاہوں گا کہ آپ دیکھ لیں۔ میری پوزیشن تو صاف ہوجائے گی۔''
پروین نے صبیحہ کو ساری تحریری گفتگو دکھائی۔ صبیحہ ان جملوں کو پڑھتے ہوئے، احفاظ کی موجودگی کے باعث خفت محسوس کرنے لگی۔ ساری باتوں کا متن ''محبت'' تھا۔ اس میں صبیحہ یا وہ جو کوئی بھی تھی، ایک جملہ یہ بھی تھا ''ہماری ملاقاتیں اس محبت کو عشق میں بھی بدل سکتی ہیں۔''
''بس بند کرو۔'' صبیحہ نے کہا۔
پروین نے موبائل احفاظ کو واپس کردیا۔
''کیا اب آپ مجھے معاف کردیں گی؟'' احفاظ نے صبیحہ کی طرف دیکھا۔
''کس بات پر؟''
''آپ سے ملاقات ہوتے ہی میں بے تکلفی سے بات کرنے لگا تھا۔''
''وہ کوئی ایسی بات نہیں جس کے لیے آپ معافی مانگیں۔ سب کچھ میرے سامنے آچکا ہے۔ یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ شرارت کس نے کی ہے اور کیوں کی ہے۔ اس کے علاوہ......'' صبیحہ نے پروین کی طرف دیکھا۔ ''فیلڈ بروک کی طرف سے وہ فون...... ای میل ایڈریس؟''
''یہ معاملہ تو تحقیق طلب ہے۔'' احفاظ بولا۔ ''میں بھی جاننا چاہوں گا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اس شرارت کا نشانہ تو میں بھی بنا ہوں...... وہ جو کوئی بھی ہے، اس کے پاس آپ کی تصویر بھی ہے اور میری بھی۔ فیس بک پر آپ کے نام سے اکاؤنٹ بھی اسی نے بنایا ہوگا۔''
''آخر اس سارے کھیل کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟'' صبیحہ بڑبڑائی۔
''یہ بات بھی سوچنے کی تو ہے۔'' احفاظ بولا۔
انہی باتوں کے دوران میں ویٹر کافی لے آیا۔
''تم بناؤ۔'' صبیحہ نے اپنی پیشانی مسلتے ہوئے پروین سے کہا۔ ''ان سب باتوں کی وجہ سے میرا دماغ بھاری ہوگیا ہے۔''
''کیا آپ مجھے وہ ای میل ایڈریس بتانا پسند کریں گی؟'' احفاظ پھر بولا۔ ''اس معاملے کی چھان بین تو میں بھی کرنا چاہوں گا۔''
صبیحہ نے اسے بتادیا جو اس نے فوراً اپنے پاس نوٹ کرلیا۔
پروین نے کافی بنا کر ایک کپ صبیحہ کی طرف اور دوسرا احفاظ کی طرف بڑھایا۔ احفاظ موبائل میں کچھ کررہا تھا۔ اس نے پروین کی طرف دیکھے بغیر ''تھینکس'' کہا اور مصروف رہا۔
''جو بات بھی ہے، معلوم تو ہوجائے گی۔'' پروین نے صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم خواہ مخواہ اتنی پریشان نظر آرہی ہو۔''
''مجھے اندیشہ ہورہا ہے کہ......''
''اوہ گاڈ!'' احفاظ کے منہ سے نکلا۔ صبیحہ اور پروین اس کی طرف دیکھنے لگے۔
''اس نے اپنا اکاؤنٹ ختم کردیا ہے۔'' احفاظ بولا۔ ''میں نے اس پتے پر صرف یہ سوال بھیجا تھا ابھی کہ کیا آپ کے پاس میری تصویر ہے؟ جواب میں یہ لکھا نظر آیا ہے۔'' اس نے موبائل صبیحہ کے سامنے کردیا۔
صبیحہ نے پڑھا۔ لکھا تھا...... ''ایڈریس ناٹ فاؤنڈ''
''اس نے سوچا ہوگا کہ اب بات کھلے گی لہٰذا اس نے اکاؤنٹ بند کردیا۔'' احفاظ بولا۔ ''ممکن ہے فیس بک سے بھی اکاؤنٹ ختم کیا گیا ہو۔ میں وہ بھی چیک کرتا ہوں۔''
یہ ایسی صورت حال سامنے آئی تھی کہ صبیحہ کافی پینا بھول کر احفاظ کی طرف دیکھتی رہی جو موبائل پر جلدی جلدی کچھ کررہا تھا۔ آخر وہ ایک طویل سانس لے کر صبیحہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ''فیس بک اکاؤنٹ بھی ختم کردیا گیا۔ صبیحہ ملک کے نام سے کئی اور اکاؤنٹ ہیں مگر ان میں سے کوئی وہ

اکاؤنٹ نہیں ہے جس پر آپ کی تصویر ہوتی تھی۔ دیکھیے!''
اس نے موبائل صبیحہ کی طرف بڑھایا۔ صبیحہ نے دیکھا۔
احفاظ پھر بولا۔ ''میں جب آپ کا نام لکھتا تھا تو بھی یہ نام سامنے آتے تھے لیکن سب سے اوپر آپ کا نام اور تصویر ہوتی تھی کیونکہ میری فرینڈ شپ میں صرف وہی شامل تھی اور کوئی صبیحہ ملک نہیں تھی۔''
''لیکن یہ کام کسی نے ذرا دیر سے کیوں کیا؟'' صبیحہ نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''کیا اس لیے کہ پہلے ہم وہ دیکھ لیں؟''
''فوری طور پر یہی بات ذہن میں آتی ہے۔'' احفاظ نے کہا اور چاروں طرف بہت غور سے دیکھنے لگا۔
''کیا دیکھ رہے ہیں؟'' پروین بول پڑی۔
''جس نے بھی شرارت کی ہے، اسے اس وقت یہیں ہونا چاہیے۔ جب اس نے ہماری حرکات وسکنات سے اندازہ لگالیا کہ ہم نے فیس بک دیکھ لیا ہے تو اس کے بعد ہی اس نے وہ اکاؤنٹ بند کیا ہوگا۔''
''ضروری نہیں کہ وہ اب بھی ہو۔'' صبیحہ نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ''شاید ایک دومنٹ پہلے یہاں سے چلا ہی گیا ہو۔''
''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' احفاظ نے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ چلا گیا ہو۔''
پروین بولی۔ ''ان باتوں میں کافی ٹھنڈی ہوگئی۔ دوسری منگوائی جائے؟''
''نہیں۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''بس اب چلنا چاہیے۔''
پروین نے اشارے سے ویٹر کو بل لانے کے لیے کہا۔
''کیا آپ مجھے اپنا فون نمبر دینا پسند کریں گی؟'' احفاظ بولا۔ ''میں اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش تو کروں گا، اگر کچھ معلوم ہوا اور وہ آپ کے علم میں لانا بھی ضروری ہوا تو میں آپ کو بتا تو سکوں گا۔''
صبیحہ نے اپنے پرس سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔
''آپ کا مشغلہ کیا ہے احفاظ صاحب؟'' پروین پوچھ بیٹھی۔
''معمولی سا مصور ہوں۔'' احفاظ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کم ازکم لوگوں کا میرے بارے میں یہی خیال ہے لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ غالباً اس شعبے میں بھی پی آر بہت ضروری ہے یا کم ازکم میرے پاس اتنا پیسا ہوتا کہ میں کسی آرٹ گیلری کا بندوبست کرسکتا۔''
''اپنی کوئی پینٹنگ دکھایئے گا۔'' پروین نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اگر وہ صبیحہ کو پسند آگئی تو سمجھ لیجیے کہ آپ واقعی بہت اچھے مصور ہیں۔''
''میں کل ہی پیش کردوں گا۔'' احفاظ نے جواب دیا پھر صبیحہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوجاؤں گا۔''
''فون کرکے آیئے گا۔''
''یقیناً۔'' احفاظ نے جواب دیا۔ ''آج کے دور میں تو یہ تہذیب کا تقاضا بن چکا ہے۔''
اسی وقت ویٹر بل لے آیا۔ احفاظ نے ادائیگی کرنی چاہی لیکن صبیحہ نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا اور خود ایک بڑا نوٹ نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا۔

☆☆☆

واپسی پر کار ہی میں صبیحہ نے کہا۔ ''اس کے سامنے یہ کہنا تہذیب کے خلاف ہوتا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ تم نے خوامخواہ دعوت دے ڈالی اسے!''
''ارے تو حرج کیا ہے اس میں!...... اتنے خوب صورت آدمی سے تو بار بار ملنے کو جی چاہتا ہے۔''
صبیحہ چپ رہ گئی۔
''کیا تمہیں اچھا نہیں لگا؟'' پروین پھر بولی۔
''میرا دماغ اس میں الجھا ہوا ہے کہ یہ حرکت کس نے کی اور اس کا مقصد کیا ہوسکتا ہے!''
''یہ بات تو طے ہے کہ وہ تمہیں بھی قریب سے جانتا ہے اور احفاظ کو بھی۔'' پروین نے کہا۔ ''تم دونوں ہی کی تصویریں تھیں اس کے پاس!''
''لیکن میں اسے نہیں جانتی۔ خیال ہے نا کہ وہ اس وقت ہوٹل میں ہوگا اور اسے یہ اطمینان ہوگا کہ میں اسے جانتی ہی نہیں ہوں۔''
''ہاں یہ معاملہ ہے تو خاصا الجھا ہوا۔''
''کسی طرح سلجھانا ہوگا اسے۔''
''میرا خیال ہے کہ یہ خود ہی سلجھے گا۔''
''وہ کیسے؟''
''جب اس حرکت کا مقصد سامنے آئے گا۔ یہ حرکت بغیر کسی مقصد کے تو نہیں کی گئی ہوگی۔''
''ہاں، کوئی مقصد تو ہونا چاہیے۔''
''اور وہ کوئی ایسا مقصد بھی ہوسکتا ہے جس سے مجھے کسی قسم کا نقصان پہنچے یا شاید احفاظ کو پہنچے۔''
''احفاظ سے تو ہمیں کوئی مطلب نہیں لیکن تمہیں کیا

نقصان پہنچ سکتا ہے؟''
''یہی تو سمجھ نہیں آرہا ہے۔ میں تو اسی وقت سے سوچے جارہی ہوں۔ سر میں درد ہونے لگا ہے۔''
''تم ضرورت سے زیادہ ٹینشن لے رہی ہو۔'' پروین نے کہا، پھر شرارت سے بولی۔ ''حسن سے دماغ کو آسودگی ملتی ہے۔ احفاظ کا تصور ذہن میں لاؤ، دردِ سر ختم ہوجائے گا۔''
''پھر بکواس شروع کردی تم نے؟''
''کیا احفاظ تمہیں اچھا نہیں لگا؟ خوب صورت نہیں ہے وہ؟''
''خوبصورتی سے انکار کیسے کیا جاسکتا ہے!''
''تو پھر اچھا لگا نا وہ تم کو؟''
''خوبصورت چیزیں مجھے یقیناً اچھی لگتی ہیں۔''
''تو پھر وہ تمہیں اچھا لگا نا!''
''اگر تم بات زیادہ آگے نہ بڑھاؤ تو میں اعتراف کیے لیتی ہوں کہ ہر خوبصورت چیز کی طرح وہ بھی مجھے اچھا لگا۔''
''واہ!...... اب دل چاہ رہا ہے کہ نعرہ لگاؤں ہرّے کا۔ ارے!'' وہ دفعتاً چونکی۔ ''یہ تم کس طرف جارہی ہو؟ مجھے گھر پر ڈراپ نہیں کروگی؟''
''نہیں، ابھی تو تمہیں اپنے گھر لے کر چل رہی ہوں۔''
''کوئی خاص وجہ؟''
''کچھ ایسی خاص بھی نہیں۔ میں بس یہ چاہتی ہوں کہ فیس بک پر اپنا اکاؤنٹ کھولوں اور یہ سب کچھ مجھے آتا نہیں ہے۔ ویسے تو میں نے سنا ہے کہ کمپیوٹر ہی سے یہ سب کچھ سیکھا، سمجھا جاسکتا ہے لیکن اس میں دیر تو لگتی ہوگی۔ کوئی سکھانے والا پاس بیٹھا ہو تو کام جلدی سمجھ میں آجاتا ہے۔''
''لیکن یہ فیس بک اکاؤنٹ کی تمہیں کیا سوجھی؟''
''شاید اسی ذریعے سے مجھے کچھ معلوم ہوسکے؟''
''کیا معلوم ہوسکے؟''
''وہی جو ابھی ہوچکا ہے۔ فیس بک ہی کے ذریعے کسی نے مجھے کھلونا بنایا ہے۔''
''اس کا پتا لگانے کے لیے اکاؤنٹ کھولو گی؟''
''ہاں۔''
''کیا اس طرح معلوم ہوجائے گا؟''
''کوشش کرلینے میں کوئی حرج نہیں۔ تم مجھے سکھادوگی نا؟''
''تم گھنٹا بھر میں سب سمجھ لوگی۔''
''ویری گڈ!''
چنانچہ گھر پہنچتے ہی صبیحہ کمپیوٹر کھول کر بیٹھ گئی۔ پروین کو اس نے برابر میں بٹھالیا۔ پروین ایک اچھی استاد ثابت ہوئی۔ اس نے صبیحہ ہی کے ہاتھوں سے سب کچھ کروایا۔ صرف دس منٹ میں صبیحہ فیس بک پر تھی۔ فیس بک کے سوال وجواب میں دس بارہ منٹ اور لگے۔ اسی دوران میں پروین نے اپنے گھر فون کرکے بتادیا کہ اسے گھر پہنچنے میں دیر ہوجائے گی۔ صبیحہ چاہتی تھی کہ فیس بک کے تمام معاملات اسی وقت سمجھ لے۔ پروین نے ایک گھنٹے کی بات کی تھی لیکن دو گھنٹے لگ گئے۔ بعض باتیں ایسی تھیں جو صبیحہ بھول سکتی تھی اس لیے وہ باتیں اس نے نوٹ کرلیں۔
''بس ٹھیک ہے۔'' آخر صبیحہ نے فیس بک سے آؤٹ ہوکر ''ٹیب'' بند کرنا شروع کیں اور پھر کمپیوٹر بھی بند کردیا۔
''اب تم میرے ساتھ ہی کھانا کھاؤ، پھر چھوڑ آؤں گی تمہیں۔''
''میرے پیٹ میں تو چوہوں کی ریس چل رہی ہے۔''
''فیس بک کے چکر میں مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔''
''یہ ایسا ہی طلسم ہے۔ جکڑ لیتا ہے آدمی کو۔''
''مجھے نہیں جکڑے گا۔ میں نے جس مقصد سے یہ کیا ہے، وہ مقصد حاصل ہوگیا تو اچھا ہے۔ اگر مجھے مایوسی ہوئی تو ختم کردوں گی اسے۔ میں اس قسم کی حرکتوں میں وقت ضائع نہیں کرسکتی لیکن ابھی تو میں تمہیں گھر پہنچا کے واپس آؤں گی تو فیس بک پر ایک گھنٹا اور لگاؤں گی۔ تمہاری عدم موجودگی میں بھی دیکھوں گی کہ مجھ سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔''
''کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ تم نے بہت تیزی سے سب کچھ سمجھا ہے اور نوٹس بھی لے لیے ہیں۔''
''ڈائننگ روم میں چلو۔'' صبیحہ کھڑی ہوگئی۔
کھانا کھانے کے بعد صبیحہ پروین کو کار میں لے کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔
''کل احفاظ تمہیں فون تو کرے گا؟'' پروین بولی۔
''کیوں؟''
''بھول گئیں؟ تصویر دکھانے آئے گا تمہیں!''
''ہوں۔'' صبیحہ نے سر ہلایا۔ ''خیال نہیں رہا تھا مجھے۔''
''جب وہ آنے کے لیے فون کرے تو مجھے بھی اطلاع دے دینا۔ میں بھی آؤں گی۔ دیکھوں تو سہی اس کی تصویر! انداز تو اس کا ایسا تھا جیسے وہ بہت اچھا مصور ہو۔''
صبیحہ نے سر ہلایا۔ ''اچھا، کردوں گی تمہیں فون۔''
پروین کو اس کے گھر پر چھوڑ کر صبیحہ واپس لوٹی۔ کپڑے تبدیل کرکے لیپ ٹاپ نکالا اور بستر پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے بعد ہی وہ فیس بک پر تھی۔ اپنے پیج سے وہ احفاظ

کے پیج پر گئی۔ ''کور'' پر ''ایڈ فرینڈ'' لکھا تھا۔ صبیحہ نے اسے کلک کیا اور اپنے پیج پر واپس آ گئی۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ احفاظ ''آن لائن'' تھا۔ اس نے صبیحہ کی ریکوئیسٹ کنفرم کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی احفاظ کا ''ان باکس'' بھی اسکرین پر آ گیا۔ اس نے لکھا تھا۔

''بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تم فیس بک چھوڑ گئی تھیں۔ اب پھر آئی ہو تو میری فرینڈ شپ میں نہیں تھیں۔ تمہاری ریکوئیسٹ میں کنفرم کر چکا ہوں۔ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارا کور پیج بھی مختلف ہے اور تصویر بھی۔''

صبیحہ زیرِلب مسکرائی۔ ''ہاں، میں نے پیج بند کرنے سے پہلے تمہیں ان فرینڈ کر دیا تھا۔ اب دوبارہ آئی تو تمہیں ریکوئیسٹ بھیج دی۔''

اس طرح ان کی گفتگو شروع ہوئی۔

احفاظ نے انگریزی ہی میں ٹائپ کیا۔ ''ان سب باتوں کا مطلب؟''

''کن باتوں کا؟'' صبیحہ نے بھی انگریزی ہی میں جواب دیا۔

''جو حرکت تم نے کی ہے۔''

''کون سی حرکت؟'' صبیحہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم تھی۔

''تم آخر ہو کون؟...... یہ ڈراما کیوں کیا تم نے؟''

''کون سا ڈراما؟''

''اب میں بے وقوف نہیں بنوں گا۔ بات کھل چکی ہے اور تمہیں بھی یقیناً اس کا علم ہے۔''

صبیحہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ قائم تھی۔ اس نے سمجھ لیا تھا، احفاظ اپنے خیال کے مطابق اسی صبیحہ ملک سے بات کر رہا تھا جس نے اسے ڈنر پر بلایا تھا۔

''جواب دو!'' احفاظ نے قدرے توقف سے پھر لکھا۔

''سوری احفاظ صاحب!'' صبیحہ نے اردو میں ٹائپ کیا۔ ''میں وہ صبیحہ نہیں ہوں جس نے میرے اور آپ کے ساتھ کوئی کھیل کھیلا۔ میں وہی صبیحہ ملک ہوں جس سے ہوٹل میں آج آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔''

''اب تم کوئی اور کھیل کھیلنا چاہتی ہو؟''

''ٹھیک ہے، آپ کو محتاط تو رہنا چاہیے، لیکن میں جو کہہ رہی ہوں، اس کا ثبوت بھی دے سکتی ہوں۔ کل آپ میرے پاس کوئی تصویر لانے والے ہیں نا؟''

دوسری طرف سے کچھ توقف سے جواب آیا۔

''معذرت چاہتا ہوں ان باتوں کی جو ابھی کر چکا ہوں۔ آپ تو فیس بک پر تھیں ہی نہیں۔''

''آپ سے مل کر گھر لوٹی تھی تو پہلا کام یہی کیا تھا۔ پروین سے سیکھا ہے سب کچھ۔ بس اس توقع پر یہ اکاؤنٹ کھولا ہے کہ شاید اسی پلیٹ فارم سے اس کا پتا لگایا جائے جس نے مجھے اور آپ کو بے وقوف بنایا۔'' اس مرتبہ اردو میں جواب دینے کے بعد اس نے انگریزی میں لکھا۔ ''اردو ٹائپ کی مجھے ابھی عادت نہیں ہے۔ فیس بک پر مجھے انگریزی ہی میں ٹائپ کرنا ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ رومن میں لکھا جائے۔''

''اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔'' احفاظ نے رومن ہی میں جواب دیا۔

''پروین ہی نے مجھے یہ سب کچھ سکھایا ہے۔ اسے گھر چھوڑ کر آئی تو پھر لیپ ٹاپ لے بیٹھی۔ سوچا آپ کو بھی ریکوئیسٹ بھیج دوں۔ خیال تھا کہ آپ فیس بک پر آئیں گے تو کل ہی آئیں گے اور کل ہی میری ریکوئیسٹ کنفرم کریں گے۔ اسی وقت مجھے اس کی توقع اس لیے نہیں تھی کہ آدھی رات گزر چکی ہے۔ دو بجنے والے ہیں۔''

''میں تو کبھی کبھی فیس بک پر تین، چار بھی بجا دیتا ہوں۔ اکیلے پڑے پڑے گھبراہٹ ہوتی ہے اور نیند آتی نہیں۔''

''کیا آپ کے گھر میں کوئی اور نہیں؟''

''میں نے ہوٹل میں شاید بتایا تو تھا کہ والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ شادی ابھی میری ہوئی نہیں ہے کہ بال بچوں کا بکھیڑا ہوتا۔''

صبیحہ نے قدرے رک کر ٹائپ کیا۔ ''اچھا اب کل ملاقات ہوگی آپ سے۔ جب آپ تصویر لے کر آئیں گے۔ میں اب فیس بک سے آؤٹ ہو رہی ہوں۔ صبح دفتر جانے کی فکر لاحق ہے۔ میں وقت کی پابندی کرتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے، خدا حافظ، شب بخیر۔''

''شب بخیر۔'' صبیحہ نے جواب میں لکھا اور فیس بک سے آؤٹ ہو گئی۔

لیپ ٹاپ رکھ کر وہ بستر پر لیٹی اور آنکھیں بند کر لیں۔ نیند آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ اس نے خواب میں احفاظ کو دیکھا۔

''آپ کو دیکھ کر'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''آپ سے مل کر ایسا لگا جیسے میں صدیوں سے آپ ہی کا منتظر تھا۔''

فوراً صبیحہ کی آنکھ کھلی اور وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں خفیف سا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی کہ اگر اسے کوئی خوب صورت چیز اچھی لگتی تھی اور کسی وجہ

سے فوری طور پر خرید نہیں پاتی تھی تو وہ چیز اسے خواب میں ضرور نظر آتی تھی۔

وہ اپنا ذہن کریدنے لگی، کیا احفاظ اسے اتنا پسند آ گیا ہے؟ کیا وہ اسے حاصل کرنا چاہتی ہے؟

اس کی نیند اڑ گئی اور وہ کشمکش کا شکار ہوگئی۔ اس نے تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی لیکن اب احفاظ اسے اتنا اچھا لگا تھا کہ......

نہیں، اس نے سوچتے ہوئے اپنا سر جھٹکا، میں شادی نہیں کروں گی۔

تو پھر تم اسے کیسے حاصل کرسکتی ہو؟ یہ سوال خود اس کے اندر سے اٹھا۔

وہ بے چین ہو کر بستر سے اٹھی اور ٹہلنے لگی۔ اسے یہ خیال بھی آیا کہ وہ نامعلوم صبیحہ ملک کی الجھن میں پڑی رہی تھی اور احفاظ نے اس کے لاشعور میں جگہ بنالی تھی۔

نہیں، اس نے ایک بار پھر اپنا سر جھٹکا اور بستر پر جالیٹی لیکن اس کی آنکھیں بند نہیں ہوئیں۔ احفاظ اس کے تصور میں ابھر آیا۔

جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اگر وہ اس معاملے میں اپنے آپ سے لڑتی رہی تو رات بھر نہیں سو سکے گی۔ وہ جھنجلائے ہوئے انداز میں بستر سے اٹھی، کپڑے تبدیل کیے اور بنگلے سے باہر نکل آئی۔ پورچ میں کھڑی ہوئی اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے ہارن دیا تاکہ چوکیدار جاگ جائے اور پھاٹک کھول دے۔ پھر اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور کار حرکت میں لاکر اسے پھاٹک کی طرف لے جانے لگی۔

چوکیدار سرونٹ کوارٹر سے نکل آیا تھا اور پھاٹک کی طرف لپک رہا تھا۔ اتنی رات گئے صبیحہ کا گھر سے جانا چوکیدار کے لیے کچھ تعجب خیز نہیں تھا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کوئی بڑی کاروباری الجھن پریشان کرتی تھی تو صبیحہ لانگ ڈرائیو پر نکل جایا کرتی تھی۔ اس طرح اس کا دماغ کچھ پُرسکون ہوجاتا تھا۔ اور کبھی کوئی ایسی تدبیر بھی ذہن میں آجاتی تھی جسے بروئے کار لاکر وہ کاروباری پریشانی کا سدباب کرلیتی تھی۔

پھاٹک کھلا۔ صبیحہ کار باہر لائی اور بائیں جانب مڑ کر اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ رات اتنی گزر چکی تھی کہ ٹریفک تھا ہی نہیں۔

پھر یہ اتفاق ہوا کہ صبیحہ کو ایک میڈیکل اسٹور نظر آیا جو چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا۔ صبیحہ نے کار وہاں روک دی۔ اسے خیال آیا تھا کہ وہ کوئی مسکن دوا لے لے تو تین ساڑھے تین گھنٹے ہی سو لے گی۔ اس نے پہلے کبھی ایسی کوئی دوا استعمال نہیں کی تھی ورنہ گھر میں ہی ہوتی۔

میڈیکل اسٹور سے ایک دوا لے کر وہ واپس گھر کی طرف روانہ ہوئی ورنہ لانگ ڈرائیو پر نہ جانے کتنی دور نکل جاتی۔

چار بجے تھے جب وہ ٹیبلٹ کھا کر بستر پر لیٹی۔ اس قسم کی کوئی دوا اس نے پہلی بار استعمال کی تھی اس لیے اسے جلد ہی نیند آگئی۔

☆☆☆

صبح دفتر میں پروین نے صبیحہ کو دیکھتے ہی کہا۔ ''خیریت! رات کو نیند نہیں آئی کیا؟ آنکھوں میں سرخی ہے۔''

''ہاں۔ کم سو سکی۔ تم نے کہا تھا نا، جادو ہے یہ فیس بک، تو وہی ہوا۔'' صبیحہ نے جواب دیا۔ ''تمہیں چھوڑ کر واپس گھر گئی تو لیپ ٹاپ لے بیٹھی۔''

''یعنی فیس بک؟'' پروین ہنسی۔

''ہاں۔ بہت سے لوگوں کے پیج دیکھتی رہی۔ عجیب عجیب چیزیں دیتے ہیں لوگ......''

''احفاظ کے پیج پر بھی گئی تھیں؟''

''ہاں، وہ بھی دیکھا تھا، وہ اپنی ہی تصویریں لوڈ کرتا رہتا ہے۔ اسے اپنی پینٹنگز لوڈ کرنی چاہئیں۔ پبلسٹی ملے گی۔ اس طرح بھی آگے بڑھنے کا موقع مل سکتا ہے۔''

''آج آئے تو مشورہ دینا۔ ویسے فیس بک پر زیادہ تر یہی ہوتا ہے۔ لوگ اپنی ہی تصویریں بھرتے رہتے ہیں اور خاصے لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے، بس اِدھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔ لڑکیوں کے پیج پر انہیں چیٹنگ کی سوجھتی ہے۔''

''میرے پیج پر تو کوئی نہیں آیا۔''

''ارے اتنے آئیں گے کہ پریشان ہوجاؤ گی۔ ابھی تو کھولا ہے تم نے اکاؤنٹ۔ اب جاؤ گی نا فیس بک پر تو ریکوئیسٹ کا ڈھیر ہوگا۔ خیر چھوڑو، میں یہ کہنے والی تھی کل ہی کہ اگر اس کی پینٹنگ تمہیں اچھی لگے تو اس کے لیے آرٹ گیلری کا بندوبست کروادینا۔ کوئی بہت زیادہ اخراجات نہیں آئیں گے۔ اس بے چارے کا شاید کچھ بھلا ہوجائے۔''

''خاصی دلچسپی لے رہی ہو اس بے چارے میں!''

صبیحہ مسکرائی۔

''سچی بات کہوں؟''

''بولو!''

''مرمٹی ہوں میں تو اس پر۔''

صبیحہ یکلخت سنجیدہ اور چپ ہوگئی۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں یہ سوال بھی اٹھا کہ اسے پروین کی بات ناخوشگوار

کیوں معلوم ہوئی۔

''کیا ہوا؟'' پروین نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اس پر میرا مرمٹنا کیا برا لگ گیا تمہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم بھی......''

''فضول بک بک پھر شروع۔'' صبیحہ ہنسی۔

''ہیں جی؟'' پروین نے آنکھیں پھاڑ کر صبیحہ کو دیکھا۔

''کیوں؟ اس طرح کیوں دیکھنے لگیں؟''

''فضول بک بک کی بات تم اکثر کہتی ہو لیکن ہنس کر نہیں کہتیں۔''

''تو پھر؟''

''تو پھر یہ کہ دال میں کچھ کالا نہیں ہے، ساری دال ہی کالی ہے۔ سچ بتاؤ۔ تمہیں میری قسم! اگر دال کالی ہو چکی ہے تو میں اس پر مرمٹنے کا ارادہ قطعی ترک کرتی ہوں۔''

''اچھا اب اور دماغ نہ کھاؤ، کام کرنے دو۔''

''اچھا ایک گانے کا مکھڑا سن لو۔ صرف مکھڑا......''

''بس اب دفع ہو۔'' صبیحہ نے اسے روک دیا۔

پروین اٹھ کر جانے لگی لیکن جاتے جاتے گاتی رہی۔

''دل متوالا......''

صبیحہ نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور خوامخواہ نمبر ملانے لگی۔ پھر جیسے ہی پروین نے کمرے سے باہر جا کر دروازہ بند کیا، صبیحہ نے ریسیور رکھ کر کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی۔ پھر جیسے ہی آنکھیں بند کیں، اسے احفاظ نظر آنے لگا، اس نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

''یہ کیا ہو گیا ہے مجھے!'' وہ خود پر کھسیا سی گئی۔

کیوپڈ اپنا کام کر چکا تھا......

تین بجے احفاظ کا فون آیا۔

''میں کس وقت حاضر ہو جاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''آج میں بہت مصروف ہو گئی ہوں۔ پھر کسی دن دیکھا جائے گا۔'' صبیحہ نے دل کڑا کر کے کہا اور مزید کچھ کہے سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

لیکن یہ قدم اٹھانے کے بعد صبیحہ بے چین رہی۔ دماغ کہہ رہا تھا کہ یہی اقدام مناسب تھا لیکن دل کہہ رہا تھا، تمہیں اس کے بغیر سکون نہیں مل سکتا۔

دل کی بات زیادہ وزنی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دفتر کے کسی کام میں وہ ذہنی یکسوئی حاصل نہیں کر سکی۔ ایک گھنٹے بعد ہی اس نے احفاظ کے موبائل سے رابطہ کیا۔

''معاف کیجیے گا احفاظ صاحب! دراصل مصروفیت کے باعث میں نے اچانک فون بند کر دیا تھا۔ آپ نے برا محسوس کیا ہوگا۔ میں معذرت چاہتی ہوں۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ!'' احفاظ ہنسا تھا۔ ''میں نے قطعی برا نہیں مانا تھا۔ آپ ایک بڑا کاروبار چلا رہی ہیں۔ اچانک کوئی خاص مصروفیت ہو ہی جاتی ہے۔''

''خیال تھا کہ مصروفیت رات تک رہے گی لیکن غیر متوقع طور پر مصروفیت بہت جلدی ختم ہو گئی۔ آپ چھ بجے گھر آ جائیے!''

''اوہ!'' احفاظ کا انداز ایسا تھا جیسے خوش ہو گیا ہو۔ ''میں حاضر ہو جاؤں گا۔''

''میں انتظار کروں گی۔''

''انتظار نہیں کرنا پڑے گا آپ کو۔ میں ٹھیک چھ بجے پہنچ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' صبیحہ نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

اب اس نے خود کو پُرسکون محسوس کیا۔ قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سامنے پڑے ہوئے پیڈ پر لکھنے لگی۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

لیکن یہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ وہ آگ بہت کچھ جھلسا کر رکھ دے گی۔

پروین شاید یہ تجزیہ کرتی کہ وہ محبت نہیں، اس کا جنون تھا۔ کوئی بھی چیز اچھی لگ جانے کی صورت میں اسے حاصل کرنے کی خواہش اس میں جنون ہی کی حد تک تھی۔

دفتر سے وہ ساڑھے چار بجے اٹھ گئی۔ پروین کو اس نے بتا دیا تھا کہ احفاظ چھ بجے آئے گا، فون پر بات ہو چکی ہے۔

''میں چھ سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔'' پروین کا جواب تھا۔

صبیحہ اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ غسل کرنے سے پہلے اس نے ملازمہ سے کہہ دیا کہ ایک مہمان آ رہا ہے جس کے لیے چائے کے ساتھ خاص لوازمات کا بندوبست کرے۔

غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے اور لاشعوری طور پر میک اپ اپنی عادت کے خلاف کچھ زیادہ کیا۔

پروین آئی تو اسے دیکھتے ہی اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔ ''ہائے میں مر جاؤں!...... یہ تو احفاظ کو قتل کرنے کی مکمل تیاری ہے۔''

صبیحہ ہنس کر رہ گئی۔

''میں جانتی تھی۔'' پروین بولی۔ ''کسی نہ کسی دن کوئی ایسا تمہارے سامنے ضرور آئے گا کہ تمہارا دل پگھل جائے گا۔''

صبیحہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''تم نے تو اس پر مرمٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے نا؟''

’’نہیں تو!‘‘

صبیحہ یکلخت سنجیدہ ہوکر اس کا منہ تکنے لگی۔

پروین ہنسی۔ ’’مانو ی نہیں کیا، ترک کیا ہے۔ جب وہ تمہیں بھا گیا تو میری مجال کہ اس پر مرمٹنے کے لیے پر تولوں!‘‘

ان میں اس قسم کی باتیں جاری تھیں کہ ملازمہ نے آکر اطلاع دی ’’کوئی احفاظ صاحب آئے ہیں، موٹر سائیکل پر۔‘‘

’’اسی کے لیے کہا تھا۔‘‘ صبیحہ نے سنجیدگی سے کہا۔

’’ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں آتی ہوں۔‘‘

ملازمہ چلی گئی۔

’’خوب!‘‘ پروین نے دیدے نچائے۔ ’’خاص لوازمات کا بندوبست!‘‘

’’میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔‘‘ صبیحہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے، میں شادی کرلوں گی اس سے!‘‘

’’اسے کہتے ہیں دل آجانا۔ سارا فلسفہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ بہت کہا کرتی تھیں کہ شادی کی صورت میں شوہر حاکم بن جاتا ہے اور بیوی محکوم۔‘‘

’’احفاظ کے معاملے میں ایسا نہیں ہوسکے گا۔ اس کے مالی معاملات اچھے نہیں ہیں۔‘‘

’’تو تم اسے اپنی دولت سے دبا کر رکھوگی؟‘‘

’’دبا کر کیوں رکھوں گی؟ بس دبوں گی نہیں، لیکن دو ایک الجھنیں ہیں۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

’’ظاہر ہے کہ وہ کسی معمولی فلیٹ میں رہتا ہوگا۔ میں وہاں کیسے رہ سکتی ہوں۔‘‘

’’اس کی تو فکر نہ کرو۔ یہ طے ہے کہ جو بھی تم سے ملتا ہے، اپنا دل ہار جاتا ہے تمہارے قدموں میں۔ اور احفاظ...... یقین کرو، مجھے اپنی طرف سے غافل سمجھ کر وہ تمہیں ایسے دیکھتا تھا جیسے ہزار جان سے فدا ہوگیا ہو۔ وہ ہمارا گھر داماد بننے کے لیے تیار ہوجائے گا۔ میں بات کروں گی اس سے۔‘‘

’’میری دوسری الجھن یہی تھی کہ اس سے تم ہی بات کرو۔ میرا کوئی بزرگ تو ہے نہیں۔‘‘

’’گویا آج سے میں تمہاری خالہ جان ہوں!‘‘ پروین ہنسی۔

صبیحہ نے اس کی پیٹھ پر دھموکا جڑ دیا اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ’’چلو، وہ انتظار کررہا ہوگا۔‘‘

پروین نے مصنوعی طور پر دل دوز آہ بھری۔

’’محبوب کو انتظار نہیں کرایا جاسکتا۔‘‘

صبیحہ کے قدم دروازے کی طرف بڑھ چکے تھے۔

پروین کو اس نے اپنی خواب گاہ میں ہی بلوایا تھا۔

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ احفاظ ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ چار بائی پانچ کا ایک فریم براؤن کاغذ میں لپٹا ہوا اس کے قریب صوفے سے ٹکا ہوا تھا۔ ان دونوں کو دیکھتے ہی وہ کھڑا ہوگیا۔

’’بیٹھیں بیٹھیں۔‘‘ صبیحہ جلدی سے بولی۔

’’آپ تو تشریف رکھیں۔‘‘

احفاظ اسی وقت بیٹھا جب صبیحہ اور پروین بیٹھ چکی تھیں۔

احفاظ نے فریم اٹھایا۔ وہ اسے کاغذ سے نکالنا چاہ رہا تھا۔

’’پینٹنگ ہے آپ کی؟‘‘ صبیحہ بولی۔

’’جی۔‘‘

’’ابھی رہنے دیں۔ پہلے چائے پی لی جائے۔‘‘

ایک ملازمہ ایک بڑی سی ٹرالی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آرہی تھی۔

وہ سب کچھ دیکھ کر احفاظ بولا۔ ’’خاصا تکلف کرڈالا آپ نے!‘‘

’’کم کیا ہے۔‘‘ پروین مصنوعی سنجیدگی سے بولی۔ ’’آپ کے لیے اس سے زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ مصور ایک معزز شخصیت ہوتی ہے۔‘‘

’’ذرہ نوازی ہے آپ کی۔‘‘

چائے سے فارغ ہونے میں بیس پچیس منٹ لگے۔ اس کے بعد احفاظ نے براؤن پیپر ہٹا کر پینٹنگ ان دونوں کے سامنے رکھ دی۔

اس نے ’’کیوپڈ‘‘ پینٹ کیا تھا لیکن عام انداز سے خاصا مختلف۔

’’اوہ!‘‘ پروین شرارت سے بولی۔ ’’آپ تو میسج لائے ہیں۔‘‘

’’جی۔‘‘ احفاظ کچھ سٹپٹا سا گیا۔

’’دلکش پینٹنگ ہے۔‘‘ پروین نے کہا۔

پینٹنگ واقعی اچھی تھی۔ پروین کو پسند آئی لیکن اس کے خیال میں وہ اتنی اچھی نہیں تھی کہ صبیحہ کو بھی زیادہ پسند آتی۔

’’اوہ!‘‘ صبیحہ بولی۔ ’’بہت ہی خوب صورت ...... بہت ہی پیارے انداز میں بنایا ہے آپ نے کیوپڈ۔ آپ کی پینٹنگز کی نمائش ضرور ہونی چاہیے۔ میں بندوبست کروں گی اس کا۔‘‘

’’بہت نوازش ہوگی۔‘‘

''لیکن نمائش سے پہلے آپ کی ایک پینٹنگ کی خریدار میں بننا چاہتی ہوں۔ یہ پینٹنگ میں اپنی خواب گاہ میں لگاؤں گی۔''
''خریدار بننے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔ یہ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔''
''بہت شکریہ احفاظ صاحب لیکن......''
''بس اور کچھ نہ کہیے!'' احفاظ نے اس کی بات کاٹی۔ ''شکریہ تو مجھے ادا کرنا چاہیے۔''
''آپ کا قیام کہاں ہے احفاظ صاحب؟'' پروین نے پوچھا۔
''مجھے خیال تھا کہ شاید یہ بات پوچھی جائے گی۔'' احفاظ نے اپنی جیب سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ ''میں لکھ کر لے آیا تھا۔ کارڈ تو میں نے چھپوائے ہی نہیں ہیں۔''
پروین نے اس سے کاغذ لے لیا۔
''ہم آئیں گے کسی وقت آپ کے گھر۔'' پروین نے کہا۔
''دو تین روز تو نہ آیئے گا۔ یہ کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے لیکن مجبوری ہے۔ میرے ایک دوست کی بہن کی شادی ہے۔ اس میں مجھے خاصا مصروف رہنا پڑے گا۔ دوست کی بہن ہے لیکن میں بھی اسے اپنی بہن ہی سمجھتا ہوں۔''
''کوئی بات نہیں۔'' صبیحہ بولی۔ ''دو تین روز بعد سہی۔''
''دل تو نہیں چاہ رہا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب مجھے اجازت لینی چاہیے۔''
''کیا آپ آج ہی سے مصروف ہو جائیں گے؟'' پروین نے پوچھا۔
''جی نہیں۔ کل سے ہو گی مصروفیت اب تو جا کے بس آرام کروں گا۔''
احفاظ کے رخصت ہو جانے کے بعد پروین نے صبیحہ سے کہا۔ ''میں ابھی گھنٹا بھر بعد جا دھمکتی ہوں اس کے گھر۔ میں بے قرار ہو گئی ہوں تمہاری خالہ جان کا کردار ادا کرنے کے لیے۔''
''خالہ جان صاحبہ!'' صبیحہ سنجیدگی سے بولی۔ ''اتنی جلدی کی ضرورت نہیں۔ دو تین روز رک جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔ اس کا رہن سہن دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسی دن بات کر لینا اس سے۔''
''تمہارے سامنے؟''
''نہیں۔ میں کوئی موقع دوں گی کہ تم تنہائی میں بات کر سکو۔''
''کیسے موقع دو گی جب وہ میرے ساتھ ہو گی؟''
''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔''
''بہت بہتر بھانجی صاحبہ!''
صبیحہ نے ہنس کر اس کی پیٹھ پر پھر ایک دھموکا جڑ دیا۔
''اچھا اب میں بھی چلتی ہوں۔'' پروین بولی۔
''کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ تم مجھ سے ملنے آئی ہو اور کھانا کھائے بغیر چلی گئی ہو۔''
''لیکن کھانے کے وقت میں تو ابھی دیر ہے!''
''اتنی دیر کچھ گپ شپ رہے گی۔''
پروین کو رکنا پڑا۔
☆☆☆
تیسرے دن چار بجے صبیحہ نے دفتر میں میز سے سامان سمیٹنا شروع کیا۔ ساڑھے چار بجے وہ دفتر سے اٹھ جاتی تھی۔
''احفاظ سے پھر رابطہ نہیں ہوا؟'' پروین نے پوچھا جو چند منٹ پہلے ہی اس کے کمرے میں آئی تھی۔
''نہیں۔'' صبیحہ نے جواب دیا، پھر مسکرا کر بولی۔ ''اب تم سے کچھ پوشیدہ تو ہے نہیں۔ اسی لیے بتا رہی ہوں۔ کئی بار میرا دل تو چاہا تھا کہ اس سے ایک آدھ منٹ کے لیے فون کر کے ہیلو ہائے کر لوں لیکن اس خیال سے نہیں کیا کہ اسے میری بے تابی محسوس ہو جاتی۔''
اسی وقت صبیحہ کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ صبیحہ نے میز سے موبائل اٹھا کر اسکرین پر نظر ڈالی، پھر ہنس کر بولی۔ ''لو! آ گیا اس کا فون۔''
''دل سے دل کو راہ شاید اسی کو کہتے ہیں۔'' پروین نے ہنس کر کہا۔ ''تو بات کرو نا!''
''نہیں، تم بات کر لو...... کہہ دینا کہ میں واش روم میں ہوں۔''
''کیوں...تم کیوں نہیں؟ تمہارا تو دل چاہ رہا تھا اس سے بات کرنے کو!''
''اب اس وقت تو تم کر لو۔''
اس دوران میں تیسری گھنٹی بھی بج چکی تھی۔ پروین نے موبائل لے کر کال ریسیو کی۔ ''جی احفاظ صاحب!...... میں پروین بول رہی ہوں۔ صبیحہ واش روم میں ہیں۔ اتفاق سے میں ابھی آئی تھی یہاں۔''
پھر وہ دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سننے لگی۔ صبیحہ کی نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
''نہیں نہیں۔'' پروین کچھ توقف سے بولی۔ ''تھکے

ہوئے ہوں گے، آپ آرام کریں۔ ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ ہم کل آجائیں گے۔ دفتر سے اٹھ کر سیدھے آپ کی طرف۔'' کچھ توقف سے پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے، ہاں پانچ بجے۔ دفتر سے ساڑھے چار بجے اٹھیں گے۔ ٹھیک ہے؟''

پھر دوسری طرف سے کچھ سن کر رابطہ منقطع کردیا۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' صبیحہ نے پوچھا۔

''ذرا دیر پہلے ہی مصروفیت ختم ہوئی ہے اس کی۔ کہہ رہا تھا کہ اگر صبیحہ صاحبہ آنا چاہیں تو آجائیں لیکن میں نے کل تک کے لیے ٹال دیا۔''

''یہ تو میں سن چکی ہوں۔''

''بس تو پھر کل چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''میں نے ٹھیک کیا نا؟ تھکے ہوئے آدمی کو کیا پریشان کرنا!...... اسے تمہاری خاطر مدارات کے لیے دوڑ دھوپ کرنی پڑتی۔''

''میں نے کہا نا کہ ٹھیک ہے۔''

پروین نے اس کا موبائل واپس کردیا۔

دوسرے دن ساڑھے چار بجے وہ دونوں دفتر سے روانہ ہوئیں۔ پروین نے احفاظ کو فون کر کے دفتر سے اپنی روانگی کے بارے میں بتادیا تھا۔

''ایک الجھن تو بڑھتی ہی جارہی ہے۔'' صبیحہ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بولی۔

''اب بھی کوئی الجھن ہے؟''

''بھول گئیں تم؟...... وہ فیلڈ بروک کا معاملہ!...... آخر کسی نے یہ حرکت کیوں کی تھی؟''

''ارے جہنم میں ڈالو اسے، تمہیں اس بہانے من کا میت تو مل گیا۔''

''نہیں۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''میں تو اس کے بارے میں سوچتی ہی رہتی ہوں۔ آخر کسی نے اس حرکت سے کیا فائدہ اٹھایا ہے یا وہ میرے یا احفاظ کے لیے کوئی مصیبت بننا چاہتا ہے۔''

''وہ کیا مصیبت بن سکتا ہے؟''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اسی کو تو الجھن کہا ہے میں نے!''

''ارے اگر کچھ ہونا ہے تو کسی وقت سامنے آجائے گا۔ قبل از مرگ، واویلا آخر کیوں؟''

''ہوں۔'' صبیحہ چپ ہوگئی۔

دفتر سے احفاظ کے گھر کا فاصلہ آدھے گھنٹے ہی کا تھا لیکن اتفاق سے ٹریفک میں کچھ کمی تھی اس لیے پانچ منٹ پہلے ہی فاصلہ طے ہوگیا۔

عمارت پانچ منزلہ تھی لیکن احفاظ کا فلیٹ پہلی ہی منزل پر تھا۔ اگر چوتھی پانچویں منزل پر ہوتا تو خاصی پریشانی ہوتی کیونکہ لفٹ پر لکھا ہوا تھا۔

''آؤٹ آف آرڈر!''

وہ دونوں زینے طے کر کے پہلی منزل پر پہنچیں۔ راہداری میں تین فلیٹوں کے دروازے تھے۔ تینوں پر نمبر لکھے ہوئے تھے۔

پروین نے اس فلیٹ کی کال بیل کا بٹن دبایا جس کا نمبر احفاظ نے بتایا تھا۔ اندر کہیں گھنٹی بجی لیکن دروازہ فوراً ہی کھول دیا گیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے احفاظ بے چینی سے دروازے کے قریب ہی کھڑا کال بیل کا منتظر تھا۔

''تشریف لائیں۔'' وہ جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔

دونوں اندر داخل ہوئیں اور احفاظ نے دروازہ بند کرلیا۔

صبیحہ نے حیرت سے ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اور وہاں کے خاصے قیمتی صوفہ سیٹ دیکھے جبکہ اس کا خیال تھا کہ وہاں چند کرسیاں یا معمولی صوفے پڑے ہوں گے۔

''تشریف لائیے نا!...... آپ تو وہیں رک گئیں۔ آئیے، بیٹھیے!'' احفاظ بولا۔

صبیحہ نے پروین کی طرف دیکھا۔ پروین نے اس طرح شانے اچکائے جیسے صبیحہ کا مطلب سمجھ جانے کے باوجود کچھ کہنا نہ چاہتی ہو۔

''خاصا خوب صورت ڈرائنگ روم ہے آپ کا!'' صبیحہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ قدم بڑھایا۔

''آپ کے ذہن میں جو کچھ ہے، وہ میں نے پڑھ لیا ہے۔'' احفاظ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہاں کا سامان دیکھ کر حیران ہورہی ہوں گی۔ یہ بھی سوچ رہی ہوں گی کہ میں نے اپنے مالی معاملات کے بارے میں جھوٹ بولا تھا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ ہاں، ایک جھوٹ میں نے یقیناً بولا تھا اور یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اپنے جھوٹ کا اعتراف کرلوں گا۔ میں ان تین دنوں میں کسی کی شادی کے معاملے میں ہرگز مصروف نہیں تھا۔ بس یہی جھوٹ بولا تھا میں نے۔ دراصل ان تین دنوں میں، میں کسی اور کام میں مصروف رہا تھا۔''

صبیحہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ احفاظ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''پلیز! پہلے مجھے اپنی بات مکمل کر لینے

دیکھیے۔ تین دن پہلے آپ یہاں آئیں تو آپ کو یہاں بہت معمولی سامان پڑا نظر آتا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں آپ کو ایسی جگہ بٹھاؤں جو آپ کے شایانِ شان نہ ہو۔ آپ کے شایانِ شان تو یہ بھی نہیں ہے لیکن میں جس قدر کر سکتا تھا، وہ میں نے کیا۔ اس کے لیے مجھے اپنا فلیٹ بیچنا پڑا۔''

''کیا مطلب!'' صبیحہ کچھ حیرت سے بولی۔

''آپ دونوں تشریف تو رکھیں۔ میں ابھی سب کچھ عرض کروں گا۔''

پروین اور صبیحہ صوفوں کے قریب تو پہنچ گئی تھیں لیکن ابھی بیٹھی نہیں تھیں۔ احفاظ کے کہنے پر بیٹھ گئیں......

''دراصل۔'' احفاظ نے پھر بات شروع کی۔

''میرے والدین جب دنیا سے رخصت ہوئے تھے تو انہوں نے ورثے میں جو کچھ چھوڑا تھا، اسے بیچ کر میں نے یہ فلیٹ خرید لیا تھا کہ سائبان تو میسر آ جائے، سانس لینے کا سامان تو کسی نہ کسی طرح ہوتا ہی رہے گا۔ مختصر یہ کہ جس دن آپ سے مل کر آیا ہوں، اس کے دوسرے ہی دن میں نے یہ فلیٹ اس شرط پر بیچ دیا تھا کہ میں اسے چار دن بعد خالی کروں گا۔ اسی شرط کی وجہ سے مجھے آدھی رقم ملی۔ اسی سے میں نے یہ سب سامان خریدا اور یہاں سجایا۔ میں باقی رقم ملنے کے بعد کرائے کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو جاؤں گا اور یہ سامان بھی وہیں لے جاؤں گا۔ کرائے کے فلیٹ کی بات بھی کر لی ہے۔ فی الحال ٹوکن کی رقم دے دی ہے۔ بس یہ ہے وجہ کہ آپ یہاں قدرے بہتر سامان دیکھ رہی ہیں۔''

''یہ تو آپ نے برا کیا!'' پروین بول پڑی۔ ''سر چھپانے کی جگہ تو رہنا چاہیے۔ زندگی تو جیسے تیسے گزر ہی جاتی ہے۔ سائبان اپنا نہ ہو تو انسان کسی وقت بھی فٹ پاتھ پر آ سکتا ہے۔''

''میں بس یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ میری مہمان کو اس گلے سڑے صوفے پر بیٹھنا پڑے۔'' احفاظ نے ''میری مہمان'' کہتے ہوئے صبیحہ پر اچٹتی سی نظر ڈالی تھی لیکن جواب پروین ہی کی طرف دیکھتے ہوئے دیا تھا۔

پروین نے صبیحہ کی طرف دیکھا۔

''فلیٹ آپ نے کسے بیچا ہے؟'' صبیحہ نے احفاظ سے پوچھا۔

''یہ آپ کیوں جاننا چاہتی ہیں؟''

''اس کی رقم واپس کر دی جائے گی۔''

''یعنی آپ کریں گی؟''

''ہاں۔''

''نہیں، پلیز! اصرار مت کیجیے گا۔ میں آپ پر یہ بوجھ نہیں ڈالوں گا۔''

''اسے قرضِ حسنہ سمجھ لیجیے گا۔''

''پلیز!''

''اچھا!'' صبیحہ نے طویل سانس لی۔

''میرے گھر میں کوئی ملازم تو ہے نہیں۔ آپ کی تواضع کے لیے مجھے ہی اٹھنا پڑے گا۔ برا مت مانیے گا۔ ذرا دیر کے لیے آپ دونوں اکیلی رہ جائیں گی۔''

''تواضع کی ضرورت کیا ہے!'' صبیحہ نے ہنس کر کہا۔

''ضرورت تو ہے۔ ایک تو میں وہ سب کچھ خرید لایا ہوں جو اگر استعمال نہ کیا جائے گا تو خراب ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ آپ یہاں سے یونہی چلی گئیں تو مجھے دکھ ہوگا۔ یہ تو آپ کی عزت افزائی ہے کہ آپ نے غریب خانے کو رونق بخشی۔''

''میں فائن آرٹ کے لوگوں کی بہت قدر کرتی ہوں۔''

''اچھا۔'' احفاظ اٹھا۔ ''میں سامان لے کر آتا ہوں کچن سے۔''

''مرضی آپ کی۔'' پروین نے طویل سانس لی۔

احفاظ اٹھ کر تیزی سے چلا گیا۔

''یہ تو برا کیا اس نے کہ فلیٹ بیچ دیا۔'' صبیحہ بولی۔

''ابھی تم بھی یہ بات کہہ چکی ہو۔''

''کہہ تو چکی ہوں لیکن اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ تمہارے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ فلیٹ کو جس حد تک ممکن ہوا، اس نے ڈیکوریٹ بھی کر لیا لیکن یہ خیال رہے، میں یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''پیاری بھانجی! وہ ہمارا گھر داماد بننے کے لیے خوشی سے تیار ہو جائے گا۔'' پروین نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔''

''وہ ہماری خاطر تواضع کے لیے جو کچھ لائے گا، اس میں دس پندرہ منٹ لگیں گے، پھر میں کسی بہانے یہاں سے اٹھ جاؤں گی۔ تم بات کر لینا اس سے!''

''کیا بہانہ کرو گی؟''

صبیحہ جواب نہیں دے پائی تھی کہ احفاظ ایک بڑی سے ٹرے سنبھالے ہوئے آ گیا۔ وہ بازار سے بہت کچھ خرید لایا تھا۔

''بے جا تکلف کر ڈالا آپ نے!'' صبیحہ نے کہا۔

''یہ اس سے زیادہ بہتر تو نہیں جو آپ نے میری

خاطر تواضع کے لیے کیا تھا۔‘‘
’’وہ سب کچھ تو گھر میں تیار ہو گیا تھا۔ اچھا خیر!‘‘
پروین نے حلیم بہت شوق سے کھایا۔
اس تواضع سے فارغ ہو کر صبیحہ نے پروین سے کہا۔ ’’شیخ صاحب کا گھر یہاں سے پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے اور مجھے ان سے ایک کام بھی ہے۔ تم تو انہیں سخت ناپسند کرتی ہو۔ میں ان سے مل کر بیس منٹ میں واپس آ جاؤں گی۔ تم اتنی دیر احفاظ صاحب سے گپ شپ کرو۔‘‘
شیخ صاحب کا سرے سے کوئی وجود نہیں تھا۔
’’ٹھیک ہے۔‘‘ پروین نے کہا۔ ’’لیکن بس بیس منٹ میں آ جانا۔‘‘
’’سوری احفاظ صاحب!‘‘ صبیحہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ’’ایک کام کر ہی لوں تو بہتر ہے۔‘‘
’’ہاں ہاں، ضرور! آپ کو سوری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔‘‘
وہاں سے رخصت ہو کر صبیحہ کو کچھ دیر تک سڑکوں پر کار دوڑانی پڑی لیکن یہ پٹرول کا زیاں نہیں تھا۔ صبیحہ نے اس طرح پروین کو احفاظ سے بات کرنے کا موقع دیا تھا۔
احفاظ کے گھر کی طرف لوٹتے ہوئے اس نے پروین سے موبائل پر رابطہ کیا اور کہا۔ ’’میں ہارن دوں گی۔ تم نیچے آ جانا۔‘‘
دراصل صبیحہ نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس وقت احفاظ کا سامنا کرنے میں دقت محسوس کر رہی تھی۔
لیکن ہوا یہ کہ ہارن کی آواز سن کر پروین کے ساتھ احفاظ بھی نیچے آ گیا۔
’’ہم سے ملے بغیر ہی چلی جائیں گی؟‘‘ احفاظ نے کار کی کھڑکی کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا۔
’’دراصل کسی وجہ سے بہت عجلت ہو گئی ہے۔‘‘ صبیحہ اس سے نظریں نہیں ملا سکی۔
’’رات کو ملاقات ہو سکتی ہے؟‘‘
’’رات کو؟‘‘ صبیحہ چونکی۔
’’میرا مطلب ہے، فیس بک پر!‘‘
’’ہوں!‘‘ صبیحہ نے سر ہلا دیا۔ نظریں اب بھی نہیں ملا سکی۔
پروین دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ چکی تھی۔
’’چلو اب!‘‘ وہ بولی۔
کار اسٹارٹ ہی تھی۔
’’خدا حافظ۔‘‘ احفاظ نے کہا۔

جواب میں صبیحہ نے بھی ’’خدا حافظ‘‘ کہا تھا لیکن اتنی دھیمی آواز میں کہ احفاظ بہ مشکل سن سکا ہوگا۔ پھر فوراً ہی وہ کار حرکت میں بھی لے آئی۔
پروین ہنس کر بولی۔ ’’تم تو اس طرح شرما رہی ہو جیسے......‘‘
’’کیا کہا اس سے؟‘‘ پروین نے اس کی بات کاٹی۔
’’جو تم چاہتی تھیں۔‘‘
’’پھر؟‘‘
’’وہ میرا منہ تکتا رہ گیا۔ میں نے اپنی بات دہرائی تو بھرائی ہوئی آواز میں بولا...... شادیٔ مرگ کے قریب پہنچا دیا آپ نے مجھے!‘‘
’’مختصر طور پر بتاؤ۔ نتیجہ کیا نکلا؟‘‘
’’ارے اگر ممکن ہو تو وہ ابھی تم سے نکاح پڑھوا لے۔‘‘
’’یہ بھی بتا دیا اسے کہ وہ میرے گھر میں رہے گا!‘‘
’’ہاں اس پر تھوڑا سا کسمسایا تھا لیکن پھر ٹھنڈی سانس لے کر یہ کہتے ہوئے تیار ہو گیا کہ تم اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہ بھی کیسے سکتی ہو!‘‘
’’ہوں۔‘‘ صبیحہ مسکرائی۔ ’’ہمارے معاشرے میں پہلے کبھی شاید ہی ایسا ہوا ہو کہ اس معاملے میں لڑکی نے پہل کی ہو!‘‘
’’تو کب کر رہی ہو نکاح؟‘‘ پروین نے ٹہوکا دیا۔
’’تمہیں معلوم ہے، مجھے چار دن بعد ایک نہایت ضروری کام سے لندن جانا ہے۔‘‘
’’نکاح کر کے ہی جاؤ۔‘‘
’’عجیب سا محسوس کر رہی ہوں۔‘‘ صبیحہ نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ’’کبھی سان گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ میں شادی کروں گی۔‘‘
’’وہ بہت بے قرار ہو گیا ہے شادی کے لیے!‘‘ پروین نے کہا۔ ’’فیس بک پر وہ تم سے یہی بات کرے گا۔‘‘
’’ہوں۔‘‘
’’نکاح کر کے ہی جاؤ!‘‘ پروین نے پھر دہرایا۔ ’’لندن بھی اپنے ساتھ ہی لے جانا...... ہنی مون۔‘‘ وہ مسکرائی۔ ’’پاسپورٹ تو ہوگا اس کے پاس۔ دو دن میں ویزا بھی مل سکتا ہے اگر تم اپنے تعلقات کام میں لاؤ۔‘‘
’’مجھ سے یہ بات نہیں ہو گی اس سے۔‘‘
’’تو یہ بھی میں ہی کروں؟‘‘
’’ہوں۔‘‘ صبیحہ دھیرے سے ہنسی۔ ’’خالہ تو بن ہی گئی ہو میری۔‘‘

''اچھا!'' پروین ہنسی۔ ''ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی فون کروں گی اسے۔''

☆☆☆

پروین کو اس کے گھر چھوڑ کر صبیحہ اپنے گھر لوٹی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کا سارا جسم سنسنا رہا تھا۔ بہت سے خیالات دماغ میں چکرانے لگے تھے۔ وہ خواب گاہ میں جاکر بستر پر جیسے ڈھیر ہوگئی۔ پرس ایک طرف اچھال دیا۔ اس کا ذہن بھی جانے کہاں کہاں اچھل رہا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق اس کی زندگی میں یہ موڑ اچانک ہی آیا تھا۔

یہ موڑ اس کی زندگی میں ایک خطرناک موڑ لائے گا، اس خیال کا سایہ بھی اس کے ذہن پر نہیں پڑ رہا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے بستر پر بیٹھ کر لیپ ٹاپ کھولا۔ احفاظ اس سے کہہ چکا تھا کہ رات کو فیس بک پر بات ہوگی......

فیس بک پر جاتے ہوئے وہ کچھ دیر تک تذبذب کا شکار رہی، لیکن آخر پاس ورڈ ڈال کر کلک کر ہی دیا۔

نیوز فیڈ پر اسے ایک تحریر دکھائی دی جو احفاظ نے اپنی ٹائم لائن پر لگائی ہوگی۔ لکھا تھا۔

زندگی میں کبھی ان لوگوں کو کھونے کی غلطی
مت کرنا
جن کی آنکھیں
آپ کے لیے روئی ہوں
جن کے لب
آپ کے لیے دعا گو رہے ہوں
جن کا دل
آپ کے لیے تڑپا ہو
کیونکہ ایسے نقصان کا ازالہ کبھی ممکن نہیں ہوتا

صبیحہ کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آگئی۔ نیوز فیڈ سے وہ ٹائم لائن پر پہنچی۔ پھر وہ احفاظ کے پیج پر جانے کے لیے اس کا نام ٹائپ کرنے ہی کو تھی کہ ''ان باکس'' سامنے آگیا۔ وہ احفاظ ہی نے بھیجا تھا۔

''دیر سے منتظر تھا۔'' اس نے رومن ٹائپ میں لکھا تھا۔

صبیحہ نے لکھا۔ ''کیا آپ کی آنکھیں کسی کے لیے روئی تھیں؟''

''روئی تو نہیں تھیں لیکن اداس ہوگئی تھیں۔'' جواب آیا۔

''وجہ؟''

''ایک ذرے نے پہلی مرتبہ ایک چمکتے ہوئے ستارے کو دیکھا اور تڑپ گیا کہ وہ اس تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

''پھر؟''

''پھر وہ ہوگیا جسے شاید معجزہ ہی کہنا چاہیے۔ وہ ستارہ ہی زمین پر اتر آیا۔''

''نثر میں شاعری کرتے ہیں آپ؟''

''شاید باقاعدہ ہی شاعری کرنے لگتا اگر ستارہ زمین پر نہ اتر آتا۔''

''یہ کیسے ہوگیا؟''

''اس پر میں بھی حیران ہوں۔ پھر ایک اور خوش کن بات ہوئی۔ ستارے ہی نے ذرّے کے دل کی بات کہہ دی۔''

''وہ کیا؟''

''یہ کہ اب وہ جلد از جلد ہمیشہ کے لیے ایک ہوجائیں۔''

صبیحہ نے سمجھ لیا کہ پروین اس سے بات کر چکی تھی۔

''تو کیا کچھ طے پا گیا؟''

''ہاں۔ وہ کل ہی ہمیشہ کے لیے ایک ہوجائیں گے۔''

صبیحہ کا جسم جو پہلے ہی سنسنا رہا تھا، کچھ اور سنسنا گیا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں لکھ سکی۔

احفاظ ہی نے پھر لکھا۔ ''آپ کو یہ بات کیسی لگی؟''

''کل زبانی ہی بتاؤں گی۔'' صبیحہ نے جواب دیا اور پھر فوراً ہی فیس بک سے آؤٹ ہوگئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوچکی تھیں۔

دنیا میں انقلابات کو کامیابی تک پہنچنے میں جتنا وقت لگتا ہے، اتنا وقت صبیحہ کی زندگی میں آنے والے انقلاب میں نہیں لگا۔ دوسرے ہی دن ان کی شادی ہوگئی اور یہ عمل اتنی سادگی سے ہوا کہ پروین کو انتظامات کرنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی۔ صبیحہ اس کے علاوہ کسی سے کام لینا چاہتی بھی نہیں تھی۔ ہنگامہ بہ دوش شادی سے صبیحہ نے اس لیے بھی گریز کیا تھا کہ اسے لوگوں سے آنکھیں چار کرنے میں بھی دقت ہوئی۔ اس کے حلقے میں یہ بات خاصی مشہور ہوچکی تھی کہ اس نے زندگی بھر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔

دفتر سے صبیحہ نے کئی دن کی چھٹی کر لی تھی۔ اب وہ اسی دن گھنٹے دو گھنٹے کے لیے دفتر جاتی جس شام لندن کے لیے اس کی فلائٹ تھی۔

''اتنی جلدی جدائی کی گھڑی بھی آرہی ہے۔'' احفاظ نے شادی کے دوسرے ہی دن بڑے افسردہ لہجے میں صبیحہ سے کہا جب اسے صبیحہ کے لندن جانے کا علم ہوا۔

''جدائی کیوں ہوگی احفاظ!'' ایک ہی دن بعد صبیحہ اور احفاظ ایک دوسرے سے بے تکلف ہوچکے تھے۔ ''تم

بھی چلو گے میرے ساتھ۔ پاسپورٹ تو ہوگا تمہارے پاس! ویزا بھی میں جلدی لگوا دوں گی۔''

''پاسپورٹ میں نے کبھی بنوایا ہی نہیں صبیحہ، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ہوائی سفر کر ہی نہیں سکتا۔ مجھے کلاسوفوبیا ہے۔''

''کلاسوفوبیا؟...... ہاں یہ لفظ میں نے سنا تو ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن یہ شاید پبلک میٹنگ سے خوفزدہ ہونے کو کہتے ہیں لیکن......''

''ہوسکتا ہے اسے بھی کہتے ہوں۔'' احفاظ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''لیکن ہوائی سفر سے خوف کو بھی کہتے ہیں۔ مجھے ایک ڈاکٹر نے یہی بتایا تھا اور مشورہ دیا تھا کہ کسی ماہر نفسیات سے رابطہ کروں۔''

''کیوں نہیں کیا؟ کرنا چاہیے تھا نا احفاظ!''

''بس کچھ حالات ایسے رہے کہ توجہ نہیں دے سکا۔ پھر یہ خیال بھی رہا کہ مجھے کون سا بیرونِ ملک کا سفر کرنا ہے۔ اسی لیے میں اپنے ملک کے بعض دور دراز شہروں میں بھی گیا ہوں تو ٹرین سے۔''

''یہ تو بڑی بری خبر سنائی تم نے!''

''تم سے چند روزہ جدائی شاید قسمت میں لکھی تھی۔'' احفاظ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''تمہارا علاج تو کروانا پڑے گا کسی سائیکاٹرسٹ سے۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''مجھے تو سال میں دو تین بار جانا پڑتا ہے ملک سے باہر۔''

''نفسیاتی علاج تو بہت طویل ہوتا ہے۔''

''طویل ہو یا مختصر، کروانا تو پڑے گا۔''

''تم واپس آجاؤ تو پھر دیکھا جائے گا۔''

''دیکھا کیا جائے گا، لازمی کروانا ہوگا علاج۔ میں تو مطمئن تھی کہ تم میرے ساتھ ہی چلو گے۔''

''فی الحال تو مجبوری ہی ہے۔ چند روز کی جدائی برداشت کرنی ہی پڑے گی۔''

جب پروین کو اس بات کا علم ہوا تو وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''ارے بھول جائیں احفاظ صاحب!...... بس آنکھوں پر پٹی باندھ کر چل دیں صبیحہ کے ساتھ۔ سمجھ لیجیے گا کہ کسی کار میں بیٹھ رہے ہیں۔''

''یہ سب کچھ فرض نہیں کیا جاسکتا۔'' احفاظ اس وقت بھی اداس تھا۔

صبیحہ نے پروین سے کہا۔ ''تم بس اول جلول باتیں کرنا جانتی ہو۔ ہر معاملے میں غیر سنجیدہ نہیں ہونا چاہیے۔ احفاظ پہلے ہی اداس ہیں کہ میں جارہی ہوں، کسی طرح منسوخ کروں میں اپنا جانا!''

''کیسی بات کررہی ہو۔'' پروین سنجیدہ ہوگئی۔ ''بہت ہی اہم میٹنگ ہے یہ تمہاری۔'' وہ صبیحہ کے سارے کاروبار کو پوری طرح سمجھتی تھی۔ ''اگر بات کچھ پیسوں کے نقصان کی ہوتی تو تم اسے برداشت بھی کرسکتی تھیں لیکن تمہاری یہ میٹنگ پیسوں کے نقصان سے بہت آگے کی ہے۔''

''تم ضرور جاؤ صبیحہ! معاملہ اتنا اہم ہے تو اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔'' احفاظ ہنسا۔ ''میں تو یوں ہی ایکٹنگ کررہا تھا افسردگی کی۔''

''جب تو خیر ایکٹنگ نہیں کررہے تھے لیکن اب جو ہنسے ہو تو یہ ہے ایکٹنگ۔'' صبیحہ کی مسکراہٹ مرجھائی ہوئی سی تھی۔

پھر باقی دو دن اس طرح گزرے کہ صبیحہ اور احفاظ ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں ہوئے۔ بیشتر وقت گھر پر اور کچھ وقت تفریحات میں گزارا...... تفریحات کے موقعوں پر صبیحہ نے پروین کو بھی ساتھ رکھا۔

جس دن صبیحہ کو لندن جانا تھا، اس دن وہ دو گھنٹے کے لیے دفتر گئی تو بھی احفاظ کو اپنے ساتھ رکھا۔ رات کے کھانے پر ان کے ساتھ پروین بھی تھی۔

گیارہ بجے صبیحہ ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوئی۔ پروین اور احفاظ بھی اس کے ساتھ تھے۔ صبیحہ اندازہ کررہی تھی کہ احفاظ اپنے چہرے سے افسردگی دور رکھنے کی انتہائی کوشش کررہا تھا تاکہ صبیحہ اس کی وجہ سے اداس نہ ہو...... یہی کوشش صبیحہ کی بھی تھی لیکن جب وہ طیارے میں اپنی سیٹ پر بیٹھی تو افسردگی نے اس کی آنکھیں نم کردیں۔ وہ احفاظ کو اتنی ہی شدت سے چاہنے لگی تھی......

☆☆☆

شبنم ائرہوسٹس تھی۔ کچھ دن پہلے اس کی فلائٹ بیرونِ ملک گئی تھی۔ اسے کسی وجہ سے وہاں رکنا تھا اور خاصے دن رکنا تھا۔ وہاں کے دفتر سے کوئی اور ائرہوسٹس اس کی جگہ لے کر فلائٹ کے ساتھ واپس آجاتی لیکن شبنم کو وہاں ایک ایسی اطلاع ملی کہ وہاں رکنا اس کے لیے محال ہوگیا۔ اسے بہانے کرنے پڑے۔ خاصے پاپڑ بیلنے کے بعد وہ کسی اور فلائٹ سے اپنے ملک واپس آگئی۔

فلیٹ مقفل تھا۔ شبنم کے پاس چابی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ فلیٹ میں داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ صرف ایک وینٹی بیگ تھا۔ بیرونِ ملک سے وہ خاصا سامان لائی تھی جو اس نے ائرپورٹ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ نکلوانے میں اسے وقت لگتا جبکہ وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم میں ہی صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بڑے گمبھیر تھے۔ اس نے موبائل نکالا اور ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے دو گھنٹیوں کے بعد ریسیور اٹھایا گیا۔

اس سے پہلے کہ دوسری طرف سے کچھ کہا جاتا، وہ بول پڑی۔

''کہاں ہو؟''

''ارے! کیا واپس آ گئیں؟'' چونک کر کہا گیا۔ ''تمہیں تو......'' وہ آواز احفاظ کی تھی۔

شبنم نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے جو سوال کیا تھا، اس کا جواب دو۔''

''میں ایک دوست کے پاس ہوں جانِ من!''

''میں گھر پر ہوں۔ فوراً آؤ۔ میں بے چینی سے انتظار کروں گی۔''

دوسری طرف سے کچھ کہا جاتا لیکن شبنم نے فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا اور اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ موبائل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

بیس منٹ گزر گئے۔ اس دوران میں وہ ٹہلتی رہی تھی۔ اس نے کال بیل کی آواز سنی لیکن دروازہ کھولنے کے لیے نہیں گئی۔ اس نے موبائل پر نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کی گئی۔

''کہاں ہو تم شبی!'' احفاظ کی آواز آئی۔ ''میں گھر پہنچ چکا ہوں۔ ابھی کال بیل بھی اس خیال سے بجا چکا ہوں کہ تم گھر پر ہی ہوگی۔''

''میں گھر میں ہی ہوں۔ چابی ہے تمہارے پاس! خود دروازہ کھول کر اندر آ جاؤ۔''

اس بار بھی شبنم نے جواب سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی بیڈ روم میں پہنچی اور رائٹنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر قلم اٹھایا۔ ایک پیڈ بھی اپنی طرف سرکایا۔ وہ کچھ لکھنا چاہتی تھی لیکن پھر اس طرح رک گئی جیسے کچھ بے بسی محسوس کی ہو۔

''کہاں ہو؟'' احفاظ کی آواز سنائی دی۔ وہ فلیٹ میں آ چکا تھا۔

شبنم چپ بیٹھی رہی۔ احفاظ خود ہی خواب گاہ میں آتا۔ یہی ہوا بھی۔ وہ خواب گاہ میں آیا اور تیزی سے شبنم کی طرف بڑھا۔

''وہیں رک جاؤ!'' شبنم چیخی۔

احفاظ ٹھٹک کر رک گیا۔ وہ حیرت سے شبنم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''وہاں بیٹھ جاؤ!'' شبنم نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

''آخر......''

''میں نے کچھ کہا ہے!'' شبنم نے ڈپٹ کر کہا۔

احفاظ ایک طویل سانس لے کر صوفے پر جا بیٹھا۔ اس نے کہا۔ ''اتنے دن سے مس کر رہا تھا تمہیں! اب بے اختیار جی چاہا تھا کہ تمہیں سینے سے لگا لوں۔''

شبنم نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا اور بولی۔ ''کہاں تھے تم؟''

''بتایا تو تھا تمہیں فون پر! ایک دوست کے پاس تھا۔''

شبنم نے غصے سے ہاتھ میں دبا ہوا موبائل ہی احفاظ پر کھینچ مارا۔ احفاظ ایک طرف ہٹ کر اس سے بچ گیا۔ موبائل صوفے سے ٹکرا کر اچھلا اور فرش پر گر گیا۔

''جھوٹ بول رہے ہو!'' شبنم گرجی۔ ''دوست کے پاس تھے یا اپنی دوسری بیوی کی آغوش میں!''

احفاظ کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔

''مجھے امریکا ہی میں اطلاع مل گئی تھی۔'' شبنم نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اتفاق سے ایک شناسا کا امریکا آنا ہوا تھا۔ مجھ سے بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ تم شادی کر چکے ہو۔ اس کے بعد میں وہاں نہیں رک سکی۔ فوراً واپس آئی۔ کتنا بڑا دھوکا دیا ہے تم نے مجھے احفاظ!''

''پُرسکون ہو جاؤ شبنم، پلیز!''

''پُرسکون؟'' شبنم دانت پیستی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ احفاظ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ قریب آتے ہی شبنم نے دونوں ہاتھوں سے احفاظ کا گلا دبوچ لیا۔

''مار ڈالوں گی میں تمہیں!'' اس نے احفاظ کی گردن دباتے ہوئے کہا۔

احفاظ نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور دباؤ بڑھنے سے روکا۔ پھر جھٹکے سے اپنی گردن چھڑا لی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے شبنم کو بھی جھٹکے سے اپنے قریب بٹھا لیا۔

''بات سنو میری!''

''میں تمہاری کوئی بات نہیں سننا چاہتی۔ کیسا عذاب جھونکا ہے تم نے میری زندگی میں! میرے دماغ میں فوری طور پر آیا تھا کہ تم سے طلاق لے لوں۔ میں لکھنے بیٹھی تھی۔ پھر خیال آیا کہ طلاق اس حرافہ کو دلاؤں۔ اسی کشمکش میں تھی کہ تم آ گئے۔''

''شبی!'' احفاظ بولا۔ ''میں تمہیں سب کچھ سمجھا دوں گا لیکن پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شادی میں نے صبیحہ سے

کی ہے لیکن محبت مجھے صرف تم سے ہے۔''
''محبت کہتے ہو اسے!'' شبنم چیخ پڑی۔ ''زہر گھول دیا تم نے میری روح میں!...... مجھے بتایا ہے کسی نے۔ بہت امیر ہے وہ اور تمہارے خواب بہت اونچے ہیں۔ اسی لیے شادی کی ہے نا تم نے اس سے لیکن مجھے دولت کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ دل چاہ رہا ہے، کہیں سے ریوالور لاؤں اور جاکے اسے مار ڈالوں۔''
''ایسا مت سوچو شبی!...... میں جانتا ہوں تم بہت جنونی ہو، میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ ہمارا مستقبل ہے اور بڑھاپا ہم پر آنا ہے۔ اس وقت کوئی ہمارا سہارا نہیں ہوگا۔ ہمارے بچے تو ہوں گے نہیں۔ لیڈی ڈاکٹر تمہیں بتا چکی ہے کہ تمہارا مرض لاعلاج ہے۔ تو جب تک ہماری عمر زیادہ ہوگی، میرے بینک میں بہت سرمایہ جمع ہو چکا ہوگا اور جب سرمایہ ہو تو ہر عمر میں ہر قسم کے سہارے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔''
''تو تم چاہتے ہو کہ میری ساری زندگی سسک سسک کر گزرے اور میں راتوں کو تڑپتی رہوں کہ تم اس کی آغوش میں ہوگے۔''
''میں تم سے بھی ملتا رہوں گا۔ تمہیں اپنی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔'' احفاظ نے کہا۔ ''ابھی تو اس کی حالت یہ ہے کہ اسے میرے بغیر ایک پل بھی چین نہیں ملتا لیکن دھیرے دھیرے جذبات ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات!''
''میں اس کے جذبات ٹھنڈے پڑنے کا انتظار نہیں کرسکتی۔''
''ایک اچھے مستقبل کے لیے انتظار تو کرنا ہوگا شبی!...... پلیز!...... یا پھر...... یا پھر...... مجھے ہی مار ڈالو۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ کہیں سے ریوالور لاکر اسے گولی ماردو گی۔ اس کے بجائے ریوالور لاکر تم مجھے ہی ماردو۔''
''میں تمہیں کیسے مار سکتی ہوں۔'' شبنم کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''اپنی زندگی سے زیادہ چاہتی ہوں تمہیں!''
''اسی لیے ابھی میرا گلا گھونٹنے ڈال رہی تھیں۔'' احفاظ مسکرایا۔
''وہ تو جھنجلاہٹ تھی میری۔ میں اتنی طاقتور نہیں ہوں کہ تمہارا گلا گھونٹ سکوں۔''
''جنونی تو ہو تم!'' احفاظ اب مطمئن نظر آرہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کئی واقعات یاد ہیں مجھے!...... اور شاید تمہارے اس جنون کی وجہ یہ ہے کہ تم ماں نہیں بن سکتیں۔''
''اور وہ بن جائے گی ماں۔'' شبنم نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے دانت پیسے۔ ''تمہارے بچوں کی ماں اور پھر تم......''
''ایسا نہیں ہوگا۔ میں اسے ماں نہیں بننے دوں گا۔''
''اگر ایسا ہوا اور مجھے بھی معلوم ہوگیا تو پھر شاید میں کچھ بھی کرگزروں!''
''اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ بھروسا کرو مجھ پر!''
''ابھی میں نے فون کیا تھا تو تم اسی کے ساتھ تھے نا!''
''نہیں۔'' احفاظ نے جواب دیا۔ ''وہ چار دن سے بیرون ملک گئی ہوئی ہے۔ کوئی کاروباری معاملہ ہے اس کا۔ وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتی لیکن میں بہانہ کرکے بچ گیا۔ کہا تھا اس سے کہ میں ہوائی سفر کے خوف کا مریض ہوں۔''
''کب آئے گی واپس؟''
''پرسوں یا اس سے اگلے دن۔ جب بھی آئے گی، مجھے معلوم ہوجائے گا۔ روزانہ ہی فون کرتی ہے مجھے تو آنے کی اطلاع بھی دے گی۔ میں نے ابھی بتایا تھا تمہیں! بہت چاہنے لگی ہے مجھے!''
''اس کی اتنی چاہت تمہیں مجھ سے دور کرسکتی ہے۔''
''ہرگز نہیں۔ اس کی چاہت اپنی جگہ، میں تو تمہیں چاہتا ہوں۔''
''تو ابھی اس کے آنے تک تو تم میرے ساتھ ہی رہو گے نا!'' شبنم نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔
''نہیں شبی!...... ایک مصیبت تو وہ میرے گلے لگا گئی ہے۔''
''کیسی مصیبت؟''
''ایک لڑکی ہے، پروین۔ وہ صبیحہ کی دوست بھی ہے اور دفتر میں اس کی خصوصی ماتحت بھی۔ صبیحہ کے ساتھ رہ کر خاصی کاروباری سوجھ بوجھ بھی آگئی ہے اس میں۔ صبیحہ اسے یہ کام سونپ گئی ہے کہ اسے جب بھی موقع ملا کرے، گھر آکر مجھے صبیحہ کے کاروبار کے بارے میں لیکچر دیا کرے، مجھے اس بارے میں سب کچھ سمجھائے۔ صبیحہ چاہتی ہے کہ میں کاروباری معاملات میں اس کا معاون بن سکوں۔''
''لعنت ہے اس پر!''
''ہماری بہتری بھی اسی میں ہے شبنم!'' احفاظ نے کہا۔ ''جب میں اس کے دفتر میں بیٹھوں گا تو مجھے کچھ اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر میں اپنا بینک بیلنس بڑھا سکوں گا۔''
''کیا نام بتایا تم نے؟ افشین؟''

"پروین۔"

"وہ کس وقت آتی ہے؟"

"یہی تو مسئلہ ہے۔ کسی وقت بھی آجاتی ہے۔ رات کو دس بجے بھی ٹپک پڑتی ہے۔"

"اطلاع تو دیتی ہوگی آنے کی؟"

"ہاں اطلاع تو دیتی ہے لیکن کسی وقت موبائل کے بجائے ٹیلی فون کھڑکھڑا دیتی ہے۔ اگر فون پر اسے جواب نہیں ملے گا تو وہ سمجھ لے گی کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ دراصل مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔ نہ جانے کس بات پر میں روانی میں کہہ بیٹھا تھا کہ وہ کسی وقت بھی آسکتی ہے کیونکہ مجھے ہر وقت گھر ہی پر رہنا ہے۔ اتفاق سے یہ بات اس کی ملازمہ کے سامنے ہوئی تھی۔ اگر میں رات کو گھر سے غائب رہوں گا تو وہ بھی جان لے گی اور اس سے یہ اطلاع پروین کو بھی مل جائے گی۔ میں اسے جواب دہ تو نہیں لیکن وہ رواروی میں تو پوچھ سکتی ہے کہ میں رات کو کہاں چلا گیا تھا۔ اس وقت میں اسے کوئی معقول جواب نہیں دے سکوں گا اور یہ بھی مناسب نہیں کہ ایسی کسی بات پر اسے ڈانٹ دوں۔ وہ اس بارے میں صبیحہ کو بتا دے گی۔ اس کا رابطہ تو رہتا ہے صبیحہ سے۔"

"تو پھر تم میرے لیے وقت کیسے نکالو گے؟"

"دن میں شاپنگ کے بہانے تو گھر سے نکل سکتا ہوں۔"

"وہ تو زیادہ سے زیادہ دو تین گھنٹے کے لیے......!"

"وہ وقت میں تمہارے ہی ساتھ گزاروں گا۔"

"تو میری قسمت میں اب دو تین گھنٹے رہ گئے ہیں۔"

شبنم اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔

"وقت گزرنے دو۔ میں کوشش کروں گا کہ حالات میں کسی قسم کی بہتری لائی جاسکے اور میں تمہارے ساتھ زیادہ وقت گزار سکوں۔"

"راتوں کو تو تڑپتی ہی رہوں گی۔" شبنم نے ٹھنڈی سانس لی۔ "گھر کہاں ہے اس کا؟"

"یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"ایسے ہی پوچھ بیٹھی۔ کوئی حرج ہے بتانے میں۔"

"ارے نہیں۔" احفاظ جلدی سے بولا۔ "بتا دیتا ہوں، بہت آسان پتا ہے۔ نوٹ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ ویسے ہی یاد رکھ سکتی ہو۔" اس نے صبیحہ کے گھر کا پتا بتا دیا۔

"اس علاقے میں تو بہت امیر لوگ رہتے ہیں۔"

"بتا تو چکا ہوں تمہیں! بہت بڑا کاروبار ہے اس کا۔"

"وہ تمہیں مل کیسے گئی؟"

"یہ تو ابھی تک میرے لیے بھی اور اس کے لیے بھی ایک معما بنا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

احفاظ نے فیلڈ بروک کا قصہ سنا دیا۔ اس میں اسے یہ بھی بتانا پڑا کہ وہ وقت گزاری کے لیے فیس بک پر ایک خاتون سے دوستی کر بیٹھا تھا۔

"اور تم پھسل پڑے اس دوستی پر!" شبنم نے تلخی سے کہا۔ "یہ تو ہوتی ہے مردوں کی عادت!...... بیوی سے کتنی بھی محبت ہو، کوئی دوسری مل جائے تو فوراً پھسل جاتے ہیں۔"

"ارے بس یوں ہی۔" احفاظ نے قدرے جھینپ کر کہا۔ "یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس بری طرح مجھ پر فدا ہوجائے گی لیکن جب ایسا ہوگیا تو میں نے سوچا کہ اس کی دولت مندی سے فائدہ اٹھا ہی لیا جائے۔ بڑھاپے میں کام آئے گا وہ سرمایہ ہم دونوں کے۔"

"وہ وقت آنے سے پہلے میں مر بھی سکتی ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کرو شبنم!" احفاظ جلدی سے بولا۔

"جھلستی تو رہوں گی نا میں! خون تو جلتا رہے گا میرا۔ اسی میں مر بھی سکتی ہوں۔"

"اب تم مجھے دکھی کر رہی ہو۔"

"میرے دکھ کا اندازہ لگا سکتے ہو۔" شبنم تلخی سے بولی۔

اسی وقت احفاظ کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا اور پھر ایک طویل سانس لے کر بولا۔ "اسی کی کال ہے۔"

"صبیحہ کی؟"

"پروین کی۔"

"کیوں کیا ہوگا اس نے فون؟"

"اپنے آنے کی اطلاع دینے والی ہوگی۔ آج ابھی تک تو نہیں آئی تھی!"

"تو بات کرو اس سے!" شبنم نے طویل سانس لی۔ "اور ہاں!...... اسپیکر آن کر دینا۔ میں بھی تو سنوں ذرا......"

"ہاں ہاں، سنو! مجھے اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔"

احفاظ نے اس وقت کال ریسیو کی جب تیسری گھنٹی بجی تھی۔

"ہیلو!" اس نے کہا۔

"کہاں ہیں احفاظ صاحب! پہلے تو میں نے ٹیلی فون کیا تھا۔ جواب نہیں ملا تو اب موبائل پر کیا۔ کہاں مصروف ہیں کہ تیسری گھنٹی کے بعد......"

احفاظ نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ "میں کچھ

شاپنگ کے لیے نکل آیا تھا۔ وہ سامان کار میں رکھ رہا تھا اس لیے کال فوراً ریسیو نہیں کر سکا۔"

"خیر! تو کب پہنچے گا گھر؟"

"بس یہیں پاس ہی ہوں منٹ میں۔"

"تو پھر میں ابھی آ رہی ہوں۔"

"ہاں بس آتا ہوں۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔

"تو جاؤ اب!" شبنم پھر ہونٹ کاٹنے لگی۔ یہ اس کی عادت تھی کہ کھسیاہٹ میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگتی تھی۔ "آج ہی آئی ہوں اور تم......"

"میں پھر آؤں گا۔" احفاظ بول پڑا۔ "وہ ایک دو گھنٹے میں چلی جائے گی۔ اس کے جاتے ہی میں تمہارے پاس آؤں گا۔"

جواب دے کر احفاظ نے شبنم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

"زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا تمہیں!" احفاظ نے جانے کے لیے اٹھتے ہوئے کہا۔

شبنم افسردہ چہرے کے ساتھ اسے چھوڑنے دروازے تک گئی۔

☆☆☆

آدھے گھنٹے بعد صبیحہ کی خواب گاہ میں پروین بستر پر اس طرح لیٹی ہوئی تھی کہ احفاظ کا بازو اس کی گردن کے نیچے تھا اور وہ ایک ہاتھ سے احفاظ کی قمیص کے بٹنوں سے کھیلتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "جب میں نے تمہیں فون کیا تھا تو وہ باتیں شبنم کو سنوائی تھیں نا تم نے؟ تم نے کہا تھا کہ اسپیکر کھول دو گے!"

"خود شبنم ہی نے اسپیکر کھولنے کے لیے کہا تھا۔" احفاظ ہنس کر بولا۔

"یہ ضروری تھا۔ اسے میری طرف سے تو اطمینان ہو جائے!"

"اسی لیے تو تمہیں بتا کر گیا تھا کہ وہ آگئی ہے، اس نے مجھے فون کیا ہے لہٰذا جانا تو پڑے گا۔"

"کیا گزری؟ پوری بات بتاؤ۔"

احفاظ نے وہ ساری باتیں بتا دیں جو شبنم سے ہوئی تھیں۔ پروین مسکراتی ہوئی سب کچھ سنتی رہی تھی۔ جب احفاظ سب کچھ کہہ چکا تو وہ ہنس کر بولی۔ "گردن دبوچ لی تھی اس نے تمہاری؟"

"ہاں، جنونی تو وہ ہے۔ ایک بار تو پیپر ویٹ مار کر میرا سر پھاڑ دیا تھا لیکن پھر مرہم پٹی بھی خود کی تھی۔ محبت تو وہ مجھ سے بہت کرتی ہے لیکن اس کی انہی حرکتوں سے عاجز ہونے کے باعث ہی میں نے تم سے شادی کی تھی۔"

یہ جواب دیتے ہوئے وہ دن بھی احفاظ کے دماغ میں چکرا گیا جب وہ تیزی سے ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہو رہا تھا اور باہر آتی ہوئی پروین سے ٹکرا گیا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے "سوری" کر کے گزر گئے تھے۔ پھر چند روز بعد احفاظ کے خیال کے مطابق کہیں ان دونوں کی اتفاقیہ ملاقات ہو گئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ اس ٹکراؤ کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ پھر بات سے بات نکلتی چلی گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے دوست بنتے چلے گئے تھے۔ ملاقاتوں میں احفاظ نے محسوس کیا کہ اس کی طرف پروین کا جھکاؤ غیر معمولی ہے۔ پھر احفاظ بھی اس سے بے تکلف ہوتا چلا گیا تھا۔ بات اظہار محبت تک پہنچی تھی۔ پھر شادی تک بھی پہنچ گئی لیکن احفاظ نے اس سے چھپایا نہیں تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اس کے باوجود پروین نے اس سے شادی کر لی تھی۔

"اچھا ہے کہ وہ جنونی ہے ورنہ شاید تم مجھ سے شادی نہ کرتے۔" پروین نے کہا۔ "ہے نا؟"

"یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم پھر بھی مجھ سے شادی کر لیتے۔" پھر وہ ہنس کر بولی۔ "بہت کم مرد ایسے ہوتے ہیں جو شادی کرنے کے بعد کسی اور لڑکی کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ عموماً مردوں کا مزاج ایسا ہی ہوتا ہے لیکن عورتوں کا جو مزاج ہوتا ہے، تم کو میں نے اس کے برخلاف پایا۔ لڑکی جسے پسند کر لیتی ہے اس سے شادی کے لیے بے چین ہو جاتی ہے، خواہ وہ شخص شادی شدہ ہی کیوں نہ ہو لیکن پھر یہ برداشت نہیں کرتی کہ اس کا محبوب تیسری شادی بھی کر لے۔ تم نے تو میری تیسری شادی کا بندوبست خود کیا تھا۔"

"ہوں۔" پروین مسکرائی۔ کوئی جواب نہیں دیا۔

"صبیحہ سے میری ملاقات کرانے کے لیے تم نے اچھا خاصا ڈراما بھی کر ڈالا تھا۔"

"مجھے یقین تھا کہ تم اسے پسند آ جاؤ گے۔ میں واقف ہوں نا اس کی فطرت سے۔"

"کیا یہ عجیب بات نہیں ہے؟"

"کیا!"

"تم چاہتی تھیں کہ میری شادی صبیحہ سے ہو۔"

"ہاں۔ میں اسے شکست دینا چاہتی تھی۔"

"کیسی شکست؟"

''وہ کہا کرتی تھی کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گی لیکن میرا خیال تھا کہ تم جیسے ہینڈسم شخص سے ملنے کے بعد اس کی سوچ بدل جائے گی۔ مجھے اس کا یقین تو نہیں تھا لیکن میں نے چانس لیا۔''

''لیکن مجھے یقین ہے، بات صرف اتنی نہیں ہوسکتی کہ تم اس کا خیال تبدیل کرنا چاہتی تھیں۔ بات کچھ اور بھی ہے جو تم مجھ سے چھپا رہی ہو۔''

''اس موضوع پر تم کئی بار بات کر چکے ہو احفاظ!''

''میں جاننا چاہتا ہوں نا کہ دراصل تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''اگر کوئی اور بات ہے تو وہ وقت آنے پر ہی جان سکو گے!''

''ہاہ۔'' احفاظ نے ایک طویل سانس لی۔ ''آخر آج تمہارے منہ سے نکل ہی گیا!''

''کیا نکل گیا؟''

''یہی کہ اور کوئی بات بھی ہے۔''

''میں نے یہ کب کہا؟''

''ابھی کہا ہے نا کہ وقت آنے پر ہی جان سکو گے!''

''میں نے کہا تھا کہ اگر کوئی بات ہے تو۔''

''اگر کا لفظ کہہ کر تو تم نے مجھے شبے میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔''

''اب تم جس طرح چاہو، سوچو!''

''اچھا اگر یہ بات کھل گئی۔''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ اسے مجھ سے ملوانے کے لیے فیس بک کا ڈراما تم نے کیا تھا۔''

''یہ بات اسے کیسے معلوم ہوسکتی ہے؟''

''فیس بک پر اب اس نے اپنا اکاؤنٹ تو کھول لیا ہے۔''

''تو اس سے کیا ہوگا؟''

''فیس بک والوں سے براہِ راست بات بھی تو کی جاسکتی ہے۔''

''ہاں کی تو جاسکتی ہے لیکن یہ سمجھنا اس کے لیے آسان نہیں ہوگا۔ میں فیس بک پر تین سال سے ہوں۔ کوئی سال بھر پہلے مجھے اتفاقیہ طور پر معلوم ہوا تھا کہ فیس بک والوں سے براہِ راست بھی بات کی جاسکتی ہے۔''

''صبیحہ کے ساتھ یہ اتفاق جلدی بھی ہوسکتا ہے۔''

''اگر یہ اتفاق ہو بھی گیا تو وہ کیا پوچھے گی ان سے؟''

''یہی کہ اس کے حکم کے مطابق اس کا اکاؤنٹ کھلنے سے پہلے کوئی اور بھی تمہارے نام سے اور تمہاری تصویر کے ساتھ فیک اکاؤنٹ کھولے ہوئے تھا۔ وہ پوچھ سکتی ہے کہ وہ اکاؤنٹ کس کمپیوٹر سے کھولا گیا تھا۔''

''وہ لوگ کسی کو کسی کا آئی پی نمبر نہیں بتاتے......!''

''صبیحہ یہ کہہ سکتی ہے کہ اس جعلی اکاؤنٹ کی وجہ سے اس کو کسی قسم کا نقصان پہنچا ہے۔''

''پوچھا جاسکتا ہے کہ کیا نقصان پہنچا ہے؟''

''ممکن ہے وہ اس سلسلے میں فیس بک والوں کو کسی طرح مطمئن کر سکے۔''

''کیسے مطمئن کرسکتی ہے؟''

''یہ اندازہ تو میں نہیں لگا سکتا۔''

''مجھے اس کا اندیشہ نہیں لیکن تمہاری اس بات نے میرے دماغ میں تھوڑی سی الجھن پیدا کردی ہے۔''

''یعنی تمہیں بھی خیال آرہا ہے کہ شاید میرا خیال درست ثابت ہوجائے۔''

''ہاں۔ ایک خلش سی پیدا کردی تم نے!''

''فرض کرو کہ اسے معلوم ہوجاتا ہے۔''

''میں نے صبیحہ کے نام سے جو اکاؤنٹ کھولا تھا، وہ اپنے گھر کے کمپیوٹر پر کھولا تھا۔''

''اس کا ایڈریس معلوم ہوسکتا ہے اسے!''

''پریشان مت کرو مجھے۔ اگر یہ انہونی ہو بھی گئی تو پھر اسی وقت دیکھا جائے گا کہ کیا کرنا چاہیے۔''

''تم نے اپنا پاس ورڈ بتا دیا تھا مجھے۔ ایک آدھ بار میں بے خیالی میں اپنے اکاؤنٹ کا پاس ورڈ ڈالنے کے بجائے تمہارا پاس ورڈ ڈال کر تمہارے اس پیج پر بھی گیا ہوں۔ فیس بک نے تفتیش کی تو اسے یہ بھی معلوم ہوجائے گا۔ فیلڈ بروک کا فرضی ای میل ایڈریس میں نے اپنے کمپیوٹر پر بنایا تھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں لیکن شاید یہ معاملہ الجھ جائے۔ صبیحہ کو اگر ساری بات معلوم ہوگئی تو وہ میرے تمہارے گٹھ جوڑ سے بھی واقف ہوجائے گی۔''

''دیکھا جائے گا احفاظ! تم میرا دماغ خراب کیے دے رہے ہو۔''

''چلو چھوڑو۔'' احفاظ نے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ''کچھ پیار محبت کی باتیں کرلیتے ہیں۔''

''ابھی تمہیں پھر شبنم کے پاس جانا ہے۔''

''ہاں، کہہ کر تو آیا ہوں۔ اگر نہیں جاؤں گا تو فون کرے گی۔''

''بس تو آج پیار محبت کی باتیں اس کے لیے اٹھا رکھو۔'' پروین نے ہنس کر کہا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''اب وہ

کب اور کس فلائٹ پر جائے گی؟"
"اس قسم کی باتیں کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی "
"یہ میں اس لیے پوچھ رہی تھی کہ جب وہ فلائٹ پر جاتی ہے، تبھی ہمیں زیادہ وقت ساتھ گزارنے کا موقع ملتا ہے۔"
"آج باتوں باتوں میں پوچھ لوں گا اس سے؟"
پروین کچھ سوچنے لگی۔
"ارے!" احفاظ مسکرایا۔ "پیار محبت کا ذکر چھیڑ کر کس سوچ میں پڑ گئیں!"
"ہاں بس وہ اچانک خیال آ گیا۔"
"میرے علاوہ بھی کسی کا خیال آتا ہے؟" احفاظ نے اسے چھیڑا۔
"ہاں۔" پروین نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
"کون ہے وہ خوش نصیب؟"
"دو ہیں۔"
"خوب......!"
"صبیحہ اور شبنم۔"
"ارے!" احفاظ ہنس پڑا۔ "میرا خیال تھا مردوں کے نام بتاؤ گی۔"
"تمہارے بعد اب میری زندگی میں کوئی اور مرد نہیں آ سکتا۔"
"تو یہ صبیحہ اور شبنم کا خیال کس لیے؟"
"انہی دونوں کی تو اہمیت ہے۔"
"کیا اہمیت ہے۔"
"بتاؤں گی۔ جلد ہی بتانا چاہتی ہوں۔ اسی لیے تو پوچھا تھا کہ اب شبنم کب جائے گی فلائٹ پر؟"
"صبیحہ، شبنم، اس کی فلائٹ!...... کیا ربط ہے ان تینوں میں؟"
"بہت خاص ربط ہے۔"
"تو میرا یہ خیال ٹھیک ہی ہے نا کہ تمہارے دماغ میں کوئی خاص مواد پک رہا ہے جو تم مجھ سے پوشیدہ رکھے ہوئے ہو!"
"مان لیتی ہوں تمہاری بات...... ذہن میں ہے کچھ!"
"اور وہ تم کوئی خاص وقت آنے پر بتاؤ گی!" احفاظ نے لمبی سانس لی۔
"میں جلد از جلد بتانا چاہتی ہوں۔"
"تو بتاؤ۔"
"کہا نا! شبنم سے اس کی اگلی فلائٹ کے بارے میں پوچھ لو۔"

''یہ سوچ سوچ کر تو میرے سر میں درد ہو جائے گا کہ اس کی فلائٹ کا اس مواد سے کیا تعلق جو تمہارے دماغ میں پک رہا ہے۔''

''بہت گہرا تعلق ہے۔''

''اور تم چاہتی ہو کہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پھوڑے کی طرح پکنے لگے۔''

''فی الحال چھوڑو یہ باتیں۔'' پروین نے کہا، پھر مسکرائی۔ ''ابھی ذرا دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ اب پیار محبت کی باتیں کی جائیں۔ ایک اور جملہ بھی میرے منہ سے نکلا تھا، پھر بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ اب بھول جاؤ وہ سب باتیں۔''

وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے متوالے تھے۔ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ انہیں چونکنا اس وقت پڑا جب احفاظ کے موبائل نے اسے آواز دی۔

''اوہ!'' احفاظ گھڑی دیکھتا ہوا اٹھا۔ ''خاصا وقت گزر گیا۔ شبنم ہی کا فون ہوگا۔''

اس نے سرہانے رکھا ہوا موبائل اٹھایا اور پھر چونک کر بولا۔ ''ارے! یہ تو صبیحہ کی کال ہے۔''

''سنو!'' پروین بولی۔ ''اس وقت کیسے فون آ گیا اس کا۔ وہاں تو شاید رات خاصی گزر چکی ہوگی۔''

''ہیلو صبیحہ!'' احفاظ نے کال ریسیو کی۔ ''دل خوش ہو جاتا ہے تمہاری کال آتی ہے تو...... لیکن تم اس وقت...... خاصی رات ہوگی وہاں تو!''

''ہاں، لیکن نیند نہیں آ رہی تھی سوچا تمہیں فون کرلوں۔ ابھی زیادہ دن تو نہیں ہوئے لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے بہت عرصہ ہو گیا تم سے جدا ہوئے۔''

''میں بھی تمہیں بہت مس کر رہا ہوں۔'' احفاظ نے پروین کو آنکھ ماری۔

''پروین آئی تھی؟'' صبیحہ نے پوچھا۔

''ابھی تو نہیں آئی۔'' احفاظ نے مسکراتے ہوئے پروین کی طرف دیکھا۔ ''دفتر میں ہوگی۔ اس کا کوئی وقت تو ہے نہیں آنے کا۔ یہ تم عجیب مصیبت لگا گئی ہو میرے سر!''

''مصیبت نہیں ہے یہ ڈیئر! تم دفتر کے معاملات جتنی جلدی سمجھ لو، اچھا ہے۔ میرا خاصا بوجھ کم کرسکو گے تم!''

''پروین تو رہتی ہے تمہارے ساتھ ہر وقت!''

''اس کی بات اور ہے۔ یوں سمجھو کہ وہ ایڈوائزر ہے میری۔ اسے وہ اختیارات تو حاصل نہیں، جس میں تم کو میرا شراکت دار بننا ہے۔''

''اعتماد نہیں ہے کیا پروین پر؟'' احفاظ نے سوال کرتے وقت اسپیکر آن کردیا تاکہ پروین بھی صبیحہ کا جواب سن سکے۔

''اعتماد نہ ہوتا تو وہ میری ایڈوائزر کیوں ہوتی......؟ محنتی بھی ہے اور مخلص بھی!...... لیکن مالک تو نہیں ہے نا کاروبار کی۔''

''تو کیا میں مالک ہوں؟''

''یقیناً۔'' صبیحہ نے جواب دیا، پھر شاید مسکرا کر کہا۔ ''آخر میں تمہاری نصف بہتر ہوں۔''

''اور میں نصف بدتر۔'' احفاظ ہنسا۔

پروین یہ باتیں سنتے ہوئے زیرلب مسکرا رہی تھی۔

''یہ محاورہ بھی عجیب ہے۔'' احفاظ بولا۔ ''نصف بہتر!...... اسی حساب سے شوہر کو نصف بدتر کہنا چاہیے۔''

صبیحہ ہنسنے لگی۔

احفاظ نے پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسے خیال آ رہا تھا کہ شبنم اب اس کے انتظار میں بے چین ہوگی۔

''تم تو کمپیوٹر میں لگے ہوئے ہو گے!'' صبیحہ نے بات بدلی۔

''ابھی پانچ منٹ پہلے ہی بند کیا ہے۔ اوہ! آواز سنی؟''

''کیسی آواز؟''

''کوئی کار آ کر رکی ہے باہر۔ پروین ہی ہوگی۔''

''بس تو اب تم اس کے ساتھ نمٹو!...... سنو! میں بند کر رہی ہوں۔''

احفاظ نے یہی چاہا تھا کہ اب صبیحہ سے باتیں ختم ہوں تو وہ جائے شبنم کے پاس!

صبیحہ نے ''شب بخیر'' کہہ کر فون بند کردیا۔

احفاظ نے اپنا موبائل آف کیا ہی تھا کہ اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس مرتبہ شبنم ہی کی کال تھی۔

''ہاں شبی!'' احفاظ نے کال ریسیو کی۔

''کئی بار نمبر ملایا ہے تو اب لائن ملی ہے۔'' شبنم کے لہجے میں غصہ تھا۔ ''کس سے باتیں ہو رہی تھیں؟ تم نے تو کہا تھا کہ پروین......''

''ہاں، وہ آج ذرا دیر سے گئی ہے۔'' احفاظ نے اس کی بات کاٹی۔ ''میں اب بس نکلنے ہی والا تھا کہ صبیحہ کی کال آ گئی۔ اسی سے بات ہو رہی تھی۔ ابھی بند کیا ہے اس نے فون!...... بس اب آتا ہوں۔''

''جلدی آؤ۔ بور ہو گئی ہوں اتنی دیر میں!''

''بس آتا ہوں۔'' احفاظ نے کہا اور موبائل بند کردیا۔

پروین ہنستے ہوئے بولی۔ ''تین تین بیویوں میں پھنس گئے ہوتم!''

احفاظ بھی ہنسا۔ ''کبھی سان گمان میں بھی نہ تھا کہ میری تین شادیاں ہوں گی۔''

''پہلے میں جاتی ہوں، پھر تم جانا۔'' پروین نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ملازموں کو یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ میں گھر میں ہوں اور تم چلے گئے!''

''بس تو اب جاؤ جلدی سے۔'' احفاظ بولا۔

''بہت ڈر لگتا ہے تمہیں شبنم سے!'' پروین مسکرائی۔

''وہ ہے ہی ایسی......! ذرا ذرا سی بات پر انگارے چبانے لگتی ہے۔''

''مجھے اس کی یہی خصوصیت تو پسند ہے ورنہ......''

اس نے جان بوجھ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کی زبان پر شاید کوئی ایسی بات آنے والی تھی جسے اس نے اب تک راز رکھا تھا۔

اس کے جانے کے بعد احفاظ بھی روانہ ہوا۔

☆☆☆

واپسی میں احفاظ کو شام ہوگئی۔ شبنم سے پیچھا چھڑانے میں اسے خاصی دشواری ہوئی تھی۔

دس منٹ بعد ہی اس کے موبائل پر، پروین کی کال آئی۔

''اتنی دیر لگا دی۔'' پروین نے کہا۔ ''میں دو مرتبہ ٹیلی فون کر چکی ہوں۔ اس مرتبہ موبائل پر کال کیا۔''

''میں واپس آ گیا ہوں لیکن اگر اس وقت بھی شبنم کے ساتھ ہوتا؟''

''میں دفتر کی کوئی بات کر کے فون بند کر دیتی۔ اتنی دیر کیوں ہوگئی۔'' پھر پروین ہنسی۔ ''وہ پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہوگی۔''

''ہاں۔''

''اچھا وہ...... پوچھا اس سے؟''

''فلائٹ کے بارے میں؟''

''اس کے علاوہ تو کوئی بات نہیں پوچھنی تھی۔''

''ابھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کل معلوم ہوگا اسے۔ میرے اس سوال پر وہ بھنا گئی تھی۔ کہنے لگی، تم چاہتے ہو کہ میں ہر وقت ڈیوٹی پر رہا کروں تاکہ تم ہر وقت صبیحہ کے ساتھ گل چھرے اڑاتے رہو۔''

''ہاں۔'' پروین پھر ہنسی۔ ''یہ خیال اسے آنا ہی چاہیے تھا۔ خیر! کل تک اور انتظار کرتی ہوں۔''

''نہ جانے تم مجھ سے کیا چھپا رہی ہو۔ جب بھی سوچوں گا، سوچتے سوچتے دماغ اُبل جائے گا۔''

''تو سوچو ہی کیوں؟''

''فطری بات ہے۔ دماغ کو تو ایسے معاملوں میں کنٹرول نہیں کیا جا سکتا۔''

''قوتِ ارادی ہونی چاہیے۔'' پروین نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی۔

احفاظ نے ٹھنڈی سانس لے کر فون بند کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ پروین کی کال آنے سے پہلے اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔

رات کے کھانے سے پہلے وہ کچھ دیر لان میں ٹہلتا رہا اور اس کا دماغ اس ''راز'' میں الجھا رہا جو پروین اس سے چھپائے ہوئے تھی۔

کھانے کے بعد وہ بستر پر لیٹا تو بھی خیالات سے نجات نہیں ملی۔ نیند اسے جلدی نہیں آتی تھی اس لیے سوچتے سوچتے اب اس کا سر دکھنے لگا۔

ساڑھے دس ہی بجے تھے جب ملازمہ نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اسے آواز بھی دی۔ ''صاحب!''

''کیا ہے؟'' احفاظ حیران ہوا تھا۔ ملازمہ آخر اس وقت اسے کیا بتانے آئی تھی۔

''صاحب! ایک خاتون آئی ہیں آپ سے ملنے۔ نام شبنم بتا رہی ہیں۔'' ملازمہ نے باہر ہی سے قدرے بلند آواز میں کہا۔

احفاظ بستر پر تقریباً اچھل ہی پڑا تھا پھر جلدی سے کھڑا بھی ہوگیا۔ فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا۔ کیا کرے، کس طرح ٹالے؟ اگر وہ سونے کا بہانہ کر کے ملازمہ کے ذریعے اسے ٹالنے کی کوشش کرتا تو وہ شور مچا دیتی۔ آخر اسے ایک بات سوجھی۔ اس نے جلدی سے موبائل اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''کہاں ہیں وہ خاتون؟''

''وہ کار میں آئی ہیں۔ چوکیدار نے پھاٹک ہی نہیں کھولا ہے۔''

''اس سے کہہ دو کہ میں سو چکا ہوں۔ وہ کل کسی وقت آئے۔'' یہ جواب دیتے ہوئے وہ موبائل پر شبنم کا نمبر ملا رہا تھا۔

''اچھا صاحب!'' ملازمہ نے جواب دیا تھا۔

موبائل پر شبنم سے رابطہ ہوگیا۔

''یہ کیا حرکت کی ہے تم نے!'' احفاظ نے کہا۔ ''اس وقت کیوں آ گئیں؟''

''اندر بلاؤ تو بتاؤں گی۔''

''یہ بہت نامناسب ہوگا شبنم!''
''ہوگا نامناسب! تم مجھے اندر بلاؤ۔''
''اچھا تم ابھی تو میکڈونلڈ میں جا کر بیٹھو۔ میں آتا ہوں وہاں۔''
''کتنی دیر میں؟''
''ایک میل پر تو ہے۔ ابھی آتا ہوں، فوراً۔ ابھی چوکیدار تمہیں بتائے گا کہ میں سو رہا ہوں اس لیے اس وقت ملاقات ممکن نہیں۔ یہ سن کر تم فوراً روانہ ہو جانا یہاں سے!''
''چوکیدار باہر آرہا ہے۔''
''بس اس کی بات سن کر تم جاؤ۔ میں فوراً آرہا ہوں۔''
''اچھا۔'' شبنم نے جواب دیا اور رابطہ منقطع کر دیا۔
احفاظ نے سکون کی سانس لی۔ اسے بہت کم توقع تھی کہ شبنم اس کی بات مان لے گی۔ وہ بستر پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ شبنم سے اس نے کھڑے کھڑے گفتگو کی تھی۔ ایک منٹ بعد ہی وہ اٹھا اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے۔ ضروری تھا کہ وہ میکڈونلڈ جا کر شبنم سے ملتا۔ نہ ملنے کی صورت میں شبنم پھر آدھمکتی۔ نہ جانے کیا سوجھی تھی اسے اس وقت؟
کپڑے تبدیل کر کے وہ کمرے سے نکلا۔
ملازمہ کو آواز دے کر اس نے پوچھا۔ ''کیا رہا؟''
''وہ چلی گئیں صاحب!''
''اچھا ٹھیک ہے۔ میں ذرا قریب کے ریسٹورنٹ سے کچھ لینے جا رہا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں آجاؤں گا۔''
''جی صاحب!''
احفاظ نے باہر نکل کر کار سنبھالی اور اسے پھاٹک سے نکال کر تیزی سے میکڈونلڈ کی طرف دوڑا دیا۔ وہ خاصا پریشان ہو گیا تھا۔
شبنم وہاں اس کی منتظر تھی۔ ایک ویٹر اس کی میز پر کچھ چیزیں رکھ رہا تھا جو اس نے منگوائی ہوں گی۔
احفاظ میز پر جا بیٹھا۔ ویٹر جا چکا تھا۔
''اب بتاؤ۔ تم تو مصیبت میں ڈال دو گی مجھے!'' احفاظ نے کہا۔
''اتنا ڈرتے ہو اس حرافہ سے؟'' شبنم تلخی سے بولی۔
''شاید میں تمہیں یہ بتانا بھول گیا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ طلاق دوں گا تو مہر بھی دینا پڑے گا اور مہر بہت زیادہ ہے۔ گھر بیچ کر بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔''
''اچھی طرح پھانسا ہے اس نے تمہیں!''
''تم اب یہ بتاؤ کہ اس وقت وہاں کیوں آئی تھیں؟ کافی وقت گزار کے تو لوٹا تھا میں تمہارے پاس سے!''
''ہاں، لیکن جب میں ڈیوٹی پر نہ ہوں، گھر پر ہوں تو رات کو نیند آنا محال ہو جاتا ہے تمہارے بغیر......''
''تو وہاں آکر تم کیا حاصل کرنا چاہتی تھیں!''
''جب تک صبیحہ نہیں آجاتی اور جب تک میں ڈیوٹی پر نہیں جاتی، میں اپنی راتیں تمہارے ساتھ صبیحہ کے گھر پر گزاروں گی۔''
''کیا!'' احفاظ کو اپنے پیروں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔
''ہاں۔'' شبنم کے لہجے میں گمبھیرتا تھی۔ ''اگر تم رات کو اپنے گھر پر میرے ساتھ نہیں سو سکتے تو میں صبیحہ کے گھر میں تمہارے ساتھ رات گزاروں گی۔''
''لیکن......''
''کوئی بحث نہیں۔'' شبنم نے انگلی احفاظ کے چہرے کے سامنے کی۔ ''اب اگر تم نے کوئی آنا کانی کی تو یہ پلیٹ......'' اس نے ایک پلیٹ اٹھالی۔ پلیٹ میں جو کچھ تھا، وہ میز پر الٹ گیا۔ ''یہ پلیٹ۔'' شبنم نے دہرایا۔ ''تمہارے سر پر ٹوٹے گی۔''
احفاظ نے پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ شبنم کے پلیٹ الٹنے کی وجہ سے خاصے لوگ ہی نہیں بلکہ کئی ویٹر بھی ان کی طرف دیکھنے لگے۔
''ٹھیک ہے۔'' احفاظ نے شبنم کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ''چلو!''
شبنم نے ویٹر کو اشارہ کیا کہ بل لائے......
لوگوں کے متوجہ ہونے کی وجہ سے احفاظ بڑی خجالت محسوس کر رہا تھا، خود پر جھنجلاہٹ بھی تھی اور کچھ غصہ بھی...... لیکن شبنم کے سامنے بھی اس کا غصہ موثر ثابت نہیں ہوا تھا......
ویٹر بل لے آیا۔ اس نے میز پر بکھری ہوئی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سب پیک کروا دوں میڈم!''
''ضرورت نہیں۔'' شبنم نے بل... کی رقم سے کچھ زیادہ رقم پلیٹ میں رکھی اور کھڑی ہو کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس نے پلٹ کر یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں محسوس کی تھی کہ احفاظ اس کے پیچھے آرہا تھا یا نہیں۔ اسے یقین تھا کہ احفاظ آرہا ہوگا اور اس کا یقین غلط بھی نہیں تھا......
شبنم کی کار پارکنگ لاٹ میں کھڑی تھی۔
''تم اپنی کار میں چلو'' شبنم نے کہا۔ ''میں

تمہارے پیچھے آتی ہوں۔''
''ایک کام کرو۔'' احفاظ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تم کار پر گھر کی طرف چلو پھر کار وہیں چھوڑ کر میرے ساتھ چلو۔''
''گڈ!'' شبنم خوش ہوئی۔ ''یہ تو مجھے بہت اچھا لگے گا کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔''
''چلو تم! میں تمہاری گاڑی کے پیچھے آتا ہوں۔''
شبنم تیزی سے اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولنے لگی۔ یہ شاید وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ احفاظ اس کے پیچھے آنے کے بجائے فرار کی کوشش کرے گا اور یہی ہوا بھی! احفاظ نے اپنی کار اسٹارٹ کی تو شبنم کی کار پارکنگ شیڈ سے نکل رہی تھی۔ احفاظ نے اپنی کار اس کے پیچھے ڈال دی اور ساتھ ہی اپنی جیب سے موبائل نکالا۔ وہ پروین کو اس صورتِ حال سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ رابطہ ہو جانے پر احفاظ نے جزوی باتوں کے ساتھ ساری تفصیل بیان کر دی۔ اس کے بولنے کے دوران میں پروین صرف ''ہوں...... ہوں'' کرتی رہی تھی۔
پھر جیسے ہی احفاظ خاموش ہوا، پروین چہکنے والے انداز میں بولی۔ ''بہت شاندار! جنون بڑھتا جا رہا ہے اس کا!''
''ہاں۔'' احفاظ نے کہا۔ ''بھرے پُرے ریسٹورنٹ میں اس نے پلیٹ اٹھالی تھی اور صاف صاف کہا تھا کہ وہ پلیٹ میرے سر پر توڑ دے گی۔''
''میں نے کہا نا کہ شاندار!'' پروین بہت خوش تھی۔ ''اس کا یہ بڑھتا ہوا جنون ہی تو کہانی کو کلائمیکس تک پہنچائے گا۔''
''سوچ سوچ کے تھک چکا ہوں کہ آخر تم چاہتی کیا ہو لیکن اس وقت میں ان باتوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔ یہ بتاؤ کہ میں اب کیا کروں؟''
''ٹھیک ہے، لے جاؤ اسے اپنے ساتھ......''
''میں نے ایک ایسی تدبیر سوچی ہے کہ ملازمین میں سے کسی کو اس بارے میں علم نہ ہو۔ خاص طور سے ملازمہ کو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میں اس سے اپنی بات منوا سکوں گا یا نہیں!''
''کیا تدبیر سوچ لی تم نے؟''
احفاظ نے جو کچھ سوچا تھا، پروین کو بتا دیا۔
''گڈ!'' پروین کی آواز میں پھر چہکار تھی۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر تم اسے قاعدے سے سمجھا سکے تو وہ مان جائے گی۔''
''اسے اپنے ساتھ لے جانا تو پڑے گا مجھے!......

خواہ ملازمہ کے ذریعے صبیحہ کو معلوم ہو یا نہ ہو۔''
''ٹھیک ہے، تدبیر ٹھیک سوچی ہے تم نے...... میں پھر کہتی ہوں کہ وہ مان جائے گی۔ اسے بس تمہارے ساتھ رات گزارنا ہے، کسی طرح بھی گزارے۔''
''اچھا!'' احفاظ نے طویل سانس لی۔ ''میں نے یہ سوچ کر تمہیں فون کیا تھا کہ تم شاید کوئی اور تجویز دے سکو۔''
''جو تم نے سوچا ہے، اسی میں کامیاب رہو گے۔''
گھر آنے تک ان دونوں میں باتیں ہوتی رہیں جو تقریباً اسی قسم کی تھیں۔
اپنی گاڑی وہاں چھوڑنے کے بعد شبنم احفاظ کی کار میں آبیٹھی۔
''چلو!'' اس نے کہا۔
''ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ میری ایک بات تو مان لو شبنم!'' احفاظ نے قریب گھگیاتے ہوئے کہا۔
''کہو ڈیئر!'' شبنم غالباً اس بات سے خوش تھی کہ احفاظ اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔
''میں نے تمہیں یہ تو بتایا ہی تھا کہ صبیحہ کو طلاق دینے کی صورت میں مہر کی رقم دینا میرے لیے ممکن نہیں۔''
''ہاں، بتا چکے ہو۔''
''اب اس کی ملازمہ نے تمہیں دیکھ لیا تو بات صبیحہ تک ضرور پہنچے گی۔ میرے لیے مسئلہ بن جائے گا۔''
''دیکھا جائے گا۔'' شبنم نے سر جھٹکا۔
''اگر تم میری خاطر ایک کام کرو تو بات بن سکتی ہے۔''
''کب ایسا ہوا ہے کہ میں نے تمہاری خاطر کوئی کام کرنے سے گریز کیا ہو۔'' شبنم بولی۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے۔''
''تو پھر میری خاطر تم ایک ایسی بات پر عمل کرو کہ ملازمہ کی نظر میں آئے بغیر گھر میں پہنچ جاؤ۔''
''ایسی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟''
''جب گھر کچھ دور رہ جائے تو تم پچھلی سیٹ پر جا کر لیٹ جاؤ۔ اس طرح کوئی بھی تمہیں نہیں دیکھ سکے گا۔ چوکیدار بھی نہیں کیونکہ میں کار کی اندر کی روشنی بجھا دوں گا۔''
''ہوں۔'' شبنم کچھ سوچنے لگی۔
''میری خاطر!'' احفاظ نے پھر لجاجت سے کہا۔
''اچھا۔'' شبنم دھیرے سے ہنسی۔ ''جیسا تم کہو۔''
احفاظ خوش ہو گیا......
پھر اسی طرح ہوا جیسا احفاظ نے چاہا تھا۔ شبنم پوشیدہ طور پر صبیحہ کی خوابگاہ میں پہنچ گئی۔ کار کی آواز سن کر

ملازمہ برآمدے میں آ تو گئی تھی لیکن احفاظ نے اسے کسی کام کے بہانے وہاں سے ٹال دیا تھا۔

"شاندار۔" شبنم نے صبیحہ کی خواب گاہ پر چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "بہت خوب صورت کمرا بنایا ہے صبیحہ نے!"

احفاظ نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا۔ "کل صبح میں تمہیں باہر بھی اسی طرح پہنچاؤں گا۔ ذرا جلدی اٹھنا ہوگا۔ صبح کی روشنی پھوٹنے سے ذرا پہلے۔"

☆☆☆

دوسرے دن صبیحہ نے فون پر بتایا کہ اسے واپسی میں دو دن اور لگیں گے۔ صبیحہ نے جب یہ اطلاع احفاظ کو دی تھی تو اتفاق سے شبنم اس کے ساتھ تھی۔ اس نے احفاظ کے موبائل کا اسپیکر کھلوا دیا تھا۔ اس طرح اسے بھی صبیحہ کی آمد میں کچھ تاخیر کا علم ہوگیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔ اب اس کی دو اور راتیں بھی احفاظ کے ساتھ گزر سکتی تھیں۔

اسی روز دن میں احفاظ نے پروین کو فون پر اس کی اطلاع دی۔ پروین بولی۔ "صبیحہ مجھے بھی فون پر اطلاع دے چکی ہے۔"

"شبنم اس بات سے بہت خوش ہے۔"

"ابھی کسی فلائٹ پر جانے کا پروگرام نہیں ہے اس کا؟"

"آج ہی اس نے بتایا ہے کہ اس نے مزید ایک ہفتے کی میڈیکل لیو لے لی ہے۔"

"اوہ گڈ!" پروین نے کہا۔ "جس دن صبیحہ آئے گی، اسی روز میں تمہیں بتاؤں گی کہ اب کیا کرنا ہے۔"

احفاظ نے طویل سانس لی۔ "شکر ہے کہ مجھے کچھ بتانے کا وقت آگیا ہے۔ میرا یہ جملہ بھی اب سڑ چکا ہے کہ سوچ سوچ کر میرا دماغ پک گیا ہے۔"

پروین نے ہنس کر رابطہ منقطع کر دیا۔

آخر وہ دن آگیا جب صبیحہ کو لینے کے لیے احفاظ اور پروین ائرپورٹ پہنچے۔ صبیحہ آئی تو بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ کار میں اسی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔

"کام بہت اچھا ہوگیا ڈیئر!" اس نے اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے احفاظ سے کہا۔

پروین پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

"میں تمہیں بہت مس کرتا رہا ہوں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تمہیں مس نہیں کر رہی تھی۔ روزانہ تمہیں فون کرتی تھی۔"

"کبھی کبھی دن میں دو بار بھی کیا ہے۔" احفاظ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پروین چہکی۔ "بہت کہا کرتی تھیں کہ میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔" اس نے صبیحہ کو مخاطب کیا تھا۔

صبیحہ ہنس کر رہ گئی...... پھر سنجیدہ ہو کر بولی۔ "وہاں میں نے فیلڈ بروک کے بارے میں بھی بات کی تھی کسی سے۔ اس کا ای میل اس سے مختلف ہے جس کے ذریعے فیس بک پر میرے نام سے اکاؤنٹ بنایا گیا تھا۔"

"اصل کیا ہے؟" پروین نے معصومیت سے پوچھا۔

"ایف ڈاٹ بروک ایٹ دی ریٹ یاہو ڈاٹ کام۔" صبیحہ نے جواب دیا۔ پھر بولی۔ "اب تک سمجھ میں نہیں آسکا کہ آخر ہمارے ساتھ وہ شرارت کس نے کی تھی!"

"اس شرارت نے تمہیں تو احفاظ صاحب سے ملا دیا نا!" پروین نے ہنس کر کہا۔

"ہاں یہ تو ہوا ہے۔" صبیحہ بولی۔ "لیکن یہ الجھن تو رہے گی نا!"

"اب تک تو کوئی بات سامنے آئی نہیں۔"

"یہ بھی الجھن ہے کچھ تو سامنے آنا چاہیے تھا۔" صبیحہ نے کہا۔ "کیا تمہیں خیال نہیں آتا احفاظ؟"

"یہ کیسے ممکن ہے کہ مجھے خیال نہ آئے!"

"تم تو میرا خیال ہے کافی عرصے سے کمپیوٹر کا استعمال جانتے ہوگے!"

"ہاں، یہ تو ہے۔"

"کمپیوٹر کے ذریعے کچھ معلوم کرنے کی کوشش نہیں ہوسکتی؟"

"غالباً ایسا ممکن نہیں۔ میں کر کے دیکھ چکا ہوں۔"

"تم پروین؟"

"میں بھی کوشش کر کے دیکھ چکی ہوں۔ کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔" پروین نے کہا۔ "اب اپنا دماغ اس میں نہ تھکاؤ۔ کچھ نہیں ہوگا، کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ فیس بک پر لوگ بلا وجہ اس قسم کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا، پھر بھی کرتے ہیں۔"

"خدا کرے تمہاری بات ہی ٹھیک ہو۔"

"تم دیکھ لینا، کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی بات ایسی سامنے نہیں آئے گی جس سے تمہیں یا احفاظ صاحب کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔"

صبیحہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

گاڑی گھر پہنچ گئی۔ پروین اپنی کار وہیں چھوڑ گئی تھی۔ صبیحہ نے اس سے کہا۔ "تھوڑی دیر بعد آفس جانا

ہے۔ میں بس غسل کر کے پہنچوں گی۔ تم بھی میرے ساتھ ہی چلی چلنا۔"

"اب آج تو آرام کرلو۔"

"مجھے یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ لوگ آٹھ نو گھنٹے کے ہوائی سفر کے بعد بھی آرام کرنا چاہتے ہیں۔ میں سولہ گھنٹے کا سفر کر کے آئی ہوں لیکن مجھے بالکل تھکن نہیں ہے۔ ہوائی جہاز میں ہل تو نہیں چلانا ہوتا کہ تھکن ہو جائے۔"

"ہر معاملے میں تمہاری سوچ الگ ہے۔" پروین نے ہنس کر کہا، پھر بولی۔ "نہیں، ابھی تو میں بھی گھر ہی جاؤں گی۔ تمہیں لینے کے لیے بہت جلدی گھر سے نکلنا پڑا تھا۔ انکل اس وقت جاگے بھی نہیں تھے۔ میں انہی کے ساتھ ناشتا کرتی ہوں۔ بس ناشتا کر کے دفتر پہنچوں گی۔"

"اچھا! جیسی تمہاری مرضی۔"

پروین ان دونوں کو چھوڑ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس نے شادی کے بعد احفاظ کو بھی بتا دیا تھا کہ وہ اپنے ماموں سے بہت محبت کرتی ہے چونکہ وہ نابینا بھی تھے اس لیے پروین اچھا خاصا وقت ان کے ساتھ بھی گزارتی تھی۔

لیکن اس وقت صبیحہ سے جدا ہونے میں اس کی ایک مصلحت بھی تھی۔ اسے یقین تھا کہ صبیحہ جب غسل کرنے جائے گی تو احفاظ اسے فون ضرور کرے گا۔

خیال درست ثابت ہوا۔ پروین ابھی راستے ہی میں تھی کہ احفاظ کی کال آگئی۔

"مجھے یقین تھا کہ تم فون ضرور کرو گے۔" پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے کار کی رفتار بہت کم کر دی تھی۔

"کیوں۔ یقین کیوں تھا؟"

"تمہیں اب تک اس بات کا خیال نہیں آیا تھا کہ صبیحہ کے آنے کے بعد تم شبنم سے ملنے کس طرح جا سکتے ہو۔ ہر وقت ہی صبیحہ تمہیں اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ اب اس وقت تمہیں اپنی مشکل کا خیال ضرور آئے گا۔"

"ہاں......" احفاظ نے کہا۔ "صبیحہ باتھ روم میں ہے اس لیے مجھے موقع مل گیا تمہیں فون کرنے کا۔ واقعی تم نے ٹھیک کہا۔ اس وقت ہی مجھے خیال آیا ہے کہ اب میں شبنم کے پاس نہیں جا سکوں گا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شبنم جنون میں آ کر نہ جانے کیا حرکت کر بیٹھے۔"

"اس کی تدبیر پہلے ہی سوچ چکی ہوں میں۔ میں نے اپنے گھر جانے کا بہانہ ہی اس لیے کیا تھا کہ تم سے فون پر بات ہو جائے ورنہ انکل کے لیے تو میں ملازمہ کو ہدایات دے آئی تھی۔"

"یہ بتاؤ کہ تم نے تدبیر کیا سوچی ہے؟"

"بیماری بتا کر نہیں آتی۔"

"کیا مطلب؟"

"پیٹ میں تکلیف کا بہانہ کر کے دفتر سے اٹھ جانا۔"

"دو ڈھائی بجے کے قریب اس کے پاس جانے کا سوچا تھا میں نے۔"

"اسی وقت یہی بہانہ کر کے اٹھ جانا۔" پروین نے کہا۔ "صبیحہ خود تو دفتر نہیں چھوڑے گی۔ آج اسے خاصے کام دیکھنا ہوں گے۔ وہ تمہیں یہی مشورہ دے گی کہ کسی ڈاکٹر کو دکھاتے ہوئے گھر جاؤ اور آرام کرو، بلکہ......"

"بلکہ......تم چپ کیوں ہوگئیں......؟"

"ایک اور خیال آیا مجھے۔ وہ تمہیں اپنے ہی کمرے میں بٹھاتی ہے نا۔ میں لنچ کرنے وہاں آؤں گی۔ تم میرے سامنے ہی بہانہ کرنا۔ یہ خیال مجھے اس لیے آیا کہ شاید وہ تمہیں اپنے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے لیے تیار ہو جائے۔"

"اگر ایسا ہوا تو؟"

"تم دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔"

"لیکن یہ بہانہ کب تک چلے گا۔"

"یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر نے دو دن تک تمہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔"

"لیکن پھر بھی بار بار تو یہی بہانہ کرنے سے رہے۔ شبنم نے تو میڈیکل لیو لے لی ہے۔ کل تو وہ کہہ رہی تھی کہ چھٹیاں اور بڑھوا لے۔ میں......"

رابطہ یکلخت منقطع ہوگیا۔ پروین سمجھ گئی کہ صبیحہ باتھ روم سے نکلنے والی ہوگی۔ اسی لیے احفاظ نے فوراً لائن کاٹ دی تھی۔

پروین نے موبائل رکھا تو اس کے ہونٹوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔

گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ اس کے ماموں اٹھ چکے تھے اور اب ناشتا کرنے ہی والے تھے۔ پروین ان کے ساتھ شریک ہوگئی۔ وہ رات کو اپنے ماموں کو بتا چکی تھی کہ صبح اسے صبیحہ کو لینے ائرپورٹ جانا ہے۔

ناشتا کرنے کے چند منٹ بعد وہ دفتر روانہ ہوگئی۔ وہ دفتر پہنچی تو صبیحہ اس وقت تک نہیں آئی تھی۔ عموماً ایسا ہی ہوتا تھا۔ پروین پہلے ہی پہنچا کرتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد آپریٹر نے اسے اطلاع دی کہ صبیحہ اور احفاظ آگئے تھے۔ یہ معمول تھا کہ آپریٹر پروین کی ہدایت

کے مطابق اسے صبیحہ کے آنے کی اطلاع دیا کرتا تھا۔
پروین اپنے کام میں مصروف رہی۔
آدھ گھنٹے بعد انٹر کام پر صبیحہ نے اس سے پوچھا۔
''آج کہاں غائب ہو؟ ایک بار بھی چکر نہیں لگایا میرے کمرے کا۔''
''بس کام میں الجھی ہوئی تھی۔''
''لنچ کے لیے تو آؤ گی نا؟''
''ہاں وہ تو آؤں گی۔''
لنچ صبیحہ کے ساتھ کرنا پروین کا معمول تھا۔ کھانا کھا کے وہ دو بجے تک وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آجاتی تھی۔ اس وقت اسے خیال آیا کہ وہ احفاظ کو ایک مشورہ دینا بھول گئی تھی۔ احفاظ کو کھانا کھانے کے چند منٹ بعد ہی پیٹ کی تکلیف کا بہانہ کرنا چاہیے تھا۔ ایک جواز بن جاتا کہ کھانے میں کوئی چیز اسے نقصان دے گئی تھی۔
ایک بجنے میں پانچ منٹ پر وہ صبیحہ کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس وقت چپراسی میز پر پلیٹیں لگا رہا تھا۔ کھانا صبیحہ کے گھر سے ہی آتا تھا۔
کھانے کے دوران میں صبیحہ نے اس کام کا ذکر چھیڑ دیا جس کے لیے وہ بیرون ملک گئی تھی۔
پروین بولی۔ ''میں تم سے اس بارے میں پوچھنے ہی والی تھی۔''
اس طرح کھانے کے دوران میں کاروباری معاملات پر بات ہوتی رہی۔ احفاظ ان باتوں میں خاصی دلچسپی لیتا رہا یا ظاہر کرتا رہا کہ دلچسپی لے رہا ہے۔ بیچ میں اس نے ایک سوال بھی کر ڈالا۔
صبیحہ نے مسکرا کر پروین کی طرف دیکھا۔ ''خاصے کامیاب لیکچر دے چکی ہو تم احفاظ کو!''
''تمہاری ہدایت تھی، عمل کیسے نہیں کرتی۔''
صبیحہ احفاظ کی طرف متوجہ ہوئی اور اسے اس کے سوال کا جواب دیا۔ کھانے کے بعد صبیحہ ہاتھ دھونے واش روم میں چلی گئی۔
پروین نے موقع غنیمت جانا۔ احفاظ کی طرف جھک کر سرگوشی کرنے والے انداز میں بولی۔ ''تم چند منٹ بعد ہی چہرے پر کچھ ایسا تاثر پیدا کرنا جیسے تکلیف محسوس کر رہے ہو۔ وہ پوچھے گی تم سے۔ اگر نہ بھی پوچھے تو تم خود کہنا۔''
احفاظ نے سر ہلا دیا۔
صبیحہ واش روم سے آئی تو احفاظ واش روم میں چلا گیا۔ ملازم نے برتن سمیٹنا شروع کر دیے۔ احفاظ کے بعد پروین واش روم میں گئی۔ وہ آکر بیٹھی ہی تھی کہ ایک اور ملازم آیا اور معمول کے مطابق چائے کا سامان میز پر رکھنے لگا۔
صبیحہ کو اس روز اتنا کام تھا کہ چائے پینے کے دوران میں بھی ایک فائل دیکھتی رہی۔ احفاظ اس وقت اپنے چہرے پر تکلیف کے تاثرات بڑھا رہا تھا لیکن صبیحہ نے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔
آخر پروین ہی کو بولنا پڑا۔ ''کیا بات ہے احفاظ صاحب! کچھ بے چین نظر آرہے ہیں آپ!''
اب صبیحہ نے چونک کر احفاظ کی طرف دیکھا۔
''پیٹ میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔'' احفاظ نے کہا۔
''ارے!'' صبیحہ کے منہ سے نکلا۔ ''کھانے میں تو ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔''
''نہ جانے کیا بات ہے۔'' احفاظ نے کہا۔ ''صبح ناشتے کے بعد بھی تکلیف ہوئی تھی لیکن اس وقت زیادہ ہوئی ہے۔''
''اوہ!'' پروین بول پڑی۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تکلیف کا سبب کھانے میں کسی قسم کی خرابی نہیں۔ آپ کے معدے میں کچھ گڑبڑ ہے جو کھانے کی کسی بھی قسم کی اشیا قبول نہیں کر رہا ہے۔ آپ ڈاکٹر کو دکھائیں، بلکہ اس میں دیر نہ کریں۔''
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' صبیحہ بول پڑی اور اس نے اپنے سامنے کھلی ہوئی فائل بند کر دی۔
''تمہیں آج کام بہت ہے۔'' پروین بولی۔ ''تم مصروف رہو۔ میں لے جاتی ہوں احفاظ صاحب کو ایک ڈاکٹر کے پاس۔ وہ میرے جاننے والے بھی ہیں۔ دو بجے سے چار بجے تک بیٹھتے ہیں۔''
''ہاں، ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے۔'' صبیحہ نے کہا، پھر احفاظ سے بولی۔ ''تم فوراً چلے جاؤ پروین کے ساتھ......''
''ہوں۔'' احفاظ نے سر ہلایا۔ ''صبح کی بہ نسبت اس وقت زیادہ تکلیف ہے۔''
''تم انہیں فوراً لے جاؤ پروین!'' صبیحہ بولی۔
''آیئے احفاظ صاحب!'' پروین کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔
احفاظ کے ساتھ صبیحہ بھی اٹھی اور ان دونوں کو خصوصاً احفاظ کو رخصت کرنے کے لیے دروازے تک آئی۔
''میری کار لے جانا۔'' اس نے چابی پروین کی طرف بڑھائی۔
پروین نے سر ہلا کر چابی اس سے لے لی۔
جب وہ اور احفاظ کار میں بیٹھے تو پروین ہنس کر بولی۔

''کیا اچھا پلان بنایا تھا میں نے۔'' ساتھ ہی اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن فون پر اصل مسئلے پر بات ہی نہیں ہوسکی تھی۔ میں نے صبیحہ کی وجہ سے اچانک لائن کاٹ دی تھی۔''

''وہ تو میں سمجھ گئی تھی۔ تم نے غالباً یہ سوال کیا تھا کہ آخر ایسا کب تک چلے گا؟''

''ہاں۔''

''زیادہ عرصے کی ضرورت نہیں۔ اب اس معاملے کا آخری سین ہونا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' احفاظ کے منہ سے نکلا، پھر اس نے کہا۔ ''اچھا تو اب تم مجھے بتاؤ گی کہ تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے۔''

''نہیں۔'' پروین نے کہا۔ ''ابھی ساری بات تو نہیں بتاؤں گی۔ فی الحال مجھے ایک کام سپرد کرنا ہے تمہیں۔''

''وہ کیا؟''

''ذرا صبر کرو۔ کار ردکنا پڑے گی۔ میں ایک ایسی سڑک کی طرف جا رہی ہوں جہاں برائے نام ٹریفک ہوتا ہے۔ وہاں کار کھڑی کی جاسکتی ہے۔''

''ایسا کیا کام ہے جس کے لیے ویرانہ ضروری ہے۔''

''ابھی سمجھ میں آجائے گا تمہاری۔''

اور جب ایک ویران سی سڑک پر کار روک کر پروین نے احفاظ کو بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے تو اس کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''یہ سب......'' سب کچھ جاننے کے بعد اس کے منہ سے بس دو لفظ نکلے اور وہ پروین کی صورت تکنے لگا۔

''کیوں؟'' پروین بولی۔ ''منصوبہ پسند نہیں آیا تمہیں جبکہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس کے نتائج ہم دونوں کے لیے کتنے خوشگوار ہوں گے۔''

''وہ تو ہے لیکن......میرا مطلب ہے......شبنم......''

''ایک چانس لینا ہے ہمیں۔'' پروین نے کہا۔ ''مجھے بہت امید ہے کہ کام اسی طرح ہوگا جس طرح میں نے سوچا ہے۔''

''بالفرض ایسا نہ ہوا؟''

''میرے دماغ میں پلان بی بھی ہے لیکن پہلے تو پلان اے پر ہی کام کرنا ہوگا۔''

احفاظ کے چہرے سے تذبذب اب بھی ختم نہیں ہوا تو پروین کو جھنجلاہٹ سی ہوئی۔ اس نے اپنی جھنجلاہٹ دبا کر احفاظ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی اور آخر کامیاب ہوگئی......

''اب چلتے ہیں۔'' پروین نے مسکراتے ہوئے انجن اسٹارٹ کیا۔ ''شبنم تمہیں اچانک دیکھ کر خوش ہوجائے گی۔ میں واپس جا کر صبیحہ سے کہہ دوں گی کہ میں نے تمہیں گھر چھوڑ دیا ہے کیونکہ ڈاکٹر نے تمہیں دو دن آرام کا مشورہ دیا ہے۔''

احفاظ اب پروین کے پلان اے پر عمل کرنے کے لیے تیار تو ہوگیا تھا لیکن اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

پروین نے کار اب اس راستے پر ڈال دی تھی جہاں احفاظ کا وہ گھر تھا جہاں وہ شادی سے پہلے رہا کرتا تھا۔

☆☆☆

احفاظ کو دیکھ کر شبنم واقعی بہت خوش ہوئی۔ احفاظ سے اس نے گزشتہ رات ہی کہا تھا کہ صبیحہ کے آنے کے بعد وہ کس طرح ملیں گے اور احفاظ نے اس وقت تو شاید ٹالنے ہی کے لیے کہا ہوگا کہ وہ کوئی تدبیر سوچ لے گا۔ اس وقت اس کے ذہن میں کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

''تمہارے خیال سے مجھے آج بھوک ہی نہیں لگ رہی تھی۔'' شبنم بولی۔ ''ابھی بیٹھی تھی کہ تھوڑا بہت تو کھالوں۔ آؤ تم بھی کھالو۔'' وہ احفاظ کو اندر لے جاتے ہوئے بولی۔

''میں تو ابھی کھا کر آیا ہوں۔''

''اسی حرافہ کے ساتھ؟'' صبیحہ کی بات کرتے ہوئے شبنم کے لہجے سے شدید نفرت ٹپکنے لگتی تھی۔

''ہاں۔'' احفاظ نے کہا۔ ''ظاہر ہے کہ اب تو پھنس ہی گیا ہوں۔''

شبنم ڈرائنگ روم ہی کے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ کھانا وہیں تپائی پر رکھا تھا۔

''کیا بہانہ کرکے آئے ہو؟'' شبنم نے پوچھا۔

''بہانے کرتے کرتے آخر میں کب تک زندگی گزاروں گا۔'' احفاظ اس کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

''جو کیا ہے، وہ تو بھگتنا پڑے گا۔''

''میں نہیں چاہتا کہ اس طرح زندگی گزرے۔''

شبنم پانی پی رہی تھی۔ گلاس منہ سے ہٹانے کے بعد اس نے کہا۔ ''بس کھا چکی۔ ہاں یہ تم نے ابھی کیا کہا؟ تم اس طرح زندگی نہیں گزارنا چاہتے۔''

''ہاں۔ زندگی عذاب بن گئی ہے۔ ضروری ہوگیا ہے کہ میں اس سے چھٹکارا حاصل کرلوں۔''

اچانک شبنم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ احفاظ نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر اس کی طرف تان لیا تھا۔

"یہ...... یہ...... یہ کیا؟" وہ ہکلا گئی۔

"جب راہ کے کسی کانٹے سے پیر لہولہان ہونے لگیں تو وہ کانٹا راستے سے ہٹانا ہی پڑتا ہے۔"

"تمہارے راستے کا کانٹا میں ہوں یا صبیحہ؟" شبنم کے تنفس کی رفتار بڑھ گئی۔ "کیا وہ مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے تم سے!...... اگر گولی ہی مار کر جان بچانا ہے تو تم صبیحہ کو کیوں نہیں مارتے!"

"اس کے پاس دولت ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔"

"محبت سے زیادہ اہمیت دولت کی ہے؟"

"آج کی دنیا میں تو ایسا ہی ہے۔ پھر بھی میں تم سے کچھ محبت تو کرتا ہی ہوں۔ اسی لیے جاننا چاہوں گا کہ مرنے سے پہلے تمہاری آخری خواہش کیا ہے۔"

"پوری کرو گے میری خواہش؟" شبنم کی آواز کانپ رہی تھی۔

"بولو!"

"آخری مرتبہ پیار کرلو مجھے!" شبنم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"بے وقوف سمجھتی ہو تم مجھے؟ میں تمہارے قریب آؤں اور تم مجھ سے ریوالور چھیننے کی کوشش کرو۔"

"ایسا کوئی خیال میرے ذہن میں نہیں ہے احفاظ! میں تو دیوانی ہوں تمہاری۔ اسی لیے صبیحہ کو برداشت کرنا میرے لیے دشوار ہے۔"

"تو میں اس دشواری سے تمہاری جان چھڑائے دیتا ہوں۔" احفاظ نے ریوالور بالکل سیدھا کرلیا۔

"مار دو!" شبنم کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

احفاظ نے ٹریگر دبا دیا۔ بہت ہلکا سا دھماکا ہوا۔ شبنم نے ایسی ہچکی لی جیسے گولی اس کے سینے کے آر پار ہوگئی ہو۔

لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ریوالور سے نکلنے والی گولی اس کے بائیں بازو کے قریب صوفے سے ٹکرائی تھی اور وہ گولی ربر کی تھی۔

احفاظ ہنسنے لگا۔ "پگلی! میں بھلا مار سکتا ہوں تجھے! میری جان ہے تو...... یہ تو بس مذاق کیا تھا میں نے!"

شبنم صوفے پر اس طرح لڑھک گئی جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔

احفاظ ریوالور اپنی جیب میں ڈالتا ہوا لپک کر آگے بڑھا اور شبنم کو اپنی گود میں اٹھا کر بیڈروم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "یہ ٹوائے ریوالور ابھی خریدا تھا بازار سے۔ بالکل اصلی معلوم ہوتا ہے۔ سوچا تم سے ایک شرارت کرلی جائے!"

"ایسی شرارت!" شبنم روہانسی ہوگئی۔ "آدھی جان تو نکل گئی ہے میری۔" اس کا جسم ٹھنڈا پڑا ہوا تھا۔

"چلو سوری کرلیتا ہوں۔" احفاظ نے بیڈروم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"بے جان کردیا ہے مجھے!"

"ابھی زندگی ہی زندگی بھر دوں گا" احفاظ نے اسے بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔ "کپڑے تبدیل کرلوں۔" وہ اپنی الماری کی طرف بڑھا جس میں اس کے کپڑے تھے۔ جیب سے ریوالور نکال کر الماری کے ایک خانے میں ڈالا اور کوٹ اتار کر ہینگر سے لٹکانے لگا۔

شبنم بستر پر بے سدھ پڑی رہی۔ اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ "شاک" کی کیفیت سے ابھی باہر نہیں نکلی تھی۔

احفاظ کپڑے تبدیل کر کے بستر کے قریب آیا اور شبنم کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

"آخر یہ ریوالور" شبنم بولی۔ "تم نے خریدا ہی کیوں؟"

"بڑا خراب وقت چل رہا ہے آج کل!...... کسی وقت بھی کوئی آڑی ترچھی صورت حال سامنے آسکتی ہے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر خرید لایا۔ اس سے کم از کم ڈرایا تو جاسکتا ہے۔"

"لعنت ہے ایسے ریوالور بنانے والوں پر!" شبنم شاک کی کیفیت سے باہر آرہی تھی۔

"ارے نہیں۔ لعنت مت بھیجو ان پر...... ہم جیسے لوگ جو اسلحہ نہیں رکھتے، ان کے لیے غنیمت ہوتی ہیں ایسی چیزیں بھی......"

"میں ابھی تک بے جان سی ہو رہی ہوں۔"

"کہا تو ہے، ابھی جان ہی جان آجائے گی۔"

"مجھے پانی پلا دو......"

احفاظ اٹھ کر اس کے لیے پانی لایا۔ سارا گلاس شبنم نے ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ "ایسا محسوس کر رہی ہوں جیسے ابھی کوئی بھیانک خواب دیکھ کر آنکھ کھلی ہے۔"

"چلو اب معاف کردو میری اس حرکت کو......"

"جی چاہ رہا ہے، گردن دبا دوں تمہاری!" شبنم اسے گھورنے لگی۔ وہ اب "شاک" کی کیفیت سے باہر آچکی تھی۔

"دبا دو۔" احفاظ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن پر رکھ لیے۔

شبنم نے اس کی گردن پر تھوڑا سا دباؤ ڈالا، پھر گردن چھوڑ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔ "تمہیں کیسے مار

سکتی ہوں میں۔زندگی ہو تم میری!''

ان دونوں میں اب پیار محبت کی باتیں ہونے لگیں۔

آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ احفاظ کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔

کال صبیحہ کی تھی...... احفاظ نے ریسیو کی۔ شبنم نے اسپیکر کھولنے کا اشارہ کیا۔

''ہاں صبیحہ!'' احفاظ نے اسپیکر کھولتے ہوئے کہا۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟''

''اتنی جلدی فائدہ تو نہیں ہونا چاہیے لیکن شاید ڈاکٹر کے انجکشن کی وجہ سے نفسیاتی طور پر خود کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔''

''درد کم ہے پیٹ میں؟''

''ہاں۔''

''اچھا میں آدھے پون گھنٹے میں پہنچ رہی ہوں گی۔''

''لیکن ابھی تو......''

''ہاں ابھی دفتر سے اٹھنے کا وقت تو نہیں ہوا لیکن اب کام میں دل نہیں لگ رہا۔ تمہاری فکر لگی ہوئی ہے لیکن دس پندرہ منٹ تو رکنا پڑے گا۔ کچھ چیکس پر دستخط کرنے ہیں۔ اکاؤنٹنٹ چیک بنا رہا ہے۔ دستخط کر کے فوراً روانہ ہو جاؤں گی۔''

''تم خوامخواہ اتنا پریشان ہو رہی ہو۔ کہا تو ہے کہ میں کچھ بہتر محسوس کر رہا ہوں۔ تم اپنا معمول تبدیل نہ کرو۔ وقت پر ہی اٹھنا دفتر سے۔''

''دفتر کے معمولات تم سے زیادہ اہم نہیں ہیں۔ بس میں آتی ہوں پون گھنٹے کے اندر اندر۔'' دوسری طرف سے فوراً ہی رابطہ ختم کر دیا گیا۔

''اب تو جانا ہی پڑے گا جلدی۔ میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ چار بجے تک رکوں گا۔'' احفاظ نے شبنم سے کہا۔

''یہ پیٹ کے درد کا کیا چکر ہے؟'' شبنم نے پوچھا۔

''یہی بہانہ کر کے تو دفتر سے اٹھا تھا کہ ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔ بعد میں یہ اطلاع بھی دے دی کہ ڈاکٹر نے دو دن آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔'' احفاظ نے کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''دو دن آرام کی بات اسی لیے کی تھی کہ کل بھی تمہارے پاس آنے کا موقع مل جائے گا۔ پرسوں کی یا اس کے بعد کی پھر سوچوں گا کچھ۔''

''حرافہ۔'' شبنم نے دانت پیسے اور پھر صبیحہ کو کوسنے لگی۔

احفاظ نے جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے اور مخصوص انداز میں الوداع کہنے کے لیے شبنم کے قریب ہوا۔

شبنم نے دیکھ لیا تھا کہ عجلت کے باعث احفاظ الماری کی دراز سے ریوالور نکالنا بھول گیا تھا۔ شبنم کے دماغ میں اس وقت نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس نے احفاظ کو ریوالور کے بارے میں یاد بھی نہیں دلایا۔

احفاظ کے جاتے ہی شبنم تیزی سے الماری کی طرف گئی۔ احفاظ اپنی الماری کبھی مقفل نہیں رکھتا تھا۔ شبنم نے الماری کھولی اور دراز سے ریوالور نکال کر دیکھا۔

شبنم نے کچھ عجیب سا محسوس کیا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ریوالور ہاتھ میں نہیں لیا تھا۔ اب جو اس کے ہاتھ میں تھا، وہ کھلونا سہی لیکن دیکھنے میں اصلی ہی لگتا تھا۔

''اس سے کم از کم ڈرایا تو جا سکتا ہے۔'' احفاظ کی بات شبنم کے دماغ میں چکرا گئی۔

کچھ خیال آیا تو اس نے موبائل پر احفاظ سے رابطہ کیا۔ اسے توقع تھی کہ وہ ابھی راستے ہی میں ہوگا۔ خیال درست ثابت ہوا۔ احفاظ نے کال ریسیو کی۔ ''خیریت شبنم؟'' اس کے لہجے میں کچھ تعجب تھا۔

''تم اسی لیے پریشان ہو نا کہ صبیحہ کا مہر ادا نہیں کر سکتے؟''

''ہاں۔ یہ اچانک تمہیں اس کا خیال کیوں آ گیا کہ فون کر بیٹھیں۔ ابھی تو تمہارے پاس ہی تھا۔''

''بس آ گیا کسی وجہ سے خیال۔'' شبنم نے کہا۔ ''تم میرے سوال کا جواب دو۔''

''ہاں، بتا تو چکا ہوں تمہیں!...... اس کا مہر ادا کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔''

''اگر وہ تم سے خلع لینا چاہے؟''

''وہ ہرگز نہیں چاہے گی۔''

''اس سے تحریری طور پر درخواست کروائی جا سکتی ہے۔''

''کیسے؟''

''ڈرا دھمکا کر!''

''میں اسے کیسے ڈرا سکتا ہوں؟''

''یہ کام میں کر سکتی ہوں۔'' شبنم مسکرائی۔

''کیسے؟''

''تم نے جس ٹوائے ریوالور سے مجھے ڈرایا تھا، اسی سے کام لے کر۔ وہ تم یہیں بھول گئے ہو۔''

''اوہ، ہاں لیکن...... تم یہ کیسے کرو گی؟''

''بتایا تو ہے کہ ڈرا دھمکا کر اس سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس نے خلع نامے پر دستخط نہ کیے تو میں اسے گولی مار دوں گی۔ خلع کی درخواست ٹائپ کروا کے میں خود اس کے پاس لے جاؤں گی۔''

''کسی مشکل میں نہ پھنس جاؤ شبنم!'' احفاظ نے تشویش ظاہر کی۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اس سے تمہاری جان چھڑوانے کے لیے میں کچھ کروں گی تو ضرور۔'' شبنم نے کہا اور پھر احفاظ کی کسی بات کا انتظار کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

دوسرے دن صبیحہ کو اکیلے ہی دفتر جانا پڑا۔ احفاظ پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ ڈاکٹر نے اسے دو دن آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔

''ویسے تو بالکل ٹھیک ہوں۔'' احفاظ نے اس سے کہا تھا۔ ''لیکن ابھی ناشتے کے بعد پھر کچھ تکلیف محسوس ہو رہی ہے۔ جانا آج بھی ہوگا ڈاکٹر کے پاس۔ وہ آج بھی انجکشن لگائے گا۔ دوا تو اس نے کل بھی دی تھی۔''

''مجھے یہ ڈاکٹر کچھ پسند نہیں آیا۔ وہ انجکشن سے علاج نہیں کر رہا ہے بلکہ میرے خیال میں یہ پین کلر ہے۔ اسے تمہارے پیٹ کا الٹرا ساؤنڈ کروانا چاہیے تھا۔ خیر! آج تو جانا۔ میں پروین کو بھیج دوں گی۔ اسی کے ساتھ چلے جانا لیکن ڈاکٹر کہے یا نہ کہے الٹرا ساؤنڈ آج ہی کروا لینا۔ کل میں تمہیں ایک اور ڈاکٹر کے پاس بھیجوں گی۔ پروین کو بتا دوں گی کہ کل وہ تمہیں کہاں لے جائے۔ الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ لے کر جانا۔''

''ارے معمولی سی بات ہے۔ تم کچھ زیادہ ہی فکر مند رہتی ہو میرے لیے!''

''تمہارے لیے فکر مند نہ ہوں گی تو کیا کسی اور کے لیے ہوں گی!'' صبیحہ نے محبت سے اس کا گال تھپکا تھا۔

ان دونوں میں یہ گفتگو صبیحہ کے دفتر جانے سے پہلے ہوئی تھی۔

احفاظ ذرا دیر لیٹا رہا، پھر کمپیوٹر پر جا بیٹھا۔ صبیحہ کے گھر میں کمپیوٹر بھی تھا اور لیپ ٹاپ بھی لیکن احفاظ اپنا کمپیوٹر بھی اٹھا لایا تھا۔

وقت گزاری کے لیے وہ فیس بک پر گیا اور مختلف پیجز پر گھومتا رہا۔ تنہائی میں وہ عموماً اپنا وقت فیس بک یا ٹیوٹر پر گزارتا تھا لیکن زیادہ رغبت اسے فیس بک سے ہی تھی۔

پونے دو بجے کے قریب پروین اسے لینے آ گئی۔ وقت یہی طے ہوا تھا۔ احفاظ اس کے ساتھ روانہ ہوا۔

''صبیحہ بتا رہی تھی کہ اس نے تمہیں الٹرا ساؤنڈ کا مشورہ دیا ہے۔'' پروین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس نے مجھے ایک اور ڈاکٹر کا بتایا ہے اور کہا ہے کہ اگر تمہاری طبیعت ٹھیک بھی ہو جائے تو کل دوسرے ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔ ابھی تو میں لیبارٹری لے کر چل رہی ہوں۔ الٹرا ساؤنڈ تو کروانا ہی پڑے گا۔ اندیشہ تو نہیں کہ وہ دیکھنے کے لیے تم سے الٹرا ساؤنڈ کی رسید مانگے گی لیکن احتیاط کرنا اچھی بات ہے۔''

''کیا مصیبت ہے۔'' احفاظ بڑبڑایا۔

''اچھا!'' پروین ہنسی۔ ''الٹرا ساؤنڈ مصیبت ہے؟''

''بات کچھ اور ہے۔ شبنم کا فون آیا تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ ڈھائی بجے تک پہنچ جاؤں گا اس کے پاس! اب الٹرا ساؤنڈ کرانے میں کچھ وقت تو لگے گا۔''

''بہانہ کر دینا کہ ٹائر برسٹ ہو گیا تھا۔''

''پہیا تبدیل کرنے میں دس منٹ لگتے ہیں۔''

''یہ بہانہ بھی کر دینا کہ اسٹپنی میں جو ٹائر رکھا تھا، وہ بھی نہ جانے کب سے خراب پڑا تھا۔ صبیحہ اپنی کاروباری الجھنوں میں اسے بنوانا بھول گئی ہوگی۔ تمہیں پنکچر لگوانے میں دیر ہوئی ہے۔''

''بہانے ہی بہانے!'' احفاظ نے ٹھنڈی سانس لی۔

''کامیابی حاصل کرنے تک یہ سب تو ہوگا۔''

''فون پر تمہیں بتا دیا تھا میں نے! بڑی صفائی سے وہ کام کر ڈالا جو تم چاہتی تھیں۔''

''اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا جنون بڑھایا جائے، تبھی وہ ریوالور کام میں لانے پر تیار ہوگی۔''

''اس کی کیا صورت ہوگی؟''

''موقع دیکھنا پڑے گا اس کے لیے۔''

''موقع کب آئے گا؟''

''سوچ رہی ہوں اس کے بارے میں۔ تم سے زیادہ جلدی مجھے ہے۔''

''تمہارا منصوبہ کامیاب ہونے کی صورت میں قانون میرے لیے بھی پریشان کن ہو سکتا ہے۔''

''کیسے؟''

''شبنم بتائے گی تو پولیس کو کہ وہ اسے ٹوائے ریوالور سمجھ رہی تھی جبکہ تم نے بڑی چالاکی سے ریوالور بدل دیا تھا۔ نقلی کی جگہ اصلی رکھ دیا تھا۔''

''اس کا کوئی ثبوت نہیں دے سکتی وہ۔ تم اس کا بیان جھٹلا سکتے ہو۔''

''پریشانی تو ہوگی۔''

''زندگی سنوارنے کے لیے تھوڑی بہت کیا، زیادہ پریشانیاں بھی جھیلنا پڑتی ہیں کبھی کبھی۔''

انہی باتوں میں لیبارٹری آ گئی۔ ان کے پاس کسی ڈاکٹر کا ڈسکرپشن تو تھا نہیں اس لیے کہا گیا کہ پیٹ میں کبھی کبھی درد ہوتا ہے اس لیے بس صرف اپنا اطمینان کرنا ہے کہ

کوئی خاص گڑبڑ تو نہیں......

جب وہ لیبارٹری سے لوٹ رہے تھے تو احفاظ کے موبائل پر شبنم کی کال آگئی۔ ''کہاں ہو اب تک؟'' وہ جھنجلائی ہوئی تھی۔

''بس پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔'' احفاظ نے جواب دیا۔ ''راستے میں ہوں۔ دیر اس لیے ہوگئی کہ......'' اس نے وہی بہانہ کردیا جو پروین نے سمجھایا تھا۔

'لعنت ہے اس حرافہ پر......'' شبنم نے شاید دانت پیسے تھے۔ ''اپنی گاڑی کی اسٹپنی کا بھی خیال نہیں رکھتی وہ۔''

''حرافہ جو ٹھہری۔'' احفاظ ہنسا۔

''اچھا بس جلدی آؤ۔'' دوسری طرف سے رابطہ منقطع کردیا گیا۔

''حرافہ؟'' پروین نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں۔'' احفاظ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''صبیحہ کو وہ حرافہ ہی کہتی ہے۔''

''دل کے پھپھولے۔'' پروین ہنسی۔ ''اور یہ پھپھولے پھٹنا بھی چاہئیں جتنی جلدی ممکن ہو۔''

''تم ہی بتاؤ گی اس کی تدبیر۔''

''ذہن میں تو کچھ ہے لیکن ابھی اس پر مزید غور کر رہی ہوں۔''

''اور یہ تم بتاؤ گی نہیں کہ بات صرف دولت کے حصول کی نہیں، کچھ اور بھی ہے جو تم نے مجھ سے ابھی تک چھپا رکھا ہے۔''

''وہ بتانے کا وقت بھی اب قریب ہی سمجھو۔''

''کتنا قریب؟''

''جتنی جلدی شبنم کے جنون کو ہوا دی جاسکے۔''

''پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ کب ہوا دی جاسکے گی۔''

''شاید۔'' پروین نے کہا۔ ''کل......''

اس طرح احفاظ کی ذہنی الجھن ختم نہیں ہوسکی اور اس کا گھر آگیا۔ وہاں سے پروین ٹیکسی لے کر دفتر روانہ ہوگئی۔

احفاظ کا جو وقت شبنم کے ساتھ گزرا، اس میں شبنم کا یہ گلہ شدید رہا کہ اس کی راتیں ویران ہوگئی ہیں۔

''مجھے یہ کرنا ہی پڑے گا کہ تمہیں اس حرافہ سے نجات دلاؤں۔''

''تم نے جو کچھ سوچا ہے، اس میں ڈر یہ ہے مجھے کہ تم کسی پریشانی میں نہ پڑ جاؤ......''

''صبیحہ سے تمہاری جان چھڑانے کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہوں لیکن تم میری ہمت بڑھانے کے بجائے مجھے ڈرا رہے ہو۔''

''ہرگز نہیں شبی!'' احفاظ نے جلدی سے کہا۔ ''میں صرف تمہارے لیے پریشان ہو رہا ہوں ورنہ...... میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اس سے میری شادی ہوگئی لیکن محبت مجھے اب بھی تم سے ہی ہے۔''

''تو پھر تمہیں میری ہمت بڑھانی چاہیے تاکہ ہم دونوں کے بیچ میں کوئی تیسرا نہ رہے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔'' احفاظ مسکرایا۔ ''اب میں اس بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جسے تم میری طرف سے اپنی ہمت شکنی کہہ سکو۔''

احفاظ نے شبنم کے ساتھ سوا چار بجے تک کا وقت گزارا۔ اس کے بعد وہ اس لیے نہیں رک سکتا تھا کہ پانچ بجے تک صبیحہ گھر پہنچ جاتی۔

☆☆☆

صبیحہ پانچ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ گھر پہنچ گئی۔

احفاظ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ صبیحہ کو دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔ ''آج میں نے ہوٹل میں ہی کھانا کھالیا۔ بہت دن سے ہوٹل کا مزہ بھولا ہوا تھا۔''

''تو یہ یاد کرنا آج ہی ضروری تھا۔'' صبیحہ نے خفگی سے کہا۔

''کیوں......آج کیا بات ہے؟''

''تمہارا پیٹ ٹھیک نہیں ہے۔''

''آج کا انجکشن لگنے کے بعد تو میں بالکل ٹھیک محسوس کر رہا ہوں۔ کھانے کے بعد بھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔''

''پھر بھی......آخر یہ تو معلوم ہونا چاہیے کہ تکلیف کسی خاص وجہ سے تو نہیں ہوئی تھی۔ کل تمہیں ایک اور ڈاکٹر کے پاس بھیج رہی ہوں۔ پروین بتا رہی تھی کہ تمہارا الٹراساؤنڈ تو ہوگیا ہے۔''

''ہاں۔''

''اگر میں تمہاری طرف سے بالکل مطمئن ہوتی تو کل ایک شاندار جشن مناتی۔''

''وہ کس سلسلے میں؟''

''کل تمہاری سالگرہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ نکاح نامے پر تم نے اپنے یوم ولادت کی تاریخ کیا لکھوائی تھی۔''

''اوہ!'' احفاظ ہنسا۔ ''میں تو برسوں پہلے بھول چکا ہوں کہ سالگرہ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔''

''اب کسی سال نہیں بھولو گے۔ میں جو موجود رہوں

گی تمہیں یاد دلانے کے لیے۔''

اس وقت احفاظ کے ذہن میں بیک وقت دو خیال آئے۔ ایک تو یہ کہ پروین کا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جانے کی صورت میں صبیحہ اگلے سال زندہ ہی نہیں ہوتی۔ دوسرا خیال اسے یہ بھی آیا کہ وہ اپنی تینوں ہی بیویوں کے معاملے میں خوش قسمت رہا ہے۔ تینوں ہی اسے شدت سے چاہتی تھیں۔ یہ ایک الگ بات تھی کہ شبنم کے جنونی مزاج کے باعث وہ اکثر بہت پریشان ہو جاتا تھا۔

''فی الحال میں تمہارے لیے ایک تحفہ تو لے ہی آئی ہوں۔'' صبیحہ نے ایک چھوٹا سا پیکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ ''کوئی بھی خوب صورت گھڑی دیکھتی ہوں تو خرید لیتی ہوں۔ بہت گھڑیاں ہیں میرے پاس۔''

''وہ تو میں دیکھتا ہوں۔ روزانہ ہی تمہاری کلائی پر ایک نئی گھڑی ہوتی ہے۔ تو یہ اپنے خزانے ہی سے دے رہی ہو!'' احفاظ نے ہنستے ہوئے ڈبا کھولا۔ ''لیکن یہ تو مردانہ گھڑی ہے۔ ہاں خوب صورت بہت ہے۔''

''اسی لیے پسند آنے کے باوجود میں نے نہیں خریدی تھی لیکن آج میں نے دفتر سے ہی دکاندار کو فون کر دیا تھا کہ یہ گھڑی وہ مجھے دفتر میں پہنچا دے کیونکہ زیادہ تر گھڑیاں اسی سے خریدتی رہی ہوں۔ اس لیے گویا اس کی مستقل گاہک ہوں۔ اسی لیے وہ خود دفتر آ کر مجھے دے گیا تھا۔ اتفاق سے پروین بھی تمہیں چھوڑ کر اسی وقت واپس آئی تھی۔ گھڑی اسے بھی بہت پسند آئی۔''

''بہت قیمتی معلوم ہوتی ہے!'' احفاظ نے کہا۔

''محبت سے زیادہ قیمتی کچھ نہیں ہوتا۔''

''یہ گھڑی میں کل ہی باندھوں گا۔''

''اب یہ تمہاری ہے، جب چاہو استعمال کرو۔'' صبیحہ نے اسے پیار بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت احفاظ کے ذہن میں یہ سوال اٹھا کہ ایسی محبت کرنے والی بیوی کو قتل کرانے کے لیے وہ پروین کا آلۂ کار کیوں بن رہا ہے؟

''اچھا میں کپڑے تبدیل کر لوں۔'' صبیحہ اٹھی۔

احفاظ اس کی، پروین کی اور شبنم کی محبت کا موازنہ کرنے لگا۔ اس کی تاریخِ پیدائش پروین اور شبنم کو بھی معلوم تھی مگر ان دونوں میں سے کسی کو بھی خیال نہیں آیا تھا کہ کل اس کا یومِ پیدائش ہے۔

جتنی دیر میں صبیحہ نے کپڑے تبدیل کیے، اسی اثنا میں ملازمہ نے چائے کمرے میں پہنچا دی۔ یہ صبیحہ کا معمول تھا۔ دفتر سے آتے ہی چائے پیتی تھی۔

چائے پینے کے دوران میں صبیحہ نے احفاظ سے کہا۔ ''پروین بتا رہی تھی کہ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ آج شام ہی کو مل جائے گی۔''

''ہاں۔ رسید پروین ہی نے لے لی ہے۔ وہ......''

''دکھائی تھی اس نے مجھے۔'' صبیحہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''شام کو وہ رپورٹ لے لے گی اور پھر اپنے گھر چلی جائے گی۔ کل بھی جانا تو تمہیں اسی کے ساتھ ہوگا۔ یہ ڈاکٹر صاحب تین بجے سے پانچ بجے تک بیٹھتے ہیں۔ میں پروین کو ڈھائی بجے دفتر سے روانہ کر دوں گی۔ ہاں! اسی نے بتایا تھا کہ تمہارے موجودہ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ احتیاطاً تم کل اور کر لو آرام۔''

''اب اس کی ضرورت تو نہیں ہے۔''

''آرام کرنا بہرحال اچھی بات ہے۔ جب تک پروین آتی ہے، اس وقت تک تم بور تو نہیں ہوتے ہو نا؟ تمہی نے بتایا تھا کہ فیس بک پر دل بہلاتے رہتے ہو۔''

''ہاں۔'' احفاظ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ فیس بک بھی جادو ہے ایک۔ کھو جاتا ہے آدمی اس میں لیکن میں وہ سارا وقت تو فیس بک پر نہیں گزارتا۔ بیچ میں گھنٹے آدھے گھنٹے کا وقفہ بھی آ جاتا ہے۔''

''ہاں، زیادہ دیر تک بیٹھے رہنے سے تو آنکھیں دکھنے لگتی ہوں گی۔ اور ہاں! کل تمہاری سالگرہ ہم ایک ریسٹورنٹ میں منائیں گے۔ بس میں، تم اور پروین ہوں گے۔ تجویز یہ پروین ہی کی ہے۔''

''جیسا تم کہو۔'' احفاظ نے کہا، پھر مسکرا کر بولا۔ ''تمہاری سالگرہ کب ہوتی ہے؟''

''یوم پیدائش تو تم نکاح نامے پر دیکھ لینا۔''

''مجھے اس کا دھیان ہی نہیں آیا تھا۔''

اس قسم کی باتوں میں وقت گزرتا رہا۔ ساڑھے سات بجے پروین کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ رپورٹ اس نے لے لی ہے اور اپنے گھر جا رہی ہے۔

''میں وہاں آتی۔'' پروین نے فون پر کہا تھا۔ ''لیکن آج انکل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے واپس گھر ہی جاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا اس سے۔ کیا ہوا تمہارے انکل کو؟''

''کچھ خاص نہیں۔ حرارت ہو گئی ہے۔ کبھی کبھی ہو جاتی ہے جب وہ کوئی ٹھنڈی چیز زیادہ کھا لیتے ہیں۔''

''احفاظ صاحب کو بتادیا ہے کل کی پارٹی کا؟''

''بتادیا ہے۔'' صبیحہ نے جواب دیتے ہوئے مسکرا کر احفاظ کی طرف دیکھا۔

''کیا بتادیا ہے؟'' احفاظ پوچھ بیٹھا۔

''کل کی پارٹی کے بارے میں۔'' صبیحہ نے موبائل بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

پھر کھانا کھانے سے پہلے وہ دونوں کچھ دیر لان میں ٹہلتے رہے، پھر کھانا کھا کر انہوں نے خواب گاہ کا رخ کیا۔

☆☆☆

صبح صبیحہ کے دفتر جانے کے بعد احفاظ نے شبنم کو فون کیا۔

''جانِ من! آج میں دو ڈھائی بجے نہیں آسکوں گا۔ کسی اور ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔ وہ بیٹھتا ہی ساڑھے تین بجے ہے۔''

''دوسرے ڈاکٹر کی بات کیوں نکلی؟''

احفاظ نے سب بتادیا۔ جواب میں شبنم صبیحہ کی شان میں قصیدے پڑھنے لگی جو ایسے موقعوں پر وہ کرتی ہی تھی۔

''مجبوری ہے جانِ من!'' احفاظ نے کہا۔

''ختم کرنی ہی پڑے گی یہ مجبوری۔'' شبنم کی آواز ایسی تھی جیسے اس نے دانت پیسے ہوں، پھر اس نے مزید کچھ کہے سنے بغیر رابطہ ختم کردیا۔

یہی تو کرنا ہے، احفاظ نے سوچتے ہوئے موبائل بند کیا، مجبوری ہی ختم کرنے کے لیے پاپڑ بیلے جارہے ہیں۔

وہ بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ کب کب کیا کیا ہوگا؟ لیکن یہ سوچنا بس سوچنے ہی کی حد تک تھا۔ وہ بھی اندازہ نہیں لگاسکا تھا کہ کب کیا ہوگا۔ یہ صرف پروین ہی جانتی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ بستر سے اٹھ کر کمپیوٹر پر جابیٹھا جو اس کی عادت تھی۔ نیوز فیڈ پر کچھ چیزیں دیکھنے کے بعد ٹائم لائن پر گیا اور ٹھیک اسی وقت ''ان باکس'' سامنے آگیا جس پر پروین کا نام تھا۔ اس کے نچلے حصے میں یہ تحریر موجود تھی۔

''مجھے خیال تھا کہ تم نے کمپیوٹر سنبھال لیا ہوگا۔''

''تم اس وقت فیس بک پر کیسے آگئیں؟'' احفاظ کو واقعی حیرت ہوئی تھی۔ ''کیا صبیحہ کے کمپیوٹر پر ہو؟''

''اور کہاں ہوسکتی ہوں اس وقت!''

''صبیحہ اب پہنچنے ہی والی ہوگی۔''

''اگر اسے پہنچنا ہوتا تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس پر اسے کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ میں اس کا کمپیوٹر استعمال کرلیتی ہوں بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ میری موجودگی میں اگر وہ کسی کام میں مصروف ہوتی ہے تو مجھ سے کہہ دیتی ہے کہ میں کمپیوٹر پر وقت گزاروں، یعنی فیس بک پر!''

''یہ تم نے کیا کہا کہ اسے پہنچنا ہوتا تو!''

''ہاں۔ آج وہ سیدھی دفتر نہیں آئے گی۔ ایک پارٹی سے ملنا ہے اسے۔ مجھے بھی اس کے ساتھ ہی جانا ہوتا ہے ایسے موقعوں پر لیکن دفتر میں کچھ ایسے کام تھے کہ اس کی عدم موجودگی میں میری موجودگی ضروری تھی۔ کام کوئی نہیں تھا لیکن کسی کو آنا ہے جس سے صبیحہ بات کرسکتی ہے یا میں۔ وہ حضرت ابھی پہنچے نہیں تو میں نے کمپیوٹر سنبھال لیا۔ یہ توقع بھی تھی کہ تم بھی فیس بک پر ہوگے۔''

''تنہائی میں اب مجھے یہی دو کام رہ گئے ہیں۔ فیس بک پر وقت گزاروں یا سوچتا رہوں کہ تم نے صبیحہ کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کیوں کی ہے۔ بظاہر تو تم دونوں کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ صبیحہ تمہیں پسند بھی بہت کرتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں۔'' تحریری گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ ''تعلقات بہت اچھے ہیں تو اس میں میری ہی کوششوں کا دخل ہے۔''

''ابھی شبنم کو فون کیا تھا میں نے!''

''کیوں؟''

''یہی بتانے کے لیے کہ آج دو ڈھائی بجے نہیں آسکوں گا۔ یہ جان کر وہ بہت کھسیائی تھی۔ میں نے اپنی مجبوری کا رونا رویا تھا۔ اس پر اس نے دانت پیسے تھے اور کہا تھا کہ یہ مجبوری ختم کرنا ہی پڑے گی۔''

''اس کا یہ کہنا تو ہمارے حق میں ہے۔''

''ہاں، لیکن کبھی کبھی یہ بڑا عجیب سا لگتا ہے کہ چند دن بعد وہ اس دنیا میں نہیں ہوگی۔''

''اور ہم دونوں میں سے کوئی اس کا قاتل نہیں ہوگا۔ کتنے مزے کی بات ہے۔''

''ہاں اگر شبنم ڈرانے دھمکانے کے چکر میں جھنجلائی اور اس نے ٹریگر دبادیا۔''

''کام یقیناً تم نے بڑی چابک دستی سے کیا ہے۔ وہ اسے کھلونا ریوالور ہی سمجھ رہی ہے۔''

''تم نے اتنے یکساں ریوالور کیسے حاصل کرلیے؟ ایک نقلی ایک اصلی اور دونوں بالکل ایک جیسے۔''

''خاصی تگ ودو کرنی پڑی تھی مجھے!''

''تم نے اس کے جنون کو ہوا دینے کے لیے اپنے منصوبے پر اچھی طرح غور کرلیا؟ تم نے کہا تھا ناکہ آج بتاؤ گی مجھے۔''

''ہاں۔''
''تو بتاؤ کیا سوچا ہے؟''
''ملاقات ہونے پر ہی بتاؤں گی۔''
''اب یہ بھی بتا ہی دو کہ آخر تم نے صبیحہ کو ختم کرنے کا فیصلہ کیوں کیا ہے؟''
جواب میں کارٹون کے ذریعے ہنسنے کا تاثر دے کر لکھا گیا۔''میں ختم نہیں کروں گی اسے، شبنم کرے گی یہ کام۔''
''جس میں تم نے بہت اہم کام کیا ہے۔''
''وہ جو ریوالور میں نے اس تک پہنچایا ہے۔''
''ہاں۔''
پھر احفاظ نے کچھ لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ سامنے دوسری تحریر آگئی۔''ویٹ!''
احفاظ لکھتے لکھتے رک گیا۔ اس نے یہی اندازہ لگایا کہ کمرے میں کوئی آگیا تھا اس لیے اس سے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ پھر جلد ہی یہ تحریر سامنے آگئی۔''وہ صاحب آگئے ہیں جن سے مجھے ملنا ہے اس لیے اب میں کمپیوٹر بند کر رہی ہوں۔ چار بجے تک آؤں گی۔''
''چلو میں بھی بند کرتا ہوں۔'' احفاظ نے بھی کمپیوٹر بند کر دیا۔ جو گفتگو ہوئی تھی، اس کے بعد اب فیس بک پر اس کا دل نہیں لگتا۔ اس کے دماغ میں پھر یہی سوال کھڑا ہو گیا تھا کہ نہ جانے کب، کیا ہوگا؟
دوپہر کے کھانے کا وقت آتے آتے وہ بستر پر ہی لیٹا اور سوچتا رہا۔ گزشتہ شام سے ہی اس کے دل میں صبیحہ کے لیے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ شاید اس کا سبب وہ گھڑی ہو جو صبیحہ نے اسے بڑی محبت سے دی تھی۔ سالگرہ کا تحفہ!
کھانا کھانے کے بعد بھی یہی خیال اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے کہ صبیحہ کا فون آگیا۔
''کیا ہو رہا ہے احفاظ...... کھانا کھا لیا؟'' اس نے پوچھا۔
''دفتر میں بیٹھے بیٹھے یہ کیا خیال آگیا تمہیں کہ میں نے کھانا کھا لیا یا نہیں۔'' احفاظ نے ہنس کر کہا۔
''دراصل میں ابھی کھانا کھانے بیٹھی تو اچانک خیال آگیا تم سے پوچھنے کا کہ آج تو کھانا کھانے کے بعد تکلیف نہیں ہوئی پیٹ میں؟''
''نہیں۔ میں نے تو شاید صبح بھی تمہیں بتایا تھا کہ اب میں ٹھیک ہوں۔''
''اچھی بات ہے یہ تو لیکن ڈاکٹر کے پاس تم ضرور جانا۔ میں نے تمہاری الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ پروین سے لے کر دیکھی تھی۔ میرا خیال ہے کہ یہ رپورٹ بھی کسی خرابی کی نشاندہی نہیں کر رہی ہے لیکن بہرحال میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ کوئی ڈاکٹر ہی یہ رپورٹ دیکھ کر حتمی طور پر کچھ بتا سکتا ہے۔ دراصل میں اس بات پر یقین رکھتی ہوں کہ جسم میں کوئی بھی گڑبڑ ہو تو اس کا کوئی سبب ضرور ہوتا ہے۔ اسی لیے چاہتی ہوں کہ ڈاکٹر سے تم مل ہی لو۔''
''پروین کو بھیج دینا وقت پر۔''
''آج وہ خاصی بور ہوئی ہے۔'' صبیحہ نے ہنس کر کہا۔
''کیوں؟''
''میں دو گھنٹے دیر سے دفتر آئی تھی۔''
''کیوں؟ یہاں سے تو تم وقت پر نکل گئی تھیں۔''
''مجھے کاروباری سلسلے میں کسی سے ملنے جانا تھا۔ وہیں گئی تھی۔ دفتر میں پروین کی موجودگی ضروری تھی۔ میں نہ ہوں تو وہ بور ہوتی ہے۔''
''ہوں، اچھا تم کھانا کھاؤ۔ میری طرف سے بےفکر رہو۔''
دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔
اس وقت احفاظ کو پھر صبیحہ کی محبت کا خیال آیا۔ صرف پیٹ کے درد کی وجہ سے وہ اس کے لیے فکرمند تھی۔
صرف دولت کے لیے اسے کھو دوں؟ احفاظ نے سوچا۔ اس دولت میں تو شوہر کی حیثیت سے اس کا بھی حصہ تھا۔ ناممکن تھا کہ صبیحہ اس کی کوئی خواہش پوری نہ کرتی۔ اگر وہ اس سے کہتا کہ وہ اس کا ذاتی اکاؤنٹ کھلوا دے تو بھی وہ انکار نہ کرتی۔
احفاظ نے فیصلہ کر لیا کہ پروین نے اگر اپنے اس منصوبے کی کوئی ٹھوس وجہ نہ بتائی تو وہ اب اس کا ساتھ نہیں دے گا۔
مقررہ وقت پر پروین اسے لینے آگئی۔ وہ تیار ہی تھا، فوراً اس کے ساتھ روانہ ہو گیا۔
''کیا بات ہے...... کچھ فکرمند سے ہو؟'' پروین بولی۔
''ہاں۔'' احفاظ نے کہا۔''اس میں تو تمہیں کوئی شبہ نہیں ہوگا کہ میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں لیکن صبیحہ بھی میرے لیے اچھی بیوی ثابت ہوئی ہے۔ برا مت ماننا پروین! میں اب اس منصوبے میں تمہارا ساتھ ہرگز نہیں دوں گا اگر تم نے مجھے اس کی کوئی ٹھوس وجہ نہ بتائی۔ تم جو راز اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہو، وہ تمہیں آج ہی بتانا پڑے گا۔ میں اب ہر صورت میں جاننا چاہتا ہوں کہ صبیحہ کو ختم کرنے کا تمہارے پاس کوئی ٹھوس جواز ہے یا نہیں۔ صرف دولت کے حصول کے لیے میں اس منصوبے میں تمہارا ساتھ نہیں دوں گا۔''

پروین چپ رہ گئی۔ ڈرائیونگ وہی کر رہی تھی۔
ایک منٹ کی خاموشی کے بعد احفاظ پھر بولا۔
''جواب نہیں دیا تم نے!''
''ٹھیک ہے۔ میں بتا دوں گی تمہیں۔''
''تو بتاؤ۔''
''ذرا لمبی کہانی ہے۔ اس کی سچائی کا ثبوت بھی دکھاؤں گی تمہیں۔ ڈاکٹر سے مل لو۔ اس کے بعد واپسی پر!''
''ہاں اتنا انتظار تو میں کر سکتا ہوں۔''
پروین خاموش رہی۔
''راستہ کتنی دیر کا ہے؟'' احفاظ نے پوچھا۔
''ہم اب دس منٹ میں وہاں پہنچ جائیں گے۔''
اس کے بعد پھر خاموشی رہی۔ پروین بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔
احفاظ بولا۔ ''برا مان گئیں تم میری باتوں کا۔''
''نہیں۔'' پروین مسکرائی۔ ''میں سوچنے لگی تھی کہ اب تم شاید صبیحہ کو مجھ سے زیادہ چاہنے لگے ہو۔''
''یہ بات نہیں پروین۔ میں بس یہ چاہتا ہوں کہ بعد میں میرا ضمیر مجھے ملامت نہ کرے۔ مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ صبیحہ سے تمہارے عناد کا سبب مضبوط ہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' پروین نے کہا۔ ''ڈاکٹر سے ملنے کے بعد واپسی پر تمہیں سب بتا دوں گی۔''
احفاظ نے سر ہلا دیا۔
ڈاکٹر نے رپورٹ دیکھنے کے بعد کہا۔ ''یہ تو بالکل ٹھیک ہے احفاظ صاحب! کوئی خرابی نہیں ہے آپ کے پیٹ میں۔''
''شکایت بھی یہی تھی۔''
''تو پھر ایک ہی بات ہو سکتی ہے۔'' احفاظ نے کہا۔ ''کھانے کی کوئی چیز وقتی طور پر نقصان دے گئی تھی۔''
''یہی ہو سکتا ہے۔ اگر آئندہ کبھی ایسا ہو تو مجھ سے بلا تاخیر مل لیجیے گا۔'' ڈاکٹر نے جواب دیتے ہوئے اپنے موبائل پر کوئی نمبر بھی ملایا تھا۔
''تو اب ہمیں اجازت؟'' پروین کرسی سے اٹھی۔
اسی وقت ڈاکٹر موبائل پر کہنے لگا۔ ''کچھ بھی نہیں ہے صبیحہ صاحبہ! آپ بہت فکرمند ہو گئی تھیں ان کے لیے۔ اب میں نے انہیں ایک مناسب مشورہ دے دیا ہے۔'' پھر وہ کچھ رک کر بولا۔ ''انہیں آرام کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''
رابطہ منقطع کر کے ڈاکٹر نے پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے کچھ کہا تھا۔ فون کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے میں سن نہیں سکا۔ شاید آپ کی آواز بھی دھیمی تھی۔''
''بس یہ کہا تھا کہ اب ہمیں اجازت ہے؟''
''ہاں ہاں، بالکل۔ اطمینان سے جائیں۔ آپ کو نہ کسی دوا کی ضرورت ہے، نہ آرام کرنے کی۔''
احفاظ اور پروین وہاں سے اٹھ آئے۔
''اب بتاؤ!'' کار میں بیٹھتے ہی احفاظ نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا نا کہ واپسی میں بتاؤ گی۔''
''بیس منٹ اور انتظار کرو۔ میں تمہیں کسی جگہ لے جا رہی ہوں۔''
''کسی جگہ...... کیوں؟''
''وہیں بتاؤں گی۔ تم اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لو گے۔''
''کیا دیکھ لوں گا؟''
پروین کے جواب دینے سے پہلے ہی احفاظ کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے اس خیال سے اپنا موبائل نکالا تھا کہ کال شبنم کی ہو گی لیکن وہ صبیحہ تھی۔
''ڈاکٹر کی بات سے اطمینان ہوا ہے مجھے۔'' وہ بولی۔ ''اب تم دفتر آ جاؤ۔ آرام کرنے کے لیے گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''کچھ دیر ہو جائے گی مجھے آنے میں!''
''کیوں؟''
''لو پروین سے بات کرو۔'' احفاظ نے موبائل پروین کی طرف بڑھایا۔
پروین نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔ ''مجھے اچانک اپنا ایک ذاتی کام یاد آ گیا ہے صبیحہ!...... میں نے سوچا وہ کرتی چلوں۔ بس آدھے گھنٹے کی تاخیر ہو گی۔''
دوسری طرف سے کچھ سن کر پروین نے موبائل بند کر کے احفاظ کو لوٹا دیا۔ احفاظ نے پوچھا۔ ''کیا کہا اس نے؟''
''چلو ٹھیک ہے۔ بس اتنا ہی کہا اور لائن کاٹ دی۔''
''اب ایک نیا مسئلہ بھی سامنے آ رہا ہے۔''
''وہ کیا؟''
''میں شبنم کے پاس نہیں جا سکوں گا۔ وہ بہت کھسیائے گی۔''
''اچھا ہے۔'' پروین نے کہا۔ ''اس کی کھسیاہٹ جنون میں بھی بدل سکتی ہے۔''
''ہوں۔'' احفاظ نے سر ہلایا۔
پندرہ منٹ بعد کار ایک ایسی عمارت کے احاطے میں داخل ہوئی جس کا نام پڑھ کر احفاظ کو حیرت ہوئی۔ وہ نفسیاتی امراض کا اسپتال تھا۔

"یہاں؟" احفاظ حیرت سے بولا۔

"ہاں۔"

"لیکن......"

"اب فوراً کوئی سوال نہ کرو۔ میں تمہیں کچھ دکھاؤں گی۔ اس کے بعد کرنا سوالات۔"

احفاظ نے خاموشی اختیار کرلی۔

اسپتال میں داخل ہونے کے بعد پروین جس کمرے کے سامنے رکی، اس کے دروازے پر "ایڈمنسٹریٹر" کے نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

"بس ایک منٹ!" پروین بولی۔ "تم یہیں رکو۔ میں ایڈمنسٹریٹر سے مل کر آتی ہوں۔ یہاں ہمیں ایک نفسیاتی مریض سے ملنا ہے جس کے لیے ایڈمنسٹریٹر کی اجازت ضروری ہے۔"

احفاظ نے سر ہلا دیا۔ پروین کمرے میں چلی گئی۔

احفاظ کا موبائل ایک بار پھر بج اٹھا۔ اس نے اس یقین سے موبائل نکالا کہ یہ کال تو شبنم ہی کی ہوگی۔ اس کا خیال درست ثابت ہوا۔

"کتنی دیر لگاؤ گے آنے میں؟" شبنم جھنجلائی ہوئی تھی۔

"اب آج تو میں نہیں آسکوں گا شبنم!"

"کیا؟" اس مرتبہ شبنم کی آواز میں غراہٹ سی تھی۔

جواب میں احفاظ نے اسے وجہ بتا دی، پھر کہا۔ "ابھی تو میں ایک کام سے راستے میں رک گیا ہوں، پھر دفتر جانا ہوگا۔"

"یعنی اب......"

"غلط نہ سمجھو۔" احفاظ نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ "میں دو ایک روز میں کچھ سوچ لوں گا۔"

شبنم نے مزید کوئی بات کیے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت پروین کمرے سے نکل آئی۔ اس نے احفاظ کو موبائل جیب میں رکھتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ بولی۔ "کس کو فون کیا ہے...... شبنم کو؟"

"نہیں، اسی کا فون آیا تھا۔ اس بات پر آگ بگولا ہوگئی ہے کہ میں آج اس سے ملنے نہیں آسکوں گا۔"

پروین نے سر ہلایا اور کچھ سوچتی ہوئی ایک طرف بڑھنے لگی۔

جلد ہی وہ ایک ایسے کمرے میں تھے جہاں ایک بستر کے علاوہ کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ روشنی بھی مدھم تھی۔ بستر پر دیوار سے ٹیک لگائے ایک عورت بالکل گم صم بیٹھی خلا میں تک رہی تھی۔ اس نے احفاظ اور پروین کی آہٹ پر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی۔

"یہ...... کون ہیں۔ تم مجھے کہاں لے آئیں پروین؟"

"اندازہ لگاؤ یہ خاتون کون ہوسکتی ہے۔ کیا مجھ میں ان کی شباہت نہیں ہے؟" پروین کی آواز فرطِ جذبات سے بھرا گئی۔

"اوہ!" احفاظ نے غور سے خاتون کی طرف دیکھا۔

"کیا یہ تمہاری ماں ہیں پروین؟"

"ہاں۔" پروین کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک گئے۔

☆☆☆

پروین کے باپ کا نام احسان ملک اور ماں کا نام وحیدہ خانم تھا۔ وحیدہ خانم ایک پختون فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔ بہت خوب صورت تھیں۔ احسان ملک ان پر فریفتہ ہوگئے تھے۔ وحیدہ خانم نے بھی انہیں پسند کرلیا تھا۔ ان کے گھر والے کسی برادری میں ان کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن وحیدہ خانم نے کسی طرح اپنے والدین کو مجبور کر دیا کہ ان کی شادی احسان ملک سے ہی ہوگی، چنانچہ شادی تو ہوگئی لیکن وحیدہ خانم کے والدین نے اپنی بیٹی سے ہمیشہ کے لیے تعلق ختم کرلیا۔ بعد میں وحیدہ خانم نے انہیں منانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکیں۔

ڈیڑھ سال بعد انہوں نے پروین کو جنم دیا۔

احسان ملک کے مالی حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے، وہ ایک کمپنی میں جاب کرتے تھے پھر زندگی میں انہیں ایک موقع ملا اور ان کے باس کا ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوگیا۔ باس کی بیوی بڑی رنگین مزاج خاتون تھیں۔ رفتہ رفتہ احسان ملک سے ان کے تعلقات استوار ہوگئے اور احسان ملک نے اپنی بیوی وحیدہ خانم سے چھپ کر اس مالدار عورت فرزانہ سے شادی کرلی جو عمر میں ان سے ایک دو سال زیادہ ہی تھی اور ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فرزانہ نے احسان ملک کو اپنا ایسا گرویدہ بنا لیا کہ وہ وحیدہ خانم کو نظر انداز کرنے لگے۔ ان کی زیادہ تر راتیں فرزانہ کے ساتھ گزرنے لگیں۔ اس کے لیے وہ مختلف بہانے تراشتے تھے۔ وحیدہ خانم کا شک بڑھتے بڑھتے یقین میں بدل گیا۔ انہوں نے جاننے کی کوششیں شروع کردیں کہ احسان ملک کی راتیں کہاں گزرتی ہیں۔ آخر وہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئیں کہ انہوں نے فرزانہ سے شادی کرلی تھی۔

اس سارے عمل میں سات سال گزر گئے تھے۔

وحیدہ خانم سے ان کی بیگانگی بڑھتی ہی چلی گئی۔ گھر کے

اخراجات کے معاملے میں بھی وحیدہ خانم پریشان رہنے لگیں۔ ایک بار وہ چھ ماہ تک گھر نہیں آئے۔ اخراجات کے سلسلے میں وحیدہ خانم کی پریشانی اتنی بڑھی کہ ایک رات وہ پروین کو ساتھ لے کر فرزانہ کے گھر پہنچ گئیں۔

احسان ملک انہیں دیکھ کر چونکے۔

''تم!'' ان کے منہ سے نکلا۔

اس وقت ان کے ساتھ فرزانہ بھی تھی اور فرزانہ... کی بیٹی بھی پاس کھڑی تھی......

وحیدہ خانم غصے میں چیختی ہوئی فرزانہ پر جھپٹ پڑیں۔ ''مار ڈالوں گی تجھے! مار ڈالوں گی تجھے!'' وہ چیخ رہی تھیں اور ان کی کوشش تھی کہ فرزانہ کا گلا دبا دیں۔

احسان ملک نے فرزانہ کو ان سے نہ صرف چھڑایا بلکہ زور سے ایک طرف دھکا بھی دے دیا۔ وہ ایک طرف گریں تو پروین روتی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔ وہ اس وقت تقریباً چھ سال کی تھی۔ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

''نکل جا یہاں سے پاگل عورت!'' احسان ملک چیخے۔

''پاگل تو بنا دیا ہے تم نے مجھے احسان!'' وحیدہ خانم نے چیخ کر کہا۔ ''بڑے چاؤ سے شادی بنایا تھا تم نے مجھے!''

''بکواس مت کرو۔ کوئی بیوی نہیں ہے میری فرزانہ کے علاوہ۔''

''تو کیا یہ بیٹی بھی تمہاری نہیں ہے؟'' وحیدہ خانم نے پروین کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''میری صرف یہ ایک بیٹی ہے۔'' انہوں نے فرزانہ کے بطن سے جنم لینے والی لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا جو اس وقت پروین سے چھوٹی تھی اور اس سارے ماجرے پر ہکا بکا تھی......

''تم ہی اپنی بیٹی کو بیٹی نہیں مانو گے تو میں تمہارا جینا حرام کر دوں گی۔'' اس مرتبہ وحیدہ خانم احسان ملک پر ہی جھپٹ پڑی تھیں۔

فرزانہ نے چیخ کر ملازمین کو بلالیا۔ انہوں نے پروین اور وحیدہ خانم کو زبردستی گھر سے نکال دیا اور پھاٹک کے باہر وحیدہ خانم کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ گریں تو ان کا سر ایک پتھر سے ٹکرا کر پھٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو گئیں۔

☆☆☆

پروین نے یہ سب کچھ اختصار سے بیان کر دیا تھا اور اس کے آنسو بہتے رہے تھے۔ احفاظ ہکا بکا یہ کہانی سن رہا تھا۔

''اس کے بعد۔'' پروین نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میری ماں ہوش میں آنے کے بعد بھی پھر کبھی ہوش میں نہیں آ سکیں۔ انہیں نہ یہ یاد رہا کہ وہ کون ہیں اور نہ یہ یاد رہا کہ میں ان کی کون ہوں۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ اس کی اطلاع میرے ماموں تک کس طرح پہنچی تھی۔ اگرچہ خاندان نے میری ماں سے قطع تعلق کر لیا تھا لیکن بھائی بہرحال بھائی ہوتا ہے۔ ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ماموں ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ میری پرورش انہوں نے اپنی اولاد کی طرح کی اور والدہ کو علاج کے لیے اس اسپتال میں داخل کرا دیا۔ ان کے پاس اتنا پیسا نہیں تھا کہ ان کے علاج کے لیے انہیں بیرونِ ملک کسی اچھے اسپتال میں لے جا سکتے۔ اس وقت سے آج تک میری ماں اسی حالت میں ہیں جیسا تم انہیں اس وقت دیکھ رہے ہو۔''

''اور...... اور...... یہ......'' احفاظ کی آواز اس کے حلق میں اٹکنے لگی۔ ''یہ صبیحہ؟''

''یہ فرزانہ کے پہلے شوہر کی بیٹی ہے۔''

''یعنی تمہاری سوتیلی بہن؟''

''ہاں۔ کہا تو جا سکتا ہے۔'' پروین نے جواب دیا۔ ''ماموں نے جنہیں میں انکل کہتی ہوں، مجھے اس وقت سب کچھ تفصیل سے بتایا۔ جب میری ماں کو دھکے دے کر نکالا گیا تھا، میں بہت چھوٹی تھی۔ اس وقت کے وہ سارے مناظر میرے ذہن میں دھندلے دھندلے سے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ مناظر میرے ذہن سے مٹ بھی گئے تھے لیکن جب ماموں نے مجھے یہ سب کچھ بتایا تو وہ سب کچھ مجھے پھر یاد آ گیا۔ میں پختون باپ کی بیٹی تو نہیں لیکن میری ماں، میرا سارا ننھیال تو پختون ہے۔ مجھ میں وہی اثرات آئے ہیں۔ کچھ لوگ نسل در نسل اپنا انتقام لیتے ہیں۔ میری مدد شاید قدرت نے کی تھی کہ صبیحہ میری کلاس فیلو بھی تھی۔ صبیحہ کے والد کا انتقال ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہو چکا تھا اور میرے والد احسان ملک ان کی کمپنی میں ایک عہدے پر فائز تھے۔ پھر جانے کیا ہوا کہ دھیرے دھیرے فرزانہ اور میرے والد کے درمیان کیا بات طے ہوئی کہ میرے والد نے ایک روز اچانک ہمیں چھوڑ دیا اور فرزانہ اور صبیحہ کے ساتھ رہنے لگے۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ پاپا نے فرزانہ سے شادی کر لی تھی اور اس طرح انہوں نے ان کے ڈوبتے ہوئے بزنس کو اتنے اچھے طریقے سے سنبھالا کہ دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی چلی گئی۔''

''مگر اب فرزانہ اور احسان ملک کہاں ہیں؟''

''ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسی لیے تو ان کا سارا

کاروبار صبیحہ سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ کاروبار جس کا نصف کم از کم میرا ہونا چاہیے اپنے پاپا کی محنت کے عوض ہی سہی لیکن مجھے اس نصف سے زیادہ اپنی ماں کا انتقام لینا ہے۔''

احفاظ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے پروین سے ہمدردی ہوگئی تھی۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کا ایک ایک پل کیسے کرب میں گزارا تھا اور گزار رہی تھی۔ اپنی ماں کی اس حالت پر اس کا کلیجا کٹ جاتا ہوگا۔

''کرے کوئی، بھرے کوئی۔'' وہ بے خیالی میں بڑبڑا گیا۔

''کیا!'' پروین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

احفاظ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''جو کچھ ہوا تھا، وہ تمہارے والد کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا انتقام تم ان کی بیٹی سے لینا چاہتی ہو۔''

''یہی روایت ہے۔''

''جسے ایک اچھی روایت نہیں کہا جا سکتا۔''

پروین نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''تو تمہارے خیال میں، میں غلط سوچ رہی ہوں؟ انتقام لینے کے لیے میرا جواز مضبوط نہیں ہے؟''

''آؤ یہاں سے تو چلیں۔'' احفاظ اس کی بات ٹال گیا۔

پروین اپنی ماں کے قریب گئی۔ اس نے ماں کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے چوما۔ احفاظ کی طرف اس کی پشت تھی اس لیے وہ پروین کی آنکھوں کے آنسو نہیں دیکھ سکا۔ پروین کی ماں خالی خالی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ پروین نے اس کی پیشانی بھی چومی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے آنسو صاف کرتی ہوئی تیزی سے پلٹی۔

''چلو!'' اس نے احفاظ سے کہا تھا۔

احفاظ اس کے پیچھے کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت ایک بار پھر اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

''وہی ہوگی!'' احفاظ کو شبنم کا خیال آیا تھا۔

لیکن جب اس نے موبائل نکال کر دیکھا تو اسے ایک اجنبی نمبر دکھائی دیا۔

گھنٹی اب تیسری بار بج رہی تھی۔

''شبنم ہوگی۔'' پروین بولی۔ ''کال ریسیو کرو۔''

''شبنم نہیں ہے۔ کوئی اجنبی نمبر ہے۔ خیر! دیکھتا ہوں۔'' اس نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو! کون؟''

''آپ کا ایک دوست۔'' ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

''میں پہچانا نہیں۔''

''مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ اس وقت کہاں ہیں؟'' آواز آئی۔ ''یہاں سے قریب ہی ایک ریسٹورنٹ ہے۔'' ریسٹورنٹ کا نام بتا کر کہا گیا۔ ''وہاں آجایئے! میں آپ کو منتظر ملوں گا۔''

''آپ اپنا تعارف تو کرائیں۔''

''ریسٹورنٹ میں ہی کراؤں گا۔''

''سوری۔'' احفاظ نے خشک لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنا تعارف نہیں کرائیں گے تو میں نہیں آؤں گا۔''

''تو آپ سراسر اپنا نقصان کریں گے۔ میرے پاس ثبوت موجود ہے کہ آپ اور آپ کی بیوی پروین، صبیحہ صاحبہ کے قتل کی منصوبہ بندی کررہے ہیں۔''

احفاظ کے دماغ میں دھما کا سا ہوا۔

''کیا؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''بس ریسٹورنٹ آجائیں۔ میں آپ کو بہت کچھ دکھاؤں گا۔''

''ایک منٹ۔'' احفاظ نے موبائل کے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پروین سے کہا۔ ''یہ کوئی اجنبی ہے جسے معلوم ہوگیا ہے کہ ہم صبیحہ کے قتل کی منصوبہ بندی کررہے ہیں۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' پروین تیزی سے بولی۔ ''کسی کو یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے؟''

احفاظ نے مختلف الفاظ کے ساتھ وہ گفتگو دہرا دی جو اجنبی سے ہوئی تھی۔

''تم نے تو میرا دماغ ہلا دیا۔'' پروین کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اس سے ملنا چاہیے۔''

''اگر اس کے پاس ایسا کوئی ثبوت ہے تو وہ ہمیں بلیک میل کرنا چاہتا ہوگا، لیکن مجھے یقین تو نہیں ہے کہ کسی کے پاس اس کا ثبوت ہوگا!''

''ہمیں اس سے ملنا تو چاہیے۔''

''ہوں۔'' پروین کے چہرے سے پریشانی صاف ظاہر ہورہی تھی۔

وہ دونوں کار میں بیٹھ کر ریسٹورنٹ کی طرف روانہ ہوئے۔

''وہ۔'' پروین سوچتے ہوئے بولی۔ ''وہ جو کوئی بھی ہے، اسے کسی طرح اس کا علم ہوچکا ہے ورنہ وہ تم سے اس قسم کی باتیں نہ کرتا۔ اب وہ ایسی گھما پھرا کر بات کرے گا کہ ہم اس کی بات تسلیم کرلیں۔''

''بے وقوف نہیں ہوں میں۔'' احفاظ نے کہا۔ ''تم

بھی بلکہ تم خاموش رہنا۔ میں بات کروں گا اس سے۔''

پروین نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہ دونوں ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ ریسٹورنٹ میں داخل ہو کر انہوں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

''ہم اسے پہچان کیسے سکتے ہیں؟'' پروین بولی۔

''میں تو پہچان سکتا ہوں آپ دونوں کو۔'' ایک آواز نے انہیں چونکا دیا۔

وہ ایک جوان العمر قبول صورت شخص تھا۔

''ادھر تشریف لے چلیے!'' اس نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی اس جانب قدم بڑھائے۔ اس میز پر ایک اور شخص بھی موجود تھا۔

''تم ہی نے فون کیا تھا مجھے؟'' احفاظ نے اس شخص کو گھورتے ہوئے کہا جو انہیں اس میز پر لایا تھا۔

''میرا نام عدنان ہے۔'' وہ خفیف سا مسکرایا۔

''فون پر کیا بکواس کی تھی تم نے!'' احفاظ کا لہجہ بہت تیز تھا۔

''کیا آپ دونوں کی تی[illegible] صبیحہ صاحبہ کے قتل کی تیاری نہیں کر رہے تھے؟''

''بکواس کر رہے ہو تم!''

''ملاحظہ فرمائیے!'' عدنان نے ہاتھ میں رول کیا ہوا ایک کاغذ تھا جو اس نے احفاظ کی طرف بڑھا دیا۔

احفاظ نے دیکھا۔ کاغذ پر فیس بک کے ''ان باکس'' کے پچیس تیس کے لگ بھگ پرنٹ تھے۔ ان میں وہ ساری باتیں تھیں جو اسی دن صبح فیس بک پر اس کے اور پروین کے درمیان ہوئی تھیں۔

احفاظ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

''یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟'' احفاظ کی آواز بھرا گئی تھی۔

عدنان کے جواب دینے سے پہلے پروین نے احفاظ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہے؟''

''فیس بک پر آج صبح کی کہانی۔'' احفاظ کو اپنی آواز ڈوبتی سی لگی۔

''آج صبح کی کیا مطلب؟ اوہ!'' اس کی نظر پرنٹس پر گئی۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''یہ اسکرین شاٹس کے پرنٹ ہیں محترمہ!'' عدنان بول پڑا۔

پروین نے احفاظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تو آج فیس بک پر گئی ہی نہیں تو تم سے یہ باتیں کیسے ممکن ہیں؟''

''کیا!'' احفاظ حیرت سے بولا۔

''یہ سب کچھ میں نے نہیں لکھا۔''

عدنان ہنسا۔ ''جب کوئی کسی غلط کام میں پھنستا ہے تو اسی طرح انکار کرتا ہے۔ کیا یہ آپ کا ان باکس نہیں ہے؟''

عدنان نے پروین کی طرف دیکھتے ہوئے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

''کسی نے میرا اکاؤنٹ ہیک کر کے تم سے یہ باتیں کی ہوں گی۔'' پروین نے احفاظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ ملاحظہ فرمائیں۔'' عدنان نے ایک کارڈ احفاظ کی طرف بڑھایا۔

احفاظ نے کارڈ کی تحریر پڑھی تو اس کا سارا جسم سنسنا گیا۔ وہ کارڈ ایک سرکاری ایجنسی کے افسر کا تھا جس کا نام عدنان ہی تھا۔

''ایسے کارڈ کوئی بھی چھپوا سکتا ہے۔'' عدنان بولا۔

''لہٰذا آپ یہ بھی دیکھ لیں۔'' اس نے جیب سے اپنا سرکاری شناختی کارڈ نکال کر احفاظ کے سامنے کر دیا۔ اس پر اس کی تصویر بھی تھی اور سرکاری ایجنسی کی مہر بھی!

پروین کبھی اپنے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذ پر نظر ڈالتی تھی، کبھی احفاظ، عدنان اور عدنان کے ساتھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

عدنان نے اپنا سرکاری شناختی کارڈ پروین کو بھی دکھایا۔

''آپ دونوں ایک اعتبار سے خوش قسمت ہیں۔'' عدنان بولا۔ ''اگر خدانخواستہ صبیحہ صاحبہ کا قتل ہو چکا ہوتا تو آپ دونوں کو ہتھکڑیاں لگ چکی ہوتیں۔ یہ پرنٹ تو آپ کو بعد میں دکھائے جاتے۔''

یکایک پروین نے کاغذ کے پرزے پرزے کر ڈالے۔

عدنان ہنسا۔ ''کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم نے صرف یہی ایک پرنٹ بنایا ہوگا۔''

''ہم نے ایسی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی۔'' پروین تیز لہجے میں بولی۔

''وضاحتیں تو آپ کو پولیس اسٹیشن چل کے کرنا ہوں گی۔''

''ہاں۔'' عدنان کا ساتھی بول پڑا۔ ''اب یہاں اور باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ پولیس اسٹیشن میں ہوں گی ان سے یہ باتیں۔''

''میرا ساتھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' عدنان مسکراتا رہا۔

''چلیے، اٹھیں۔''
''کہاں چلیں؟'' پروین نے اسے گھورا۔
''پولیس اسٹیشن۔''
''کوئی زبردستی ہے کیا!''
''نہیں۔ ابھی تو کوئی زبردستی نہیں کی لیکن آپ لوگ مجبور کریں گے تو ریسٹورنٹ کے باہر موجود پولیس کو یہاں بلا لیا جائے گا۔ ریسٹورنٹ میں بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ سب کے سامنے بے عزتی ہوگی آپ دونوں کی۔ اگر یہاں کوئی صحافی بھی ہوا تو کل کے اخبارات میں یہ خبر چھپ جائے گی۔ یہاں کسی کے پاس کوئی کیمرا دکھائی نہیں دے رہا ہے لیکن اب تصویریں تو موبائل سے بھی لے لی جاتی ہیں۔ خبر کے ساتھ آپ دونوں کی تصویریں بھی آسکتی ہیں۔''
موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی لیکن یہ گھنٹی احفاظ کے موبائل کی نہیں تھی۔
عدنان نے اپنی جیب سے موبائل نکالا۔ گھنٹی اسی کے موبائل کی تھی۔

☆☆☆

شبنم، صبیحہ کے دفتر میں تو داخل ہوگئی لیکن صبیحہ کے کمرے میں داخل نہیں ہوسکی۔ اسے روک لیا گیا تھا۔
''پہلے آپ ان کے پی اے سے بات کریں۔''
''جانے دو مجھے۔ بہت ضروری کام ہے۔'' شبنم نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں ایسی ہو رہی تھیں جیسے ان میں خون اترا ہوا ہو۔
''معاف کیجیے گا محترمہ!'' روکنے والے نے کہا۔ ''میں تو ملازم ہوں۔ میں تو وہی کرسکتا ہوں جس کا مجھے حکم ملا ہے۔ میڈم کا ہر ملاقاتی پہلے ان کے پی اے سے بات کرتا ہے۔''
''کہاں ہے پی اے؟'' شبنم نے جھنجلا کر پوچھا۔
''وہ سامنے ہی تو بیٹھے ہیں۔'' ایک طرف اشارہ کیا گیا۔
پی اے ان دونوں ہی کی طرف متوجہ تھا۔ شبنم تیزی سے اس کی میز کی طرف گئی۔
''مجھے صبیحہ صاحبہ سے ملنا ہے۔ کچھ ضروری کام ہے ان سے۔''
''آپ کا نام محترمہ؟'' پی اے نے انٹر کام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے پوچھا۔
''شبنم۔''
پی اے نے انٹر کام کا ایک بٹن دبا دیا۔
شبنم کھڑے کھڑے اس طرح پہلو بدل رہی تھی جیسے بہت بے چین ہو۔ اِدھر اُدھر ایک اچٹتی سی نظر دوڑانے کے بعد وہ پی اے کی طرف متوجہ ہوئی جو انٹر کام کا ریسیور منہ سے لگائے کہہ رہا تھا۔
''میڈم! ایک خاتون آپ سے فوراً ملنا چاہتی ہیں۔ کوئی بہت ضروری کام ہے۔ انہوں نے اپنا نام شبنم بتایا ہے۔''
وہ دوسری طرف سے کہی جانے والی بات سننے لگا، پھر ''جی'' کہہ کر ریسیور رکھ دیا اور شبنم سے بولا۔ ''اسٹینو ہے ان کے کمرے میں۔ وہ کچھ ڈکٹیٹ کرا رہی ہیں۔ آپ کو دس منٹ انتظار کرنا ہوگا۔''
''انتظار نہیں کرسکتی میں۔'' شبنم جیسے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ تیزی سے پھر صبیحہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔ وہ نہیں دیکھ سکی کہ جس نے اسے روکا تھا، اس کی طرف دیکھتے ہوئے پی اے نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ اس نے پھر شبنم کا راستہ روک لیا۔
''محترمہ! جب تک مجھے میڈم کے پی اے کی طرف سے اشارہ نہیں ملے گا، آپ اندر نہیں جاسکتیں۔''
''ہٹو سامنے سے!'' شبنم نے اسے ایک طرف دھکیلا اور پھر کمرے کا دروازہ بھی دھکے سے کھول کر اندر داخل ہوگئی۔
''یہ کیا حرکت ہے محترمہ!'' میز کے پیچھے بیٹھی ہوئی صبیحہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آپ کو پی اے کی اجازت کے بغیر اندر نہیں آنا چاہیے تھا۔''
''وہ مجھے اجازت نہیں دے رہا تھا۔ آپ نے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ آپ اسٹینوگرافر کو کچھ ڈکٹیٹ کروا رہی ہیں!''
''میں جھوٹ کیوں بولوں گی۔ اس کمرے میں آنے کے دو راستے ہیں۔'' صبیحہ نے ایک اور دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''دفتر کے لوگ میرے کمرے میں اسی طرف سے آتے جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ نے مجھے جھوٹا کہا۔ یہ تہذیب سے گری ہوئی بات ہے۔''
''آپ نے جھوٹ تو بولا تھا کہ اسٹینو کے ساتھ دس منٹ کے لیے مصروف ہیں جبکہ آپ مصروف نہیں ہیں۔''
''اسٹینو ابھی ابھی گیا ہے۔ خیر! میں آپ کے اس غیر مہذبانہ اندازِ گفتگو کو نظر انداز کرکے پوچھوں گی کہ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟''
''میں اس سے زیادہ غیر مہذب حرکت بھی کرچکی

ہوں، اگر اسے غیر مہذب کہا جاسکے۔ کیا تم جاننا چاہو گی؟''
صبیحہ کی پیشانی پر شکن پڑ گئی۔ ''کیا ہم اتنے بے تکلف ہیں کہ ایک دوسرے کو تم کہیں؟''
''ہمارا رشتہ ہی ایسا ہے۔'' شبنم سفاکی سے مسکرائی۔
''ہمارا کیا رشتہ ہے؟''
''تم بھی احفاظ کی بیوی ہو اور میں بھی اس کی بیوی ہوں۔''
''کیا بکواس کر رہی ہو؟'' صبیحہ نے غصے سے کہا۔
''جب تم امریکا گئی ہوئی تھیں۔'' شبنم بولی۔ ''ان دنوں تمہارے ہی گھر میں تمہارے شوہر کی آغوش میں میرا جسم بھی تھا۔ اسی طرح جیسے تم اس کی آغوش میں ہوتی ہو گی۔''
''بکواس۔'' صبیحہ نے منہ بنا کر کہا۔ ''صرف میں ہوں اس کی بیوی۔''
''نہ کرو تم میری بات کا یقین۔ میں اس لیے آئی ہوں کہ تم احفاظ سے خلع لے لو۔ تمہیں اس کے لیے کچھ نہیں کرنا پڑے گا، سوائے اس کے کہ اس کاغذ پر دستخط کر دو۔'' اس نے اپنے پرس سے ایک کاغذ نکال کر صبیحہ کے سامنے میز پر ڈال دیا۔ وہ باتیں کرتی ہوئی میز کے بالکل قریب اور صبیحہ کے عین سامنے آ گئی تھی۔
''خلع۔'' صبیحہ نے حقارت سے کہا اور کاغذ اٹھا کر اس کے پرزے پرزے کر ڈالے۔
''اوہ یو!'' شبنم نے دانت پیسے۔ ''اب تمہیں خود ہی سب کچھ ٹائپ بھی کرنا ہوگا۔''
''دماغ خراب ہے تمہارا۔ چلی جاؤ یہاں سے!''
''میں جس کام سے آئی ہوں، وہ کروا کے ہی جاؤں گی۔'' شبنم نے کہتے ہوئے اپنی ساڑی میں اڑسا ہوا ریوالور نکال لیا۔ ''اگر تم میری بات نہیں مانو گی تو اس ریوالور کی ساری گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گی۔''
صبیحہ نے غور سے ریوالور کی طرف دیکھا۔ ''یہ واقعی اصلی ریوالور ہے یا تم مجھے ڈرانے کے لیے کھلونا خرید لائی ہو؟''
''اگر تم میری بات نہیں مانو گی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ یہ اصلی ہے یا نقلی۔''
''بہتر ہوگا کہ تم دفع ہو جاؤ۔'' صبیحہ نے بڑے سکون سے کہا۔ ''اصلی ریوالور چلانے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے اور تمہارے چہرے سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم اتنی جی دار نہیں ہو۔''
''میں سچ مچ اب ٹریگر دبا دوں گی۔''
''دبا دو!''
''پھر سوچ لو ایک بار! زندگی دوبارہ نہیں ملتی۔''
''میں اندازہ لگا چکی ہوں تمہارے چہرے سے۔ تم ایک بزدل عورت ہو۔''
شبنم بری طرح کھسیا گئی۔
ربر کی گولی سے چوٹ تو بہت لگتی ہے اگر وہ ریوالور سے نکلے، شبنم کے ذہن میں آیا۔
اسی وقت وہ دروازہ کھلا جس کے بارے میں صبیحہ نے بتایا تھا کہ وہاں سے دفتر کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ اندر آنے والے شخص کے ایک ہاتھ میں شارٹ ہینڈ لکھنے والی کاپی اور دوسرے ہاتھ میں قلم تھا۔
''میڈم سوری!'' اس نے اندر آتے ہی کہا۔ ''میں شاید ایک لفظ لکھنا بھول......'' وہ یکایک خاموش ہو گیا۔ اس کی نظر اب پڑی تھی شبنم کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور پر۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چہرے پر خوف و حیرت کے تاثرات تھے۔
''ابھی تم جاؤ!'' صبیحہ نے اس سے کہا۔ ''بعد میں پوچھ لینا۔''
اس شخص نے تیزی سے پلٹنا چاہا تھا کہ شبنم گرجی......
''اب تم نہیں جاؤ گے اس کمرے سے۔''
نو وارد شخص ٹھٹک کر رک گیا۔
''پیچھے پیر کر کے اسی سے دروازہ بند کرو اور آگے آؤ!'' شبنم نے اس سے حکم دینے والے انداز میں کہا۔
صبیحہ نے ہونٹ بھینچ لیے۔ تاثر کچھ ایسا تھا جیسے جو کچھ ہوا، وہ اس کی مرضی یا خواہش کے خلاف تھا۔
وہ نو وارد صبیحہ کا اسٹینو گرافر ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے صبیحہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور بے بسی تھی۔
''سنا نہیں تم نے!'' شبنم ڈپٹنے کے انداز میں بولی۔ ''دروازہ بند کرو۔''
اسٹینو گرافر نے اس مرتبہ مشینی انداز میں عمل کیا۔ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھے بغیر پیر سے دروازہ بند کر دیا۔
''آگے آ جاؤ۔'' شبنم نے پھر حکم دیا۔
اسٹینو گرافر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا آگے آنے لگا۔
''چالاک بننے کی کوشش کی تھی تم نے!'' شبنم نے صبیحہ کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اس سے

جانے کے لیے کہا تھا تاکہ یہ دفتر کے لوگوں کو اس کمرے کی صورت حال کے بارے میں بتادے۔''

صبیحہ کچھ نہیں بولی، خاموشی سے شبنم کو گھورتی رہی۔

''اب۔'' شبنم نے صبیحہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''میں دس تک گنوں گی۔ اگر تم نے خلع کی درخواست لکھنا نہیں شروع کی تو میں دس کہتے ہی گولی چلادوں گی۔''

''گنتی یاد کرو گی؟'' صبیحہ نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

شبنم نے دانت پیسے اور کہا۔ ''ایک۔''

''دو۔'' صبیحہ مسکرائی۔

''تین۔'' شبنم نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''چار۔'' صبیحہ نے گنتی آگے بڑھائی۔

''پانچ۔''

''چھ۔''

''سات۔''

''آٹھ۔''

''نو۔''

''چلو میں ہی گنتی پوری کردیتی ہوں۔'' صبیحہ اب بھی مسکرا رہی تھی۔ ''چلاؤ گولی...... دس۔'' اس نے گنتی مکمل کی۔

شبنم بری طرح کھسیا گئی تھی۔ اسٹینو گرافر نے ٹریگر پر شبنم کی انگلی کا دباؤ بڑھتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار چیخ پڑا۔ ''نہیں۔''

کھسیائی ہوئی شبنم نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کرکے پے درپے تین مرتبہ ٹریگر دبا دیا۔ تین دھماکے ہوئے۔ شبنم نے زندگی میں پہلی مرتبہ ریوالور چلایا تھا۔ اس کے دونشانے خطا گئے۔ ان دو گولیوں نے دیوار کا پلاسٹر ادھیڑا تھا لیکن ایک گولی اسٹینو گرافر کے پیٹ میں لگی اور وہ کراہتا ہوا جھٹکے سے پیچھے کی طرف جھکا۔

شبنم نے اس کے پیٹ سے خون ابلتا دیکھا تو فوری طور پر سکتے ہی میں رہ گئی۔ اس نے اپنے خیال کے مطابق ربر کی گولیاں چلائی تھیں لیکن وہ تو سچ مچ کی گولیاں تھیں۔

''کم بخت!'' صبیحہ تیزی سے میز کے پیچھے سے نکل کر شبنم پر جھپٹی۔

شبنم کا دماغ بری طرح گھوم چکا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ اس کے ریوالور سے اصلی گولیاں کیسے نکل پڑیں۔ اسی عالم میں جب اس نے صبیحہ کو اپنی طرف جھپٹتے دیکھا تو ریوالور کا رخ اس کی طرف کرکے پے درپے گولیاں چلاتی گئی لیکن چوتھی مرتبہ گولی نہیں نکلی۔ ریوالور چھ گولیوں کے بعد خالی ہوچکا تھا۔ صبیحہ کیونکہ شبنم کے بہت قریب تھی اس لیے دو گولیاں صبیحہ کے سینے پر لگیں۔ تیسری گولی کسی اور جانب چلی گئی۔ صبیحہ کے جسم کو ایک دھچکا سا لگا۔

☆☆☆

صبیحہ کے دفتر کی صورت حال کی اطلاع ریسٹورنٹ میں عدنان کو اپنے موبائل پر ملی تھی۔ اس نے کچھ سنا اور پھر تیزی سے کہا۔ ''میں آتا ہوں۔'' اس نے موبائل بند کرکے اس پر غالباً کچھ ٹائپ کیا اور اپنے ساتھی کے سامنے کردیا۔ عبارت پڑھ کر وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

''تو اب کیا ارادہ ہے؟'' عدنان نے پروین اور احفاظ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں آپ پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتے ہیں۔ یعنی گرفتار کررہے ہیں؟'' پروین بولی۔

''ہاں۔'' عدنان نے کہا۔ ''اب گرفتار ہی کررہا ہوں کیونکہ شبنم کو جو کام سونپا گیا تھا، وہ اس نے کردیا ہے۔''

احفاظ اور پروین نے فوراً ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''خوب!'' عدنان تلخی سے مسکرایا۔ ''تم دونوں کا اس طرح ایک دوسرے کو دیکھنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس اطلاع نے تمہیں خوش کیا ہے۔''

''آپ بہت سی باتوں کا مطلب خود ہی اخذ کرلیتے ہیں۔'' پروین نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آپ نے ان باکس کے جو پرنٹ دکھائے ہیں، انہیں میں عدالت میں چیلنج کرسکتی ہوں۔''

عدنان سے زیادہ تر بات پروین ہی نے کی تھی۔ احفاظ کچھ نروس دکھائی دے رہا تھا۔

اس وقت وہ دونوں چونکے جب انہوں نے پولیس کو اپنے قریب دیکھا۔ ان کے ساتھ وہ بھی تھا جو عدنان کے موبائل پر کچھ پڑھ کر وہاں سے گیا تھا۔

''ان دونوں کو ہتھکڑیاں لگا کر لے جاؤ۔'' عدنان نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''مجھے فوراً صبیحہ صاحبہ کے دفتر پہنچنا ہے۔'' پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر اٹھ کر تیزی سے ریسٹورنٹ کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

صبیحہ کے دفتر پہنچنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہاں پولیس موجود تھی۔ ان کے ایک افسر نے عدنان سے کہا۔ ''شبنم کو گرفتار کرکے پولیس اسٹیشن روانہ کردیا گیا ہے

سر!...... لاش ابھی پڑی ہے۔ ضروری کارروائی کے بعد اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا جائے گا۔''

''دفتر میں سناٹا ہے۔'' عدنان بولا۔

''صبیحہ صاحبہ ہی نے سب کی چھٹی کر دی ہے۔ بس دو آدمیوں کو روکا ہے۔''

''وہ خود کہاں ہیں؟''

''لاش کی وجہ سے وہ اپنے کمرے میں نہیں بیٹھنا چاہتی تھیں۔ ایک اور کمرے میں بیٹھی ہیں۔ میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ آپ کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ آپ جلد ہی پہنچ جائیں گے۔''

''وہ کس کمرے میں ہیں؟''

''آیئے!''

عدنان کو اس کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں صبیحہ ایک کرسی پر اپنا سر تھامے بیٹھی ہوئی تھی۔

''آؤ!'' عدنان کو دیکھ کر وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔ ''ایک زندگی بہرحال ختم ہو چکی ہے۔ میں اس بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے زندہ ہوں جو تم نے مجھے مہیا کی تھی۔''

''سارا واقعہ کس طرح پیش آیا؟'' عدنان نے صبیحہ کے قریب کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے پی اے نے اطلاع دی تھی کہ شبنم نام کی کوئی خاتون مجھ سے ملنے آئی ہے۔ اس اطلاع سے میں سمجھ گئی کہ آج شبنم پر جنون طاری ہو گیا ہے اور وہ مجھے ختم کرنے آئی ہے۔ میں تمہیں اس کی اطلاع دینا چاہتی تھی لیکن شبنم اس سے پہلے ہی میرے کمرے میں گھس آئی۔''

''گھس آئی...... کیا مطلب؟''

''میں نے پی اے سے کہا تھا کہ وہ اسے دس منٹ روکے۔ میں یہ مہلت اسی لیے حاصل کرنا چاہتی تھی کہ تمہیں اطلاع دوں۔ میرے کہنے پر اسے میرے کمرے میں آنے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن میرا چپراسی اسے روکنے میں ناکام رہا۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ وہ میرے کمرے میں گھس آئی۔''

عدنان نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

صبیحہ پھر بولی۔ ''بہرحال مجھے یہ اطمینان تھا کہ بلٹ پروف جیکٹ کی وجہ سے میں محفوظ رہوں گی۔ میرے گھر پر اور دفتر کے کمرے میں ریکارڈنگ کا بندوبست اسی لیے کیا گیا تھا کہ جب وہ آ کر مجھے گولی مارنے سے پہلے جو باتیں کرے، وہ ریکارڈ ہو جائیں۔ جب وہ آئی تو میں نے پیر سے وہ بٹن دبا دیا جس سے خفیہ کیمرے نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔''

عدنان بڑی توجہ سے سب کچھ سنتا رہا۔ صبیحہ نے اسے بتایا کہ شبنم سے کیا باتیں ہوئی تھیں۔

''انہی باتوں کے دوران میں میرا اسٹینو گرافر کمرے میں آ گیا۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''بس اس کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ شبنم نے اسے واپس نہیں جانے دیا۔ اس کا یہ ڈر ٹھیک ہی تھا کہ وہ واپس جا کر دفتر کے لوگوں کو بتا دے گا۔''

''تمہارے دفتر کے لوگ اچانک بھی تمہارے کمرے میں آ جاتے ہیں۔''

''دراصل وہ اسی وقت مجھ سے ڈکٹیشن لے کر گیا تھا اور خود میں نے اس سے کہا تھا کہ کوئی غلطی نہ رہنے پائے۔ اگر اسے کچھ شبہ بھی ہو تو فوراً آ کر مجھ سے پوچھ لے۔''

''ہوں۔''

صبیحہ نے شبنم سے ہونے والی باقی باتیں بتائیں، پھر بولی۔ ''اس طرح وہ مارا گیا۔ اس کے بعد شبنم نے مجھے نشانہ بنایا لیکن بلٹ پروف جیکٹ نے مجھے بچا لیا۔ دو گولیاں ٹکرانے سے مجھے جھٹکا تو لگا تھا لیکن ظاہر ہے کہ وہ میرے جسم تک نہیں پہنچ سکی تھیں۔ اس وقت شبنم کے چہرے پر حیرت کے آثار ابھرے تھے۔ پھر فوراً ہی اس نے بھاگنا چاہا تھا لیکن میں نے اسے پکڑ لیا۔ خاصی طاقتور بھی ہے وہ۔ میرے قابو میں نہ آتی لیکن فائرنگ کی آوازیں سن کر دفتر کے لوگ اندر آ گئے تھے۔ انہوں نے اسے جکڑ لیا۔ انہی میں سے کسی نے علاقے کے پولیس اسٹیشن فون کر دیا تھا۔ یہ تم نے مجھ سے بھی کہا تھا کہ ایسی ویسی کوئی بات ہو تو علاقے کے پولیس اسٹیشن سے رابطہ کروں۔''

''میں تمہارے سلسلے میں ان لوگوں کو ہدایات دے چکا تھا۔''

''ہاں۔ جب وہ لوگ آئے تو ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم انہیں میرے بارے میں ہدایات دے چکے ہو۔ انہی میں سے کسی نے تمہیں اطلاع دی ہو گی۔ مجھے بھی بتا دیا تھا کہ تم فوراً آ رہے ہو...... اس طرح یہ قصہ تمام ہوا۔''

''تم نے مجھے یہ تو بتا دیا تھا کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے لیکن پوری بات نہیں بتائی تھی۔''

''دراصل ابتدا میں تو مجھے تھوڑا تھوڑا سا شبہ تھا کہ......'' صبیحہ یکایک رکی، پھر بولی۔ ''یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں کہ میری شادی کیسے ہوئی تھی۔''

”ہاں۔ وہ تو بتا چکی ہو۔“

”مجھے شبہ یہ تھا کہ پروین نے شرارتاً یہ حرکت کی ہے اور احفاظ بھی اس بات سے واقف ہے۔ مجھے دو ایک بار محسوس ہوا تھا کہ ان دونوں نے اپنی دانست میں مجھ سے نظر بچا کر ایک دوسرے کو کچھ اشارے کیے تھے لیکن میں نے دیکھ لیا تھا۔ اس کے باوجود مجھے صرف شرارت ہی کا شک تھا۔ یہ تو میرے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ اصل معاملہ بہت خطرناک ہے، تاہم میں اپنے شبہے کو یقین میں بدلنا چاہتی تھی۔ قدرت نے مجھے اس کا موقع بھی فراہم کر دیا۔ جب میں امریکا گئی تو واشنگٹن میں میری ملاقات افسر علی سے ہوئی۔ یاد ہے تمہیں؟ وہ بھی ہمارا کلاس فیلو تھا۔ سب اسے افی افی کہا کرتے تھے۔“

”ہاں، یہ تمہاری افی والی بات پر مجھے یاد آ گیا۔ اس سے میرے کچھ خاص مراسم نہیں تھے۔“

”مراسم تو ساری کلاس کے مجھ سے تھے۔“ صبیحہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”کئی کی یہ خواہش سامنے بھی آ گئی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے اور ان میں......“

عدنان نے اس کی بات کاٹی۔ ”تو امریکا میں افسر سے ملاقات ہوئی۔“

”ہوں۔“ صبیحہ پھر خفیف سا مسکرائی۔ ”تم نے ابھی میری بات اس لیے کاٹی کہ میں تمہارا نام بھی نہ لے بیٹھوں۔ مجھ سے شادی کے خواہش مند تم بھی تھے۔“

”اب چھوڑو یہ ذکر۔“ عدنان نے کچھ خجالت سے کہا۔ ”رات گئی، بات گئی۔ وہ زمانہ کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ اب تو میں چار سال کی ایک بیٹی کا باپ بن چکا ہوں۔“

”خیر!“ صبیحہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”مجھے تو سارے کلاس فیلو یاد ہیں۔ مجھے اس کا علم بھی ہو گیا تھا کہ تم ایک اہم سرکاری ایجنسی میں ملازم ہو گئے ہو۔ بس یہ نہیں معلوم تھا کہ تم نے خاصی ترقی بھی کر لی ہے۔ بہرحال، جب مجھے اس کا علم ہوا تھا کہ مجھے قتل کرنے کی سازش ہو رہی ہے، تبھی میں نے تم سے رابطہ کیا تھا۔“

”سازش کا علم کیسے ہوا تھا؟ تم نے کچھ اشارے تو دیے تھے لیکن اب مجھے تفصیل سے سب کچھ بتاؤ۔ کیا اس سازش کو بے نقاب کرنے میں افسر کا بھی کچھ ہاتھ رہا؟“

”نہیں، اس معاملے میں اس کا کیا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ ہاں اس معاملے میں مجھے اس کی کچھ مدد ضرور حاصل ہوئی۔ ملاقات ہونے پر اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ فیس بک والوں کے پاس کام کر رہا ہے اور اس نے کمپیوٹر کے معاملات میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہے کہ فیس بک کے چیئرمین مارک ایلیٹ زکر برگ کی آنکھوں کا تارا بن گیا ہے۔ یہ جاننے کے بعد یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ پروین نے میرے ساتھ شرارت کی ہے، یعنی میرے نام سے فیس بک کا اکاؤنٹ کھول کر یہ ڈراما کیا ہے جس میں احفاظ بھی شامل ہے تو افسر اس معاملے میں میری مدد کر سکتا ہے۔ دراصل ابتدا میں تو مجھے صرف پروین پر شبہ تھا کہ یہ اس کی شرارت ہے لیکن جب میں نے اس کی اور احفاظ کی اشارے بازیاں دیکھیں تو مجھے یہ تجسس بھی ہو گیا تھا کہ آخر پروین سے احفاظ کا تعلق کیا ہے...... یہ بات میں نے افسر کو بتائی۔“

”اوہ! اب ان باکس والی بات میری سمجھ میں کچھ کچھ آ رہی ہے۔“

”آنا بھی چاہیے۔ تم نے جو اتنی ترقی کی ہے تو ذہانت ہی کے بل پر کی ہوگی۔ خیر، میں تمہیں وضاحت سے بتاتی ہوں۔ میں نے افسر سے اس کا ذکر کیا تو اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ اس معاملے میں میری کیا مدد کر سکتا ہے۔ بس باتوں باتوں ہی میں مجھے خیال آیا کہ اگر میں فیس بک پر پروین کے نام سے اکاؤنٹ کھول لوں اور اسی کی تصویر استعمال کروں تو فیس بک پر احفاظ سے باتیں کر کے حقیقت کی تہ تک پہنچا جا سکتا ہے۔“

”ہوں۔“ عدنان نے سر ہلایا۔

”ایک وعدہ کرو عدنان! یہ بات تم کسی کو بتاؤ گے نہیں کہ اس معاملے میں افسر نے کس طرح میری مدد کی تھی۔ اگر یہ بات کھل گئی تو فیس بک والوں کی نظر میں افسر کی پوزیشن خراب ہو جائے گی۔“

”یہ تو ہے۔ افسر نے فیس بک والوں سے چھپ کر ہی تمہاری مدد کی ہوگی جو فیس بک کے قوانین کے خلاف ہے۔“

”ہاں۔“ صبیحہ نے کہا۔ ”اس نے بتایا کہ ایک اکاؤنٹ کی موجودگی میں اسی کے نام سے دوسرا اکاؤنٹ وہ کسی تدبیر سے کھلوا تو سکتا ہے لیکن بہتر یہ ہوگا کہ وہ مجھے پروین کا پاس ورڈ بتا دے اور میں اسے استعمال کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھوں کہ اس وقت پروین فیس بک پر اپنے اکاؤنٹ میں جانے کی کوشش نہ کرے۔ دوسری بات اس نے یہ کہی کہ یہ حرکت میں بس ایک مرتبہ کروں کیونکہ بار بار کرنے سے پروین کو یہ خیال آ سکتا ہے کہ اس کا اکاؤنٹ ہیک کر لیا گیا ہے۔“

''یہ تو اس نے ٹھیک کیا اور اس کی تجویز بھی مناسب تھی۔''

''میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔ مجھے بس ایک بار ہی احفاظ سے بات کر کے سب کچھ معلوم ہو جاتا۔ بس اس نے کسی طرح پروین کا پاس ورڈ معلوم کر کے مجھے بتا دیا۔''

''فیس بک کا ہیڈ کوارٹر تو شاید کیلی فورنیا میں ہے!''

''دفتر واشنگٹن میں بھی ہے۔''

''اچھا پھر؟''

''اگر یہ کام نہ ہوتا تو بھی میں حقیقت معلوم کر ہی لیتی۔ میں نے اس کا کچھ اور بندوبست بھی کیا تھا اور دراصل مجھے اپنے کیے ہوئے بندوبست سے ہی حقیقت کا علم ہوا۔ فیس بک پر تو میں نے بعد میں کام صرف اس لیے کیا کہ اس طرح میں اس سازش کا ایک ثبوت اور حاصل کرنا چاہتی تھی۔''

''تم نے کیا بندوبست کیا تھا؟''

''اگر میں صرف فیس بک کا استعمال کرتی تو مجھے اس سازش کا علم ہی نہیں ہوتا۔ میں نے اپنی کار میں ریکارڈنگ کا خفیہ بندوبست کیا تھا۔ بندوبست بھی ایسا کہ جب بھی کار اسٹارٹ کی جائے تو ریکارڈنگ کا سسٹم کام کرنا شروع کر دے۔ دراصل کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ مجھے پروین کو کہیں بھیجنا ہوتا اور اس کی کار خراب ہوتی تو میں اسے اپنی کار کی چابی دے دیا کرتی تھی۔ واشنگٹن سے آ کر میں ایسے کسی موقع کی تاک میں رہتی لیکن خود ان دونوں ہی نے مجھے اس کا موقع فراہم کر دیا۔ شبنم سے ملنے کے لیے احفاظ نے پیٹ کے درد کا بہانہ تراشا تو پروین اسے میری کار میں لے کر چلی گئی۔ بظاہر ڈاکٹر کے پاس لیکن دراصل شبنم کے پاس اور ایسا دو مرتبہ ہوا۔ دونوں مرتبہ ان کی گفتگو ریکارڈ ہو گئی جو میں نے بعد میں سن لی۔ یقین کرو عدنان! میرا جسم سنسنا گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پروین میرے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد ہی میں نے بس ایک مرتبہ پروین کا اکاؤنٹ استعمال کیا۔ احفاظ سے میری جو باتیں ہوئیں، ان کے میں اسکرین شاٹس لیتی رہی۔ وہی میں نے تم کو دیے تھے۔''

''تم نے اپنا ہی کمپیوٹر استعمال کیا ہوگا۔''

''ظاہر ہے۔''

''تو اس کے لیے افسر نے تمہیں کیا تدبیر بتائی تھی؟ دراصل جب اپنے کمپیوٹر کے بجائے کوئی دوسرا کمپیوٹر استعمال کیا جائے تو فیس بک کی مشینری کنفرم کرتی ہے کہ فیس بک پر جانے کا خواہش مند وہی فرد ہے کسی اور کو پاس ورڈ معلوم ہو گیا ہے اور......''

''یہ بتا دیا تھا مجھے افسر نے کہ اس صورت میں فیس بک متعلقہ اکاؤنٹ ہولڈر کے فون پر کوڈ بھیجتی ہے چنانچہ میں نے پروین کے بیگ سے اس کا موبائل چرا لیا تھا۔ اسے چرانا ہی کہیں گے۔ پروین کو اس کا علم نہیں ہو سکا تھا۔ یہی ہوا بھی! فیس بک نے پروین کے فون نمبر پر کوڈ بھیجا۔ فون میرے پاس موجود ہی تھا۔ کوڈ اس پر آیا۔ وہی میں نے لکھ دیا اور اس طرح فیس بک کی مشینری مطمئن ہو گئی۔ میں پروین کے پیج پر پہنچی۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ احفاظ عموماً اپنا وقت فیس بک پر ہی گزارتا ہے۔ میری قسمت اچھی تھی۔ احفاظ تھا فیس بک پر۔ میں نے سوچا تھا کہ پروین کو اپنا موبائل غائب ہونے کا علم ہوگا تو وہ مجھ کو بھی بتائے گی اور اگر اسے معلوم نہ ہوا تو میں موقع دیکھ کر اس کا موبائل پھر اس کے وینیٹی بیگ میں رکھ دوں گی۔ آج میں نے احفاظ کو پروین کے ساتھ اپنے جاننے والے ایک ڈاکٹر کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک ان کا کچھ پتا نہیں ہے۔ میں اس معاملے میں پھنس گئی تھی اس لیے احفاظ کو فون کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ بس یہ احساس میری جان جلاتا رہا کہ پروین آخر میری دشمن کیوں ہو گئی تھی۔ انہیں تو پکڑنا ہے عدنان! شبنم تو آلۂ کار بنی ہے ان کی۔''

''وہ دونوں اس وقت حوالات میں ہیں۔''

''کیا؟'' صبیحہ چونک پڑی۔

''ہاں۔ تم سے وہ پرنٹ لینے کے بعد میں گھر جا کر سو تو نہیں جاتا۔ ویسے بھی میں نے ان کی نگرانی شروع کروا دی تھی۔ نجانے کیوں وہ آج ایک نفسیاتی اسپتال میں گئے تھے۔ میں نے انہیں وہیں دھر لیا۔'' عدنان نے وضاحت سے سب کچھ بتا دیا۔

''تو وہ...... میری کار؟''

''وہ بھی اس وقت پولیس اسٹیشن میں ہوگی۔ وہ تمہیں آج ہی کسی وقت مل جائے گی۔ میں پہلے تمہارے پاس آ گیا۔ اب جا کر ان کی مزاج پرسی کرتا ہے۔''

''میں نے ایک بندوبست اور بھی کیا تھا۔''

''کس سلسلے میں؟ کیا بندوبست؟''

''میں نے کل احفاظ کو تحفے کے طور پر ایک گھڑی دی تھی۔ اگر اس کے علاوہ پروین کی باتیں کار کے باہر بھی ہوں گی تو اس گھڑی میں ریکارڈ ہو جائیں گی۔ وہی گھڑی میں نے آج احفاظ کی کلائی پر بندھی دیکھی تھی۔ میں چاہوں

گی۔ تم وہ گھڑی بھی اس سے لے کر مجھے پہنچا دو۔ ممکن ہے اس میں کچھ ریکارڈ ہوا ہو۔ کار میں جو سسٹم ہے، اسے بھی سننا چاہتی ہوں میں۔ دیکھنا ہے کہ آج ان میں کیا باتیں ہوئی تھیں۔"

"میں اتروا لوں گا اس سے گھڑی۔" عدنان نے کہا۔ "وہ بھی مل جائے گی تمہیں۔"

"یہاں پولیس کا کام کب ختم ہوگا؟ لاش کب اٹھوائی جائے گی؟"

"میرا خیال ہے کہ ختم ہو چکا ہوگا یا ہونے ہی والا ہوگا۔ میں دیکھتا ہوں جا کر۔" عدنان [illegible] اٹھا۔

"ابھی تو مجھے گھر جانے کے لیے ٹیکسی کرنا پڑے گی۔"

"نہیں۔" عدنان نے کہا۔ "میں تمہیں اپنی کار میں چھوڑ آؤں گا۔ اس کے بعد جاؤں گا پولیس اسٹیشن۔"

☆☆☆

تین گھنٹے بعد صبیحہ کو کار بھی مل گئی اور گھڑی بھی۔ وہ اس وقت اپنے گھر پر ہی تھی۔ عدنان خود دونوں چیزیں دے گیا تھا۔

"کچھ معلوم ہوا ان سے؟" صبیحہ نے اس سے پوچھا تھا۔ "آخر پروین میری جان کی دشمن کیوں ہو گئی تھی؟"

"ابھی وہ دونوں کسی بات کا بھی اعتراف نہیں کر رہے ہیں لیکن کرنا تو پڑے گا انہیں۔"

عدنان جلدی میں تھا اس لیے زیادہ بات نہیں ہو سکی تھی۔

عدنان کے جاتے ہی صبیحہ کار میں جا بیٹھی۔ اس نے ان باتوں کی ریکارڈنگ سنی جو اس روز احفاظ اور پروین میں ہوئی تھیں۔ اس دن کی گفتگو سے صبیحہ کو دو خاص باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اس دن احفاظ اس کے قتل کے معاملے میں پہلی بار کچھ متذبذب ہوا تھا۔ دوسری بات یہ کہ اس نے پروین کو مجبور کر دیا تھا کہ آج وہ اپنا اصل مقصد ضرور بتا دے۔ پروین اسے لے کر کہیں روانہ ہوئی تھی اور احفاظ سے کہا تھا کہ جہاں وہ اسے لے جا رہی ہے، وہیں اسے سب کچھ بتائے گی۔

اور وہ اسے ایک [illegible] اسپتال میں لے گئی تھی۔

عدنان نے اسے یہی بتایا تھا۔

وہ باتیں، صبیحہ نے [illegible] اس گھڑی [illegible] جو اس نے احفاظ کو دی تھی اور اس [illegible] کی میز پر وہی گھڑی اس کی کلائی پر بندھی ہوئی تھی۔

صبیحہ کار سے اتر کر گھر میں آئی۔

گھڑی کی ریکارڈنگ سے اس کو جو باتیں معلوم ہوئیں، انہوں نے اسے کچھ دیر کے لیے سن کر دیا۔ یہ اس کے لیے ایک دھماکا خیز انکشاف تھا کہ پروین اس کے سوتیلے باپ کی سگی بیٹی تھی اور اس کی سوتیلی بہن۔

اس انکشاف کے باعث اس کے دماغ میں بہت سے خیالات کا ایک سمندر سا امڈ آیا۔ وہ خیالات ایسے تھے کہ وہ کچھ دیر تک تو اس کے دماغ میں چکراتے ہی رہتے اگر موبائل فون کی گھنٹی نے اسے چونکا یا نہ ہوتا۔

کال عدنان کی تھی۔

"معاف کرنا صبیحہ!" اس نے کہا۔ "تم سوئی تو نہیں تھیں؟"

"شاید سو جاتی اگر آج وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔ ویسے بھی گیارہ ہی بجے ہیں ابھی!"

"تم اس واقعے کی وجہ سے بہت ڈسٹرب تھیں اس لیے میں نے تمہیں پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"اب تو میں اس وقت سے بھی زیادہ ڈسٹرب ہوں، لیکن یہ تم نے کیا کہا کہ تم نے مجھے پریشان کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ایسی کیا بات ہے؟"

"اس سارے معاملے میں تمہارا بیان ریکارڈ کرنا ہے، لیکن تم بتا رہی ہو کہ اب تم اس وقت سے بھی زیادہ ڈسٹرب ہو۔ کوئی اور بات ہو گئی؟"

"ہاں۔ ایسی بات کہ آج رات میری نیند نہ جانے کب تک اڑی رہے۔ میں اپنا بیان ریکارڈ کرانے ابھی آ جاتی ہوں لیکن بیان ریکارڈ کرانے سے پہلے میں تم سے کچھ مشورہ کرنا چاہوں گی۔"

"وہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بیان کی ریکارڈنگ سے پہلے ہم تنہائی میں کچھ دیر باتیں کر سکتے ہیں۔ اگر تم زیادہ ڈسٹرب ہو تو بیان کل صبح بھی ریکارڈ کرا سکتی ہو۔ میں نے اپنی رپورٹ میں یہی لکھا ہے کہ اس واقعے سے تم ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئی ہو اس لیے فوری طور پر بیان نہیں لیا جا سکتا تھا۔"

صبیحہ نے اس کی پوری بات سننے کے بعد کہا۔ "نہیں، تم اسی وقت میرا بیان لے سکتے ہو۔ دراصل تم سے جو مشورہ کرنا ہے، وہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے بیان ریکارڈ کروانے کے لیے کہاں آنا ہوگا؟"

"دل کا بوجھ۔ کیا مطلب؟"

''فون پر وہ باتیں کرنا مناسب نہیں ہوگا۔''
''کیا میں تمہارے گھر آ جاؤں؟''
''آ جاؤ تو اچھا ہے۔''
''میں فوراً آ رہا ہوں۔''
''آ جاؤ! میں انتظار کر رہی ہوں۔''
تھوڑی دیر بعد عدنان اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ملازمہ چائے بھی اسی وقت لے آئی۔
''ارے!'' عدنان کے منہ سے نکلا۔ ''جو حالات ہیں، ان میں ایسے تکلفات کی کیا ضرورت تھی صبیحہ!''
''تکلفات کی بات نہیں، میں خود بھی چائے پینا چاہتی تھی۔ سر میں درد ہو گیا ہے۔ تم بھی خاصے تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔''
''تھکا ہوا تو میں اس وقت بھی تھا جب تمہیں کار اور گھڑی دینے آیا تھا۔''
''اس وقت شاید میں نوٹ نہیں کر سکی۔''
''بہت مصروف رہا ہوں۔ بتاؤں گا تمہیں لیکن پہلے تم اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لو۔ کیا مشورہ کرنا ہے تمہیں...... تم سے ابھی فون پر بات کرنے کے بعد میں سوچتا ہوا یہاں آیا ہوں۔ کیا کار کی اور گھڑی کی ریکارڈنگ سے کوئی ایسی بات معلوم ہوئی ہے جو......''
''ہاں عدنان۔'' صبیحہ بول پڑی۔ پیالیوں میں چائے بناتے ہوئے اس نے کہا۔ ''پروین میری بہن ہے۔''
''کیا؟'' عدنان چونک گیا۔
''ہاں۔'' صبیحہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''سوتیلی بہن۔ مجھے گھڑی کی ریکارڈنگ سے اس کا علم ہوا ہے۔ میں تمہیں ساری بات بتاتی ہوں۔''
عدنان کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا کہ وہ خاصا متجسس ہو گیا تھا۔
صبیحہ نے اسے ساری بات بتائی۔ عدنان کوئی سوال کیے بغیر خاموشی سے سنتا رہا۔ سب کچھ بتانے کے بعد صبیحہ نے کہا۔ ''یہی باتیں جان کر میں بہت زیادہ ڈسٹرب ہوئی ہوں۔ میرے والد نے، بلکہ اس میں میری والدہ کا بھی ہاتھ ہوگا، پروین اور اس کی ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، بلکہ بہت برا کیا۔ مجھے اب پروین سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ اس نے جو کچھ کیا، ایک انتقامی جذبے کے تحت کیا۔ ماں کی طرف سے اس کی رگوں میں پختون خون دوڑ رہا ہے۔''

''ہوں۔'' عدنان نے سر ہلایا۔ ''تمہاری باتوں سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم اس زیادتی کا ازالہ کرنا چاہتی ہو جو تمہارے والد نے ان ماں بیٹی کے ساتھ کی تھی۔''
''ہاں عدنان! تم نے ٹھیک سمجھا ہے۔''
''لیکن اب اگر میں بھی چاہوں بھی تو اسے سزا سے نہیں بچا سکتا۔ وہ اب تک اعتراف کرنے سے گریز کر رہی ہے لیکن اس کے خلاف بہت ثبوت جمع ہو چکے ہیں۔ اس کے گھر سے اس کا کمپیوٹر اٹھا لیا گیا ہے۔ کمپیوٹر کا سارا ریکارڈ اس کے خلاف بہت اہم ثبوت ہوگا۔ کمپیوٹر متعلقہ ایکسپرٹ کو دیا جا چکا ہے۔ میں اس نفسیاتی اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر سے بھی مل چکا ہوں۔ مجھے اس سے معلوم ہوا تھا کہ وہاں پروین کی ماں برسوں سے زیر علاج ہیں۔''
''بہت زیادتی ہوئی ان کے ساتھ۔'' صبیحہ اداس تھی۔
''خاتون کو ان کے بھائی نے اسپتال میں داخل کرایا تھا۔ وہ اس وقت نابینا نہیں ہوئے تھے۔ وہی اپنی بہن سے ملنے آیا کرتے تھے۔'' عدنان نے کہا۔ ''یہ سب کچھ مجھے وہاں کے ایڈمنسٹریٹر ہی نے بتایا ہے۔ یہ بھی کہ اب تو برسوں سے خاتون سے ملنے کے لیے ان کی بیٹی پروین آیا کرتی تھی۔''
''پروین کے ماموں سے بھی بیان لیا گیا ہوگا۔''
''ہاں۔'' عدنان نے جواب دیا۔ ''وہ صاحب قطعی بے خبر ہیں کہ پروین اس دوران میں کیا کرتی رہی ہے۔ مختصر بات یہ ہے صبیحہ کہ اب سارا معاملہ بہت سے لوگوں کے علم میں آ چکا ہے۔ بات اب میرے ہاتھ سے قطعی نکل چکی ہے۔ میں پروین کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ضرور ممکن ہے کہ تم ایسا بیان دو جس سے پروین کے خلاف مقدمہ زیادہ تقویت نہ پا سکے۔ اس کے علاوہ اب جو ریکارڈنگ تم نے سنی ہے، اسے بھی مقدمے کا حصہ نہ بنایا جائے۔''
''تمہاری آخری بات تو میں یقیناً چاہوں گی۔ اگر یہ باتیں بھی اخبارات میں آ گئیں تو مجھے اپنے جاننے والوں میں کچھ خفت محسوس ہوگی۔''
''لیکن اس سے عام لوگوں میں پروین کے لیے ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ اگرچہ وہ ہمدردی عدالت سے پروین کی سزا میں تخفیف نہیں کرا سکتی۔''
''تو پھر میں خفت سے بچ جاؤں تو بہتر ہے نا!''
''ٹھیک ہے۔ تم اپنے بیان میں اس ریکارڈنگ کا

کوئی حوالہ نہیں دینا۔"
"شبنم نے کچھ بیان دیا ہے؟"
"ہاں۔" عدنان نے کہا۔ "پروین اور احفاظ کی باتوں کی ریکارڈنگ سے اس کے بیان کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔ وہ تمہیں بھی صرف ڈرانا دھمکانا چاہتی تھی۔ وہ اس بات سے آخر تک بے خبر رہی کہ اس کے ہاتھ میں اصلی ریوالور تھا۔ وہ بہت غصے میں کہہ رہی تھی کہ قتل کی سزا اسے نہیں بلکہ احفاظ کو ملنی چاہیے۔"
"بات اس کی درست ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ احفاظ بھی پروین کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا تھا۔"
"اب اس سے بھی ہمدردی محسوس کر رہی ہو کیا؟"
"میں تو شبنم سے بھی ہمدردی محسوس کر رہی ہوں۔ یہ سب کچھ ہرگز نہ ہوتا اگر میرے سوتیلے والد نے ان ماں بیٹی کے ساتھ زیادتی نہ کی ہوتی۔"
"ہوں۔" عدنان پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔ "لیکن تم اپنے یہ جذبات عدالت کے دل میں نہیں ڈال سکتیں۔"
"اتنا تو میں بھی سمجھتی ہوں۔ جو فیصلہ قانون کے مطابق ہونا چاہیے، وہی ہوگا۔ اب تم مجھے یہ سمجھا دو کہ بیان کیا دوں۔ اور ہاں! کیا میں پروین سے مل سکتی ہوں؟"
"ہاں مل سکتی ہو۔ ملاقات کر کے اس کے سامنے بھی اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتی ہو؟"
"ہاں۔"

☆☆☆

لیکن جب پروین کو بتایا گیا کہ صبیحہ اس سے ملنا چاہتی ہے تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ اسی دن اس نے ان باتوں کا بھی اعتراف کر لیا جو وہ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔ یہی احفاظ نے بھی کیا تھا۔

ان تینوں پر مقدمہ چلا۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں سخت سزائیں ملیں گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ عدالت نے تمام حالات کو سامنے رکھتے ہوئے شبنم کو عمر قید کی سزا نہیں سنائی۔ پروین کو بھی چار سال اور احفاظ کو ساڑھے تین سال کی سزا سنائی گئی۔

احفاظ کو جیل میں اپنی اچھی روش کی وجہ سے معینہ مدت سے چند ماہ قبل رہا کر دیا گیا۔ صبیحہ کو اس کا علم نہیں ہو سکا تھا ورنہ شاید وہ اس سے ملاقات کرنا چاہتی۔ احفاظ خود بھی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ ملنا تو کیا، اس کے بعد صبیحہ کو کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔

کچھ تخفیف پروین کی سزا میں بھی ہوئی۔ صبیحہ کو اس کا علم ہو گیا تھا۔ اسی لیے جب پروین جیل سے باہر نکلی تو صبیحہ کو اپنے سامنے پا کر ٹھٹک گئی۔

صبیحہ اس طرح آگے بڑھی جیسے اسے اپنے سینے سے لگا لینا چاہتی ہو لیکن پروین تیزی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔
"نہیں۔" اس کے منہ سے نکلا۔ "جب تم نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، اس وقت میرے جذبات کچھ اور تھے، اب کچھ اور ہیں۔ مجھے احساس ہو چکا ہے کہ میں نے غلطی کی تھی۔ تمہارے والد نے جو کچھ کیا اس کا انتقام تم سے لینے کے بارے میں مجھے سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ بس میرے انتقام نے مجھ سے وہ سب کچھ کروا دیا۔ میں اب خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ تم مجھے اپنے سینے سے لگاؤ۔"
"جب تمہیں یہ احساس ہو چکا ہے تو تمہیں میرے جذبات کا احترام کرنا چاہیے پروین!" صبیحہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اگر میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں سزا ہی نہیں ہونے دیتی۔ آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ...... میری اچھی ......میری پیاری بہن!"
شاید لفظ "بہن" کا اثر تھا کہ پروین جذباتی ہو کر صبیحہ سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
جب صبیحہ اسے اپنی کار میں وہاں سے لے جا رہی تھی تو اس نے پروین سے کہا۔ "تمہارے ماموں کا انتقال ہو چکا ہے پروین!"
"معلوم ہے مجھے۔" پروین نے کہا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ "جیل کے حکام سے مجھے اس کی اجازت مل گئی تھی کہ ان کا آخری دیدار کر سکوں۔ پولیس مجھے جیل سے ان کا دیدار کرانے لے گئی تھی۔"
"مجھے اس کا علم بروقت نہیں ہوا تھا ورنہ میں بھی آتی اور تم سے وہاں ملاقات ہو جاتی۔"
پروین کچھ نہیں بولی، نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔
"احفاظ کافی دن پہلے رہا ہو گیا تھا۔" صبیحہ نے بتایا۔ "مجھے اس کا بھی علم بعد میں ہوا۔ رہائی کے بعد وہ کہاں چلا گیا، یہ میں نے جاننے کی کوشش تو کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہو سکی۔ شرمندگی کے احساس کے ساتھ وہ نہ جانے کہاں چلا گیا۔"
پروین نے اس اطلاع پر ایک مرتبہ سر اٹھا کر صبیحہ کی طرف دیکھا اور دوبارہ نظریں جھکا لیں۔
"اپنی ماں کے بارے میں کچھ معلوم ہوا ہے

تمہیں؟''

''نہیں۔'' پروین نے جواب دیا، پھر بولی۔ ''ابھی تم مجھے کہاں لے جارہی ہو؟''

''اپنے گھر۔ کیا تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟''

''نہیں۔'' پروین نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''جب میرے لیے تمہارے جذبات یہ ہیں تو میں اس پر اعتراض کیسے کرسکتی ہوں۔ وہاں میں اپنا حلیہ درست کرنے کے بعد انہیں دیکھنے جاؤں گی۔ نہ جانے وہ زندہ ہیں بھی یا نہیں۔'' آخری فقرہ کہتے ہوئے پروین آبدیدہ ہوگئی تھی۔

''میں تمہیں یہ خوشخبری سنانا چاہتی ہوں کہ وہ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ٹھیک بھی ہوچکی ہیں، اپنے ہوش وحواس میں ہیں۔''

پروین چونک پڑی۔

''ہاں۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''جن دنوں تم پر مقدمہ چل رہا تھا، انہی دنوں میں نے انہیں اسپتال سے ڈسچارج کروایا تھا۔ علاج کے لیے انہیں میں اپنے ساتھ امریکا لے گئی تھی۔ بعد میں بھی انہیں دیکھنے امریکا جاتی رہی ہوں۔ وہ دھیرے دھیرے ٹھیک ہونے لگی تھیں اور اب تو بالکل ٹھیک ہیں۔ میں اسپتال فون کرکے ان کی حالت معلوم کرتی رہی ہوں۔ اب تو انہیں اپنا ماضی بھی یاد آچکا ہے۔ پرسوں ہی میں انہیں امریکا سے لے آئی ہوں۔''

پروین پھر چونک کر بولی۔ ''تمہارے گھر پر ہیں وہ؟''

''ہاں۔'' صبیحہ نے کہا۔ ''میں نے انہیں پرسوں سب کچھ بتادیا تھا۔ یہ بھی کہ آج تم رہا ہونے والی ہو اور میں تمہیں لینے جاؤں گی۔ وہ بڑی بے چینی سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔''

پروین کے ہونٹ کپکپانے لگے۔ آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن حد درجہ جذباتی ہوجانے کے باعث بول نہیں سکی اور پھر صبیحہ کی گود میں سر ڈال کر بے تحاشا رونے لگی۔ اس موقع پر اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اس کی انتہائی مسرت کا ردعمل تھے۔

صبیحہ نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ''احسان ملک نے تم دونوں کے ساتھ جو زیادتی کی تھی، اس کا ازالہ تو میں کسی طرح بھی نہیں کرسکتی تھی لیکن جو کچھ ممکن تھا، وہ میں نے کیا۔''

کچھ دیر تک رونے کے بعد پروین نے صبیحہ کی گود سے اپنا سر اٹھایا اور اپنی آنکھیں خشک کرنے لگی۔

ایک بار پھر وہ اس وقت روئی جب گھر پہنچ کر اپنی ماں کے سینے سے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ماں کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے تھے۔

جب ان دونوں کے جذبات کا طوفان ٹھنڈا ہوا تو صبیحہ نے ایک کاغذ پروین کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس پر دستخط کردو۔''

''یہ کیا ہے؟'' پروین نے کاغذ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کچھ تعجب سے کہا۔

''پارٹنرشپ ڈیڈ......'' صبیحہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اس پر میں دستخط کرچکی ہوں۔ اب تم بھی کردو۔ اس کے بعد تم اس کاروبار میں برابر کی شریک ہوگی جو ابھی تک صرف میرا ہے۔ اسے عروج دینے میں یقیناً احسان ملک کی دن رات کی محنتوں کا ثمر بھی شامل تھا لہٰذا اس میں کچھ حصہ تمہارا بھی تو ہوا۔''

حیرت سے پروین کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

صبیحہ بولی۔ ''اپنی والدہ کی غلطی کا اس سے زیادہ اور کیا ازالہ کرسکتی ہوں میں پروین!'' اس وقت صبیحہ کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔

پروین تیزی سے اٹھ کر صبیحہ سے لپٹ گئی۔ وہ دن ان دونوں کے لیے شدتِ جذبات سے رونے ہی کا دن تھا۔

اس موقع پر پروین کی والدہ نے صبیحہ کو اپنے دائیں بازو میں اور پروین کو بائیں بازو میں سمیٹ لیا۔

اچانک صبیحہ نے سر اٹھایا اور کہا۔ ''اور سنو میرا احفاظ پر بھی کوئی حق نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے خلع کی درخواست داخل کرادی ہے۔''

''نہیں اب مجھے اس شخص کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے جو حسن اور دولت کی خاطر اپنی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دے مگر انسانی رشتوں کی کوئی پروا نہ کرے۔ اسے شبنم کے بعد مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی اور میرے بعد تم سے...... چاہے میں نے کتنا ہی مجبور کردیا ہوتا مگر...... اس کی اپنی بھی تو کوئی رائے ہونی چاہیے تھی۔'' پروین نے نفرت انگیز لہجے میں کہا تو صبیحہ نے گہری سانس لے کر کہا۔

''اب یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے میں کہہ چکی ہوں...... بہرحال میری نظر میں وہ صرف ایک بھونرا ہے اور کچھ بھی نہیں...... لہٰذا میں نے اس سے الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

میں نے بھی......'' پروین نے بھی افسردگی سے کہا اور سر جھکا لیا۔



تیسرا رنگ

انوکھا سودا

ایچ اقبال

کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب اور بڑے آدمی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن اس تلخ حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ عورت ہی مرد کو ناکامیوں اور پستی کے گہرے غار میں بھی دھکیل دیتی ہے۔ وہ نادان بھی صرف اپنے شوہر کی محبت کے لازوال سرمائے سے مطمئن نہ ہو سکی تھی۔ دنیاوی آسائشات کے خواب اُسے رات دن بے چین رکھتے۔ وہ ایک شان دار اور پرتکلف زندگی گزارنے کی خاطر ایک ایسا سودا کر بیٹھی تھی جس کے انجام کی ہولناکی کا خود اُسے بھی کوئی اندازہ نہ تھا۔

دو محبت کرنے والوں کا فسانۂ عبرت ان کے درمیان دولت کی دیوار کھڑی ہوگئی تھی

فلم انڈسٹری کی خوب صورت اور نامور ہیروئن نائلہ خان اس دن شدید زکام کی وجہ سے شوٹنگ کے لیے نہیں جا سکی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ سونے سے پہلے اخبار کے میگزین ایڈیشن کی صفحات پر جستہ جستہ نظر ڈالنے لگی اور رنگین صفحے پر ایک تصویر دیکھ کر چونک گئی۔

وہ تصویر ایک نوبیاہتا جوڑے کی تھی۔ لڑکے کا نام شاہد اور لڑکی کا نام افروز تھا۔ دونوں ہی کافی خوب صورت تھے۔ تصویر کے ساتھ شائع شدہ عبارت سے نائلہ خان کو معلوم ہوا کہ شاہد ٹیلی وژن کے ایک معروف ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازم تھا اور ایک نہایت کامیاب ڈرامے کے حوالے سے یہ بھی درج تھا کہ اس ڈرامے کی زیادہ تر ہدایت کاری کے فرائض شاہد ہی نے سرانجام دیے تھے اور شوبزنس کے بعض مبصرین کا خیال تھا کہ شاہد کا مستقبل بہت تابناک ہوگا۔

نائلہ خان میگزین ایڈیشن ایک طرف ڈالتے ہوئے بستر سے اٹھی اور ٹیلی فون پر ادریس شاہ کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔

ادریس شاہ ایک فلمی ہفت روزہ کا رپورٹر اور فوٹو گرافر تھا کیونکہ ہفت روزہ اخبارات کے دفاتر میں رات کو عموماً کام نہیں ہوتا اسی لیے ادریس شاہ کو اس وقت اپنے گھر پر ہی ملنا چاہیے تھا بشرطیکہ وہ کسی فنکشن میں گیا ہوا نہ ہوتا۔

نائلہ خان کی خواہش تھی کہ وہ اسے گھر پر ہی مل جائے اور اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ ادریس شاہ گھر پر ہی تھا۔ نائلہ خان جیسی نامور اداکارہ کی آواز سن کر اس کی باچھیں کھل گئی ہوں گی۔ وہ بولا۔

”میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔“

”مجھے تم سے ایک کام ہے ادریس شاہ! کیا تم اس وقت میرے گھر آ سکتے ہو؟“

”میں ٹیلی فون پر نہیں پوچھوں گا کہ آپ کو مجھ ناچیز سے کیا کام آ پڑا۔ میں بس سر کے بل حاضر ہو رہا ہوں۔“

نائلہ خان نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ریسیور رکھ دیا۔ اسے خوب احساس تھا کہ اس جیسی اداکارہ کا ٹیلی فون ادریس شاہ جیسے رپورٹر کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا نائلہ خان کے لیے صدرِ امریکا کا اچانک فون ہو سکتا تھا۔

ادریس شاہ کے انتظار میں آدھا گھنٹا لگ سکتا تھا۔ نائلہ خان بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگی اور ماضی کی کچھ یادیں اس کے دماغ میں کسی فلم کی طرح متحرک ہو گئیں۔

نائلہ خان تئیس سال کی تھی جب اس نے فلمی دنیا میں قدم رکھا تھا اور کامیابیوں نے اس کے قدم چومنے میں اتنی تیزی دکھائی تھی جیسے انہیں فلم انڈسٹری میں اس کی آمد کا انتظار ہی رہا ہو۔ ایک سال کے اندر اندر اس نے اپنے معاوضے میں خاصا اضافہ کیا اور صرف دو سال بعد وہ ایک ایسی اداکارہ بن گئی جسے دوسری ہیروئنوں سے کئی گنا زیادہ معاوضہ دے کر فلموں میں لینے کی کوشش کی جاتی تھی پھر چار سال میں ہی یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ فلم انڈسٹری کی سب سے زیادہ امیر شخصیت بن چکی ہے۔

اب نائلہ خان کو فلم انڈسٹری میں نو سال گزر چکے تھے۔ اس کی عمر بتیس سال ہو چکی تھی لیکن اس نے یوگا کی ورزشوں سے اپنے جسم کو اتنا سنبھالے رکھا تھا کہ وہ اب بھی پچیس چھبیس سال سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی تھی اور بدستور تمام ہیروئنوں پر سبقت حاصل کیے ہوئے تھی۔

آدھے گھنٹے سے ذرا پہلے ادریس شاہ اس کے گھر پہنچ



گیا۔ نائلہ خان نے اس سے اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں ملاقات کی۔ اس وقت وہ میگزین اس کے ہاتھ میں تھا جس میں اس نے شاہد اور افروز کی تصویر دیکھی تھی۔

ادریس شاہ کے کندھے سے لٹکا ہوا کیمرا دیکھ کر وہ خفیف سی مسکرادی اور بولی "اس وقت میں کوئی تصویر نہیں کھنچواؤں گی۔ میں اس وقت ذہنی طور پر کچھ ایسی کیفیت میں ہوں کہ کوئی اچھا پوز نہیں دے سکوں گی۔"

"آخر آپ کو ایسی کیا پریشانی ہو سکتی ہے؟"

"پریشانی تو نہیں کہا جانا چاہیے۔ میں بس کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوں۔"

"اگر مجھے کچھ معلوم ہوا تو ضرور بتاؤں گا۔"

"تھوڑا بہت تو شاید تمہیں علم ہو لیکن میں تفصیلات چاہتی ہوں۔" نائلہ خان نے میگزین کھول کر تصویر ادریس شاہ کے سامنے رکھ دی۔

ادریس شاہ نے تصویر پر ایک نظر ڈالی اور بولا "شاہد صاحب کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ ٹیلی وژن پر ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کسی فنکشن میں بھی مل جاتے ہیں۔ بہت معقول اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ ان کی شادی کی یہ تصویر اس میگزین نے بہت تاخیر سے چھاپی ہے۔ ان کی شادی کو چھ ماہ گزر چکے ہیں اور میرے اخبار نے ان کی شادی کی تصویر چار دن بعد ہی چھاپ دی تھی۔"

"چھ ماہ۔" نائلہ خان بڑبڑائی پھر اس نے پوچھا "ان کی ازدواجی زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"اتنی زیادہ معلومات تو مجھے نہیں ہیں۔ شاہد صاحب کے بارے میں بس میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا ابھی بتا چکا ہوں۔"

"لیکن میں ان کی زندگی کی جزئیات سے بھی واقف ہونا چاہتی ہوں۔" نائلہ خان مسکرائی "اس قسم کے کام ویسے تو پولیس ہی کرتی ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ رپورٹر حضرات بھی پچاس فیصد جاسوس تو ہوتے ہی ہیں۔ ممکن ہے میں نے شرح کم بتائی ہو۔ خیر! تو میں چاہتی ہوں کہ تم یہ کام کرو۔ جب یہ دونوں یکجا ہوں تو ان کی تصاویر بھی کھینچو اور اگر ممکن ہو تو ان کی باتیں بھی ریکارڈ کرلو۔"

ادریس شاہ کے چہرے پر سنجیدگی نظر آنے لگی اور وہ کچھ سوچنے لگا۔

"کیوں!" نائلہ خان بولی "کیا یہ کام مشکل ہے؟"

"نہیں۔" ادریس شاہ مسکرا پڑا "معاف کیجیے گا، فلمی دنیا کے لوگوں کی اندرونی زندگی کا کھوج لگانے کے لیے تو ہم اس قسم کے کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ میں یہ سوچنے لگا تھا کہ اس کام میں زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ وہ دونوں روزانہ ہی گھومتے پھرتے رہتے ہوں۔"

"تم دفتر سے چھٹی لے لو۔" نائلہ خان نے کہا اور براؤن رنگ کا ایک لفافہ ادریس شاہ کے سامنے ڈالتے ہوئے بولی "اس میں دس ہزار ہیں۔ کام ہوجانے پر اتنی ہی رقم اور بھی دوں گی۔ ہاں اگر تمہارے کام سے مجھے تسلی ہوئی تو اس رقم میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس سلسلے میں تمہارے جو بھی اخراجات ہوں گے، وہ بھی میں ہی ادا کروں گی۔"

"پیسوں کا معاملہ بیچ میں لاکر آپ مجھے شرمندہ کررہی ہیں۔" ادریس شاہ نے تکلف کا مظاہرہ کیا۔

"اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ تمہارا وقت صرف ہوگا لہٰذا تمہیں اس کا معاوضہ ملنا ہی چاہیے۔"

"مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ آپ کو ان دونوں کی زندگی سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟"

"یہ نہ بتانے کا میں ایک الگ ہرجانہ ادا کردوں گی۔" نائلہ خان مسکرائی "میں نے کسی اخبار کو طویل انٹرویو کبھی نہیں دیا۔ یہ کام ہوجانے کے بعد تمہارے اخبار کے لیے بہت طویل انٹرویو دوں گی۔"

"صحیح معنوں میں تو وہی میرا اصل معاوضہ ہوگا۔"

نائلہ خان نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی خوب صورت گھڑی میں وقت دیکھا۔ ادریس شاہ نے اشارہ سمجھ لیا اور فوراً بولا "تو پھر اب میں چلتا ہوں۔"

○☆○

شام کے وقت ساحلِ سمندر کے ایک ویران حصے میں گیلی ریت پر۔ اتنی لمبی دوڑ لگائی کہ افروز کی سانس بری طرح پھول گئی اور وہ ریت پر گر پڑی ...... شاہد ہنسنے لگا۔ افروز منہ بنا کر بولی۔

"تم مجھے اسی طرح دوڑاتے رہے تو کسی دن میرے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے۔"

"تمہارے پھیپھڑے بہت مضبوط ہیں۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے تو تمہارا فزیکل چیک اپ ہوا تھا۔"

"سب چیک اپ دھرا رہ جائے گا۔ اتنا دوڑا کر تم مجھے ہمیشہ اسمارٹ نہیں رکھ سکتے۔" افروز نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا۔

"جب تک رکھ سکتا ہوں، اس وقت تک رکھوں گا۔ چلو اب اٹھو بھی!"

"میری ٹانگوں میں بالکل سکت نہیں ہے اب! ذرا دیکھو

تو میری شلوار کا ستیاناس ہو گیا ہے۔ پانی میں تر بتر اور ریت سے وزنی ہو گئی ہے۔"

"ہوا سے شلوار ذرا سی دیر میں خشک ہو جائے گی اور ریت بھی جھڑ جائے گی۔ اچھا چلو اٹھو' کھوہ میں چل کر کچھ دیر آرام کر لو۔" شاہد نے افروز کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھنے میں مدد دی۔

اس جگہ کو "کھوہ" کا لفظ شاہد ہی نے دیا تھا ورنہ پہاڑی علاقہ تو تھا نہیں کہ وہاں کھوہ ہوتی۔ ساحل پر بکھرے ہوئے بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ وہ ایک چٹان تھی جس میں ایک کٹاؤ آگیا تھا جس کی دوسری طرف پتھروں نے وہ جگہ بند کر دی تھی اس لیے اس چٹان کے سائے میں بیٹھا تو کیا' لیٹا بھی جا سکتا تھا۔

جب افروز اور شاہد آئے تھے تو دھوپ تیز تھی اس لیے وہ دونوں گھنٹے بھر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ جب شادی کو چھ ماہ گزرے ہوں اور شادی شدہ جوڑا ایک دوسرے سے محبت بھی کرتا ہو تو کرنے کے لیے باتوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

شاہد کے کندھے کا سہارا لے کر افروز ڈگمگاتے قدموں سے شاہد کی دریافت کردہ "کھوہ" کی طرف بڑھی۔

شاہد ٹیلی وژن میں ایک ڈراما ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازم تھا۔ یہ ملازمت اسے کوئی سائبان مہیا نہیں کر پاتی لیکن اپنے مرحوم والد سے ترکے میں ایک مناسب سا مکان مل گیا تھا جس کی آرائش و زیبائش شادی کے بعد خود افروز نے کی تھی لیکن بعض اوقات بازار میں خوب صورت لیکن قیمتی چیزیں دیکھ کر وہ پیسے کی کمی کی وجہ سے دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔

افروز خود بھی کسی مالدار گھرانے سے تعلق نہیں رکھتی تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ اس کا شوہر ایک بڑا آدمی بن جائے اور وہ خوب سج دھج کر کار میں بیٹھ کر اپنے والدین سے ملنے جایا کرے لیکن شاہد کے پاس تو صرف ایک موٹر سائیکل تھی جس پر رنگ و روغن افروز نے زبردستی کرایا تھا۔

کھوہ میں پہنچ کر وہ دونوں پتھروں پر بیٹھ گئے۔ افروز کی پھولی ہوئی سانس اب کسی قدر قابو میں آچکی تھی۔ اس کا چہرہ خاصا سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔

"کیا بات ہے افروز!" شاہد نے محبت سے پوچھا "ریت پر تم کئی بار گر چکی ہو پھر آج تمہارا موڈ اتنا خراب کیوں ہو رہا ہے۔"

"اگر تم سمجھ رہے ہو کہ میرا موڈ خراب ہے تو یہ خرابی گھر سے چلتے وقت بھی تھی بلکہ کل ہی سے ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"بل ادا نہ ہونے کی وجہ سے کل ہمارا ٹیلی فون کٹ گیا تھا۔"

"یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ اگر آج اتوار نہ ہوتا تو میں دفتر سے کچھ ایڈوانس رقم لے کر بل ادا کر دیتا اور فون آج ہی بحال ہو جاتا۔ اب یہ کام کل ہو جائے گا۔"

"یہی بات تو کوفت کی ہے کہ تمہیں اس کے لیے رقم ایڈوانس لینا پڑے گی یا تم کسی سے قرض لو گے۔"

"یہ سب کچھ تو شروع سے چل رہا ہے افروز! جب ہماری شادی ہوئی تھی' اس وقت بھی میرے مالی حالات ایسے ہی تھے بلکہ ان چھ ماہ میں جو مہنگائی بڑھی ہے' وہ تو کمر توڑے ڈال رہی ہے۔"

"کیا ہمارے حالات کبھی اچھے نہیں ہوں گے؟" افروز نے بڑی یاسیت سے شاہد کی طرف دیکھا۔

"کیوں نہیں ہوں گے جانِ من!" شاہد نے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "خدا سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔"

"مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ تم باصلاحیت ہونے کے باوجود ترقی نہیں کر سکے۔ تم ہی نے مجھے بتایا تھا کہ ٹی وی کی ملازمت سے پہلے تم ایک مشہور فلم ڈائریکٹر کے اسسٹنٹ تھے۔ اس کے بعد ٹیلی وژن میں تو تمہیں ترقی مل ہی جانا چاہیے تھی لیکن تم کئی سال کی ملازمت کے باوجود اب تک صرف اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہو۔"

"یہ اس لیے کہ میں فطرتاً چاپلوس نہیں ہوں۔ ایم ڈی وغیرہ کی چاپلوسی کر کے نہ جانے کتنے لوگ مجھ سے آگے نکل چکے ہیں۔ فلم لائن میں البتہ مجھے ایک گولڈن چانس مل رہا تھا لیکن میں نے اسے ٹھکرا دیا۔"

"کیوں؟"

"وہ بھی ایسا ہی تھا جیسے میں خود کو بیچ دوں۔"

"ایسی کیا بات تھی؟"

"چھوڑو یہ قصہ' پھر کبھی بتاؤں گا۔"

افروز چپ ہو کر پھر کسی سوچ میں گم ہو گئی۔ غالباً اسے ماضی سے زیادہ مستقبل کی فکر تھی۔ "کیا کوئی ایسی تدبیر نہیں کہ ہم اپنی آمدنی میں اضافہ کر سکیں؟" وہ ذرا سا رک کر بولی۔

"اگر تمہارے ذہن میں کوئی بات ہے تو بتاؤ۔"

"کوئی خاص تدبیر تو میرے ذہن میں بھی نہیں ہے لیکن ہم ہر مہینے اگر کچھ پرائز بانڈ خرید لیا کریں تو شاید قسمت چمک

جائے۔"

"عجیب باتیں کرتی ہو تم بھی!" شاہد کا لہجہ کچھ خشک ہو گیا۔ "شاید کبھی تمہارے ذہن میں یہ خیال بھی آجاتا ہو گا کہ ہمارا کوئی دور دراز کا لاپتا عزیز اچانک مر کر ہمارے لیے لاکھوں کی دولت چھوڑ جائے!"

"تم تو ناراض ہونے لگے!" افروز نے بجھے دل کے ساتھ کہتے ہوئے اپنا سر شاہد کے کندھے پر رکھ دیا۔

"نہیں جانِ من! کیا یہ ممکن ہے کہ میں اپنی زندگی سے ناراض ہو جاؤں؟" شاہد نے اپنا خشک لہجہ سنبھال لیا "بس کبھی کبھی تمہاری یہ باتیں مجھے عجیب سی لگتی ہیں جیسے تم راتوں رات امیر بن جانا چاہتی ہو۔"

"اچھا چھوڑو۔" افروز نے بظاہر اکتائے ہوئے انداز میں کہا "آج تم نے مجھے بہت تھکا دیا ہے۔ میں کچھ دیر لیٹوں گی۔"

"لیٹ جاؤ۔" شاہد نے اپنی گھڑی دیکھ کر کہا "ابھی سورج غروب ہونے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ لگے گا۔ تم آدھے گھنٹے آرام کر لو پھر ہم یہاں سے نکل چلیں گے۔"

افروز ایک پتھر پر سر رکھ کر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

شاہد نے اپنی کمر سے بندھے ہوئے تولیے سے نجات حاصل کر کے پتلون پہن لی اور افروز کو آرام کرتا چھوڑ کر اس "کھوہ" سے نکل آیا۔

باہر نکل کر وہ صرف غروبِ آفتاب کا منظر دیکھنا چاہتا تھا جو اسے جتنا اچھا لگتا تھا، افروز کو اتنا ہی برا لگتا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ صرف طلوعِ آفتاب کا منظر زندگی کے لیے حوصلہ بخش محسوس ہوتا ہے۔ غروبِ آفتاب تو مایوسی کی علامت محسوس ہوتا ہے مجھے۔ وہ دیکھ کر تو میرا دل بھی ڈوبنے لگتا ہے۔"

"کھوہ" سے نکلتے ہی شاہد کی نظر ادریس شاہ پر پڑی اور اس نے محسوس کیا کہ ادریس شاہ اسے دیکھ کر کچھ گڑبڑا گیا تھا۔

"اِدھر کہاں آنکلے بھئی؟" شاہد نے ہنس کر کہا۔

"بس یوں ہی۔" ادریس شاہ نے جلدی سے کہا "آج بہت مصروف رہا تھا۔ سوچا اس وقت سمندر کی ہوا کھا کر کچھ تازہ دم ہو لیا جائے!"

"یہ تو ہے۔ یہاں کی فضا تازہ دم کر دیتی ہے لیکن آج اتوار کو تم کس اسائنمنٹ پر نکلے ہوئے تھے کہ کیمرا بھی ساتھ ہے۔"

"ہم رپورٹروں کے لیے چھٹی کے دن کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔"

شاہد نے سرہلایا اور پھر بولا "بہت دن سے ٹیلی وژن کی طرف نہیں آئے۔"

"بس کچھ دوسری مصروفیات رہی تھیں۔ دو ایک دن میں آؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔"

شاہد کو تعجب ہوا۔ اس نے ادریس شاہ کو اتنا عجلت پسند کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے ادریس شاہ کی گھبراہٹ بھی عجیب سی لگی تھی۔

وہ ادریس شاہ کو جاتے دیکھتا رہا اور پھر اچانک مڑ کر کھوہ میں داخل ہوا۔ وہ ماچس اور سگریٹ کا پیکٹ لینا بھول گیا تھا۔ اس نے افروز کا چہرہ دیکھتے ہی محسوس کیا کہ وہ گہری نیند سو چکی تھی۔ اس کے تھوڑے سے کھلے ہوئے یاقوتی ہونٹوں میں اس کے موتیوں جیسے دانت چمک رہے تھے۔

افروز کا اتنی جلدی سو جانا شاہد کے لیے تعجب کی بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ افروز کو نیند آنے میں دو چار منٹ بھی نہیں لگتے پھر اس وقت تو وہ خاصی تھکی ہوئی بھی تھی۔

سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس اٹھا کر شاہد پھر کھوہ سے نکل آیا۔ غروبِ آفتاب کا منظر دیکھنے کے بعد وہ افروز کو جگا دیتا۔



ادریس شاہ کے سامنے تو نائلہ خان نے کیبنٹ سائز کی رنگین تصاویر اور ٹیپ کی ہوئی گفتگو سنی ہی تھی لیکن ادریس شاہ کے جانے کے بعد اس نے دوبارہ وہ فوٹو گراف دیکھے جن میں شاہد اور افروز ساحلِ سمندر پر نظر آرہے تھے۔ ان فوٹو گراف کو دیکھتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر دوبارہ ایک عجیب سی مسکراہٹ ابھری پھر فوٹو گراف رکھ کر اس نے وہ کیسٹ بھی دوبارہ سنی جس میں ادریس شاہ نے شاہد اور افروز کی گفتگو ٹیپ کی تھی۔ اس گفتگو سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ شاہد آسودہ حالی کی زندگی نہیں گزار رہا تھا اور افروز اس سے محبت کرنے کے باوجود اس سے کچھ شاکی سی تھی کہ وہ ترقی نہیں کر رہا تھا یا نہیں کر سکا تھا۔ افروز کی باتوں سے صاف پتا چل رہا تھا کہ "امارت" اس کی زندگی کا اولین خواب تھی۔

ٹیپ ریکارڈر بند کر کے نائلہ خان ذرا دیر تک بیٹھی کچھ سوچتی رہی پھر اس نے ٹیلی فون اٹھا کر ٹی وی اسٹیشن کا نمبر ملایا۔ لائن بڑی مشکل سے ملی پھر اس نے آپریٹر سے کہا کہ وہ منیجنگ ڈائریکٹر سے بات کرنا چاہتی ہے۔

ٹی وی کا ایم ڈی تصدق زمانہ صرف شاعرانہ بلکہ عاشقانہ مزاج کا بھی مالک تھا اور نائلہ خان اسے اپنے ان پرستاروں میں سے ایک سمجھتی تھی جو اس کے ایک اشارۂ ابرو پر سب

کچھ کرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے۔

○☆○

فاضل اور شاہد بچپن کے دوست تھے اور ان کا یہ تعلق محض رسمی بھی نہیں تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے۔ دنیا میں فاضل کا کوئی قریبی عزیز نہیں تھا اور اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی اس لیے وہ کئی سال سے شاہد کے ساتھ ہی رہ رہا تھا۔ شاہد کی شادی کے بعد اس نے چاہا تھا کہ وہ اپنے لیے کوئی اور چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لے مگر شاہد نے اس کا یہ خیال سختی سے مسترد کردیا تھا۔

شادی کے کچھ دن بعد فاضل محسوس کرنے لگا کہ الگ رہ کر اس کی زندگی بہت پھیکی رہ جاتی۔ اب تو وہ خود کو ایک خوش و خرم گھرانے کا فرد سمجھنے لگا تھا۔ شاہد سے انتہائی بے تکلفی کے باوجود وہ افروز کو "بھابی" ہی کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور افروز اسے "فاضل بھیا" کہا کرتی تھی۔ کچھ ہی عرصے میں وہ دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف بھی ہو گئے تھے لیکن اس بے تکلفی کی ایک حد ضرور تھی جس سے نہ کبھی افروز نے تجاوز کیا تھا' نہ فاضل نے لیکن اس خوش گوار گھریلو فضا میں فاضل کو یہ شکایت ہمیشہ رہی کہ شاہد تو کبھی اپنی مالی پریشانی کا ذکر تک نہیں کرتا تھا لیکن افروز نے بھی یہی وتیرہ اپنایا۔ دراصل اس کی تاکید اسے شاہد نے کی تھی کہ وہ کبھی اس قسم کے معاملات کی بھنک بھی فاضل کے کانوں میں نہ پڑنے دے۔

فاضل کی ملازمت کی نوعیت "آؤٹ ڈور" قسم کی تھی اس لیے اس کا گھر آنے کا کوئی خاص وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی تو وہ دوپہر کو ہی گھر آجاتا۔ ایسے موقعوں پر کھانا بھی گھر پر ہی کھاتا۔

"کیا بتاؤں بھابی!" وہ کبھی کبھی افروز سے کہا کرتا تھا۔ "ساری زندگی تو ہوٹلوں کا کھانا کھا کر گزری لیکن تمہارے ہاتھ کے کھانے کی ایسی عادت پڑی ہے کہ اب دوپہر کو مجبوراً ہوٹل میں کھانا کھانا پڑتا ہے تو کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔"

"تو کسی نہ کسی طرح دوپہر کو کچھ وقت نکال کر گھر آجایا کرو نا فاضل بھیا!" افروز جواب میں کہا کرتی "کھانا تو گھر کا ہی اچھا ہوتا ہے۔"

لیکن فاضل کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ اکثر اپنی پیشہ ورانہ مجبوری کے باعث اسے کسی "کلائنٹ" کے ساتھ ہوٹل ہی میں کھانا کھانا پڑتا تھا۔ ہاں اگر مہلت مل جاتی تھی تو وہ گھر کا رخ کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا تھا۔

جڑواں

"میں نے سُنا ہے' تمہاری ساس نے ہر مرتبہ جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا؟"

"ہاں۔ یہ درست ہے۔"

"اور ہر مرتبہ ہم شکل جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے؟"

"یہ بھی درست ہے۔"

"تو پھر تمہیں اپنی بیوی کو پہچاننے میں کوئی دشواری تو نہیں ہوتی؟"

"نہیں تو۔ اس کے جڑواں بھائی کی خاصی گھنی مونچھیں ہیں۔"

اس روز بھی ایسا ہی ہوا اور اس نے گھر کے دروازے پر ڈاکیے کو کھڑا دیکھا جس سے افروز کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ فاضل کو دیکھ کر جلدی سے بولی "اچھا ہوا فاضل بھیا کہ تم آگئے۔ میں ان سے کہہ رہی ہوں کہ پارسل واپس لے جائیں۔ شاہد خود ہی پوسٹ آفس جا کر لے آئیں گے۔"

"کیسا پارسل ہے بھابی!"

"اسے آپ وصول کرلیں تو کیا حرج ہے!" پوسٹ مین نے پارسل فاضل کی طرف بڑھایا "میں آپ کے علاقے کا جانا پہچانا پوسٹ مین ہوں۔ پارسل میں کوئی خطرناک چیز تو نہیں دے جاؤں گا۔"

"آپ تو نہیں دے جائیں گے!" افروز بول پڑی "لیکن جس نے یہ پارسل بھیجا ہے' وہ تو کوئی حرکت کر سکتا ہے۔"

"نہیں بیگم صاحبہ!" پوسٹ مین نے جواب دیا "ڈاک خانے میں پارسل وغیرہ اچھی طرح چیک کیے جاتے ہیں۔"

فاضل پارسل کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ اس پر بھیجنے والے کا نام "زاہد کاشمیری" اور اسی شہر کے ایک متمول علاقے کا پتا لکھا ہوا تھا۔

"یہ زاہد کاشمیری کون ہے؟" فاضل نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا "میں نے شاہد سے یہ نام کبھی نہیں سنا۔"

"میں نے بھی نہیں سنا۔" افروز بولی "اسی لیے تو میں پارسل لیتے ہوئے ہچکچا رہی ہوں۔"

"خیر اجنبی نام کی وجہ سے ہچکچانے کی ضرورت نہیں۔ پوسٹ آفس میں اس قسم کی چیزیں خاص طور پر چیک کی جانے لگی ہیں۔ اس میں کوئی خطرناک چیز تو ہرگز نہیں

ہو سکتی۔"

"یہی بات میں بھی بیگم صاحبہ کو سمجھا رہا تھا۔" پوسٹ مین جلدی سے بول پڑا۔

فاضل مسکرا دیا۔ وہ پوسٹ مین کے اصرار کا سبب سمجھ رہا تھا۔ اس بے چارے کو دس پانچ روپے ملنے کا آسرا تھا جب کہ شاہد اگر خود پوسٹ آفس جاتا تو پوسٹ مین کو کچھ بھی نہ ملتا۔

فاضل کے سمجھانے پر افروز نے پارسل وصول کرلیا اور فاضل نے اپنی جیب سے پوسٹ مین کو دس روپے دے دیے۔

"اب جلدی سے کھانا کھلا دو بھابی!" فاضل نے اس وقت کہا جب افروز نے پارسل ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

"مجھے تو اس پارسل نے الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"ایسی بھی کیا الجھن! شاہد کو فون کرکے بتا دو۔"

"فون کیا تھا میں نے، وہ ملے نہیں۔ کسی ڈرامے کی شوٹنگ کے سلسلے میں فلور پر تھے۔"

"چلو چھوڑو۔ یہ کوئی الجھن کی بات نہیں ہے۔"

پھر افروز کچھ کہے بغیر کچن کی طرف چلی گئی۔

کھانے کے بعد فاضل گھر سے روانہ ہوگیا۔ اسے ڈھائی بجے کسی کلائنٹ سے ملنا تھا۔

شام کو اس کی واپسی ساڑھے سات بجے کے قریب ہوئی۔ شاہد کی موٹر سائیکل دیکھ کر اس نے سمجھ لیا کہ شاہد بھی آچکا تھا۔

افروز نے دروازہ کھولا۔

وہ پہلا کمرا ہی ڈرائنگ، ڈائننگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر شاہد وہ پارسل کھولنے میں مصروف تھا۔

"یار یہ زاہد کاشمیری کون ہے؟" فاضل بولا۔

"میں خود بھی الجھن میں ہوں کہ یہ کون حضرت ہیں۔"

"پارسل کھولو گے تو شاید الجھن رفع ہوجائے۔"

لیکن پارسل کھولنے کے بعد بھی الجھن رفع نہیں ہوسکی۔

گتے کے ایک پیکٹ میں سے ایک نہایت قیمتی ساری برآمد ہوئی تھی۔ اسی پیکٹ میں ایک چھوٹا سا ڈبا ایک قیمتی گھڑی کا بھی تھا اور اسی ڈبے میں سے ایک خط بھی نکلا۔

لکھا تھا:

شاہد صاحب! آپ یقیناً حیران ہوں گے یا ممکن ہے میرا خیال غلط ہو کیونکہ شوبزنس کے لوگوں کو ان کے پرستار تحفے بھیجا ہی کرتے ہیں۔ میں آپ کا پرستار اس وقت سے بنا ہوں جب سے میں نے "دو بتی کا کانٹا" نامی ڈراما دیکھا اور اخبارات میں پڑھا کہ دراصل اس کے ہدایت کار... آپ ہی تھے لیکن آپ کا نام اسسٹنٹ کے طور پر آیا۔ ہمارے معاشرے میں "ٹیلنٹ" کے ساتھ اس قسم کی زیادتیاں ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔ اس پر کوئی کہاں تک سر پیٹے! بہرحال میری طرف سے آپ کے اور آپ کی بیگم کے لیے جو نذرانۂ عقیدت ہے، اسے آپ میری خوشی کے لیے یقیناً قبول کرلیں گے۔ ساری کے لیے سلے ہوئے بلاؤز اور پیٹی کوٹ کے بجائے بغیر سلا ہوا کپڑا بھیجنا میری مجبوری سمجھیے۔

فقط

آپ کا پرستار، زاہد کاشمیری



وہ قیمتی ساری دیکھ کر افروز کی تو آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ وہ آٹھ دس ہزار سے کم کی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ افروز کو یقین تھا کہ شاہد کے مالی حالات جوں کے توں رہے تو وہ ساری زندگی بھی اتنی قیمتی ساری نہیں باندھ سکے گی۔ وہ ساری کو کھول کر دیکھتے ہوئے بولی۔

"کسی بڑی تقریب میں جانے کا موقع ملا تو میں یہی ساری باندھوں گی۔"

شاہد اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ وہ تحفے تحائف کے لین دین کی ریت کا مخالف تو نہیں تھا لیکن یہ بات اسے مناسب نہیں معلوم ہورہی تھی کہ وہ کسی "اجنبی پرستار" سے اتنے قیمتی تحائف لے۔ فاضل کے اظہار کے مطابق کلائی پر باندھی جانے والی وہ گھڑی بھی پندرہ ہزار سے کم کی نہیں تھی۔ اس طرح وہ تحائف پچیس ہزار سے زیادہ کے تھے۔

فوری طور سے شاہد کے ذہن میں خیال آیا کہ اسے یہ تحائف واپس کردینا چاہیے لیکن افروز کی مسرت دیکھ کر اس کا فیصلہ متزلزل ہوگیا۔ اس نے یقین کرلیا کہ اگر اس نے اپنے فیصلے پر عمل کیا تو افروز ملول ہوجائے گی۔ وہ افروز کی خواہشات سے بے خبر نہیں تھا اور اسے افروز سے اتنی ہی محبت تھی کہ اگر اس کے حالات اجازت دیتے تو وہ افروز کے قدموں میں اس کی خواہشات کے ڈھیر لگا دیتا۔

افروز نے اس بات پر بھی مسرت کا اظہار کیا کہ شاہد کے مداحوں یا پرستاروں میں زاہد کاشمیری جیسے بڑے لوگ بھی شامل ہوتے رہے تو شاہد کے لیے ترقی کے دروازے بہت جلد کھلیں گے۔

شاہد نے موقع پاکر تنہائی میں فاضل سے اس معاملے پر

گفتگو کی تو فاضل کو اپنا ہم خیال نہیں پایا۔ فاضل کی دانست میں تو یہ ایک اچھا شگون تھا کہ شاہد کے مداحوں میں بڑے لوگ بھی شامل ہونے لگے تھے۔

شاہد نے اپنے طور پر فیصلہ کیا کہ وہ زاہد کاشمیری کے گھر جا کر اس کا شکریہ تو ضرور ادا کرے گا اور یہ بھی کہے گا کہ اتنے قیمتی تحائف پا کر وہ خود کو زیر بار محسوس کر رہا ہے۔

فوری طور پر شاہد کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی حالانکہ وہ دوسرے دن ہی اس پتے پر گیا تھا جو پارسل پر بھیجنے والے کے نام کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ وہ ایک شاندار کوٹھی تھی جس کے ملازمین نے بتایا کہ "صاحب" گزشتہ روز ہی اپنی فیملی کے ساتھ پہاڑوں کی سیر کے لیے جا چکے تھے اور ان کی واپسی دس پندرہ دن سے پہلے ممکن نہیں تھی۔

شاہد دفتر سے واپسی پر زاہد کاشمیری کے گھر گیا تھا۔ وہاں سے وہ اپنے گھر پہنچا۔ اس روز فاضل نے فون پر افروز کو بتایا کہ اسے کئی افراد سے ملاقاتیں کرنا تھیں اس لیے وہ ساڑھے نو بجے سے پہلے گھر نہیں آسکے گا اور رات کا کھانا بھی کھا کر آئے گا۔

شاہد اور افروز نے بہت دن بعد فاضل کے بغیر کھانا کھایا۔

کھانے کے دوران میں افروز بولی "کل آپ دفتر سے کچھ جلدی نہیں آسکتے؟"

"مشکل ہے۔ کل بھی خاصا کام ہوگا۔ کیوں، کوئی خاص بات؟"

"اس ساری کا پیٹی کوٹ تو میں خود سی لوں گی لیکن بلاؤز کسی اچھے درزی سے سلوانا چاہتی ہوں۔"

یہ شاہد کے لیے کوئی پسندیدہ موضوع نہیں تھا لیکن افروز کی خاطر اس نے اپنے چہرے سے اپنے دلی جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا اور بولا "اس کام کے لیے یہ ضروری تو نہیں کہ میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں۔ تم ٹیکسی کر کے خود ہی چلی جانا یا فاضل سے بات کر لینا۔ ممکن ہے کل اس کے پاس کچھ وقت ہو۔ اس کے ساتھ چلی جانا۔"

"عموماً تو میں انہی کو بور کرتی ہوں۔"

"اس میں بور کرنے کی کوئی بات نہیں۔ فاضل کو تو خوشی ہوتی ہے تمہارا کوئی کام کر کے۔ یہ مناسب بھی رہے گا کہ تمہیں ٹیکسی میں نہ جانا پڑے۔"

فاضل کے دل میں یہ سوال بھی ابھرا تھا کہ بلاؤز سلوانے کی اتنی جلدی کیا ہے لیکن اس نے یہ سوال بھی زبان پر لانا مناسب نہیں سمجھا۔ افروز سے محبت کے باعث وہ اکثر اپنے خیالات و جذبات کا گلا گھونٹ لیا کرتا تھا۔

دوسرے دن شاہد دفتر سے لوٹا تو معلوم ہوا کہ افروز، فاضل کے ساتھ بازار ہو آئی تھی۔

"اور آپ کے لیے ایک تحفہ بھی لائی ہوں۔" افروز نے سوٹ کا نہایت قیمتی کپڑا اس کے سامنے رکھ دیا۔

"اتنے پیسے......" شاہد کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

"جناب!" افروز بول پڑی تھی "میں نے چھ ماہ میں جو بچت کی تھی، اسی سے خریدا ہے یہ کپڑا۔ آخر جب میں وہ قیمتی ساری باندھوں گی تو آپ کے جسم پر بھی کوئی معمولی سوٹ نہیں ہونا چاہیے۔"

شاہد کو یہ فضول خرچی ٹھیک نہیں لگی تھی لیکن اس نے ہنس کر بات ختم کر دی۔

شاہد کا ایک مستقل درزی تھا اس لیے اسے ناپ دینے کے لیے جانے کی ضرورت نہ پڑی۔

ایک ہفتے میں ہی اس کا سوٹ اور افروز کا بلاؤز سل کر آ گئے۔ سلائی کے پیسے شاہد کو ادا کرنے پڑے تھے۔

پھر دو ہی دن گزرے تھے کہ شاہد کو ایک دعوت نامہ موصول ہوا جس نے اسے حیران کر دیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے ادارے کا منیجنگ ڈائریکٹر اسے اپنے گھر کی

کسی تقریب میں مدعو کرے گا۔ دعوت نامہ تصدق رسا کی بیوی کی پینتیسویں سالگرہ کا تھا۔

"یہ موقع ہوگا، وہ ساری باندھنے کا!" افروز چہکی۔

"مجھے حیرت ہے کہ مینیجنگ ڈائریکٹر نے اپنے ادارے کے مجھ جیسے معمولی ملازم کو اپنی گھریلو تقریب میں بلایا ہے۔" شاہد بولا۔

"تمہیں حیرت نہیں ہونا چاہیے۔" فاضل نے خیال ظاہر کیا "یہ بات اب خاصی مشہور ہو چکی ہے کہ اس ڈرامے کے ہدایت کار دراصل تم تھے۔ تمہارے ایم ڈی سے بھی یہ بات پوشیدہ نہیں رہی ہوگی۔ اب ان کی نظر میں تمہاری اہمیت بڑھنا ہی چاہیے۔ یوں سمجھو کہ اب قسمت نے تمہارے دروازے پر دستک دینے کا ارادہ کرلیا ہے۔"

شاہد کچھ سوچ کر بولا "اس تقریب میں تم بھی چلو ہمارے ساتھ۔"

"نا بابا نا! کارڈ پر صرف مسٹر اینڈ مسز شاہد لکھا ہے۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس قسم کی تقریبات میں لوگ اپنے ساتھ کسی کو بھی لے کر پہنچ جائیں تو میزبان بالکل برا نہیں مانتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے طفیل بننا پسند نہیں۔"

"تمہارے پیشے کے اعتبار سے بھی یہ تقریب تمہارے لیے سودمند ثابت ہو سکتی ہے۔"

اس دلیل کے بعد بھی فاضل ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا لہٰذا شاہد نے افروز کو اشارہ کیا اور وہ اشارہ سمجھ کر بول پڑی "ہمارے ساتھ تو تم کو طفیل بننا ہی پڑے گا فاضل بھیا! جو قیمتی لباس ہم پہنیں گے، اس کی وجہ سے یہ تو ضروری ہے کہ ہم موٹر سائیکل کے بجائے کار میں جائیں۔"

"تو تم لوگ میری کار لے جانا۔"

"فاضل بھیا!" افروز ٹھنکی۔

"اچھا بھائی!" فاضل نے ٹھنڈی سانس لی "چلا چلوں گا میں بھی۔" پھر اس نے مصنوعی غصیلے انداز میں شاہد سے کہا "یہ ترپ چال ضرور تم نے چلوائی ہے۔ جانتے ہو نا کہ میں بھابی کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔ میں نے تمہارا اشارہ نہیں دیکھا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم نے بھابی کو اشارہ کیا ہوگا۔"

افروز بے اختیار مسکرا دی اور شاہد نے ہنس کر فاضل کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس خیال سے خوش وہ بھی تھا کہ اب شاید اس کے لیے ترقی کی راہیں کھل جائیں۔

تقدیر کی دیوی اس وقت شاہد کی خوش فہمی پر مسکرا رہی ہوگی۔

○☆○

مقررہ شام کو شاہد، افروز اور فاضل، تصدق رسا کے بنگلے پر پہنچ گئے جن کے لان میں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خود تصدق رسا اور اس کی بیگم نے ان کا استقبال کیا۔ شاہد نے تصدق رسا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے اپنی ایک گھریلو تقریب میں مدعو کیا تھا۔

افروز، فاضل اور تصدق رسا کی بیگم کا تعارف بھی ہوا جس کے بعد ان تینوں کو ایک خالی میز تک پہنچا دیا گیا۔ تصدق رسا اور اس کی بیگم کو ابھی مزید مہمانوں کا استقبال کرنا تھا۔

سات بج چکے تھے لیکن ابھی پورے مہمان نہیں آئے تھے حالانکہ کارڈ میں صرف عصرانے کا حوالہ دیا گیا تھا، رات کے کھانے کی دعوت نہیں دی گئی تھی۔

"غیر معمولی تاخیر سے آنا اب لوگوں نے فیشن بنالیا ہے۔" فاضل بڑبڑایا۔

افروز مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے مہمانوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی توجہ کا مرکز خواتین تھیں جن سے اپنا موازنہ کرکے اسے پورا اطمینان حاصل ہو رہا تھا کہ وہ ان سے کمتر نہیں نظر آ رہی تھی۔ اس کے پاس شادی کے زیورات تو تھے ہی اور منہ دکھائی میں کسی سے ایک قیمتی گھڑی بھی مل چکی تھی۔ اگر کچھ کسر رہ جاتی تو لباس کی وجہ سے رہ جاتی کیونکہ اس کے پاس زیادہ قیمتی ساریاں نہیں تھیں۔ یہ کمی اس ساری کی وجہ سے پوری ہو گئی تھی جو شاہد .... کے ایک اجنبی پرستار کی وجہ سے ملی تھی۔

شاہد اس قیمتی سوٹ میں ملبوس تھا جو اس کے لیے افروز نے بنوایا تھا۔ اسی کے اصرار پر شاہد کو وہ قیمتی گھڑی بھی باندھنا پڑی تھی جب کہ خود اس نے وہ گھڑی باندھنے سے گریز کرنا چاہا تھا۔ افروز کی خاطر یہ سب کچھ کرکے اس نے اپنے دماغ پر ایک بوجھ لے لیا تھا۔ اس کی دانست میں یہ ایک جھوٹی خود نمائی تھی۔ وہاں ٹی وی کی اداکارائیں، اداکار اور ٹی وی ہی کے مختلف شعبوں کے بڑے بڑے لوگ موجود تھے جو شاہد کی دانست میں یقیناً محسوس کرتے کہ اس نے اس تقریب میں شرکت کے لیے اپنی بساط سے زیادہ اخراجات کیے تھے۔

ان میں سے کچھ افراد شاہد کی میز پر بھی آئے اور "ہیلو ہائے" کرکے چلے گئے۔

مہمانوں کی آمد کا سلسلہ مکمل ہو چکا تھا جب یہ غلغلہ اٹھا کہ تمام مہمان اس میز کی طرف آئیں جہاں تصدق رسا کی

بیوی کو اس تقریب کا کیک کاٹنا تھا۔

جب یہ رسم ادا کی جا رہی تھی' اس وقت شاہد نے تصدق رسا کی بیوی کے برابر میں فلم کی نامور آرٹسٹ نائلہ خان کو بھی دیکھا اور چونک پڑا۔ افروز نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور دبے ہوئے پُرمسرت لہجے میں بولی "نائلہ خان بھی ہے۔ میری تو بڑی خواہش تھی کہ اسے کبھی قریب سے دیکھوں۔ کیوں شاہد۔ !کیا یہ ممکن ہے کہ تصدق صاحب اس سے ہمارا تعارف کرائیں!"

"آؤ۔" شاہد نے اسے جواب دینے کے بجائے افروز کا ہاتھ پکڑا اور اسی میز کی طرف بڑھتا چلا گیا جہاں وہ پہلے بیٹھے تھے۔ وہ افروز سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تصدق رسا نے ان کے قریب آکر کہا۔

"کیوں شاہد! کیا تم لوگ کچھ کھاؤ پیو گے نہیں!"

"ذرا ہجوم کم ہو جائے۔" شاہد نے مسکرا کر اس طرف دیکھا جہاں میزوں پر کھانے پینے کی اشیا رکھی تھیں اور مہمانوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے۔" تصدق رسا نے واپس جاتے ہوئے کہا "کوئی تکلف مت کرنا۔"

"فاضل بھیا کہاں غائب ہو گئے!" افروز بولی۔

"وہ اسی ہجوم میں کہیں ہوگا۔" شاہد نے اشارے سے کہا "اب وہ آ ہی گیا ہے تو پی آر بڑھانے کی کوشش تو ضرور کرے گا۔"

"اچھا ہاں' میں نے تم سے نائلہ خان کے بارے میں کہا تھا۔ کتنا خوب صورت ہار پہنے ہوئے ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہیروں کا ہے۔ اس کی قیمت لاکھوں میں تو ضرور ہوگی۔"

"دس ہار ہوں گے اس کے پاس ایسے!" شاہد نے تلخی سے کہا "کیا تم نہیں جانتیں کہ ان فلمی اداکاراؤں کا کریکٹر کیا ہوتا ہے۔ چند ایک ہی ایسی ہوں گی جن پر انگشتِ نمائی نہ کی جاسکے۔ ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ فلم سے ہٹ کر کچھ بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ خصوصاً نائلہ خان تو کچھ ریاستی فرمانرواؤں تک رسائی رکھتی ہے۔"

"یہ سب کچھ میں اخبار میں پڑھتی رہتی ہوں لیکن اب کوئی بھی ان باتوں پر دھیان نہیں دیتا۔ نائلہ خان سے مصافحہ کرلینا بھی لوگوں کے لیے باعثِ فخر ہوتا ہے۔"

"تم اپنا شمار ان لوگوں میں کیوں کروانا چاہتی ہو؟" شاہد کا لہجہ کچھ خشک ہو گیا تھا۔

"ہیلو!" ایک آواز نے انہیں چونکایا۔

افروز تو جیسے کھل اٹھی۔ انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے والی نائلہ خان تھی۔ افروز لاشعوری طور پر اس سے اتنی مرعوب تھی کہ کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

"آیئے!" وہ جلدی سے بولی "ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔ اگر آپ ہمارے ساتھ کچھ دیر بیٹھیں!"

"میں اسی لیے آئی ہوں۔" نائلہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

شاہد دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے شاہد!" نائلہ خان بولی "کیا مجھ سے ناراض ہو؟"

افروز چونک پڑی۔ نائلہ خان کے جملے سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اور شاہد ایک دوسرے سے واقف تھے۔

"میں بھلا کیوں ناراض ہونے لگا۔" شاہد نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے یہ تمہاری بیگم ہیں!" نائلہ خان نے افروز کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ہاں۔" افروز جلدی سے بولی "مجھے علم نہیں تھا کہ آپ اور شاہد ایک دوسرے سے واقف ہیں۔"

"ہم بڑا اچھا وقت گزار چکے ہیں۔" نائلہ خان' شاہد کی

طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔
"میرے لیے تو وہ بڑا صبر آزما وقت تھا۔" شاہد نے سرد لہجے میں کہا "اور آخر میں نے اس وقت سے اپنا دامن چھڑا بھی لیا تھا۔"
"اب اتنے عرصے بعد ملنے پر بھی تم اتنی ناخوش گوار باتیں کررہے ہو؟"
شاہد کچھ نہیں بولا۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے اس نے ضبط کیا ہو۔
"تم نے کبھی بتایا نہیں شاہد کہ......" افروز بولی۔
"ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ ناخوش گوار باتیں تمہیں بتاؤں!" شاہد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن اب بات آہی گئی ہے تو سن لو۔ اتنا تو تم جانتی ہو کہ میں کسی زمانے میں فلم لائن سے وابستہ تھا اور ایک مشہور فلم ڈائریکٹر کا اسسٹنٹ تھا۔ وہ اب حیات نہیں ہیں۔ کسی نہ کسی فلم پر گفتگو کرنے کے لیے وہ مجھے اپنے گھر بلالیا کرتے تھے۔ وہاں ان سے بھی مڈبھیڑ ہوجاتی تھی۔" شاہد نے نائلہ خان کی طرف اشارہ کیا "وہ مرحوم فلم ڈائریکٹر ان کے ڈیڈی تھے۔"
نائلہ خان نے مسکراتے ہوئے کہا "اپنی بیگم کو یہ بھی تو بتادو کہ میں تمہیں بے حد پسند کرتی تھی۔"
افروز بھونچکا رہ گئی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ کوئی عورت کسی مرد سے اس کی بیوی کی موجودگی میں ایسی بات کہے۔
شاہد نے بے چینی سے پہلو بدلا اور نائلہ خان کو گھورتے ہوئے کہا۔ "میں یہ بد تمیزی کرنے کی جسارت کروں گا کہ آپ ہماری میز سے اٹھ جائیں۔ دوسری صورت میں ہم خود ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔"
"چلے جاؤ گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں تمہارے گھر آجاؤں گی۔ تصدق صاحب سے مجھے تمہارا پتا معلوم ہوجائے گا۔ تم جانتے ہو شاہد کہ میں بڑی ضدی فطرت کی مالک ہوں۔ جو کچھ مجھے حاصل کرنا ہوتا ہے، وہ میں ہر قیمت پر حاصل کرتی ہوں اور اگر حاصل نہیں کرپاتی تو برباد کردیتی ہوں۔ وہ ایک اتفاق تھا کہ تم غائب ہی ہوگئے تھے پھر ڈیڈی کے انتقال کے بعد میں فلم لائن میں ایسی الجھی کہ تمہارا خیال ہی نہیں آسکا لیکن اب تمہیں دیکھا ہے تو چند سال پہلے کے جذبات پھر بیدار ہوگئے ہیں۔ ان کی تکمیل کے لیے میں کچھ بھی کرسکتی ہوں۔"
"تم کیا حاصل کرنا چاہتی ہو؟" شاہد نے پہلی بار "آپ" کے بجائے "تم" کہا۔
"مجھے تمہاری بیوی کے سامنے بھی یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"
افروز کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نائلہ خان ببانگ دہل اس قسم کی بات بھی کرسکتی ہے!
"لیکن میں کسی کی دکان میں رکھا ہوا کوئی شوپیس نہیں ہوں۔" شاہد نے تلخی سے کہا "میں جانتا ہوں کہ تم بہت دولت مند ہوچکی ہو۔ بہت کچھ خرید سکتی ہو مگر انسانوں کو تو نہیں خرید سکتیں۔"
"بچکانا بات کررہے ہو تم!" نائلہ خان ہنس پڑی "انسان تو آج کل بڑی آسانی سے خریدے جاسکتے ہیں۔"
"میرا شمار ان میں نہ کرو۔"
"آج کل ہر شخص خریدا جاسکتا ہے۔ تم اس قسم کی باتیں کرکے شاید اپنا بھاؤ بڑھانا چاہتے ہو!" نائلہ خان ہنسی۔ "خیر! تم اپنے ہی منہ سے بتادو کہ تم اپنی کیا قیمت چاہتے ہو اور ہاں، میں اس بات پر کوئی اصرار نہیں کروں گی کہ تم اپنی بیوی کو چھوڑ دو۔ اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ میں تو بس......"
اب افروز کے دل ودماغ میں غصے کی چنگاریاں چٹخنے لگیں۔
"بہتر ہوگا کہ اب تم یہاں سے اٹھ ہی جاؤ۔" شاہد کا چہرہ سرخ ہوگیا۔
"قیمت لگائے بغیر!" نائلہ خان عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "میری خواب گاہ میں آنے کا فخر حاصل کرنے کے لیے لوگ لاکھوں قربان کردیتے ہیں لیکن.... تمہارے لیے یہ سب کچھ میں کروں گی۔ اپنی قیمت تم خود بتادو۔ لاکھ، دو لاکھ، پانچ لاکھ۔"
لاکھوں کی وہ بات ایک ایسی پھوار کی طرح تھی جس نے افروز کے دل ودماغ میں چٹختی ہوئی غصے کی چنگاریوں کو ٹھنڈا کردیا اور یہ عجیب سا خیال افروز کے ذہن میں ابھرا کہ اگر اتنی بڑی رقم کے لیے شاہد، نائلہ خان کی خواہشات پوری کردے تو اس میں کوئی خاص مضائقہ نہیں جب کہ یہ رقم ان دونوں میاں بیوی کی زندگی کو خاصا بڑا سنبھالا دے سکتی تھی۔
نائلہ خان کے "بولی" لگانے سے شاہد ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اور یکلخت کرسی سے کھڑا ہوتا ہوا بولا "اب تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔"
نائلہ خان نے اس کے چراغ پا ہونے کا کوئی اثر نہیں لیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اٹھی اور مسکرا کر افروز سے بولی "اگر ہوسکے تو اپنے شوہر کو سمجھانا۔ میں تم سے تمہارا شوہر چھیننا

نہیں چاہتی' بس کچھ وقت ان کا اپنے لیے وقف کرنا چاہتی ہوں۔ پانچ لاکھ روپے تمہاری زندگی کو بہت آسان کردیں گے۔"

شاہد اس وقت شاید نائلہ خان پر برس ہی پڑتا لیکن وہ اس سے پہلے ہی مڑ کر ایک طرف چل دی۔ اسی وقت فاضل بھی ان کے قریب پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں تین پلیٹیں تھیں۔ وہ افروز اور شاہد کے لیے بھی کھانے کی کچھ چیزیں لے آیا تھا۔ اس نے ایک نظر' جاتی ہوئی نائلہ خان پر ڈالی اور پھر شاہد کی طرف دیکھا جو اپنی کرسی پر بیٹھ چکا تھا لیکن اس کا چہرہ ابھی غصے سے تمتما رہا تھا۔ فاضل کے شگفتہ چہرے پر سنجیدگی بکھر گئی اور اس نے پلیٹیں خاموشی سے میز پر رکھ دیں۔ وہ خود ایک کرسی پر بیٹھ کر صورتِ حال کے بارے میں کوئی استفسار کیے بغیر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

افروز تو اس طرح بیٹھی ہوئی تھی جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

"دیکھ لیا تم نے!" شاہد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا "قیمتی ساری باندھنے یا قیمتی سوٹ پہننے سے انسان کی حقیقت نہیں چھپ جاتی۔ لوگوں کو کسی نہ کسی طرح معلوم ہو ہی جاتا ہے کہ گدڑی میں لعل چھپا ہوا ہے یا اس کے برخلاف صورت ہے۔ اگر نائلہ کو ہمارے حالات کا علم نہ ہوتا تو وہ یوں میری قیمت لگا کر نہ جاتی!"

"کیا مطلب؟" فاضل پہلی بار چونکا۔

"وہ پانچ لاکھ روپوں میں مجھے خریدنا چاہتی ہے اور دھمکی بھی دے گئی ہے کہ جو چیز اسے حاصل نہ ہوسکے' وہ اسے برباد کردیتی ہے۔"

فاضل خاموشی سے شاہد کا منہ تکتا رہ گیا۔ اس نے مزید کوئی استفسار نہیں کیا تھا۔ اس سے افروز کو اندازہ ہوا کہ فاضل کو شاہد اور نائلہ کے ماضی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگا۔

شاہد نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا اور بڑبڑایا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ بھی یہاں آئے گی تو میں یہاں ہرگز نہیں آتا۔"

"موڈ بالکل چوپٹ ہوگیا ہے۔ چلو یہاں سے نکل چلیں۔" فاضل نے کہا۔

ان تینوں نے پارٹی پوری طرح اٹینڈ نہیں کی اور میزبان کی نظروں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہاں سے نکل آئے۔

○☆○

واپسی پر معمول کے مطابق افروز کار کی پچھلی نشست پر تھی اور فاضل ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ شاہد نے اس کے برابر کی سیٹ سنبھال رکھی تھی۔ اس کے چہرے سے بدستور ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خود کو معمول پر نہیں لاسکا تھا۔ اس نے اپنے ماضی کا جو واقعہ اپنے ذہن سے جھٹک دیا تھا' وہ آج پھر نہ صرف پوری طرح تازہ ہوگیا تھا بلکہ اسے نائلہ خان کی باتوں کے باعث اپنے دل میں کسی کانٹے کی سی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔

واقعہ اس کی شادی سے چھ برس پہلے کا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف اٹھارہ سال تھی لیکن وہ اپنی صلاحیت اور ذہانت کے بل بوتے پر ایک نامور فلم ڈائریکٹر کا اسسٹنٹ بن گیا تھا بلکہ وہ جگہ اس نے سترہ سال کی عمر میں حاصل کی تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں تو اس نے اپنا کیریئر محض اس لیے ٹھکرا دیا تھا کہ نائلہ خان اس کے مزاج کے خلاف اس کے سامنے آئی تھی۔ وہ فلم ڈائریکٹر اس کا باپ تھا۔ اکثر وہ کسی نہ کسی فلم پر بات کرنے کے لیے شاہد کو اپنی عالی شان کوٹھی میں بلالیا کرتا تھا۔ اگر کبھی اسے ڈرائنگ روم تک آنے میں کچھ دیر ہوجاتی تو اتنی دیر تک نائلہ خان اس کے سر پر مسلط رہتی تھی۔ ابتدا میں تو شاہد نے اس وقتی رفاقت کو اہمیت نہیں دی تھی لیکن ..... دھیرے دھیرے جب نائلہ خان کے جذبات و عزائم سامنے آئے تو وہ پریشان ہوگیا۔ وہ اپنے الفاظ کے مطابق شاہد سے محبت کرنے لگی تھی اور اس سے شادی کی خواہاں تھی لیکن شاہد ایک تو سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شادی نہیں کرنا چاہتا تھا' دوسرے یہ کہ نائلہ خان عمر میں اس سے چھ سال بڑی تھی۔ تیسرے یہ کہ شاہد فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کی بیٹی سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ وضاحت اس نے کبھی کسی سے نہیں کی تھی کہ شادی کے سلسلے میں اس کا یہ نظریہ کیوں تھا۔ نائلہ خان اس وقت بھی بلا کی خوب صورت تھی لیکن شاہد اس سے کم عمر ہونے کے علاوہ یہ بھی سمجھتا تھا کہ امیر و کبیر باپ کی بیٹیاں' مالی طور پر کم زور شوہروں کے لیے زندگی بھر ایک حاکم بنی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ شاہد کو نائلہ خان کی باتوں میں محبت سے زیادہ ہوس کی جھلک محسوس ہوئی تھی پھر اس نے ایک سال تو کسی نہ کسی طرح گزار لیا تھا لیکن جب ایک روز نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نائلہ خان نے اس کی گردن میں بازو حمائل کردیے تو وہ بُری طرح بھڑک اٹھا۔ اسی روز اس نے ملازمت چھوڑ دی اور شہر ہی چھوڑ کر چلا گیا۔

دوسرے شہر میں اسے ٹی وی اسٹیشن میں ملازمت مل

گئی۔ وہیں اسے کچھ عرصے بعد نائلہ خان کے والد کے انتقال کی خبر ملی اور چند ماہ بعد اس کو ایک اخبار سے پتا چلا کہ نائلہ خان فلمی ہیروئن کے طور پر سامنے آنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

تین سال بعد اس شہر سے شاہد کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ واپس اپنے شہر آگیا جہاں اس کا مکان تو تھا ہی! اس کی عدم موجودگی میں وہاں فاضل رہا کرتا تھا۔

تیئس سال کی عمر میں اس کی ملاقات افروز سے ہوئی۔ وہ اناؤنسر کی حیثیت سے آڈیشن دینے ٹی وی اسٹیشن پہنچی تھی۔ اسے اپنا وہ مقصد تو حاصل نہیں ہو سکا لیکن وہاں اس کی ملاقات شاہد سے ہو گئی پھر ان ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور چند ماہ میں دونوں نے محسوس کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کو شدت سے چاہنے لگے تھے۔

افروز کے والدین کے مالی حالات شاہد سے زیادہ مضبوط نہیں تھے مگر انہیں یہ پسند نہیں تھا کہ ان کی بیٹی ٹی وی کے کسی آدمی سے شادی کرتی۔ شاہد نے ان سے ان کے اس نظریے پر بحث کرنا اس لیے فضول سمجھا تھا کیونکہ افروز اپنے والدین کی مخالفت مول لے کر شادی کرنے پر بضد ہو چکی تھی۔

آخر ان کی شادی ہو گئی۔ افروز کے والدین نے بادل ناخواستہ اس کی بات مانی تھی مگر شادی کی فضا خوش گوار نہیں رہی تھی جس کا ملال تو افروز اور شاہد کو ہوا لیکن اس کا تدارک ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔

شادی کے بعد افروز اپنے گھر والوں کے سامنے یہ دعوے بھی کرتی رہی تھی کہ ایک روز اس کا شاہد ایک بہت بڑی شخصیت بن جائے گا مگر چھ ماہ میں تو اس کے آثار دور دور تک نظر نہیں آئے تھے۔

اس دوران میں شاہد کو نائلہ خان کی بے پناہ مقبولیت کا بھی علم ہوتا رہا تھا لیکن اس نے ہمیشہ خواہش یہی کی تھی کہ نائلہ خان سے اس کا آمنا سامنا کبھی نہ ہو۔

انسان کی سب خواہشات ہمیشہ پوری نہیں ہوتیں۔ نائلہ خان سے اس کی مڈبھیڑ ہو ہی گئی اور وہ صورتِ حال بھی کم از کم شاہد کے لیے بہت تلخ تھی۔

رات کو وہ جب سونے کے لیے لیٹا تو افروز نے نائلہ خان کی بات چھیڑی "آپ نے پہلے کبھی نہیں بتایا کہ نائلہ خان سے......"

شاہد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "وہ میرے لیے نہ تو کوئی خوشگوار بات تھی نہ قابلِ فخر کہ میں تم سے اس کا تذکرہ کرتا۔ فاضل کو بھی میں نے یہ سب کچھ اس لیے بتایا تھا کہ میں نے شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیوں کیا تھا۔ دراصل مجھے ڈر تھا کہ نائلہ میرے گھر بھی پہنچ سکتی تھی۔ میرا یہ اندیشہ درست بھی ثابت ہوا تھا۔ میری عدم موجودگی میں وہ میرے گھر پہنچی تھی۔ فاضل نے اسے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ میں ملک ہی چھوڑ کر چلا گیا ہوں۔"

"لیکن آخر ہوا کیا تھا؟"

"بات تو اب سامنے آہی گئی ہے لہٰذا بتائے دیتا ہوں۔"

شاہد نے وہ سب کچھ بتا دیا جو نائلہ خان کے حوالے سے اس کے ماضی میں پیوست تھا۔

پھر چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہا "اب سو جاؤ افروز! آج طبیعت بڑی مکدر ہو گئی ہے۔" اس نے کروٹ لے لی۔

لیکن افروز کی نیند اڑی ہوئی تھی۔ اس کے دماغ میں لاکھوں روپوں کے نوٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاہد اگر نائلہ خان کی بات مان جائے تو اس سے کوئی فرق تو پڑے گا نہیں اور جو فرق پڑتا' اسے خوشگوار ہی کہا جا سکتا تھا۔ پانچ لاکھ روپوں سے وہ ایک نئی زندگی کی داغ بیل ڈال سکتی تھی۔ شاہد تھوڑی بہت مشکلات کے ساتھ ذاتی پروڈکشن کا کام بھی شروع کر سکتا تھا۔ اس میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ ضرور ترقی کر جاتا اور پھر افروز اکڑ کر اپنے والدین کے سامنے جا سکتی تھی۔

لیکن افروز کا یہ سب کچھ سوچنا ہی عجیب تھا۔ دنیا کی شاید ہی کوئی عورت ایسی ہو جو اپنے شوہر کو کسی دوسری عورت کے ساتھ شیئر کرنے پر آمادہ ہو جائے لیکن افروز نے زندگی کے لیے جو سنہرے خواب دیکھے تھے' ان کی تعبیر کے لیے اس نے اس حد تک سوچ ڈالا۔ بس اسے ایک اطمینان تھا کہ شاہد کو اس سے محبت تھی۔ وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں چھوڑ سکتا تھا اور پھر نائلہ خان نے بھی یہ بات کہی تھی کہ وہ ان میاں بیوی کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اس رات افروز دیر تک جاگتی رہی۔ دراصل اس کی سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ شاہد سے یہ بات کس طرح کرے۔ اسے ڈر تھا کہ شاہد سنتے ہی سے اکھڑ جائے گا۔ وہ اس سلسلے میں کوئی دور کی کوڑی لانا چاہتی تھی لیکن اس رات وہ کوئی تدبیر نہیں سوچ سکی اور اسے نیند آگئی۔

دوسرے دن شاہد اور فاضل اپنے اپنے دفتر چلے گئے۔ افروز گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئی لیکن اس کا وہ سارا وقت اس طرح گزرا کہ اس کے دماغ میں لاکھوں روپے کے

نوٹ پھڑپھڑاتے رہے۔
اگر کوئی غلط یا ناپسندیدہ سی سوچ ذہن میں آجائے تو انسان اس کی توجیحات ضرور ڈھونڈ نکالتا ہے۔ افروز نے بھی سوچا کہ اگر شاہد دوسری شادی کرلے تو وہ کیا کرے گی۔ شاہد کو تیسری یا چوتھی شادی کرنے کا بھی حق تھا۔ اس کے علاوہ بہت سے مرد شادی کے بعد بھی خفیہ طور پر دوسری عورتوں سے فلرٹ کرتے رہتے ہیں۔ ان سب باتوں سے تو یہی بہتر تھا کہ سب کچھ اس کے علم میں ہوتا جس سے لاکھوں روپوں کا فائدہ بھی یقینی تھا۔
چار بجے افروز آرٹس کونسل چلی گئی۔ اسے مصوری کا شوق تھا' اسی شوق کی خاطر وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے آرٹس کونسل جایا کرتی تھی۔ اس شوق میں تھوڑی سی وقت گزاری بھی ہوجاتی تھی۔



ایک گھنٹے بعد افروز آرٹس کونسل سے نکلی۔ اس مرحلے میں ٹیکسی تلاش کرنا اس کے لیے خاصی کوفت کا سبب بنتا تھا لیکن اس روز اسے وہاں ایک منٹ بھی نہیں کھڑا ہونا پڑا۔ وہ قریب رکنے والی ایک چمکتی ہوئی قیمتی کار کو دیکھ کر اس لیے بھی چونکی کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر نائلہ خان تھی۔
"ہیلو!" وہ افروز کی طرف دیکھ کر مسکرائی "میرا خیال ہے تمہیں ٹیکسی کی تلاش ہے۔ چلو میں تم کو تمہارے گھر تک چھوڑے دیتی ہوں۔"
افروز متذبذب رہی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہوگئی تھیں۔
"آؤنا افروز!" نائلہ خان پھر بولی "مجھے تم سے کچھ باتیں بھی کرنا ہیں۔ یہ بڑا خوش گوار اتفاق ہے کہ تم مجھے یہاں نظر آگئیں۔"
کیا واقعی یہ ایک اتفاق ہے؟! افروز نے سوچا۔
"تم تو تکلف سے کام لے رہی ہو بھئی!" نائلہ خان کہتی ہوئی کار سے اتر آئی اور افروز کا ہاتھ پکڑ کر کار کے قریب لے گئی اور ڈرائیونگ سیٹ کی برابر کی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی "چلو بیٹھو۔"
جب کار چل پڑی تو افروز کو بڑا خوش گوار احساس ہوا۔ کار اتنی قیمتی تھی کہ سڑک کی ناہمواری اس پر اثر انداز نہیں ہورہی تھی اور وہ جیسے پانی کی طرح بہتی چلی جارہی تھی۔ کار کی سیٹ بھی نہایت آرام دہ تھی۔ افروز نے خوابوں میں خود کو ایسی ہی کاروں کی مالک دیکھا تھا۔
"شاہد بہت ضدی ہے۔" نائلہ خان چند لمحے بعد بولی۔
"لیکن میرا خیال ہے تم خاصی سمجھدار لڑکی ہو۔ تمہیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ شاہد کسی دوسری عورت سے فلرٹ کرنے لگے تو اس کا اپنا مالی نقصان ہوگا۔ اس کے برعکس اگر وہ چند دن میرے ساتھ گزارے تو تم باخبر بھی رہو گی اور لاکھوں کا فائدہ الگ!"
افروز فلرٹ کے بارے میں پہلے ہی سوچ چکی تھی۔ نائلہ خان کی بات سے اس کے خیال کو تقویت پہنچی۔
"کیا کوئی عورت آسانی سے یہ برداشت کرسکتی ہے کہ اس کا شوہر..." افروز نہیں چاہتی تھی کہ نائلہ خان اس کے دلی جذبات تاڑ جائے۔
نائلہ خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آسانی سے نہ سہی' مشکل سے تو برداشت کرسکتی ہے اور پھر وہ مشکل بھی مشکل تو نہ رہے گی' اگر اس کے عوض لاکھوں روپے حاصل ہوسکیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم لوگوں کے گھریلو حالات اچھے نہیں ہیں اس لیے مناسب سرمائے سے ایک نئی زندگی کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔"
افروز نہیں چاہتی تھی کہ اس کے دلی جذبات کا اظہار ہوجائے لیکن اسے یہ اندیشہ بھی تھا کہ نائلہ خان اس کی طرف سے مایوس نہ ہوجائے۔
"دیکھو افروز!" نائلہ خان پھر بولی "میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہو اور محبت میں قربانی دینا تو ایک عام سی بات ہے۔ اگر تم یہ کڑوا گھونٹ پی سکتی ہو تو شاہد کو بھی تمہارے بہتر مستقبل کے لیے میری پیشکش قبول کرلینا چاہیے۔"
"شاہد بہت ضدی ہے۔" افروز کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔
نائلہ کو اس بات سے کوئی ایسا خیال آیا کہ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔ اس نے کہا "تم اسے سمجھاؤ گی تو تمہاری محبت کی خاطر وہ میری پیشکش قبول کرسکتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ایک ہفتے میرے ساتھ رہے۔ میں پانچ لاکھ روپے ایڈوانس دے سکتی ہوں۔ میں شاہد کی فطرت سے واقف ہوں۔ اگر وہ ایک بار تیار ہوگیا تو پانچ لاکھ روپے حاصل کرنے کے بعد کسی بدنیتی کا شکار نہیں ہوسکتا اور ہاں اگر میں نے شاہد کو ایک ہفتے کے بعد چند دن اور روک لیا تو میرا سیکریٹری تمہیں روزانہ شام کو پچیس ہزار روپے دے جایا کرے گا۔ شاہد کی واپسی تک یہ رقم تمہیں برابر ملتی رہے گی۔ تم بس کسی طرح شاہد کو آمادہ کرلو۔"
افروز کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہوگئیں۔ بات تو پانچ

لاکھ روپوں سے آگے بھی نکل سکتی تھی۔ یہ زندگی بنانے کا ایک سنہری موقع تھا۔ پرائیویٹ پروڈکشن شروع کرکے شاہد یقیناً ترقی حاصل کرسکتا تھا۔

"بولو بے بی!" نائلہ خان نے کہا "لاکھوں روپے کے عوض کیا تم یہ وقتی قربانی نہیں دے سکتیں!"

"مسئلہ میرا ہی تو نہیں ہے۔" افروز کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی تھی "شاہد تیار نہیں ہوگا۔"

"محبت کے اس تیر کو نہیں بھولو جس سے شاہد گھائل ہوا ہے اور وہ تیر تمہارا ہی ہے۔ اگر تم اسے ہتھیار کے طور پر سلیقے سے کام میں لاؤ تو تھوڑی بہت دشواری سے یہ کارگر ثابت ہوسکتا ہے۔"

"میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتی۔" افروز کی بھرائی ہوئی آواز کا سبب لاکھوں روپوں کی گڈیوں کا وہ دباؤ تھا جسے وہ اپنے دماغ پر محسوس کررہی تھی۔

"وعدہ نہ کرو لیکن کوشش تو کرسکتی ہو! البتہ یہ وعدہ میں کرسکتی ہوں کہ حالات کو تمہارے حق میں اتنا سازگار کردوں کہ تمہیں کوشش کرنے میں کوئی خاص دشواری نہ ہو!"

"یہ کیسے ممکن ہے!" افروز نے چونک کر پوچھا۔

"اس بارے میں کوئی سوال نہ کرو۔ یہ میرا کام ہے، مجھ پر چھوڑ دو۔"

افروز کی سمجھ میں نہیں آسکا کہ نائلہ خان یہ کام کس طرح کرسکتی تھی! پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔ اس نے چونک کر کہا "کار کسی ایسی جگہ روک دیجیے جہاں سے مجھے ٹیکسی مل جائے!"

"ارے نہیں، میں تمہیں گھر تک چھوڑ دوں گی۔"

"یہ مناسب نہیں ہے۔ اگر شاہد نے مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لیا تو......"

"اوہ! تم واقعی بہت ذہین ہو۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں کسی جگہ کار سے اتار دیتی ہوں۔ یہ میرا کارڈ رکھ لو۔ ممکن ہے کسی وقت تم مجھے فون کرنا چاہو۔"

○☆○

اس روز بھی افروز کو خاصی رات تک نیند نہیں آئی۔ ذہن پر خاصا دباؤ ڈالنے کے باوجود اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شاہد کو آمادہ کرنے کے لیے وہ کیا تدبیر کرسکتی ہے!

دوسری صبح ناشتے کی میز پر بھی افروز نے کئی بار بات چھیڑنا چاہی لیکن فاضل کی موجودگی کے باعث اس کی زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ یہ بات اسے شاہد سے تنہائی میں ہی کرنا چاہیے تھی۔

دن میں بھی وہ اسی مسئلے پر سوچتی رہی۔ کوئی تدبیر تو اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی لیکن اس نے فیصلہ کیا تھا کہ بس کسی طرح بات چھیڑ دے اور شاہد کے نہ ماننے کی صورت میں افسردہ رہنے لگے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اگر کسی بات پر افسردہ ہوتی تو شاہد جیسے تڑپ جاتا تھا۔ اسے افروز سے ایسی ہی محبت تھی۔ خود افروز کو بھی اس سے کچھ کم محبت نہیں تھی۔ اس نے شاہد ہی کی خاطر اپنے گھر والوں کو ناراض کیا تھا لیکن اس محبت کے ساتھ ساتھ وہ ایک آسودہ حال زندگی کی بھی شدید خواہش مند تھی۔ اس خواہش کی شدت ہی نے اسے ذہنی طور پر اس کے لیے آمادہ کیا تھا کہ وہ اپنے شوہر کو کچھ دن کے لیے کسی دوسری عورت کے ساتھ شیئر کرلے۔ اپنی اس سوچ میں شدت ہی کے باعث اس نے اس بارے میں بالکل نہیں سوچا کہ اس کے کیا کیا اثرات ہوسکتے ہیں یا کیا کیا نتائج و عواقب سامنے آسکتے ہیں۔

شام کو فاضل سات بجے آگیا۔ اس وقت تک شاہد بھی عموماً آجاتا تھا۔ اگر کبھی اسے دیر ہوجاتی تھی تو فون ضرور کردیتا تھا لیکن اس روز اس کا فون بھی نہیں آیا تھا پھر جب آٹھ بج گئے تو افروز کو ہی نہیں، فاضل کو بھی تشویش ہوگئی۔ اس نے کہا۔

"تم ہی فون کرلو بھابی! کچھ معلوم تو ہو!"

افروز نے فون کیا تو اسے وہاں سے کسی نے جواب دیا کہ شاہد کو ٹی وی اسٹیشن سے روانہ ہوئے آدھا گھنٹا ہوچکا ہے۔

"تب تو پھر آتا ہی ہوگا۔" فاضل نے کہا "لیکن اس کی یہ حرکت خلافِ معمول ہے کہ تاخیر کے باوجود اس نے فون نہیں کیا۔"

اس خلافِ معمول بات کا سبب انہیں دس منٹ بعد معلوم ہوا جب شاہد پہنچ گیا۔ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی پریشانی دیکھ کر ان دونوں کے ماتھے ٹھنکے اور جب شاہد نے انہیں تاخیر کی وجہ بتائی تو وہ پریشان بھی ہوگئے۔

شاہد کے بیان کے مطابق یہ ٹی وی کے ایم ڈی تصدق رسا کا معمول تھا کہ وہ لنچ ٹائم میں ڈیڑھ بجے کے بعد ہدایت کاروں، پروڈیوسرز اور اسی درجے کے کچھ لوگوں کو اپنے کمرے میں جمع کرلیتا تھا۔ دوڈھائی ماہ سے اس نے شاہد کو بھی بلانا شروع کردیا تھا۔ کہنے کو وہ "میٹنگ" ہوا کرتی تھی لیکن عام طور پر گپ شپ میں ہی دو تین گھنٹے گزر جاتے تھے اور چھٹی کا وقت قریب آجاتا تھا۔

"آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔" شاہد نے اپنے بیان میں کہا۔

تھا "میں ڈیڑھ بجے ان کے کمرے میں پہنچ گیا لیکن وہ موجود نہیں تھے۔ میں سمجھا کہ شاید کھانا کھا کر واش روم میں چلے گئے ہوں گے۔ میں بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دس منٹ بعد بھی نہیں آئے تو مجھے الجھن ہوئی۔ الجھن کا سبب یہ تھا کہ اس وقت جن لوگوں کی آمد معمول تھی' ان میں سے بھی کوئی نہیں آیا تھا۔ مزید پانچ منٹ گزارنے کے بعد میں وہاں سے اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ٹی وی ہی کے ایک صاحب کمرے میں آئے اور مجھے دیکھ کر چونکے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں تو معمول کے مطابق یہاں ہوں اور ایم ڈی صاحب کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ صاحب مجھے بتانے لگے کہ آج ڈائریکٹر جنرل دورے پر آئے ہوئے ہیں اور ایم ڈی صاحب انہی کے ساتھ ہیں۔ ان صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ایم ڈی صاحب نے سب کو فون پر بتا دیا تھا کہ ڈائریکٹر جنرل .... دورے پر آرہے ہیں لہٰذا سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں رہیں۔ میں نے ان صاحب کو بتایا کہ مجھے تو فون نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر وہ بولے کہ شاید ایم ڈی صاحب کے ذہن سے آپ کا نام نکل گیا ہو لیکن اب تو آپ اپنے کمرے میں پہنچیں پھر وہ صاحب الماری سے ایک فائل نکال کر وہاں سے جانے لگے۔ وہ وہی فائل لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ میں بھی وہاں سے نکلا اور اپنے کمرے میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایم ڈی صاحب اور ڈائریکٹر جنرل صاحب ہو کر جا چکے تھے۔ میں بیٹھ کر سوچنے لگا کہ تصدق رسا صاحب مجھے تھوڑی بہت سرزنش تو ضرور کریں گے۔ میں اسی پریشانی میں تھا کہ ساڑھے تین بجے کے قریب ٹی وی اسٹیشن میں طوفان سا آگیا۔ معلوم ہوا کہ ایم ڈی صاحب کی دراز میں اس روز محکمے کے تین لاکھ روپے رکھے ہوئے تھے جو انہوں نے اس وقت غائب پائے جب ڈائریکٹر جنرل...... کو رخصت کرکے وہ اپنے کمرے میں پہنچے۔ انہوں نے پولیس کو فون کر دیا اور اس وقت تک پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔ لوگوں سے پوچھ گچھ کا سلسلہ جاری تھا۔ جن صاحب نے مجھے ایم ڈی صاحب کے کمرے میں اکیلا بیٹھا دیکھا تھا' ان کے بیان کے بعد مجھے طلب کیا گیا اور مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ تصدق رسا صاحب کو خیال تھا کہ انہوں نے مجھے ٹیلی فون پر ہدایت کر دی تھی کہ ڈائریکٹر جنرل ...... کے اچانک دورے کی وجہ سے میں بھی اپنے کمرے ہی میں رہوں لہٰذا مجھے اس وقت ان کے کمرے میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ان کے اس بیان کی وجہ سے پولیس نے سب سے مشتبہ آدمی مجھے ہی سمجھا۔ میری اور میری میز وغیرہ کی تلاشی بھی لی گئی لیکن ظاہر ہے کہ روپے انہیں نہیں مل سکتے تھے۔ اس کے باوجود پولیس مجھے شک میں گرفتار کرنا چاہتی تھی لیکن ایم ڈی صاحب نے ان سے کہا کہ اس طرح محکمے کی بلاوجہ بدنامی بھی ہو سکتی ہے لہٰذا ثبوت ملنے سے پہلے مجھے گرفتار نہ کیا جائے۔ اس طرح میں گرفتاری سے تو بچ گیا لیکن ایم ڈی صاحب نے از خود یا پولیس کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ جب تک میں شاملِ تفتیش ہوں' اس وقت تک ڈیوٹی پر نہ پہنچوں اور اگر میرے ہاتھ صاف ہوئے تو میری ملازمت بھی بحال کر دی جائے گی اور اس عرصے کی تنخواہ بھی مل جائے گی۔"

"معاملہ تو ظاہر ہے کہ ایک آدھ ماہ میں صاف ہو جائے۔" فاضل نے کہا "تم بحال بھی ہو جاؤ گے لیکن یہ بات اخبارات میں آنے سے تمہاری کچھ بدنامی ضرور ہو سکتی ہے۔"

"ایم ڈی صاحب نے پولیس سے کہا تو ہے کہ یہ بات اخبارات میں نہیں آنا چاہیے۔"

"مجھے تو یہ کسی قسم کی سازش معلوم ہو رہی ہے۔" شاہد نے اس کی بات پر دھیان دیے بغیر کہا "میں نائلہ کی دھمکی بھولا نہیں ہوں اور یہ اندازہ بھی مجھے ہو رہا ہے کہ نائلہ خان کے اشارے پر تصدق رسا کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

فاضل اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ افروز کو بھی نائلہ کی یہ بات یاد آگئی کہ وہ اس کے لیے راہ ہموار کرے گی۔ یہ صورتِ حال پیدا ہونے سے گھر کے مالی حالات پر اثر پڑ سکتا تھا۔ پس انداز کیے ہوئے چند ہزار روپے وہ شاہد کے سوٹ پر خرچ کر چکی تھی۔ اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔

رات کو سوتے وقت اس نے شاہد سے پوچھا "تمہارے اکاؤنٹ میں کتنا روپیا ہے؟"

"چند سو روپے پڑے ہوں گے۔ وہ میں نے اس لیے رکھے تھے کہ شاید کبھی اچانک مجھے ذاتی طور پر کچھ ضرورت پڑ جائے۔ ساری تنخواہ تو میں تمہیں ہی دے دیا کرتا تھا۔"

"اور یہ مہینے کے آخری دن ہیں۔ انہی چند دن کے اخراجات کی رقم رہ گئی ہے میرے پاس۔"

"انہی دنوں میرے لیے سوٹ بھی سلوانا تھا تمہیں!" شاہد کے لہجے میں کچھ تلخی تھی۔

"خیر' ایک آدھ مہینہ تو کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گا۔ اس مرتبہ میں ٹیلیفون' بجلی اور گیس وغیرہ کے بل جمع کرانے نہیں جا سکی تھی۔ اس مرتبہ وہ بل ادا نہیں کریں گے۔ ایک آدھ مہینے میں صورتِ حال ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن اس بارے میں سوچو شاہد کہ اچانک کچھ غیر معمولی اخراجات

ابھی سامنے آسکتے ہیں۔ خدانخواستہ میں کسی ایسی بیماری میں بھی مبتلا ہو سکتی ہوں کہ علاج کے لیے زیادہ رقم ہو۔ اس وقت تم کیا کرو گے؟"

"کبھی کبھی یہ سوال مجھے بھی پریشان کرتا ہے۔"

"لیکن تم نے کبھی اس کے تدارک کے بارے میں نہیں سوچا۔"

"جب بھی سوچتا تھا' دماغی تکان کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا لہٰذا سب کچھ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔"

"کہاوت ہے کہ خدا بھی ان لوگوں کا ساتھ نہیں دیتا جو خود اپنے لیے کچھ نہیں سوچتے۔"

"تمہاری ان باتوں سے ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہارے ذہن میں کوئی خاص بات ہے۔" شاہد نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نہیں چاہتی کہ مستقبل میں کبھی تمہیں میری ہی وجہ سے پریشان ہونا پڑے اسی لیے میں اپنے سینے پر پتھر رکھ کر ایک قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"کیسی قربانی؟"

"نائلہ خان۔۔۔"

"کیا!" شاہد چونک کر اس کا منہ تکنے لگا "مجھے حیرت ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ خیال آیا ہی کیسے! کوئی عورت یہ کیسے برداشت کرسکتی ہے کہ اس کا شوہر کسی دوسری عورت۔۔۔۔"

"میں یہ برداشت کرلوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا شوہر کبھی کسی پریشانی سے دوچار ہو۔ خصوصاً میری وجہ سے۔"

"خدا نہ کرے کہ تم کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو۔"

"دعائیں ہمیشہ کارگر نہیں ہوتیں۔"

"ایسا ہوا تو بھی کوئی نہ کوئی سبیل نکال ہی لوں گا۔ میں خدا سے کبھی ناامید نہیں ہوتا لیکن میں ایسا کوئی قدم ہرگز نہیں اٹھاؤں گا کہ اپنی ہی نظروں سے گر جاؤں۔"

افروز نے فی الحال چپ ہوجانا ہی مناسب سمجھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر اس نے زیادہ بات کی تو شاہد کا موڈ بہت زیادہ خراب ہوسکتا ہے۔



یہ توقع غلط ثابت ہوئی کہ معاملات ایک ماہ میں درست ہوجائیں گے۔ پولیس کی تفتیش ایک ماہ بعد بھی جاری رہی اور شاہد کی ملازمت بحال نہیں ہوسکی۔ یہ وقفہ بڑھ جانے کی وجہ سے گھر کے مالی اخراجات درہم برہم ہونے لگے۔ شاہد بہت پریشان رہنے لگا۔ فاضل ان حالات کو دیکھ رہا تھا لیکن کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ شاہد کی فطرت سے واقف تھا کہ وہ اس کی مالی اعانت قبول نہیں کرے گا۔ شاہد نے وہ قیمتی گھڑی بیچ ڈالی جو اسے کسی "نامعلوم مداح" نے تحفے میں بھیجی تھی۔ اس رقم سے اس نے تمام رکے ہوئے بل ادا کیے جو پانچ ہزار سے زیادہ کے تھے۔ کچھ رقم ماہانہ خرچ کے لیے بچ گئی لیکن پولیس کی تفتیش اگلے ماہ بھی ختم نہیں ہوسکی اور گھڑی بیچ کر شاہد نے جو پریشانیاں ختم کردی تھیں' وہ پھر سر پر آگئیں۔

ایک مشکل یہ بھی تھی کہ شاہد وقت گزاری کے لیے دوسری ملازمت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے بھاگ دوڑ تو کی تھی لیکن خبر اخبارات میں نہ آنے کے باوجود لوگوں کی زبانی بات ہر طرف پھیل چکی تھی اور اس کی فیلڈ کے سبھی لوگوں کو علم ہوچکا تھا کہ پولیس ایک "چوری" کے سلسلے میں اس کو شاملِ تفتیش کیے ہوئے ہے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو شاہد اپنی صلاحیتوں کے باعث دوسرے ٹی وی چینل یا فلمی دنیا میں کوئی جگہ بڑی آسانی سے حاصل کرلیتا۔ ایک ماہ دھکے کھانے کے بعد اس نے چاہا کہ کوئی اور ملازمت کرے جس کا تعلق اس کی فیلڈ سے نہ ہو لیکن جس شہر میں لوگ ملازمتوں کی تلاش میں مہینوں اور برسوں دھکے کھاتے ہوں' شاہد کو اتنی جلدی کوئی اور ملازمت کیسے مل سکتی تھی؟

انہی دنوں افروز کے گھر والے بھی ان سے ملنے آئے اور ان کی اتنی خاطر مدارات بھی نہیں ہوسکی جتنی ہوتی تھی۔ افروز نے تو اس موقع پر صرف شرمندگی ہی کا سامنا کیا لیکن شاہد کے دل و دماغ پر خاصا بوجھ ہوگیا۔ اسے اندازہ تھا کہ افروز اپنی رنجیدگی کو چہرے پر نہیں آنے دے رہی تھی لیکن اس کی کیفیت یہی ہوگی۔

شاہد نے بہت سوچ بچار کرکے افروز سے کہا "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کل اپنی موٹر سائیکل بیچ دوں۔"

"کیا!" افروز چونکی "اس کے بعد بسوں میں دھکے کھاتے پھریں گے!"

"کیا حرج ہے۔ آخر لوگ بسوں میں سفر کرتے ہی ہیں!"

"یہ فیصلہ تم نے اس لیے کیا ہے ناکہ آج میرے گھر والوں کے سامنے تم نے شرمندگی محسوس کی تھی؟"

"یہ شرمندگی تو ایک آدھ دن میں ختم ہوجائے گی لیکن تم پر جو گزری ہوگی' اس احساس سے میرا دل کٹ رہا ہے۔"

"اگر میری بات ہے تو سوچیے کہ اگر میرے گھر والوں میں سے کسی نے آپ کو بس میں سفر کرتے ہوئے دیکھ لیا اور

مجھ سے بات کی تو میں انہیں کیا جواب دے سکوں گی۔"
افروز نے کہا "اس سے تو بہتر ہے کہ آپ میرے زیورات بیچ ڈالیں۔"
"زیورات بک جائیں تو ان کا خریدنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور پھر اگر تمہیں اپنی کسی گھریلو تقریب میں جانا پڑا تو تم کیا محسوس کرو گی۔"
افروز نے سر جھکا لیا۔ اپنے زیورات کی بات چھیڑتے ہوئے اسے اندازہ بھی تھا کہ جواب یہی ملے گا جس کے بعد وہ نائلہ خان کی بات چھیڑنا چاہتی تھی۔ اس نے کن انکھیوں سے شاہد کو سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھا اور پھر دھیرے سے بولی "جب میں ایک قربانی دینے کو تیار ہوں تو آپ کچھ دن کے لیے نائلہ خان کی بات کیوں نہیں مان لیتے!"
یکلخت شاہد کا چہرہ تمتما اٹھا "اصل بات ان وقتی مشکلات کی نہیں ہوتی۔ تم کو صرف لاکھوں روپوں کا تصور گھیرے ہوئے ہے۔"
"اگر ایک بہتر زندگی کا خواب دیکھنا کوئی گناہ ہے تو میں واقعی گناہ گار ہوں۔" افروز نے روہانسی آواز میں کہا "لیکن اب میں بھی نائلہ خان کا نام زبان پر نہیں لاؤں گی۔" پھر وہ اٹھ کر کمرے سے چلی گئی۔
شاہد دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔
پھر اگلے دو تین روز اس طرح گزرے کہ افروز بہت افسردہ نظر آنے کے ساتھ ساتھ اجڑی اجڑی سی بھی نظر آئی۔ اس نے میک اَپ کرنا بھی چھوڑ دیا۔ شاہد نے اسے ٹوکا تو وہ بولی "میک اَپ کا سامان سستا تو نہیں آتا۔ جب اس قسم کی زندگی گزارنا ہے تو ان چیزوں کے سلسلے میں بھی بچت کی عادت ڈالنا ہی پڑے گی۔"
شاہد چپ کا چپ رہ گیا۔ اس کے پاس کوئی جواب تھا بھی نہیں!
فاضل سے گھر کے یہ حالات چھپے ہوئے نہیں تھے۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا بھی رہتا تھا۔ اس کی دانست میں یہ شاہد کی سنک تھی کہ وہ اس کا مالی تعاون لینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ ایسی صورت میں فاضل کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ وہ ان لوگوں کو چھوڑ کر کہیں اور جا رہے تاکہ ہر وقت وہ سب کچھ دیکھ کر اس کا دل تو نہ کڑھے لیکن پھر یہ سوچ کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتا تھا کہ کسی بُرے وقت میں دوست کا ساتھ چھوڑ دینا تو بہت ہی گھٹیا بات ہوگی۔
ایک دن شاہد کے سسر کا فون آیا۔ شاہد نے ہی کال ریسیو کی تھی۔
"میرا خیال ہے کہ آج کل تم لوگ خاصے پریشان ہو۔" دوسری طرف سے کہا گیا "اگر مناسب سمجھو تو مجھ سے کچھ روپے لے لو۔"
"شکریہ۔" شاہد نے بڑے تلخ لہجے میں کہا اور مزید کوئی بات کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔
بعد میں اس نے یہ بات افروز کو بتائی تو وہ بولی "اچھا ہوا کہ تم نے انہیں صاف جواب دے دیا۔ میں تو خودکشی ہی کرلوں اگر ان سے بھیک لینا پڑے۔"
شاہد خاموش رہا۔
رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو افروز کچھ زیادہ ہی افسردہ نظر آئی۔
"آج تو تم بالکل ہی بجھی ہوئی ہو!" شاہد بولا۔
"آج جو فون آیا تھا' اس نے میرے دل میں چاقو گھونپ دیا۔"
"میں نے بھی اس کے بعد کافی غور کیا تھا۔ افروز! میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے شکست ماننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"
"کیا مطلب؟" افروز چونکی۔
"نائلہ خان کو فون کردو۔ وہ مجھے خرید کرلے جائے۔"
افروز چونک پڑی۔
"چاہو تو اسی وقت فون کردو ورنہ کل صبح کردینا۔" شاہد نے کہا۔
"مگر اس کا فون نمبر؟"
"اس کا کارڈ تو تمہارے پاس ہے نا! مجھے تو نہیں معلوم کہ وہ کارڈ تمہارے پاس آیا کہاں سے لیکن اتفاق سے میری نظر اس پر پڑ چکی ہے۔ وہ تم نے الماری کے ایک خانے میں چھپا رکھا ہے نا!"
افروز خجل ہوگئی۔
"میں تم سے کوئی گلہ نہیں کروں گا افروز!" شاہد نے دھیرے سے کہا "تم اپنے مزاج کے ہاتھوں مجبور ہو۔ آسودہ زندگی کا خواب تمہاری زندگی کو کھوکھلا کردے گا جب کہ وہ شاید میں تمہیں نہ جانے کب تک... دے سکوں اور ممکن ہے' شاید کبھی نہ دے سکوں۔"



دوسرے دن جب نائلہ خان جاگی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھ ٹیلیفون کی آواز سے کھلی تھی۔
"ہیلو!" وہ ماؤتھ پیس میں بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"میں افروز بول رہی ہوں۔"

"اوہ! خدا کا شکر ہے کہ تمہارا فون آیا لیکن تمہارے لہجے کی خوشی سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم کوئی خوش خبری سنانا چاہتی ہو!"

"ہاں، شاہد نے بات مان لی ہے۔ آپ کسی وقت آکر انہیں لے جائیے! دراصل ان کا مزاج کچھ عجیب ہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو چیز بکتی ہے، اس کے لیے خریدار ہی کو آنا پڑتا ہے۔"

"میں سر کے بل آؤں گی۔" نائلہ خان کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی "تین بجے ایک پروڈیوسر میرے گھر آرہا ہے۔ اس سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی میٹنگ ہو سکتی ہے۔ پانچ بجے تک فارغ ہو جاؤں گی لیکن تم سات بجے کا وقت رکھو۔"

"ٹھیک ہے لیکن اور معاملات؟"

"اوہ، وہ!" نائلہ خان ہنسی "میں بات سے پیچھے ہٹنے والی نہیں ہوں افروز! نقد لاؤں یا چیک۔"

"نقد ہی بہتر رہے گا۔"

"اور وہ رقم تمہیں دوں یا شاہد کو۔"

"شاہد کو ہی دیجیے گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا۔ شاہد کو وہی سوٹ پہنا دینا جو اس نے پارٹی میں پہن رکھا تھا۔ بہت اچھا سوٹ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وہ کردوں گی لیکن آپ کو اپنا ایک اور وعدہ بھی یاد ہے نا!"

"میں اپنا کوئی وعدہ نہیں بھولتی۔ میں شاہد کو ہمیشہ کے لیے نہیں اپنانا چاہتی۔ تم ہمیشہ اس کی بیوی رہوگی۔"

اس گفتگو کے بعد نائلہ خان نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ اسے اندازہ ہوا کہ غسل وغیرہ سے فارغ ہو کر ناشتا کرنے کے بعد جب وہ بینک پہنچے گی تو بینک بند ہو چکا ہوگا۔ اس نے فوراً ریسیور اٹھایا اور بینک مینیجر سے رابطہ کرکے اسے اپنا نام بتانے کے بعد کہا "کیا آپ رقم میرے گھر بھجوا سکیں گے؟"

"ہاں ہاں ضرور، کیوں نہیں!"

"تو کسی وقت بھی بھجوا دیجیے۔ میں چیک تیار رکھوں گی۔"

"بینک کا آدمی دو بجے تک آپ کے پاس ہوگا۔"

"شکریہ۔" نائلہ خان نے کہا اور ریسیور رکھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ وہ بے حد خوش تھی اور اسے یقین تھا کہ یہ کامیابی اسے تصدق رسا کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔

غسل کرنے کے بعد جب وہ ناشتا کرنے بیٹھ رہی تھی تو تصدق رسا کا فون آگیا۔

"آپ کے لیے ایک بری خبر ہے۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"کیا؟" نائلہ خان کچھ پریشان ہوگئی۔

"میں نے تو بہت کوشش کرکے معاملے کو طول دلوا دیا تھا لیکن پولیس والے اپنے افسران کی وجہ سے پریشان ہوگئے۔ اب انہیں کوئی کارگزاری دکھانا ہی تھی۔ یہ کارگزاری وہ شاہد کو شبہے میں گرفتار کرکے دکھا سکتے تھے لیکن آپ اس کی گرفتاری نہیں چاہتی تھیں۔ پولیس والوں کی دوسری تجویز یہ تھی کہ کیس کی فائل بند کردی جائے چنانچہ میں نے یہی مناسب سمجھا۔ اس کے بعد یہ بھی ضروری تھا کہ شاہد کو ملازمت کی بحالی کا لیٹر بھیج دیا جائے۔ میں نے آپ کو فون کرکے صورتِ حال بتانا چاہی لیکن آپ کے کسی ملازم نے بتایا کہ آپ آؤٹ ڈور شوٹنگ پر گئی ہوئی ہیں اور رات گئے تک آئیں گی اس لیے میں آپ کو کل دوپہر کے بعد فون کروں۔" وہ بولتا ہی چلا گیا۔

"کیا آپ نے لیٹر بھیج دیا؟"

"جی ہاں۔ یہ ضروری تھا کہ وہ لیٹر رد کا نہ جائے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے اسی حد تک کام آسکا۔"

"وہ خط شاہد کو کب ملے گا؟"

"آج نہیں تو کل ضرور مل جائے گا۔"

"شکریہ رسا صاحب!" نائلہ خان کے لہجے میں کچھ تلخی تھی۔ اس نے فون بند کردیا۔ اسے پریشانی لاحق ہو چکی تھی۔ یہ خیال اسے ستانے لگا تھا کہ وہ خط اگر شاہد کو مل گیا تو تصدق رسا کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر سکتا تھا۔

○☆○

فاضل شام کو ساڑھے چھ بجے گھر پہنچا اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ شاہد وہی سوٹ پہنے بیٹھا تھا جو اس نے تصدق رسا کی پارٹی میں پہنا تھا۔

"کہاں کی تیاری ہے؟" فاضل نے حیرت سے پوچھا۔

"اگر کوئی چیز بکنا ہو تو اسے سجا سنورا ہونا چاہیے۔" شاہد کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"سنو فاضل!" شاہد نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ "لیکن پہلے تم یہ خط دیکھ لو۔" اس نے جیب سے ایک خط نکال کر فاضل کی طرف بڑھایا۔

فاضل نے خط پڑھا اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں "یہ

تو تمہاری بحالی کا خط ہے۔ پولیس نے تمہیں بے گناہ سمجھتے ہوئے تمہارے بارے میں تفتیش ختم کردی ہے۔"

"لیکن میں یہ خط ملنے کے بعد اپنا استعفا بھیج چکا ہوں۔"

"کیوں؟" فاضل کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"اس لیے میرے دوست کہ میری بے گناہی کے باوجود اس واقعے کے سبب میری ترقی کے امکانات اور محدود ہوگئے ہیں۔ میں افروز کو وہ خوشیاں نہیں دے سکوں گا جن کی وہ خواہش مند ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں نائلہ خان کے ہاتھوں بک جاؤں۔"

"شاہد! میں اپنا سر پھوڑ لوں گا۔" فاضل ایک جھٹکے سے صوفے پر بیٹھا۔

"ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لو دوست!" شاہد نے کہا "تم جانتے ہو کہ میں افروز کو بہت چاہتا ہوں۔ اگر اس کی محبت میں مجھے بکنا پڑ رہا ہے تو اس میں بھی میرے لیے مسرت کا پہلو ضرور موجود ہے کہ افروز کی خواہشات تو پوری ہوجائیں گی۔ کچھ دیر بعد نائلہ مجھے لینے کے لیے آنے والی ہے۔"

"تم نے بھابی کو بتادیا ہے کہ تمہاری ملازمت بحال ہوگئی ہے۔"

"اس کے بارے میں بتاچکا ہوں اور استعفے کے بارے میں بھی۔"

"بھابی نے تمہیں روکنے کی کوشش نہیں کی؟"

"جو فیصلہ میں کرچکا ہوں' اسے اب کوئی نہیں روک سکتا۔"

"بھابی تمہیں روک سکتی ہیں۔ میں ابھی ان سے بات کرتا ہوں۔" فاضل کھڑا ہوگیا "وہ کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہوگی لیکن تم اپنا وقت ضائع کروگے فاضل!"

فاضل تیزی سے چلتا ہوا اندر گیا۔

افروز اپنے کمرے میں بیٹھی کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ فاضل کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔

"یہ کیا ہورہا ہے بھابی!" فاضل نے تیزی سے کہا۔

"حالات انسان سے کچھ بھی کرواسکتے ہیں۔"

"لیکن اب شاہد کی ملازمت بحال ہوگئی ہے۔"

"معطلی سے پہلے بھی حالات کون سے اچھے تھے!"

"اگر حالات کی خاطر شاہد نے بک جانے کا فیصلہ کیا ہے تو مجھ سے روپے لینے میں کیا برائی ہے۔ میں کل ہی اپنے اکاؤنٹ سے پچاس ہزار روپے نکال کردے دوں گا۔"

"یہ بات تم شاہد سے کرو۔"

فاضل کو ٹالنے کے لیے افروز اسی قسم کا جواب دے سکتی تھی۔ کہاں پانچ لاکھ یا اس سے بھی زائد ملنے کی امید اور کہاں پچاس ہزار!

"کیا یہ سب کچھ تمہارے ایما سے ہورہا ہے بھابی؟" فاضل نے اسے غور سے دیکھا۔

افروز نفی میں جواب دینے کی حد تک ڈھیٹ نہیں تھی۔ وہ چپ رہی۔ اس کی نظریں جھکی رہی تھیں۔

○☆○

آدھے گھنٹے بعد اس گھر میں دنیا کا ایک عجیب وغریب سودا ہوچکا تھا۔ نائلہ خان آئی تھی اور شاہد اس کے ساتھ چلا گیا تھا۔ پانچ لاکھ روپے افروز کو مل گئے تھے اور وہ خود کو ان روپوں کی گرمی سے پگھلتا ہوا محسوس کررہی تھی۔ شاہد کو نائلہ خان کے ساتھ جاتا دیکھ کر پل بھر کے لیے تو اسے اپنا دل ڈوبتا ہوا سا لگا تھا لیکن پھر شاید وہ پانچ لاکھ روپوں ہی کی طاقت تھی جس نے اسے فوراً سنبھال لیا تھا۔

چند دن کی تو بات ہے' اس نے سوچا تھا' شاہد اس سے ہمیشہ کے لیے تو نہیں بچھڑ رہا تھا۔ چند دن بعد وہ شاہد کے ساتھ ایک نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔ سب ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا۔

وہ خود کو مطمئن رکھنے کے لیے بہت کچھ سوچتی رہی لیکن رات کو جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹی تو اسے اپنے پہلو میں خالی خالی بستر بڑا عجیب سا لگا۔ ایسا ہوتا تو پہلے بھی تھا کہ شاہد کو زیادہ دیر ہوجاتی تھی تو وہ اکیلی لیٹی رہتی تھی لیکن اس رات خالی بستر نے اسے یکایک بے چین کردیا۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔ اس کے دماغ میں شاہد اور نائلہ کی یکجائی کا تصور ابھرنے لگا۔ وہ ایک تکلیف دہ تصور تھا۔

آج پہلی رات ہے نا' اس نے سوچا' یہ وقتی بے چینی ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

لیکن وہ خود کو کسی طرح بھی پُرسکون نہیں کرسکی۔ ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔

صبح کا ناشتا تیار کرتے ہوئے بھی وہ اتنے خلفشار میں مبتلا تھی کہ بے دھیانی میں ہاتھ تھوڑا سا جل گیا۔

فاضل ناشتے کی میز پر چپ چپ سا رہا۔ افروز بھی ہمت کرنے کے باوجود اس سے کوئی بات نہیں کرسکی۔

فاضل اپنے دفتر جانے کے لیے کھڑا ہوا تو افروز نے کہا۔ "کیا تم مجھے بینک تک چھوڑ دوگے۔ واپس تو میں ٹیکسی میں

آجاؤں گی لیکن پانچ لاکھ روپے لے کر ٹیکسی میں جانا کچھ مناسب نہیں ہوگا۔"

فاضل نے انکار نہیں کیا۔ یہ وتیرہ اس کا ہمیشہ ہی سے تھا۔

افروز پانچ لاکھ روپے اکاؤنٹ میں جمع کر آئی۔ وہ اکاؤنٹ شاہد نے اسی کے نام کھلوا رکھا تھا۔

دس بج چکے تھے۔ اس وقت افروز کھانا پکانے کی تیاری میں مصروف ہو جاتی تھی لیکن اس روز کچھ کرنے کو اس کا جی ہی نہیں چاہا۔ گھر بھی ویران اور اجاڑ سا لگ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ اس نے گھر کی کوئی بہت قیمتی چیز کوڑیوں کے مول بیچ دی تھی۔ اس نے خود کو پُرسکون رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن گھبراہٹ میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ گھبراہٹ اتنی بڑھی کہ وہ نائلہ کے گھر فون کر بیٹھی۔ وہ شاہد سے بات کرنا چاہتی تھی۔ فون خود نائلہ نے ریسیو کیا۔

"میں افروز بول رہی ہوں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

"اوہ!"

دوسری طرف کی خاموشی زیادہ طویل تو نہیں تھی لیکن افروز کو بہت طویل محسوس ہوئی' وہ جلدی سے بولی "میں ایک منٹ کے لیے شاہد سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا۔" نائلہ کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا "ایک منٹ۔"

پھر قدرے وقفے کے بعد افروز نے شاہد کی آواز سنی "ہیلو!" اس کا لہجہ بہت سپاٹ تھا۔

افروز کا دل خوشی سے دھڑک اٹھا "کیسے ہو شاہد؟"

"تمہارے خیال میں کیسا ہونا چاہیے؟"

"تم تو اس طرح بات کرنے لگے جیسے ناراض ہو!"

"میں بھلا تم سے ناراض ہو سکتا ہوں۔ تمہاری خوشی ہی کے لیے تو میں نے اپنا سودا ہو جانا تک منظور کر لیا!"

"چند دن کی بات ہے شاہد! پھر سب ٹھیک ہو جائے گا نا۔"

"تم نے سوچا ہے تو ٹھیک ہی ہو جائے گا۔" شاہد نے کہا اور پھر بولا "لو یہ نائلہ کو تم سے کچھ کہنا ہے۔"

افروز سمجھ گئی کہ نائلہ اسے شاہد سے زیادہ دیر تک بات نہیں کرنے دینا چاہتی۔

"ہیلو افروز!" نائلہ خان کی آواز سنائی دی "دراصل میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ شاہد کو ساتھ لے کر کہیں گھومنے جا رہی ہوں۔ زیادہ باتیں ہوں گی تو مجھے دیر ہو جائے گی۔ میں فون بند کر رہی ہوں۔"

افروز اس وقت تلملا کر رہ گئی جب اس کی کوئی بات سنے بغیر ہی نائلہ خان نے ریسیور رکھ دیا۔

"سؤر کی بچی!" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ اس نے شدید بے بسی محسوس کی تھی۔

جیسے تیسے اس نے دوپہر کا کھانا تیار کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اگر فاضل آجائے تو اسے کھانا نہ مل سکے۔ کھانا تیار کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی۔ رات بھر جاگنے کے باعث وہ بے حد نڈھال ہو رہی تھی۔

فاضل دوپہر کو نہیں آیا۔

"میں نے خواہ مخواہ دوپہر کا کھانا پکایا۔" شام کو فاضل کی آمد پر وہ اس سے بولی۔

"ایسا تو اکثر ہوتا ہے کہ میں دوپہر کو نہیں آپاتا۔"

افروز چپ ہو گئی۔ فاضل نے کوئی غلط جواب نہیں دیا تھا۔

رات کا کھانا دونوں نے ساتھ ہی کھایا۔ اس وقت افروز نے فاضل کو بتایا کہ اس نے شاہد کو فون کیا تھا اور نائلہ خان نے اس سے بے رخی برتی تھی۔

"وہ چند دن کے لیے شاہد کی مالک جو بن چکی ہے۔" فاضل نے کہا۔

افروز اپنا نچلا ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

دل و دماغ پر بوجھ کے باوجود اسے رات کو جلد ہی نیند آجاتی لیکن ایک ٹیلی فون کال نے اس کی نیند منتشر کر دی۔ فون کرنے والے نے اپنا نام ریحان ایڈووکیٹ بتایا تھا۔

"میں مس نائلہ خان کا قانونی مشیر ہوں۔ آپ تک ان کا ایک پیغام پہنچانا چاہتا ہوں۔ آپ اگر انہیں فون کریں تو ان نمبروں پر نہ کیجیے گا جو آپ کے پاس ہیں۔ میں آپ کو ایک نمبر دے رہا ہوں۔ وہ لکھ لیجیے!"

"یہ کیا گڑبڑ ہے!" افروز نے سوچتے ہوئے وہ ٹیلی فون نمبر لکھا جو دوسری طرف سے بتایا گیا تھا۔

"بس مجھے یہی پیغام دینا تھا۔" ٹیلی فون نمبر بتانے کے بعد دوسری طرف سے کہا گیا اور پھر سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سنائی دی۔

افروز نے پریشانی کے عالم میں وہ نمبر ڈائل کیے جو اسے کسی ریحان ایڈووکیٹ نے دیے تھے۔ دوسری طرف دو مرتبہ گھنٹی بجی اور پھر رابطہ قائم ہو گیا۔ افروز کو شاہد کی آواز سنائی دینے لگی۔

"افروز! میں بذاتِ خود تم سے مخاطب نہیں ہوں۔ یہ

میری ریکارڈڈ آواز ہے۔ نائلہ خان چونکہ ان دنوں میری مالک ہے اس لیے میں ان کی اجازت سے تمہارے لیے یہ پیغام ریکارڈ کر رہا ہوں تاکہ تم پریشان نہ ہو۔ دراصل نائلہ خان مجھے لے کر کسی پہاڑی علاقے کی تفریح کے لیے جا رہی ہے۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں معلوم۔ تم میری عدم موجودگی سے فکرمند نہ ہو جانا۔"

افروز نے اپنے دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ یہ سب کچھ سنا اور دم بخود سی رہ گئی پھر چند لمحے بعد اس نے رابطہ منقطع ہونے کی آواز سنی تو چونکی اور پھر ریسیور رکھ کر دوڑتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ وہ فاضل کو پکارتی بھی جا رہی تھی۔

فاضل بوکھلایا ہوا سا اپنے کمرے سے نکلا۔

"کیا بات ہے بھابی؟"

"وہ شاہد کو لے گئی۔" افروز نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"کہاں لے گئی؟" فاضل نے حیرت سے کہا۔

افروز نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں فاضل کو سب کچھ بتایا۔

فاضل کچھ دیر سوچنے لگا پھر سمجھانے والے انداز میں بولا "اس میں اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ شاہد کوئی بچہ نہیں ہے۔ نائلہ خان اسے اغوا کر کے نہیں لے گئی ہوگی۔ تم لوگ اس سے ایک ہفتے کی مدت طے کر چکے ہو۔ اس ایک ہفتے میں وہ شاہد کو کہیں بھی لے جا سکتی ہے۔ میں نے تو چاہا تھا کہ اس قسم کا کوئی بے ہودہ معاملہ طے نہ ہو سکے لیکن اس وقت تم نے میری بات نہیں مانی۔"

افروز پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

"جاؤ جا کر سو جاؤ۔" فاضل نے نرم لہجے میں کہا "اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ نائلہ خان کوئی جرائم پیشہ عورت نہیں ہے کہ شاہد کے ساتھ کوئی زبردستی کر سکے۔ بالفرض شاہد مقررہ دنوں کے بعد واپس نہیں لوٹا یا اس کی کوئی خبر نہیں مل سکی تو ہم پولیس سے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ ویسے یہ اتنا مضحکہ خیز معاملہ ہے کہ جس سے بھی اس بارے میں بات کی جائے گی، وہ تم دونوں میاں بیوی پر ہنسے گا۔ دنیا میں اس قسم کا سودا شاید کہیں نہ ہوا ہو۔ اچھا خیر چھوڑو۔ جا کے آرام کرو۔"

افروز جب اپنے کمرے کی طرف لوٹی تو اسے اپنے پیر من من بھر کے محسوس ہو رہے تھے۔

○☆○

ٹھیک اسی وقت وہ طیارہ فضا میں محوِ پرواز تھا جس میں نائلہ خان اور شاہد سفر کر رہے تھے۔ شاہد کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اس نے اب تک از خود نائلہ خان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ جب وہ کچھ کہتی تھی تو جواب دے دیتا تھا بس!

"تم نے اب تک نہیں پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟" نائلہ خان بولی۔

"مالک سے کوئی سوال نہیں کیا جاتا۔"

"اوہ گاڈ! کیا تم یہ کھردری باتیں کرنا ختم نہیں کر سکتے۔"

"میں تو سیدھی سادی باتیں کر رہا ہوں۔"

"خیر! میں تمہیں خود ہی بتاتی ہوں۔" نائلہ خان نے سب سے پہلے تو اس جگہ کا نام بتایا جہاں وہ جا رہے تھے پھر کہا۔ "میں اس شہر سے تمہیں اس لیے نکال لائی کہ پُرفضا مقام پر پہنچ کر تمہارے دل و دماغ کا بوجھ کم ہو سکتا ہے۔ تمہارے دماغ سے افروز کا تسلط بھی کچھ کم ہو سکتا ہے۔ آج جب اس کا فون آیا تھا، تبھی میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ اگر وہ اسی طرح تمہیں فون کرتی رہی تو تم اسی کی یادوں میں محو رہو گے اور میرا قرب تمہیں بالکل متاثر نہیں کرے گا۔ کل رات بھی تم برف کی سل بنے رہے تھے۔ مجھے بڑی خجالت محسوس ہوئی تھی۔"

شاہد خاموش رہا۔

"میں نے چند دن کے لیے تمہاری خوشگوار صحبت کی خاطر پانچ لاکھ روپے صرف کیے ہیں۔" پھر وہ بولی "لیکن تم نے مجھے اب تک کیف و سرور کا ایک لمحہ بھی نہیں دیا۔"

"تمہیں اگر اس قسم کی کوئی شرط منوانا تھی تو اس سے منواتیں جس نے مجھے تمہارے ہاتھوں بیچا ہے۔" شاہد نے تلخی سے کہا "میں نے خود کو تمہارے ہاتھوں فروخت نہیں کیا کہ تم مجھ سے کوئی شکایت کرو۔"

"تمہاری اس قسم کی باتیں مجھے بہت تکلیف پہنچاتی ہیں۔ تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ میرے دل میں تمہاری کتنی محبت ہے۔"

"مجھے تمہاری محبت کا خوب اندازہ ہے۔" شاہد کے لہجے کی تلخی برقرار رہی۔

نائلہ خان کچھ جھنجلا سی گئی اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی حالانکہ اندھیرے میں باہر کچھ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

ڈیڑھ گھنٹے کے فضائی سفر کے بعد وہ ائرپورٹ پر اترے اور وہاں سے انہوں نے ایک قیمتی کار میں سفر شروع کیا جس کا باوردی شوفر نائلہ کے سامنے اتنا مؤدب تھا جیسے وہ اس کا نوکر ہی ہو۔ شاہد کے لیے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ اسے نائلہ خان کی دولت کا خوب اندازہ تھا۔ اسی لیے

یہ عین ممکن تھا کہ اس شہر میں بھی نائلہ خان کا کوئی بنگلا ہو اور اس نے یہاں یہ کار بھی اسی لیے خریدی ہو کہ جب وہ یہاں آئے تو اسے کرائے کی کاروں میں سفر نہ کرنا پڑے۔

ذرا دیر میں کار شہری حدود سے نکل کر اس سڑک پر نکل آئی جو دس پندرہ میل کے بعد بلندی کی طرف جاتی تھی۔

"میں چاہتی ہوں کہ ہم آج رات ہی اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔" نائلہ خان بولی "وہاں میرا اپنا ریسٹ ہاؤس ہے اور اتنا خوب صورت ہے کہ تمہیں ضرور پسند آئے گا۔"

"مجھے تو وہ جھونپڑی بھی پسند کرنا پڑے گی جہاں تم مجھے لے جاؤ گی۔"

نائلہ خان اس جواب سے اتنی جھنجلائی کہ اس نے اپنے بیگ میں سے شراب کی بوتل، گلاس اور ٹھنڈے پانی کا فلاسک نکال لیا۔ اپنے لیے ایک پیگ بنا کر اس نے دو تین لمبے لمبے گھونٹ لیے۔ پہلا پیگ اس نے بیس منٹ میں ختم کردیا اور پھر دوسرا پیگ بناتے وقت وہ اپنی جھنجلاہٹ پر کچھ قابو پاچکی تھی۔ اس نے ایک اور گلاس نکالتے ہوئے کہا "مجھے تمہارے لیے بنانے کا خیال نہیں رہا۔"

"میں اس کا عادی نہیں ہوں۔"

"کبھی کبھی تو پی لیتے ہو۔ یہ میں معلوم کرچکی ہوں۔"

شاہد سمجھ گیا کہ اس کے بارے میں نائلہ کی تمامتر معلومات کا ذریعہ تصدق رسا ہی بنا ہوگا۔

نائلہ نے دو پیگ بنا کر ایک شاہد کی طرف بڑھایا۔

شاہد جب سے نائلہ کے ساتھ تھا، شدید اعصابی تناؤ کا شکار رہا تھا۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے پیگ ہاتھ میں لے لیا کہ شراب سے اس کی اعصابی کشیدگی دور ہوسکتی ہے۔

دوسرا اور تیسرا پیگ نائلہ نے بہت دھیرے دھیرے پیا لیکن شاہد کی رفتار کچھ تیز رہی۔ اس نے تیسرا پیگ بھی پی ڈالا جس سے اس کی اعصابی کشیدگی میں خاصی کمی ہوئی لیکن دماغ پر جو بوجھ تھا، اس میں کوئی نمایاں کمی نہیں ہوسکی۔ شاید اس کے لیے مزید شراب کی ضرورت تھی لیکن نائلہ خان نے مزید پیگ نہیں بنائے اور شاہد نے مانگنا مناسب نہیں سمجھا۔

بلندیوں کو سر کرتی ہوئی کار آخر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئی۔

وہ ریسٹ ہاؤس واقعی نہ صرف خوب صورت تھا بلکہ جس جگہ بنایا گیا تھا، وہ جگہ بھی اچھی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار نے ان کا اس طرح استقبال کیا جیسے وہ ان کا منتظر ہی رہا ہو۔

نائلہ خان، شاہد کو جس کمرے میں لے گئی، وہ نہایت قیمتی سازوسامان سے آراستہ خواب گاہ تھی اور خاصی کشادہ بھی تھی۔ ایک گوشے میں صوفے بھی لگے ہوئے تھے۔

انہی صوفوں پر بیٹھ کر نائلہ خان نے شراب کی بوتل پھر کھولی اور دو پیگ بنائے۔ شاہد نے وہ پیگ دھیرے دھیرے ختم کیا لیکن نائلہ اس دوران میں تیزی سے دو پیگ پی گئی اور پھر اس نے نشے سے سرشار حالت میں خود کو شاہد کی آغوش میں گرا دیا۔

شاہد نے یکلخت اپنا جسم اس طرح ڈھیلا چھوڑ دیا جیسے وہ کوئی بے جان مجسمہ ہو۔

بارہ بج چکے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" نائلہ خان کی آواز میں جھنجلاہٹ بے وجہ نہیں تھی۔

جواب میں ایک مردانہ آواز سنائی دی جس نے ناشتا تیار ہوجانے کی اطلاع دی۔

نائلہ خان نے اس سے پندرہ منٹ انتظار کرنے کو کہا اور بستر سے خود کو سمیٹتے وقت اس نے شاہد کی طرف بڑی تیکھی نظروں سے دیکھا جس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہ تھے۔

دوسری صبح ریسٹ ہاؤس کے چھوٹے سے لان میں بیٹھ کر ناشتا کرتے وقت بھی نائلہ خان کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ خاموشی سے ناشتا ختم کرنے کے بعد وہ شاہد سے بولی "کتنی شراب پی کر تمہارے جسم کی حدت بڑھ سکتی ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں! میں نے کبھی اس قسم کا تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔" شاہد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد نائلہ خان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اس مسکراہٹ میں تھوڑا سا جبر ضرور تھا۔ شاید وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ وہ جھنجلاہٹ یا غصے کے اظہار سے شاہد کا دل کبھی نہیں جیت سکے گی۔

"یہاں کچھ ٹھنڈک ہے۔ اندر ہی چلتے ہیں۔" وہ بولی۔

شاہد نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا لیکن جب وہ اٹھی تو وہ بھی اٹھ گیا۔ وہ دونوں خواب گاہ میں پہنچے۔ نائلہ خان نے ایک کھڑکی کھولی۔

"اس طرف بہت حسین منظر ہے۔" وہ بولی "میں یہاں کرسی ڈال کر خاصا وقت گزار دیتی ہوں۔ باہر گھومنے پھرنے کے لیے صرف رات کو اتنی دیر سے نکلتی ہوں جب خاصا سناٹا ہوجاتا ہے۔ دن میں کہیں گھومنا پھرنا میرے لیے ممکن نہیں۔

لوگوں کا ہجوم گھیر لیتا ہے۔ ہم اداکاروں کو آزادی سے گھومنا پھرنا نصیب نہیں ہوتا۔"

شاہد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اسے نائلہ خان کی زندگی کی مشکلات سے کوئی دلچسپی تھی' نہ کسی اور چیز سے! وہ جو یہ چند دن نائلہ خان کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا تو صرف اس لیے کہ افروز کی خواہشات پوری ہو سکیں۔ یہ شب و روز اس کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھے لیکن وہ یہ عذاب بھگت کر خود کو اس بات کی سزا دے رہا تھا کہ وہ افروز کی خواہشات پوری کرنے کا اہل نہیں تھا۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ افروز کو بھی اپنے کیے کی سزا اچھی طرح مل جائے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے "غائب" ہو جانے کے بعد تو افروز کا وقت بھی تڑپ تڑپ کر ہی گزرے گا اسی لیے وہ خود بھی یہ عذاب ناک دن گزار کر افروز کو اتنا تڑپانا چاہتا تھا کہ دولت ہی کو سب کچھ سمجھ لینے کا خیال اس کے دماغ سے ہمیشہ کے لیے نکل جائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بھی شاہد کو یہ تسکین ضرور مل جاتی' افروز سے محبت کی خاطر وہ دنیا کا ہر عذاب بھگت سکتا ہے۔

جو سودا افروز نے کیا تھا' اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔ شاہد جب چاہتا' اس معاملے کو ختم کر سکتا تھا لیکن اس کی فطری اصول پسندی ایسی تھی جسے فاضل غیر فطری اصول پسندی کہا کرتا تھا۔ شاہد نے کبھی اس کے تبصرے کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اسی لیے وہ چاہتا تھا کہ پانچ لاکھ روپوں میں جو کچھ طے ہو چکا ہے' اس سے انحراف نہیں کیا جانا چاہیے۔ رہی یہ بات کہ نائلہ خان کے بقول وہ "برف کی سل" بنا ہوا تھا تو یہ شاہد کی دانست میں کوئی "غیر اصول پسندانہ بات" نہیں تھی۔ "معاہدے" میں یہ بات طے نہیں ہوئی تھی کہ وہ نائلہ خان کے پُرجوش جذبات کی پذیرائی بھی کرے گا۔

دن گزرتے رہے۔ شاہد کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نائلہ خان جھنجلاتی اور پھر خود پر قابو بھی پاتی رہی۔

ریسٹ ہاؤس میں ٹیلی فون موجود تھا۔ شاہد اس پر افروز سے رابطہ کر سکتا تھا مگر اس کے لیے نائلہ خان کی تائید ضروری تھی۔ وہ ٹیلی فون انسٹرومنٹ لاک رکھتی تھی۔

آخر ایک صبح ناشتا کرتے ہوئے شاہد نے کہا "آج شام کو معاہدے کا ایک ہفتہ مکمل ہو جائے گا۔ ہمیں اب یہاں سے روانہ ہونا چاہیے۔"

"تم نے اب تک میرے دل کی کیفیت نہیں سمجھی لہٰذا میں اس معاہدے کی میعاد کو بڑھا رہی ہوں۔" نائلہ خان نے کہا۔

"کیا مطلب؟" شاہد چونکا۔

"افروز سے یہ بات طے ہو گئی تھی کہ اگر مدت میں مزید کچھ اضافہ ہوا تو اور رقم ادا کر دی جائے گی۔"

"مجھے ایسی کسی بات کا علم نہیں۔" شاہد کے لہجے میں سختی تھی۔

"تم خود فون کر کے اس سے پوچھ لو' اسے بس یہ نہ بتانا کہ ہم کہاں ہیں!"

نائلہ خان کے لہجے میں ایسا اعتماد تھا کہ شاہد اسے جھوٹا نہیں سمجھ سکا اور اس کے رگ و پے میں غصے کی لہریں دوڑ گئیں۔ اچھی بات ہے افروز' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اگر تم روپوں کے لیے اتنی دیوانی ہو چکی ہو تو یہی سہی! اگر تم سے محبت کرنے کی میرے لیے یہی سزا ہے کہ انگاروں پر لوٹتا رہوں تو مجھے یہ بھی منظور ہے۔



افروز کو یہ یقین آنے میں دو دن بھی نہیں لگے تھے کہ اس نے ایک بہتر مستقبل کی خاطر نائلہ خان سے سودا کر کے بہت بڑی حماقت کی تھی۔ چند لاکھ روپوں کی خاطر اس نے اپنی محبت کو نیلام.... کرتے ہوئے سوچا تھا کہ وہ شاہد کی چند روزہ فرقت اور ...... گوارا کر لے گی کہ چند دنوں کے لیے اس کا شوہر کسی دوسری عورت کا ہو گیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

لیکن فرق پڑ کر رہا۔ اگر نائلہ خان شاہد کو اس شہر سے نہ لے جاتی تو ممکن تھا کہ افروز وہ دن کسی نہ کسی طرح آسانی سے نہ سہی کچھ دشواری سے کاٹ ہی لیتی۔ شاہد سے فون پر بات کر کے اسے تسلی رہتی لیکن شاہد کا اس شہر سے چلا جانا' افروز کے لیے قیامت بن گیا۔ وہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے نائلہ خان اس سے شاہد کو ہمیشہ کے لیے چھین کر لے جا چکی تھی۔

افروز کی بھوک پیاس اور نیندیں اڑ گئیں۔ پانچ دن میں ہی اس کا رنگ پیلا نظر آنے لگا تھا۔ فاضل سے اس کی حالت چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے افروز کی ڈھارس بندھانے کی بہت کوششیں کیں مگر کامیاب نہیں ہو سکا۔

ساتویں دن ناشتے کے وقت افروز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "فاضل بھیا! آج شام کو ایک ہفتہ تو مکمل ہو جائے گا۔"

"ہاں۔" فاضل نے کہا "اور مجھے یقین ہے کہ اب نائلہ خان اسے نہیں روک سکے گی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہو گا' خود چلا آئے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔ نہ جانے کیوں میرا تو دل بیٹھا جارہا ہے۔"

فاضل نے اس کی ڈھارس بندھانے کے لیے مزید چند جملے کہے اور اپنے دفتر چلا گیا۔

افروز نے عادت ڈال لی تھی کہ دس بجے کچن میں چلی جاتی تھی اور ذہنی انتشار کے باوجود کھانا پکا کر گھر کی صفائی ستھرائی میں وقت گزارنے کی کوشش کرتی تھی لیکن اس کا دل اچاٹ ہی رہتا تھا۔ ان دنوں میں وہ ایک بار بھی آرٹ کونسل نہیں گئی تھی۔

دس بجے وہ کچن جانے کے لیے اٹھی ہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے لپک کر فون اٹھایا۔ نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ وہ شاہد کا فون ہوگا لیکن اس وقت اس کا دل سینے میں بیٹھنے سا لگا جب اس نے دوسری طرف سے آواز سنی۔ دوسری طرف سے نائلہ خان کا قانونی مشیر ایڈووکیٹ ریحان بول رہا تھا۔

"آپ کے لیے مس نائلہ خان کا پیغام ہے۔ انہوں نے کہلوایا ہے کہ شاہد صاحب ابھی ایک ہفتے اور نہیں آسکیں گے لہٰذا آپ کے بینک اکاؤنٹ میں آج نو بجے چار لاکھ روپے جمع کروائے جاچکے ہیں۔ آپ بینک سے تصدیق کرسکتی ہیں۔ کیا آپ مجھ سے کوئی سوال کرنا چاہیں گی؟"

"وہ لوگ کہاں ہیں؟" افروز نے جلدی سے پوچھا۔

"یہ بتانے کی مجھے اجازت نہیں ہے محترمہ!"

افروز نے مزید کچھ کہے بغیر کھوئے کھوئے سے انداز میں ریسیور رکھ دیا۔ لیکن پھر کچھ خیال آتے ہی دوبارہ ریسیور اٹھایا اور بینک کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس نے براہِ راست مینجر سے بات کی اور اس کی تصدیق ہوگئی کہ نائلہ خان کے نام سے اس کے اکاؤنٹ میں چار لاکھ روپے جمع ہو چکے تھے۔

یہ تصدیق کرکے افروز نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ گھنٹی پھر بجی۔ افروز نے بڑی بے دلی سے ریسیور اٹھایا "ہیلو!" اس کے لہجے میں مردنی تھی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا دل بڑی زور سے اچھلا۔

"میں شاہد بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے آنے والی آواز افروز نے صاف پہچانی تھی۔

شاید وہ کچھ اور کہتا لیکن افروز نے جلدی سے کہا "تم کہاں ہو شاہد! تم کیسے ہو؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا کہ میں کہاں ہوں لیکن تم کیسی ہو؟"

"میں۔۔۔" افروز کی آواز کانپ گئی پھر اس نے کہا "تم آج شام کو واپس آرہے ہو نا؟"

"میں یقیناً واپس آجاؤں گا' اگر تم ایک بات کی تردید کردو گی؟"

"کس بات کی؟"

"کیا نائلہ خان سے تمہاری یہ بات بھی ہوئی تھی کہ مجھے ایک ہفتے کے بعد بھی کچھ دن روکا جاسکتا ہے؟ دیکھو جھوٹ نہ بولنا۔ کیا یہ بات ہوئی تھی؟"

"ہاں۔" افروز نے آہستہ سے کہا۔

"اور آج تمہارے اکاؤنٹ میں مزید چار لاکھ روپے بھی جمع ہوچکے ہیں؟"

"ہاں۔"

"خوب!" شاہد نے ایک طویل سانس لی "ٹھیک ہے افروز! تم سرمایہ جمع کرتی رہو۔ جب تک دل چاہے' مجھے نیلام کرتی رہو!"

پھر اس سے پہلے کہ افروز کچھ کہتی' دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کیا جاچکا تھا۔

افروز دم بخود سی بیٹھی رہ گئی۔ اسے ایک اطمینان یہ تو ہوگیا تھا کہ شاہد کے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی اور وہ خیریت سے تھا لیکن اس بات نے اسے دلی تکلیف پہنچائی کہ شاہد کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

وہ ناراضگی تو میں دور کرلوں گی' اس نے سوچا۔

ان چند واقعات سے اس کے دل و دماغ میں ایک عجیب تبدیلی پیدا ہوگئی تھی۔ شاہد کی خیریت مل جانے کے بعد اسے حالات کا یہ پہلو کچھ خوش گوار محسوس ہونے لگا تھا کہ اب اس کے بینک میں نو لاکھ روپے جمع ہوگئے تھے جو اس کے لیے کوئی معمولی رقم نہیں تھی۔

وہ بتدریج کچھ پُرسکون ہوتی چلی گئی۔ شاہد خیریت سے تھا' یہ اس کے لیے سب سے اطمینان کی بات تھی اور یہ بھی یقینی امر تھا کہ اس کے دل میں اپنی بیوی کی چاہت بدستور باقی تھی۔ اس کی ناراضگی کو وقتی سمجھتے ہوئے اسے یقین تھا کہ شاہد کی واپسی پر وہ اسے منالے گی۔ اس کی دانست میں یہ ناممکن تھا کہ شاہد نائلہ خان کا ہوکر رہ جاتا۔ نائلہ خان بھی اس سے یہ بات کہہ چکی تھی کہ وہ اس سے اس کا شوہر چھیننا نہیں چاہتی۔ یہ محض ایک سرمائے دار عورت کی ضد اور انا کا مسئلہ تھا اور ایسے مسئلوں پر لوگ بڑی سے بڑی رقم داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ وہ بھی یہی کررہی تھی اور اس کی اس انا پرستی سے فائدہ نہ اٹھانا بے وقوفی ہی ہوتی۔

افروز دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی!

شام کو فاضل آیا تو اس نے افروز میں تبدیلی محسوس کی اور چونک کر بولا "کیا شاہد آگیا؟"

"فون آیا تھا۔" افروز نے جواب دیا۔

"وہ کب آرہا ہے؟" فاضل نے بے چینی سے پوچھا۔

"ابھی ایک ہفتہ اور لگے گا۔" افروز نے نظریں جھکا کر جواب دیا "نائلہ خان نے انہیں ایک ہفتے کے لیے اور روک لیا ہے جس کے عوض چار لاکھ روپے میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادیے ہیں۔"

"اوہ!" فاضل نے مردہ دلی سے کہا "تو تمہارے چہرے کی یہ بشاشت ان چار لاکھ روپوں کی وجہ سے ہے؟"

"نہیں۔" افروز جلدی سے بولی "دراصل اب مجھے یہ اطمینان حاصل ہوگیا ہے کہ شاہد خیریت سے ہے۔"

فاضل نے افروز کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ جواب اس کے لیے زیادہ تسلی بخش نہ رہا ہو۔

"بھابی!" وہ قدرے توقف سے بولا "میں نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ تم میرے ایک دوست کی بیوی ہو۔ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنے سگے بھائی کی بیوی کی طرح سمجھا ہے اور سمجھتا بھی رہوں گا لیکن مجھے اس بات کا قلق ہمیشہ رہے گا کہ تمہاری سوچ....." نہ جانے کس خیال سے اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت افروز چور سی ہو کر رہ گئی۔



"نئے معاہدے" کی وہ پانچویں شام تھی۔

شاہد ریسٹ ہاؤس کی خواب گاہ میں بیٹھا ہوا پیے ہی چلا جارہا تھا۔ تیسرے کے بعد اس نے چوتھا پیگ بھی بنایا اور اس کے انداز سے یوں ظاہر ہورہا تھا کہ پانچواں چھٹا پیگ بھی آج اس کا آخری پیگ نہ ہوگا۔ شراب پینے سے پہلے اور دوپہر سے اب تک اس کے چہرے پر کرب کی جو پرچھائیاں نظر آئی تھیں اور آنکھوں سے جو درد چھلکتا رہا تھا، ان دونوں ہی باتوں میں تین پیگ پینے کے باوجود کوئی نمایاں کمی نظر نہیں آئی تھی۔

غلطی سے وہ آج دوپہر فاضل کو اس کے دفتر فون کر بیٹھا تھا۔ فون کرنے کے لیے اسے نائلہ خان کی اجازت بھی لینا پڑی تھی ورنہ فون کا قفل کیسے کھلتا۔ شاہد نے اسے صاف صاف بتادیا کہ وہ فاضل سے افروز کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ وہ افروز سے بات کرنے کی خواہش بھی ظاہر کرسکتا تھا اور غالباً نائلہ خان اس میں بھی انکار نہ کرتی مگر شاہد کے ذہن میں کچھ ایسے خیالات تھے کہ وہ فاضل سے بات کرنا چاہتا تھا۔

فاضل سے وہ بات چیت ہی قیامت بن گئی۔ فاضل نے تو غالباً اس کو مطمئن کرنے ہی کے لیے بتایا تھا کہ شاہد کے اچانک غائب ہوجانے سے افروز کی حالت خراب تو ہوگئی تھی لیکن اس سے فون پر بات کرنے کے بعد اس کی بشاشت لوٹ آئی تھی اور باتوں باتوں میں اس نے فاضل سے اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ "مارکیٹ" میں کیونکہ سبھی شاہد کی عزت کرتے ہیں اس لیے اسے اتنا کریڈٹ ضرور مل سکے گا کہ نو لاکھ روپے سے بھی پرائیویٹ پروڈکشن کا کام شروع کرنے میں اسے کوئی خاص مشکلات نہیں ہوں گی۔

یہ باتیں شاہد کے دل میں تیر کی طرح پیوست ہوگئی تھیں۔ پہلے تو کچھ گمان اسے یہ تھا کہ افروز سوچے سمجھے بغیر نائلہ خان سے جو معاملہ طے کر بیٹھی تھی، وہ بعد میں اس کے لیے خلش کا باعث ضرور بنا ہوگا۔ فاضل کی باتوں سے اس کے گمان کی تصدیق بھی ہوگئی تھی لیکن یہ بات شاہد کے لیے بے حد کرب کا باعث بنی تھی کہ اس سے فون پر بات ہونے کے بعد افروز کی بشاشت لوٹ آئی تھی اور وہ مستقبل کی منصوبہ بندیوں میں مصروف تھی۔ حقیقت خواہ کچھ بھی ہو لیکن شاہد کے دل ودماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ افروز کی بشاشت کا سبب وہ مزید چار لاکھ روپے تھے جو نائلہ خان نے اسے بھجوائے تھے۔

شاہد اس احساس سے روحانی طور پر لہولہان ہوگیا تھا کہ افروز محض چند لاکھ روپوں کے لیے اسے ایک جہنم میں جھونکے ہوئے تھی۔ اگر نائلہ خان اسے مزید روپے بھیج دیتی تو وہ شاہد کی دوری مزید گوارا کرلیتی۔

یہ کیسی محبت ہے کہ دولت کی خاطر کوئی اپنے محبوب کو نیلام کرتا رہے؟ یہ سوال کانٹا بن کر شاہد کے دل میں ٹوٹا تھا اور شام کو اس نے وحشت میں شراب کی بوتل کھول لی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے نائلہ خان کے اصرار کے بغیر شراب کی بوتل کو ہاتھ لگایا تھا۔

تین پیگ پی کر بھی اس کے دل .... کا درد کم نہیں ہوا۔ وہ چوتھا پیگ پیتے ہوئے بھی سوچتا رہا کہ افروز کو اب اس سے نہیں، صرف دولت سے پیار تھا۔ اس سے شادی اس کا جذباتی فیصلہ تھا اور چند ماہ گزرنے کے بعد جب وہ جذبات ٹھنڈے پڑگئے تو "محبت نامی" جذبے نے دم توڑ دیا اور اس کی جگہ دولت نے لے لی۔

ملازم کے قدموں کی آہٹ سن کر شاہد چونکا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"صاحب!" ملازم بولا "میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ بیگم صاحبہ نے ہی مجھے یہ پوچھنے کے لیے بھیجا ہے۔"

"تمہاری بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟" شاہد کی آواز نشے کے باعث خفیف سی بھاری ہو گئی تھی۔

"ان کے ایڈووکیٹ ریحان صاحب آئے ہیں۔ وہ ان سے کچھ ضروری کاغذات تیار کرا رہی ہیں۔ انہیں ایک گھنٹا اور لگ جائے گا اسی لیے انہوں نے مجھے بھیجا تھا کہ اگر آپ کھانا کھانا چاہیں تو ان کا انتظار نہ کریں۔ کھانا تیار ہے۔ میں ابھی آپ کے لیے لے آتا ہوں۔"

"نہیں۔" شاہد نے کہا "میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔"

ملازم شاید کچھ اور سمجھا۔ اس نے کہا "بیگم صاحبہ کو شاید زیادہ دیر بھی لگ جائے۔ دراصل ایڈووکیٹ صاحب جس کام سے آئے ہیں' وہ مکمل کر کے انہیں اسی وقت واپس لوٹ جانا ہے۔ وہ رات ہی کے جہاز سے واپس جانا چاہتے ہیں اس لیے بیگم صاحبہ سب کام کر کے ہی فارغ ہوں گی۔"

"یہ ساری بکواس تم نے کیوں کر ڈالی؟" شاہد نے اسے گھور کر دیکھا۔

"جی' وہ۔" ملازم نے سٹپٹا کر کہا "میں بس یہ بتانا چاہتا تھا کہ اگر آپ کھانے کے لیے بیگم صاحبہ کا انتظار کرنا چاہتے ہیں تو اس میں دیر ہو جائے گی۔"

"میں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔" شاہد نے ڈپٹ کر کہا۔

"بہتر ہے صاحب!" ملازم نے آہستہ سے کہا اور چلا گیا۔

ملازم کی ان باتوں سے شاہد کا موڈ کچھ اور خراب ہو گیا۔ اسے یہ دخل اندازی بہت بری لگی تھی۔ اس نے دو سانسوں میں چوتھا گلاس خالی کر دیا اور پانچواں گلاس بنانے لگا۔

نائلہ خان بہت بری عورت سہی' وہ سوچنے لگا لیکن وہ اس کا دل جیتنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کیے ڈال رہی ہے۔ اسے کوئی قانونی مسئلہ درپیش تھا لیکن اس نے خود واپس جانے کے بجائے اپنے ایڈووکیٹ کو بلا لیا تھا۔ اس کے پاس ابھی "نئے معاہدے" کے تحت دو دن تھے۔ وہ ان دو دن کو بھی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی اور ان اڑتالیس گھنٹوں میں شاہد کا دل جیت لینے کی توقع کر رہی تھی۔

جب شاہد نے چھٹا پیگ بنایا تو وہ افروز اور نائلہ خان کا موازنہ کرنے لگا۔ وہ دونوں ہی خوب صورت تھیں۔ افروز تو اس کے مقابلے میں جوان بھی تھی لیکن اس معاملے میں نائلہ خان کا پلڑا بھاری تھا کہ وہ اس کا دل جیتنے کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنا چاہتی تھی جب کہ افروز نے اس کے دل کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔

بارہ دنوں میں نائلہ خان نے شاہد کو تو حاصل کر لیا تھا لیکن اس کا دل نہیں جیت سکی تھی اور بقول اس کے شاہد "برف کی سل" بنا رہا تھا۔ شاہد کی دانست میں یہ بات نائلہ خان کو روحانی طور پر لہولہان کیے ہوئے تھی۔ اس کے برخلاف شاہد نے ہر اعتبار سے خود کو افروز کے لیے وقف کر رکھا تھا لیکن افروز نے اس پر دولت کو ترجیح دی تھی۔

لیکن اس موازنے میں نائلہ خان کا پلڑا بھاری ہونے کے باوجود شاہد کے دل میں افروز کی محبت کی کسک پر کوئی حرف نہیں آیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ وہ واپس جا کر افروز کو مجبور کرے گا کہ وہ نائلہ کے روپے واپس کر دے کیونکہ نائلہ خان ان روپوں کے عوض جو کچھ حاصل کرنا چاہتی تھی' وہ اسے حاصل نہیں ہوا تھا۔

اگر افروز کو مجھ سے محبت ہے تو وہ میری بات مان لے گی' شاہد نے سوچا اور اگر اس نے میری بات نہ مانی تو۔۔۔

کچھ ایسے خیالات شاہد کے ذہن میں ابھرے جو زہریلے سانپوں کی طرح پھنکار رہے تھے۔ ان خیالات سے وحشت زدہ ہو کر شاہد نے چھٹا پیگ تیزی سے ختم کیا اور ساتواں پیگ بنانے لگا۔

وہ کبھی کبھار ہی شراب پیا کرتا تھا اور ساری زندگی میں اس نے اتنی زیادہ تو کبھی نہیں پی تھی۔ نشے کے باعث اس کے ہاتھ پیر اس کے قابو میں نہیں رہے تھے۔ اگر وہ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تو شاید ڈگمگا کر گر پڑتا۔ پیگ بناتے ہوئے بھی کچھ شراب گلاس کے بجائے تپائی پر گر پڑی تھی جس کی طرف اس کا دھیان بھی نہیں گیا اور وہ گلاس میں پانی ڈال کر گلاس کو گھورنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ شراب کا رنگ ہلکا کیوں ہو گیا ہے! اسے یہ خیال نہیں آیا کہ گلاس میں شراب کم تھی اور پانی پورا تھا۔ شراب جو میز پر چھلک گئی تھی اس کے بعد گلاس کی شراب کا رنگ ہلکا ہونا ہی چاہیے تھا۔

اونہہ' ہو گا' شاہد نے اپنا سر جھٹکا اور گلاس اٹھا لیا۔

اسی وقت نائلہ خان اندر آئی۔

"کیا بات ہے؟ آج تم کھانا کیوں نہیں کھانا چاہتے؟" وہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

"بس۔۔۔ بس۔۔۔ یوں ہی۔۔۔ دل نہیں چاہ رہا ہے۔"
شاہد کی زبان بُری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔
"آج تم بہت زیادہ پی گئے ہو! اتنی تو تم نے کبھی نہیں پی!"

شاہد نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور شراب کا گلاس اپنے ہاتھ میں نچانے لگا پھر اچانک ہی گلاس ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کردیا۔ پیگ ہلکا بنا تھا اس لیے سینے کے اندر کوئی دھکا نہیں لگا اور اگر لگتا بھی تو اتنی زیادہ پی جانے کے بعد اس کا احساس نہیں ہوتا۔

اس نے جب آٹھواں پیگ بنانا چاہا تو بوتل اس کے ہاتھ میں سنبھل نہیں رہی تھی۔ نائلہ خان نے اسے مزید پینے سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برخلاف اس نے بوتل شاہد کے ہاتھ سے لے لی اور خود اس کے لیے پیگ بنایا۔

نائلہ خان کچھ باتیں کرتی رہی۔ شاہد جواب بھی دیتا رہا مگر اب اس کی ذہنی حالت ایسی تھی کہ نائلہ خان کی بات کے جواب میں کچھ کہنے کے بعد بھول جاتا تھا کہ نائلہ خان نے کیا بات کہی تھی اور اس نے کیا جواب دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں لیکن وہ گلاس ہونٹوں سے لگائے رہا تھا۔

پھر اسے یہ احساس نہیں رہا کہ اس نے نواں پیگ پیا تھا یا آٹھواں پیگ بھی پورا نہیں پی سکا تھا۔ وہ صوفے پر ہی ایک طرف لڑھک گیا۔

○☆○

صبح وہ بیدار ہوا تو اسی صوفے پر تھا لیکن تپائی پر شراب کی بوتل اور گلاس وغیرہ ہٹایا جا چکا تھا۔

کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نائلہ خان رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی ہوئی کچھ لکھ رہی تھی۔ اس نے ٹیبل لیمپ جلا رکھا تھا۔

شاہد صوفے سے اٹھا تو نائلہ خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس نے جلدی سے ایک کتاب اٹھا کر رائٹنگ پیڈ پر رکھ دی پھر کھڑی ہوتے ہوئے بولی "رات تو تم نے حد ہی کردی شاہد! گلاس بھی تمہارے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ خیر! میں سب صفائی کروا چکی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اب تم غسل کرلو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اپنا سر بہت بھاری محسوس ہو رہا ہوگا۔ نہانے سے یہ کیفیت ختم ہو جائے گی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہد کو اپنے سر میں خاصا درد محسوس ہو رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور غسل خانے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

غسل کرتے ہوئے پانی کی بوچھاڑ سے شاہد نے سچ مچ یہ محسوس کیا جیسے اس کے سر کا درد پگھلتا چلا جا رہا ہو۔ پھر اسے گزشتہ رات کی کچھ باتیں بھی یاد آنے لگیں۔ وہ جو کچھ سوچتا رہا تھا اس کا کچھ نہ کچھ حصہ اسے یاد آتا رہا۔ ملازم کی آمد کے علاوہ اسے نائلہ کی آمد بھی یاد آئی۔ یہ بھی یاد آیا کہ نائلہ اس سے کچھ باتیں کرتی رہی تھیں۔ وہ باتیں اسے یاد نہیں آسکیں لیکن نائلہ خان کا ایک جملہ اس کے ذہن میں ایسا گونجا کہ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔

"میں اپنی شکست تسلیم کرتی ہوں شاہد! میں کچھ بھی کرلوں لیکن تمہارے احساسات نہیں جیت سکتی۔"

شاہد حیرت سے سوچنے لگا کیا واقعی نائلہ خان نے اس سے یہ بات کہی تھی یا اس نے شراب کے نشے میں کچھ کا کچھ سن لیا تھا؟

وہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکا۔

پھر جب وہ اچانک غسل خانے سے نکلا تو اس نے محسوس کیا کہ نائلہ خان نے جو بیڈ کی دراز میں کچھ رکھ رہی تھی، بڑی جلدی میں دراز بند کردی اور کھڑی ہوتے ہوئے بولی "ناشتا یہیں منگوالیں یا۔۔۔"

"یہیں منگوالو۔" شاہد نے آہستہ سے کہا۔ اس کا ذہن اس ریوالور میں الجھا ہوا تھا جو نائلہ خان نے بڑی تیزی سے دراز میں رکھا تھا۔

ناشتا وہیں منگوا کر وہ ناشتا کرنے لگے۔ خلافِ معمول آج نائلہ خان کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی بکھری ہوئی تھی۔ اس نے شاہد سے کوئی بات بھی نہیں کی لیکن اب شاہد کا ذہن اس ریوالور کے علاوہ اس تحریر میں الجھ گیا تھا جو رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھ کر نائلہ خان نے لکھی تھی اور شاہد کو بیدار ہوتا دیکھ کر ایک کتاب سے وہ تحریر چھپادی تھی۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد نائلہ خان نے ائرلائن کا ایک ٹکٹ شاہد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "فلائٹ کا وقت دوپہر کے بعد ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تم یہاں سے روانگی کی تیاری کرلو۔"

"کیا مطلب؟" شاہد نے اسے غور سے دیکھا۔

"اوہ!" نائلہ خان نے بھی اسے غور سے دیکھا "تو رات کو تمہیں اتنا نشہ ہوگیا تھا کہ میری باتیں بھی تمہیں یاد نہیں رہیں۔"

شاہد کو کچھ یاد تو آچکا تھا لیکن وہ مجسم سوال بنا بیٹھا رہا۔

نائلہ خان کے چہرے پر شدید کرب کے آثار ابھرے۔ اس نے شاہد سے نظریں چراتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں

کہا "میں اپنی شکست تسلیم کرچکی ہوں شاہد! ضد نے مجھے اندھا کردیا تھا یا میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی تھی۔ میں اس نازک پہلو پر غور نہیں کرسکی تھی کہ کسی بھی انسان کو کسی نہ کسی قیمت پر جبراً خریدا تو جاسکتا ہے لیکن اس کے جذبات و احساسات نہیں خریدے جاسکتے۔ آج تمہارے ساتھ میرا تیرھواں دن ہے لیکن تم نے ایک بار بھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں تمہاری روح کی بھی مالک ہوں۔ تم افروز کو بے پناہ چاہتے ہو۔ میں نولاکھ تو کیا' نو کروڑ خرچ کرکے بھی اس چاہت کو ختم نہیں کرسکتی۔ اب تم اپنی افروز کے پاس واپس چلے جاؤ لیکن آج شام کی خبریں سننا نہیں بھولنا۔"

"کیوں!" شاہد بولا "خبریں کیوں؟"

"شاید تم کوئی ایسی خبر سنو جس سے تمہیں خوشی ہو۔"

شاہد بڑی گہری نگاہ سے نائلہ خان کی طرف دیکھنے لگی۔

کچھ خیالات اس کے ذہن میں چکرانے لگے تھے۔ اچانک وہ اٹھا اور ٹہلتے ہوئے بولنے لگا "شیکسپئر نے کہا تھا کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور یقیناً یہ انسانوں کا اسٹیج ہے مگر اس کے باوجود اس اسٹیج پر انسانوں کی تمام خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔"

"اب مجھے اس کا مکمل احساس ہوچکا ہے۔" نائلہ خان کی آواز بھرا گئی "اور اسی لیے میں نے.... دل سے اپنی شکست تسلیم کرلی ہے۔"

شاہد ٹہلتا ہوا بستر پر اس جگہ جا بیٹھا جہاں دراز میں نائلہ خان نے ریوالور رکھا تھا۔

نائلہ خان اسے وہاں بیٹھتے دیکھ کر اتنی مضطرب ہوئی کہ یکایک کھڑی ہوگئی۔

شاہد نے اچانک دراز کھولی۔ ریوالور پر ایک نظر ڈالی اور پھر نائلہ خان کی طرف دیکھا جس کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔

"تم ریوالور بھی رکھتی ہو؟" شاہد بولا۔

"میرے پاس اس کا لائسنس بھی ہے۔" نائلہ نے جلدی سے کہا "فلمی دنیا میں میری کامیابی کے باعث میرے دشمنوں کی کمی نہیں۔"

شاہد نے ریوالور دراز سے نکال کر اس کا چیمبر دیکھا اور پھر نائلہ خان کی طرف دیکھتا ہوا بولا "یہ تو بھرا ہوا ہے؟"

"ریوالور کو خالی تو نہیں رکھا جاسکتا۔"

شاہد نے ریوالور دراز میں ڈال دیا اور کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا "میں کبھی کبھی سوچتا ہوں نائلہ کہ تم بظاہر ایک عورت ہو پھر بھی تمہارے اندر کوئی عورت نہیں رہتی۔"

"میں سمجھی نہیں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو!"

اس وقت شاہد ٹہلتا ہوا رائٹنگ ٹیبل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اچانک وہ کتاب اٹھائی جو رائٹنگ پیڈ پر رکھی ہوئی تھی۔ وہاں اس نے ہلکے نیلے رنگ کا ایک لفافہ رکھا ہوا دیکھا۔

نائلہ خان تیزی سے شاہد کی طرف لپکی لیکن اس کے قریب آنے سے پہلے ہی شاہد نے وہ لفافہ اٹھالیا۔

"نہیں، نہیں!" نائلہ خان چیخی "لفافہ رکھ دو۔"

"میں وہ خط بھی پڑھوں گا جو اس لفافے میں رکھا ہوا ہے۔" شاہد نے کہا "کسی دوسرے کا خط پڑھنا ایک غیر اخلاقی حرکت تو ہے لیکن میری یہ حرکت غیر اخلاقی نہیں ہوگی۔ میں دیکھ چکا ہوں کہ اس لفافے پر میرا ہی نام لکھا ہوا ہے۔ یہ میرے ہی لیے ہے۔"

"ہاں' یہ تمہارے ہی لیے ہے لیکن میں تمہارے بریف کیس میں رکھ دیتی تاکہ تم اسے بعد میں پڑھو۔" نائلہ خان نے کہا۔ وہ شاید لفافہ چھین لینے کی کوشش کررہی تھی مگر اسے کامیابی نہیں ہوسکی۔ شاہد بہرحال ایک مرد تھا' اس سے زیادہ طاقت ور!

"پلیز!" شاہد نے کہا "تم مجھے اسی وقت یہ خط پڑھنے سے ہرگز نہیں روک سکتیں۔" اس نے خود کو نائلہ کی گرفت سے چھڑایا اور تیزی سے پیچھے ہٹ کر بستر پر جا بیٹھا۔

نائلہ خان نے خود کو رائٹنگ ٹیبل کی کرسی پر گرا دیا اور اپنا سر ٹیبل پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

شاہد نے اس کی پروا کیے بغیر لفافہ چاک کیا اور اس میں سے خط نکال کر پڑھنے لگا۔ وہ اسی کے نام تھا' جیسے جیسے وہ پڑھتا گیا اس کے چہرے کی رنگت بدلتی چلی گئی۔

"میری جان شاہد! تمہیں کبھی یقین نہیں آیا.... کہ میں تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں اور کب سے چاہتی ہوں' یہ تم اچھی طرح جانتے ہو مگر تم نے میرے بارے میں کیا سمجھا اور کیا سوچا کہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئے' کہیں غائب ہوگئے۔ میں بتا نہیں سکتی کہ اس وقت میرے دل پر کیا بیتی تھی۔ ٹی وی دیکھنے کا مجھے شوق نہیں۔ مجھے اس سے کچھ الرجی ہے' نہ جانے کیوں' بہرحال اسی وجہ سے مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ تم ٹیلی وژن پر ملازمت کررہے تھے۔ ڈیڈی کی موت کے بعد میں فلمی دنیا میں چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے جو بدنامیاں مول لیں' اسے تم ایک طرح کا انتقام سمجھو۔ میں اپنے آپ سے اس کا انتقام لیتی رہی۔ میں نے سوچا تھا کہ

جب میں اپنے محبوب کی نہیں ہو سکی تو پھر کبھی کسی ایک کی نہیں ہو سکوں گی۔ میں نے خود کو "عام" کرلیا۔ اس طرح میں نے بہت دولت جمع کی لیکن میرا مقصد دولت جمع کرنا نہیں تھا۔ میں بس اپنے آپ سے انتقام لے رہی تھی۔ یہ میرے سوچنے کا ایک انداز تھا۔ شاید میں ذہنی طور پر ایب نارمل ہوں۔ خیر! پھر کچھ دن ہوئے میں نے ایک میگزین میں تمہاری اور افروز کی تصویر دیکھی۔ ناممکن تھا کہ میں تمہیں نہ پہچانتی۔ میں نے تمہارے بارے میں چھان بین کرائی۔ خاص طور سے اس بارے میں بھی جانا کہ افروز سے تمہارے کس قسم کے تعلقات ہیں۔ مجھے یہ اندازہ تو ہوگیا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے ہو لیکن یہ اندازہ بھی ہوا کہ زندگی کی مادی آسائشوں کے بارے میں افروز کے کیا خیالات ہیں۔

میں نے اس سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میں اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتی کہ میں نے تم دونوں کو تصدق رسا کے گھر کس طرح بلایا۔ میں نے وہاں تم سے جس قسم کی باتیں کیں، وہ تم کو غصہ دلانے والی ہی تھیں۔ مجھے اس کا خوب اندازہ تھا لیکن میں اس طرح صرف افروز کو خوابوں کی دنیا کا مسافر بنانا چاہتی تھی۔ میں اس میں کامیاب بھی رہی۔ ایک بات شاید افروز نے تمہیں نہیں بتائی ہوگی کہ میں اس سے ایک بار اور ملی تھی۔ اسی ملاقات میں، میں نے اسے پانچ لاکھ سے زیادہ کے خواب بھی دکھائے تھے۔ تم اتنے ذہین ہو کہ میں بہت کچھ نہیں بتاؤں گی، تو بھی تم سمجھ لوگے کہ آخر کار میں افروز ہی کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ میں تم سے شادی کرکے فلمی دنیا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ میں نے افروز سے وعدہ کیا تھا کہ میں اس سے اس کا شوہر نہیں چھیننا چاہتی لہٰذا میں نے یہ فیصلہ بھی کیا تھا کہ اسے طلاق نہیں دلواؤں گی۔ وہ بھی بدستور تمہاری بیوی رہے گی لیکن میں نے جو کچھ سوچا تھا، وہ ہو نہیں سکا۔ میں ہزار کوشش کے باوجود تمہارا دل جیتنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ میں چاہتی تھی تم مجھے اس طرح قبول کرلو جیسے میں افروز ہوں لیکن میرا یہ خواب ریزہ ریزہ ہوگیا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ تم افروز کے سوا کسی کے نہیں ہو سکتے۔ میں بہت ضدی ہوں۔ میں نے ایک بار افروز کے سامنے بھی تم سے کہہ دیا تھا کہ اگر میں اپنی پسندیدہ چیز حاصل نہیں کرپاتی تو اسے دوسروں کے لیے بھی نہیں چھوڑتی اور اسے برباد کرڈالتی ہوں لیکن میں نے محسوس کیا کہ تمہارے بارے میں اپنی ضد پر قائم رہنا میرے لیے ممکن نہیں۔ تم آج بھی میرے محبوب ہو اور تمہیں برباد کرنے کا تصور بھی میرے ذہن میں نہیں آسکتا۔

اس شکست سے میں بالکل بجھ کر رہ گئی۔ زندگی سے میرا دل اچاٹ ہوگیا۔ میں نے خودکشی کا فیصلہ کرلیا ہے جس پر میں بدستور قائم ہوں۔ آج میں تمہیں رخصت کررہی ہوں۔ اس کے بعد میں ریوالور اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلادوں گی۔ اس اقدام سے پہلے میں فون کرکے پولیس کو بلالوں گی اور ان لوگوں کے سامنے ہی یہ قدم اٹھاؤں گی تاکہ اس معاملے میں پولیس کسی اور دوسرے کو پریشان نہ کرسکے۔

یہ خط میں کسی طرح چپکے سے تمہارے بریف کیس میں رکھ دوں گی۔ اس پر بعد میں تمہاری نظر پڑ ہی جائے گی اور اگر نہ بھی پڑی تو میرے وکیل ریحان صاحب جب تمہارے پاس پہنچیں گے تو تم یہ خط بھی دیکھ ہی لوگے۔ ہاں شاہد! میری جان! دولت سے مجھے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ اسی لیے کل میں نے ایڈووکیٹ ریحان ...... کو بلاکر اپنے اس وصیت نامے پر دستخط کردیے ہیں جس کی رو سے میرے بعد میری تمام دولت افروز کی ہوجائے گی۔ میں اپنے محبوب کی محبوبہ کو وہی تحفہ دینا چاہتی ہوں جس کی وہ خواہش مند ہے۔ خدا تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔ تم سے بس ایک درخواست ہے۔ اگر ہوسکے تو کبھی کبھی مجھے یاد کرلیا کرنا۔ میری روح کو اس طرح کچھ خوشی ضرور حاصل ہوجائے گی۔ خط بہت طویل ہوگیا۔ ممکن ہے میں کوئی بات لکھنا بھول گئی

ہوں لیکن اب اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ مجھے ہمیشہ کے لیے اجازت دو۔"

بدنصیب نائلہ خان

وہ خط پڑھ کر شاہد کے دماغ میں ایک بھونچال سا آگیا۔ اس نے نائلہ خان کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی روئے جارہی تھی۔ شاہد نے خط اپنی جیب میں ڈالا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا نائلہ خان کے قریب پہنچا اور اس کے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا "میں غلطی پر تھا کہ تمہارے اندر کوئی عورت نہیں ہے۔ ہاں یہ بات یقینی ہے کہ تم تھوڑی سی ایب نارمل ہو۔ اچھا اب اپنے آنسوؤں پر قابو پاؤ۔ ہم بیٹھ کر اطمینان سے کچھ باتیں کریں گے۔ بہتر ہوگا کہ تم باتھ روم میں جاکر منہ ہاتھ دھو آؤ۔"

○☆○

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں صوفے پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہد نے اپنے لیے ایک پیگ بنایا لیکن نائلہ خان نے پینے سے انکار کردیا۔

"میں دو پیگ ضرور پیوں گا۔" شاہد نے کہا "تمہارے خط سے تمہارے جو عزائم ظاہر ہوئے ہیں، انہوں نے میرے دماغ کی چولیں ہلادی ہیں۔"

"میں چاہتی ہوں کہ تم جانے کی تیاری کرو۔" نائلہ خان نے نظریں جھکا کر کہا "میں نہیں چاہتی کہ تمہاری فلائٹ مس ہوجائے۔"

"فلائٹ دوسری بھی پکڑی جاسکتی ہے۔ پہلے تم مجھے ایک پیگ ختم کرلینے دو۔"

نائلہ خان چپ ہوگئی۔ وہ منہ تو دھو آئی تھی لیکن بال ٹھیک نہیں کیے تھے اور اجڑی اجڑی سی نظر آرہی تھی۔ چہرہ بالکل سپاٹ نظر آرہا تھا۔

شاہد نے دوسرا پیگ بنانے کے بعد بولنا شروع کیا "کل جو بہت زیادہ پی گیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں ایک کانٹا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے اسی عالم میں تمہارا اور افروز کا موازنہ کیا تھا۔ یہ میرے لیے بڑے کرب کی بات تھی کہ افروز نے دولت کے لیے اپنے محبوب کو نیلام کردیا تھا جب کہ دوسری طرف تم میرا دل جیتنے کے لیے بہت کچھ خرچ کررہی تھیں اور اب تو تم نے میری خاطر اپنا سبھی کچھ افروز پر نچھاور کردیا ہے۔ تمہارے خیالات کے بارے میں اتنا جان لینے کے بعد کیا یہ ممکن ہے کہ میں تمہیں خودکشی کرنے دوں؟"

"تم مجھے اس وقت تو روک سکتے ہو لیکن بعد میں کیا ہوگا۔ تم ہر وقت تو میرے ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

"میں ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گا۔" شاہد نے ایک بڑا گھونٹ لے کر کہا "میں نے تم سے شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

نائلہ خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن چہرہ سپاٹ ہی رہا۔ آنکھوں میں بھی خوشی کی کوئی رمق نظر نہیں آئی۔ وہ کچھ رندھی ہوئی سی آواز میں بولی "پلیز شاہد! مجھ سے اس قسم کا مذاق کرکے میرا دل زخمی نہ کرو۔"

شاہد کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر نائلہ خان کے برابر میں جابیٹھا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ نائلہ خان کی گردن میں حمائل کردیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کرلیا۔

"نائلہ!" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا جذباتی لہجے میں بولا "یہ کبھی میرے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ تم اتنی عظیم عورت ثابت ہوگی۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ تم سے آج ہی شادی کروں گا۔"

"شاہد!" نائلہ کے ہونٹ پھڑپھڑا گئے اور آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوئی، وہ خوشی کے آنسوؤں کی تھی۔

"ہاں نائلہ!" شاہد نے کہا "میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ مجھ سے تمہاری محبت افروز کی محبت سے کہیں زیادہ ہے۔ اس نے روپے کی خاطر مجھے تمہارے سپرد کردیا اور تم میری خاطر نہ صرف اپنی دولت بلکہ اپنی زندگی تک مجھ پر نچھاور کرنے کے لیے تیار ہوگئیں۔"

"شاہد!" نائلہ خان کی آواز کپکپا گئی "مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم مجھ سے مذاق نہیں کررہے ہو!"

"کیا اپنے ہونٹوں سے یقین دلاؤں!" شاہد کے لہجے میں خفیف سی شوخی تھی۔

"اوہ، شاہد!" نائلہ خان اس سے اس طرح لپٹی جیسے جسم و جاں ایک کردینا چاہتی ہو۔

"ہم آج ہی شادی کرلیں گے۔" شاہد نے کہا۔

"نہیں۔" نائلہ خان نے اس سے الگ ہوکر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "ہم واپس جاکر ہی شادی کریں گے۔ ہماری شادی دھوم دھام سے ہونا چاہیے لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"اب تو میں خود کو اس منزل پر پارہا ہوں کہ تمہاری کوئی شرط بھی ناقابل قبول نہیں ہوگی۔"

"تو سنو! میری شرط یہ ہے کہ تم افروز کو نہ صرف یہ کہ طلاق ہرگز نہیں دو گے بلکہ ہم دونوں سے مساوی سلوک روا

رکھو گے۔"

"تم واقعی بہت عظیم ہو نائلہ!" شاہد نے کہا "لیکن یہ بھی سوچا کہ افروز تم سے میری شادی برداشت نہیں کرے گی۔"

"کر لے گی۔" نائلہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

"کیسے؟"

"میں اپنے وصیت نامے میں تھوڑی سی تبدیلی کرا دوں گی۔ میری زندگی میں ہی میرا سب کچھ افروز کو مل جائے گا۔"

"نہیں۔" شاہد نے سختی سے کہا "تم نہ اسے کچھ دو گی نہ میں تم سے کچھ لینا چاہوں گا۔"

"لیکن اسے منانے کے لیے تو یہ ضروری ہے۔"

"بالکل ضروری نہیں ہے۔ اگر اسے بدستور میری بیوی رہنا ہے تو اسے میری اور تمہاری شادی کو گوارا کرنا ہی پڑے گی۔"

"تو پھر یہ معاملہ تم ہی سنبھالنا۔"

"ہاں۔ وہ میں دیکھ لوں گا۔"

"لیکن اپنے حوالے سے تم نے جو کچھ کہا ہے' اس سے محبت کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ شادی کے بعد جو کچھ تمہارا ہو گا' وہ میرا بھی ہو گا اور جو کچھ میرا ہو گا' وہ تمہارا بھی ہو گا۔"

"کیا اس پر مباحثہ کیا جائے؟"

"نہیں۔" نائلہ کے ہونٹوں پر دلکش سی مسکراہٹ ابھری۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ بالکل تر و تازہ نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کہا "چلو اب ہم کہیں تفریح کرنے چلتے ہیں۔ اس جگہ آ کر میرا موڈ بڑا اچھا ہو جاتا تھا لیکن اس مرتبہ تیرہ دن میں مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔ آج ہم خوب تفریح کریں گے۔"

"لوگوں کا ہجوم جو تمہارے پیچھے لگ جائے گا۔"

"آج مجھے کسی بات کی پروا نہیں ہو گی۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ آج سارے دن ہم اتنی تفریح کر کے شام کو لوٹیں گے کہ تھک کر چور ہو جائیں اور بڑی اچھی نیند آئے۔ کل ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ میں ابھی ٹیلیفون کر کے سیٹیں تو بک کرا لوں۔"

نائلہ خان ٹیلیفون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ شاہد اپنے گلاس کی بچی کھچی شراب حلق میں انڈیلنے لگا۔



"آج چودھواں دن ہے نا فاضل بھیا!" ناشتے کی میز پر افروز نے کہا "آج شام تک شاہد کو آ جانا چاہیے۔"

"بشرطیکہ نائلہ خان تمہیں مزید چار لاکھ روپے نہ

تین ٹکٹ

ایک نوجوان اپنی گرل فرینڈ کے پاس آیا اور کہنے لگا "ڈارلنگ۔ ہماری آج کی شام بڑی پُرلطف گزرے گی' میں نے تھیٹر کے تین ٹکٹ خرید لیے ہیں۔"

"مگر تین ٹکٹوں کی کیا ضرورت تھی؟" محبوبہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"دراصل یہ ٹکٹ تمہارے ڈیڈی' ممی اور بھائی کے لیے ہیں۔"

بھجوا دے!" فاضل کے لہجے میں تلخی تھی۔

"اب مجھے ایک روپیا بھی نہیں چاہیے فاضل بھیا! اب مجھ سے شاہد کی دوری برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ مجھے بڑا عجیب لگ رہا ہے کہ میں آخر کیا کر بیٹھی ہوں۔"

"اب احساس ہو رہا ہے غلطی کا؟"

"ہاں فاضل بھیا!" افروز نے ٹھنڈی سانس لی "محبت کرنے والے شوہر سے بڑی دولت کوئی نہیں ہو سکتی۔"

"پھر اب تو نو لاکھ روپے بھی آ گئے ہیں۔"

"وہ میں نائلہ کو واپس کر دوں گی۔"

فاضل نے یک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں بھیا!" افروز نے نظریں جھکا کر کہا "مجھے کراہیت سی محسوس ہونے لگی ہے اب ان روپوں سے! وہ نو لاکھ روپے ایسے ہی ہیں جیسے وہ کسی نے اپنی بیوی کو کوٹھے پر بٹھا کر حاصل کیے ہوں۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تمہیں اپنی غلطی کا اتنی شدت سے احساس ہو گیا ہے۔ بس اب دعا کرو کہ اس غلطی کا کوئی خمیازہ نہ بھگتنا پڑ جائے۔"

"ایسی کوئی بدفال تو منہ سے نہ نکالو بھیا!" افروز نے جلدی سے کہا۔

فاضل نے فوراً معذرت کر لی۔

"کیا آج دفتر نہیں جاؤ گے؟" افروز نے اس وقت پوچھا جب ناشتے کے بعد فاضل نے اطمینان سے اخبار پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

"دل چاہا تھا کہ آج چھٹی کر لوں۔"

"دوست کی آمد کی خوشی میں!" افروز مسکرائی۔

"شاید۔" فاضل بھی مسکرایا پھر یکایک سنجیدہ ہو کر بولا "تم نے نائلہ خان کے روپے واپس کرنے کا جو فیصلہ کیا ہے

وہ بہت ہی مناسب ہے۔ شاہد کو تم سے جو خفگی ہوگی' وہ آسانی سے دور ہو جائے گی۔"

"اچھا اب میں کچن میں جا رہی ہوں۔ شاہد کی پسند کی کئی چیزیں بنانا ہیں مجھے!"

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

کال فاضل نے ریسیو کی۔ افروز باہر جا چکی تھی پھر اچانک اسے خیال آیا کہ وہ کال شاہد کی نہ ہو۔ وہ جلدی سے لوٹی اور یہ دیکھ کر اس کا سارا جسم سن ہونے لگا کہ فاضل کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"کس کا فون تھا؟" افروز نے گھبرا کر پوچھا۔

فاضل کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ اس سے بولا نہیں جا سکا تھا۔

"بتاؤ نا بھیا!" افروز چیخی تھی۔

اور پھر فاضل نے بہ مشکل جو کچھ بتایا' وہ افروز کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔

○☆○

صبح شاہد کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ نائلہ خان پوری طرح تیار صوفے پر بیٹھی کچھ سوچتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

"آج بہت جلدی اٹھ گئیں!" شاہد بولا۔

نائلہ خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر اب بھی قائم تھی۔

"عجیب انداز میں مسکرا رہی ہو۔ بات کیا ہے آخر؟" شاہد بولا۔

"کیا تم اس مسکراہٹ کو کوئی نام دے سکتے ہو؟" نائلہ خان بولی۔

"مسکراہٹ تو بس مسکراہٹ ہوتی ہے جسے کسی نو شگفتہ پھول ہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔"

"یہ جواب سن کر تو مجھے کہنا پڑے گا کہ تم مسکراہٹوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ خیر! میں تمہیں بتاتی ہوں۔ یہ فاتحانہ مسکراہٹ ہے۔"

"فاتحانہ مسکراہٹ۔" شاہد ہنس پڑا "کیا مطلب؟"

"گزری ہوئی رات میرے لیے بہت خوش گوار تھی۔ پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ میں نے تمہیں پوری طرح پالیا۔"

"اب ساری زندگی ہی اسی طرح پاتی رہو گی!"

"خام خیالی ہے تمہاری کہ اب میں تمہارے قریب آنا چاہوں گی۔" نائلہ خان نے سرد لہجے میں کہا۔ اس کی مسکراہٹ کافور ہو چکی تھی۔

شاہد نے حیرت اور سوچ میں ڈوبی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کھیل ختم ہو چکا ہے مسٹر شاہد!" نائلہ خان نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "میری خود سری اور میری ضد نے بازی جیت لی ہے۔ میری ضد یہی تھی نا کہ میں تمہیں کم از کم ایک بار حاصل کر لوں' سو وہ میں کر چکی لیکن اس کے لیے مجھے پاپڑ بہت بیلنے پڑے۔ تمہاری طرف سے بالکل مایوس ہونے کے بعد میں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک پلان ترتیب دیا اور اس کے مطابق ڈراما اسٹیج کیا۔ میں خود ہی اپنے آپ کو داد دیتی ہوں کہ میں نے اس ڈرامے میں جتنی شاندار اداکاری کی ایسی اداکاری اگر میں امریکا کی کسی فلم میں کرتی تو شاید مجھے آسکر ایوارڈ مل جاتا۔"

شاہد سکتے کی سی حالت میں بیٹھا رہ گیا۔ بات بڑی حد تک اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔

نائلہ خان تمسخر اڑانے والے انداز میں بولتی رہی۔

"کل صبح جب تم سو کر اٹھے تھے تو میں نے پہلی اداکاری خط چھپانے کی کی تھی پھر دوسری اداکاری ریوالور چھپانے کی کی اور اس طرح کی کہ تم ریوالور کی ہلکی سی جھلک دیکھ لو۔ میرا خیال ہے کہ میں مکالمہ نگار بھی بہت اچھی بن سکتی ہوں۔ جب میں نے تم سے یہ کہا کہ آج شام کی خبریں ضرور سن لینا تو اس مکالمے کے پس منظر میں ریوالور کے باعث تمہارا ماتھا ٹھنکا اور پھر تم وہی سب کچھ کرتے چلے گئے جو میں چاہتی تھی۔ اس طرح تم بڑی آسانی سے دام میں آ گئے اور ہاں! ایڈووکیٹ ریحان کی آمد بھی اسی ڈرامے کا ایک حصہ تھی۔ میں احمق نہیں ہوں کہ اپنا سب کچھ اس بے وقوف افروز کے نام لکھ دوں گی۔"

"تو تمہارے بارے میں میرا پہلا اندازہ ٹھیک نکلا۔" شاہد نے دانت پر دانت جما کر کہا "تمہارے اندر واقعی عورت نہیں ہے' صرف ایک طوائف ہے۔"

"تمہاری اس قسم کی باتوں کا میں بالکل برا نہیں مانوں گی۔" نائلہ خان ہنسی "میں نہ صرف طوائف بن چکی ہوں بلکہ ایک بہت ضدی اور خود سر طوائف ہوں۔ بہرحال اب تم تیار ہو کر یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ اب میں تمہاری بے وقوف بیوی کو دو ٹکے بھی مزید نہیں دے سکتی۔ یہ تو تمہیں حاصل کرنے کی ضد تھی کہ میں نے نو لاکھ روپے خرچ کر ڈالے ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ میرے چاہنے والوں کے اکاؤنٹ سے سرمایہ میرے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتا ہے۔"

شاہد کے جسم میں غصے کی چنگاریاں چٹخنے لگیں۔ اس نے

دانت پیستے ہوئے کہا "افروز کچھ بے وقوف سہی لیکن اکثر ایک گھریلو لڑکی ہی کسی شریف آدمی کی بیوی بن کر رہ سکتی ہے۔ تم نے تو ثابت کردیا کہ تم گندی نالی کے ایک کیڑے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔"

"میرے ہی گھر میں میری توہین کا تمہیں کوئی حق نہیں ہے۔" نائلہ خان غصیلی آواز میں بولی "اب تم جلد از جلد یہاں سے خود نہیں گئے تو مجھے اپنے نوکروں کو بلانا پڑے گا۔"

"سنو!" شاہد دانت پیس کر بولا "شاید تمہیں ایک بات نہیں معلوم!..... بعض مرد ایسے ہوتے ہیں جن کی انا اگر تم جیسی گھٹیا عورتوں کے ہاتھوں مجروح ہو تو وہ درندے بن جاتے ہیں۔"

"مجھے ڈرانے کی کوشش مت کرو۔" نائلہ خان نے منہ بنایا۔

شاہد نے تیزی سے حرکت کی اور بیڈ کی دراز سے ریوالور نکال لیا۔ وہ بدستور اسی دراز میں رکھا ہوا تھا۔

پے در پے چلنے والی گولیوں سے ریسٹ ہاؤس گونج اٹھا۔ نائلہ خان جو گھبرا کر کھڑی ہوگئی تھی، لہولہان ہو کر گر پڑی۔ گرتے وقت بھی اس کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا اور آنکھوں میں بھی حیرانگی تھی۔ غالباً یہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ شاہد اس حد تک جا سکتا ہے۔

○☆○

اسی دن رات کے دس بجے حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑے ہوئے شاہد نے اُداس نظروں سے اپنے دوست فاضل اور اس کے ساتھ آنے والے وکیل کو دیکھا۔ فاضل کے ہونٹ پھڑپھڑا رہے تھے، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے فاضل!" شاہد نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے اندازہ ہے کہ افروز تمہارے ساتھ کیوں نہیں! یہ خبر سن کر اس کی حالت خراب ہوگئی ہوگی کہ اس سفر میں اسے اپنے ساتھ لانا تمہارے لیے ممکن نہیں رہا ہوگا۔ شاید اسے کسی اسپتال میں داخل کرانا پڑا ہو!"

"آج صبح وہ بہت خوش تھی شاہد! بہت خوش تھی۔" فاضل کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے "اسے اپنی غلطی کا احساس بھی ہوچکا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ نائلہ خان کے نو لاکھ روپے بھی واپس کردے گی۔"

پھر فاضل نے وہ باتیں لفظ بہ لفظ بھی دہرا دیں جو آج صبح اس کے اور افروز کے مابین ہوئی تھیں۔

شاہد پھیکے سے انداز میں مسکرایا "مجھے بھی یہ اندازہ دیر سے ہوا کہ وہ بے وقوف تو ہے لیکن ایک گھریلو لڑکی ہے اور گھریلو لڑکیوں ہی کو شوہر کے ساتھ جینا اور مرنا آتا ہے۔ آخر اس کی زبان پر یہ بات آ تو گئی ناکہ محبت کرنے والے شوہر سے بڑی دولت کوئی نہیں ہوسکتی اور پھر اس سے زیادہ بے وقوف تو میں ہوں کہ اس کی بے وقوفی کو نظر انداز کرکے اسے سمجھانے بجھانے کے بجائے نائلہ خان کے ساتھ ہولیا۔"

"تمہاری یہ فطرت ہمیشہ سے ہی ہے۔" فاضل نے پژمردہ لہجے میں کہا "محبت کرنے والوں کی خاطر تم نے ہمیشہ خود کو کرب میں گرفتار کیا ہے اور اس غلط فہمی کا شکار رہے ہو کہ تم اس طرح اپنے محبت کرنے والوں کو سزا دے رہے ہو۔"

"شاہد صاحب!" وکیل بول پڑا "سب سے بڑی بے وقوفی تو آپ نے یہ کی ہے کہ پولیس کو اپنا بالکل صحیح بیان دے ڈالا ہے۔"

"جھوٹ بولنا میرے مزاج میں نہیں ہے وکیل صاحب!"

"لیکن....."

"پلیز! مجھے کوئی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا!" وکیل نے ایک طویل سانس لی "بہرحال، آپ اس وکالت نامے پر دستخط تو کردیں۔ میں اپنی سی کوشش تو کروں گا ہی!"

شاہد نے دستخط کر دیے اور پھر فاضل سے پوچھا "افروز کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں تم سے کوئی بات اس لیے نہیں چھپانا چاہتا کہ اخبارات تو کبھی کچھ شائع کریں گے اور تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ تمہارے ہاتھوں نائلہ خان کا قتل اور تمہاری گرفتاری اس کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی کہ اس پر فوراً ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔"

"اوہ' خدایا! رحم!" شاہد کے منہ سے نکلا۔

"گھبراؤ نہیں۔" فاضل نے کہا "میں نے اسے بروقت اسپتال پہنچا دیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے سنبھال لیا ہے لیکن جیسا کہ تم ابھی خود کہہ چکے ہو' اس حالت میں وہ لمبا سفر نہیں کر سکتی تھی۔"

"اس کا خیال رکھنا فاضل!" شاہد نے سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر فاضل کے کندھے پر رکھ دیا "میرے بعد اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے گھر والوں کی ممنون ہونا ہرگز گوارا نہیں کرے گی۔"

"مجھے معلوم ہے اسی لیے میں کل صبح ہی کی فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں۔ اسے بے تابی سے میرا انتظار ہوگا۔"

"ٹھیک ہے لیکن اسے حالات کی سنگینی کا احساس نہ دلانا' اس کی ڈھارس ہی بندھانا۔ دل کے دورے کے بعد وہ کوئی بری خبر نہیں سن سکے گی۔"

"مجھے اندازہ ہے شاہد!" فاضل نے کہا "میں ہر طرح خیال رکھوں گا۔ میری یہ کوشش بھی ہے کہ پرسوں تم سے پھر ملنے آؤں۔"

شاہد نے سر ہلا دیا۔

لیکن فاضل اس دن نہیں آسکا جس کا اس نے وعدہ تھا۔ اس سے اگلے روز شاہد کو جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں فاضل اس سے ملنے آیا اور کچھ بولنے کی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد بلک بلک کر رو پڑا۔

افروز اپنے والدین کی ممنون تو ہونا ہی نہیں چاہتی تھی لیکن اس نے فاضل کا ممنون ہونا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ ایک دن قبل فاضل شاہد سے ملنے اس لیے نہیں آسکا تھا کہ اس روز افروز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ دنیا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

غلطی ایک مریض کی بھی تھی جس نے اس دن کا اخبار افروز کو دے دیا تھا۔ اخبار میں شاہد کا مکمل بیان شائع ہوا تھا اور افروز سمجھ سکتی تھی کہ اس بیان کے بعد شاہد کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ یہ سمجھتے ہی اس پر دل کا دوسرا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔

فاضل سے یہ سنتے ہی شاہد بے ہوش ہو کر گر پڑا اور اسے فوری طور پر طبی امداد بہم پہنچائی گئی۔

○☆○

پندرہ سال بعد ایک قبرستان میں جانے والے اکثر ایک مقبرے کے سامنے رک جاتے مگر ان کے رکنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ایک بے حد خوب صورت مقبرہ تھا۔ وہ تو اس شخص کو دیکھنے کے لیے رکتے تھے جو شب و روز اسی مقبرے میں نظر آتا تھا۔ اس کی داڑھی اور سر کے بے تحاشا بڑھے ہوئے بالوں میں سفیدی نمایاں ہوتی جا رہی تھی لیکن چہرے سے وہ پاگل نہیں' بس ایک گم صم آدمی نظر آتا تھا۔ اس کا بیشتر وقت کسی کپڑے سے اس گرد کو صاف کرتے ہوئے گزرتا تھا جو مقبرے میں بنی ہوئی قبر پر جمع ہو جاتی تھی۔

قبر کے کتبے پر "افروز شاہد" لکھا ہوا تھا۔

آندھی' طوفان' بارش' کچھ بھی ہو' وہ شخص کسی کو اس مقبرے سے دور نہیں نظر آیا تھا۔ اس کے کھانے پینے کا خیال رکھنے والی صرف ایک ہی ہستی تھی۔ وہ ایک چالیس اکتالیس سالہ خوش پوش شخص تھا جو ایک کار میں آیا کرتا۔ ناشتے اور کھانے کا سامان اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ بھی مغموم ہی نظر آیا کرتا تھا۔

اگر کبھی کوئی مقبرے میں رہنے والے سے بات کرنے کی ہمت کر بیٹھتا تھا تو اسے اپنے جواب کے بجائے ایک سوال سننا پڑتا تھا۔

"یہ بتاؤ کہ ناسمجھ گھریلو بیوی اور کروڑپتی طوائف میں کیا فرق ہے؟"

بات کرنے والا کوئی جواب دیے بغیر ہنس کر آگے بڑھ جاتا تھا۔

پھر ایک رات بڑی زور کی آندھی کے ساتھ بارش کا خوفناک طوفان آیا۔ وہ شدید سردیوں کی ایک رات تھی۔ صبح جب ناشتا لانے والا وہاں آیا تو مقبرے میں رہنے والے کی اکڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ ناشتا لانے والا بہت دیر تک لاش کے سرہانے بیٹھا آنسو بہاتا رہا۔

دوسرے دن اس مقبرے میں ایک اور قبر بن چکی تھی۔

اس کے بعد کار میں آنے والے کے معمولات میں صرف اتنا فرق آیا کہ وہ صرف شام کو وہاں آتا اور مقبرے میں ایک ڈیڑھ گھنٹا گزار کر خاموشی سے چلا جاتا۔

فاضل کا نظریہ تھا کہ موت کے بعد دوستی ختم نہیں ہو جاتی۔



تیسرا رنگ

دشمنِ وفا

نشور ہادی

محبت کے اُس لافانی جذبے کا احوال جو شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی جس کی شدت کے سامنے بڑے بڑے سرکش طوفان شرمائیں اور جس کی نرم آنچ سے پتھر بھی پگھل جائیں. وہ دونوں محبت کے متوالے اسی مشہورِ زمانہ جذبے کے جنون میں ساری دُنیا کو فراموش کیے بیٹھے تھے کہ وقت کی گردش اُن کی زندگی میں ایک عجیب موڑ لے آئی۔ وصال جدائی میں ڈھل گیا لیکن دونوں ہی یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ اُن کی وفا میں کیا کمی تھی جو وقت نے یہ دن دکھائے۔

اُس جوڑے کی دل گداز داستانِ محبت جسے وفا راس نہیں آئی تھی

ڈاک خانوں کے باہر کچھ نہ کچھ ایسے افراد بیٹھے نظر آجاتے ہیں جن کا وسیلہ روزگار وہ ڈاک خانے ہی ہوتے ہیں۔ عرف عام میں ان کے پیشے کو "منشی گیری" کہا جاتا ہے۔ وہ اَن پڑھ لوگوں کے لیے خطوط لکھ کر یا ڈاک خانے سے متعلق کسی قسم کا فارم بھر کر اس کا معاوضہ لیتے ہیں۔

جو بڑے ڈاک خانے ہوں' ان کے باہر تو اس پیشے سے منسلک افراد کی تعداد زیادہ ہوتی ہے پھر وہ ڈاک خانہ تو شہر کے ایک نہایت بارونق علاقے میں تھا۔ جہاں رات کو شاپنگ کرنے والوں کا اژدحام ہوتا ہے۔ بعض اوقات پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ان "منشیوں" کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ان میں سے بیشتر کے پاس ٹائپ رائٹر بھی ہیں۔ پڑھے لکھے لوگوں کو انگریزی میں کوئی چھوٹی موٹی چیز ٹائپ کروانا ہو تو وہ انہی سے رجوع کرتے ہیں۔

منشی یا ٹائپسٹ قسم کے یہ لوگ اپنے پاس پوسٹ کارڈ یا لفافے بھی رکھتے ہیں۔ ڈاک خانے میں بھیڑ ہو تو بعض لوگ اس بھیڑ سے بچنے کے لیے انہی لوگوں سے اپنی مطلوبہ چیز کچھ زیادہ پیسے دے کر خرید لیتے ہیں۔

لیکن عارفہ کو یہاں اس قسم کا کوئی بھی کام نہیں تھا پھر بھی وہ وہاں ٹھٹک کر رک گئی اور اس کی آنکھوں میں استعجابی کیفیت نظر آنے لگی۔ وہ ایک جوان العمر شخص کی طرف دیکھ رہی تھی جو ڈاک خانے کے باہر کام کرنے والوں ہی میں سے ایک تھا۔ زمانے کی دستبرد سے غیر محفوظ ایک چھوٹی سی میز پر رکھے ہوئے ٹائپ رائٹر پر اس کی انگلیاں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں۔ اس کی عمر تیس سال سے زیادہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حزن و یاس کی کیفیات جیسے جم کر رہ گئی تھیں۔ دوسرے "منشیوں" کی طرح اس کی میز پر لفافے یا فارم وغیرہ دکھائی نہیں دے رہے تھے البتہ گود میں تھیلا ضرور رکھا ہوا تھا۔ کوئی اجنبی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس تھیلے میں آخر ایسی کیا قیمتی شے ہوگی کہ اس شخص نے وہ تھیلا اپنی میز پر یا کہیں آس پاس رکھنے کے بجائے اسے اپنی گود میں سنبھال رکھا تھا۔

اس کی میز کے قریب ہی اچھے کپڑوں میں ملبوس ایک بوڑھا شخص کھڑا تھا اور اس کی نظر اس کاغذ پر جمی ہوئی تھی جس پر کچھ ٹائپ کیا جا رہا تھا۔ ٹائپنگ کا وہ کام اس بوڑھے ہی کا ہوگا ورنہ وہ وہاں کیوں کھڑا ہوتا۔

"سگنل بند ہوگیا ہے' اب سڑک پار کیجئے نا باجی!" بارہ سالہ چچا زاد بہن نے عارفہ کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو وہ چونکی۔

"کیا دیکھ رہی ہو تم اس طرف؟" دوسری چچا زاد بہن بولی جو اس کی ہم عمر تھی۔

"کچھ نہیں' چلو۔" عارفہ نے کہا اور دونوں بہنوں کے ساتھ سڑک پار کرنے لگی۔ سڑک پار کر کے ایک اسٹور سے عارفہ کو کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔

رات کا وقت ہوتا تو دکانوں کی تیز روشنیوں سے ہر طرف جگمگاہٹ پھیلی ہوئی ہوتی اور دکانوں پر لوگوں کا خاصا ہجوم نظر آتا لیکن اس وقت شام کے چار ہی بجے تھے۔ رات کی سی بھیڑ بھاڑ نہیں تھی اس لیے عارفہ کو اپنی مطلوبہ اشیا خریدنے میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے لیکن وہ صحیح چیزوں کا انتخاب نہیں کر سکی۔ انتخاب میں اپنی غلطیوں کا احساس اسے خود بھی تھا لیکن وہ خود کو بے بس پا رہی تھی۔ اس کا ذہن بڑی شدت سے اس شخص میں الجھا ہوا تھا اور دماغ میں ایک نام کی گونج پھیلی ہوئی تھی۔

تصور!... تصور!... تصور!

اس نے اپنے دماغ پر زور ڈال کر پورا نام یاد کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

سجاد تصور' نہیں نہیں' صبا تصور' نہیں یہ بھی نہیں۔

پے در پے کئی نام اس کے دماغ میں آئے لیکن اسے یقین تھا کہ وہ صحیح نام یاد کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اسے صرف "تصور" ہی یاد رہ گیا تھا۔

"تصور" اس کا نام تھا بھی نہیں۔ اپنے نام میں اس لفظ کا اضافہ اس نے اپنی تصاویر کی پہلی نمائش کے بعد کیا تھا۔ اس کی تصاویر صرف قدرتی مناظر کی ہوتی تھیں لیکن وہ مناظر دنیا کے کسی حصے میں نہیں دیکھے جاسکتے تھے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام مناظر اپنے تصور سے پینٹ کرتا تھا۔ ملکوں ملکوں، شہروں شہروں گھومنے والے لوگوں نے بھی اس کے دعوے کی نفی نہیں کی تھی۔ کسی نے وہ مناظر کہیں نہیں دیکھے تھے، اسی لیے اسے تصوراتی مصور کہا جانے لگا تھا۔ اسی چیز کو دیکھ کر تزئین نے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ اپنے نام میں "تصور" کا اضافہ کرلے۔

ناممکن تھا کہ وہ تزئین کی کوئی بات ٹال دیتا۔ وہ تزئین کو اتنی ہی شدت سے چاہتا تھا لیکن خود اسے بھی اپنے نام میں یہ "شاعرانہ اضافہ" پسند آیا تھا۔ اسی لیے سال بھر بعد جب اس کی تصاویر کی دوسری نمائش ہوئی تو ہر پینٹنگ پر اس نے اپنا نام صرف "تصور" ہی لکھا اور پھر اسے اسی نام سے شہرت بھی حاصل ہوئی۔

انہی دنوں میں تزئین اپنی تعلیم سے فارغ ہوچکی تھی اور اس نے طے کرلیا تھا کہ اب اپنے والدین کو صاف صاف بتادے گی کہ وہ تصور کے سوا کسی سے شادی نہیں کرے گی۔

عارفہ اس کی دوست تھی۔ اس کے گھر والوں سے اور ان کے رسم و رواج سے بھی واقف تھی۔ وہ لوگ اپنے اس رواج کے سخت پابند تھے کہ خاندان کے باہر کے کسی فرد سے شادی کا بندھن نہیں کیا جاسکتا۔

عارفہ نے تزئین کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کے خاندانی رسم و رواج کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی لیکن تزئین کا یہ قطعی فیصلہ تھا کہ وہ تصور کی خاطر ساری دنیا سے لڑ جائے گی۔ دوسری طرف تصور بھی اس کی خاطر سب کچھ کرگزرنے پر آمادہ تھا۔

ان دونوں کی محبت کا فیصلہ کن مرحلہ آنے سے پہلے ہی عارفہ اپنے والد کی خواہش پر ایک کورس کرنے لندن چلی گئی۔

ذہن میں چکراتے ہوئے انہی سب خیالات کے باعث عارفہ اپنی مطلوبہ اشیا کا صحیح انتخاب نہیں کرسکی اور جو کچھ بھی سامنے آیا، خرید کر اپنی بہنوں کے ساتھ اسٹور سے نکل آئی۔

اب انہیں پھر سڑک پار کرنا تھی۔ سڑک پار کرنے کے بعد وہ دائیں جانب کے چوراہے کی طرف جاتیں اور وہاں سے بائیں طرف مڑ کر اگلی سڑک تک پہنچتیں جہاں انہیں اپنی کار پارک کرنے کی جگہ مل سکی تھی۔

ہو تو یہ بھی سکتا تھا کہ وہ اسٹور سے نکل کر دائیں جانب چل پڑتیں اور اس چوراہے پر پہنچ کر زیبرا کراسنگ سے سڑک پار کرتیں لیکن یہ ایک اتفاق تھا کہ جب وہ اسٹور سے نکلیں تو بائیں جانب کا سگنل بند تھا اور گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ انہیں وہیں سڑک پار کرنے کا موقع مل گیا۔

اگر یہ موقع نہ ملتا تو عارفہ پوسٹ آفس کے سامنے کام کرنے والے اس شخص کو قریب سے دیکھنے کے لیے اپنی چچازاد بہنوں سے ضرور کوئی بہانہ تراشتی کیونکہ اس کی دانست میں وہ تصور ہی تھا۔

لیکن اس خیال نے اس کے دماغ کو بری طرح چکرا رکھا تھا کہ دو سال پہلے کے اس کامیاب مصور پر ایسی کیا پڑی... کہ وہ ڈاک خانے کی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر یہ معمولی قسم کا کام کرنے پر مجبور ہوگیا؟

سڑک پار کرکے دونوں چچازاد بہنیں دائیں جانب مڑی ہی تھیں کہ عارفہ نے ان سے کہا "ایک منٹ۔" اور پھر تیر کی طرح اس شخص کی طرف گئی جس کے پاس اس وقت کوئی گاہک نہیں تھا اور وہ نہ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا ایک جانب گھورے جارہا تھا۔

راہ گیروں کی آمدورفت کے باعث ان کے قدموں کی آہٹ وہ مسلسل ہی سن رہا ہوگا لیکن عارفہ کے قدموں کی آہٹ اس کے قریب پہنچ کر رکی تو وہ اپنے خیالات سے چونکا۔

"کیا مجھے آپ سے ٹیلیگرام کا ایک فارم مل سکتا ہے؟" عارفہ نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ضرور۔" وہ آہستہ سے بولا اور ایک ہاتھ اپنی گود میں رکھے ہوئے تھیلے میں ڈال کر غالباً ٹیلیگرام کا فارم ٹٹولنے لگا۔

اس کی آواز سن کر عارفہ کا دل یکبارگی بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ وہ آواز تصور ہی کی تھی۔

تھیلے میں سے فارم نکال کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن ہاتھ کا رخ سیدھا عارفہ کی طرف نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں بھی عارفہ کی طرف نہیں اٹھی تھیں۔ وہ پلکیں جھپکاتا ہوا اسی طرف دیکھ رہا تھا جدھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھا رکھا تھا۔

'اوہ گاڈ!' عارفہ کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی اور پھر اس کے ذہن میں جو خیال آیا تھا، وہ اس کی زبان پر بھی آگیا "معاف کیجیے گا، کیا آپ نابینا ہیں؟" اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔

"جی۔" وہ اس طرح بولا جیسے ایک دل دوز آہ بھری ہو!

یہ جواب ایسا نہیں تھا کہ عارفہ کو صدمہ نہیں ہوتا۔ وہ اس سے اس کا نام بھی پوچھنا چاہتی تھی لیکن اسی وقت اس کی دونوں چچازاد بہنیں قریب آگئیں۔

"یہ کس چکر میں پڑ گئیں۔" ہم عمر چچازاد بہن بولی "کیا ابھی بھیجنا ہے کسی کو ٹیلیگرام؟"

"نن... نہیں تو..."

"تو پھر وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی! گھر چل کر کسی ملازم کو فارم لینے کے لیے بھیج دیتیں بلکہ شاید گھر پر بھی کچھ فارم پڑے ہوئے ہوں۔"

"چلو کوئی بات نہیں، اب تو لے ہی لیا۔" عارفہ نے کہا اور

پھر اپنا پرس کھول کر کچھ پریشان لہجے میں بولی "میرے پاس تو صرف بڑے نوٹ ہیں۔ کیا تمہارے پاس ایک روپے کا نوٹ ہے بینا!" بینا اس کی ہم عمر چچازاد بہن کا نام تھا۔

"سنئے!" نابینا شخص بولا "کیا آپ اپنی ساتھی سے ایک روپے کا نوٹ مجھے دینے کے لیے مانگ رہی ہیں؟"

"ہاں' میں نے آپ سے یہ فارم لیا ہے نا!" عارفہ نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ بولا "یہ فارم بیچا نہیں جاتا۔ ہاں اگر آپ اس پر کچھ ٹائپ کرواتیں تو میں اس کا محنتانہ ضرور لیتا۔"

"تو....." عارفہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"تو کچھ بھی نہیں۔" اس نے عارفہ کی بات کاٹ دی "فارم کی قیمت جب حکومت نہیں لیتی تو میں کیسے لے سکتا ہوں؟"

"بات تو ٹھیک کہی ہے انہوں نے۔" بینا بولی پھر اس نے عارفہ کا بازو پکڑتے ہوئے کہا "اب چلو بھی!"

عارفہ چونک پڑی۔ وہ ابھی تک اس نابینا شخص کو تکے جا رہی تھی۔ وہ کئی مرتبہ بولا تھا اور عارفہ کو وہ آواز تصوری کی معلوم ہوئی تھی۔ وہ اس بارے میں مزید کرید ضرور کرتی لیکن اپنی چچازاد بہنوں کے باعث وہ وہاں نہیں رک سکی۔

تینوں بہنیں وہاں سے چل پڑیں۔

"حیرت انگیز شخص ہے یہ۔" بینا نے کہا "اندھا ہو کر بھی ٹائپ کر لیتا ہے۔"

"ہوں۔" عارفہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی تھی۔

تصور اور تزئین کی محبت سے تو عارفہ واقف ہی تھی اور عارفہ کو سمجھا بھی چکی تھی کہ یہ بیل منڈھے چڑھنا مشکل ہے مگر لندن پہنچنے کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی اسے تعجب خیز مسرت ہوئی تھی جب اسے ان دونوں کی شادی کا خوب صورت کارڈ ملا تھا۔ اس دعوت نامے کے ساتھ تزئین کا مختصر سا خط بھی تھا۔

عارفہ اس وقت جلد از جلد گھر پہنچ کر اپنے سامان میں سے تزئین کا وہ خط تلاش کرنا چاہتی تھی جس میں اس نے اپنا نیا پتا یعنی تصور کے گھر کا پتا لکھا تھا اسی پتے پر پہنچ کر عارفہ حقیقتِ حال سے واقف ہو سکتی تھی۔

O☆O

کراچی میں تو عارفہ کے چچا رہتے تھے جو ہائی کورٹ کے جج تھے۔ عارفہ کا اپنا گھر لاہور میں تھا۔ اس کے والد ایک بزنس مین تھے۔ عارفہ کی پیدائش بھی لاہور ہی کی تھی۔ وہیں اس نے پڑھا بھی تھا۔ تزئین اس کی ہم جماعت تھی۔ وہ ان کا آخری تعلیمی سال تھا جب وہاں تصور کی تصاویر کی دوسری نمائش ہوئی تھی۔ اس کی پہلی نمائش لگ بھگ سال بھر پہلے کراچی میں ہوئی تھی۔ ان دنوں یونیورسٹی کی چھٹیاں ہونے کے باعث عارفہ اور تزئین کراچی ہی میں تھیں۔ عارفہ تو ہر سال ہی چھٹیوں میں کراچی ضرور آتی تھی لیکن اس سال وہ تزئین کو بھی اس کے والدین کی اجازت سے اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ وہ تزئین کو اپنے ساتھ اپنے چچا ہی کے گھر میں رکھتی لیکن کراچی میں تزئین کے ایک ماموں رہتے تھے۔ اگر تزئین ان کے گھر نہ رہتی تو وہ برا مان سکتے تھے اس لیے تزئین کو عارفہ سے الگ رہنا پڑا تھا مگر ان دونوں کی ملاقات روزانہ ہوتی تھی۔

ایک روز وہ دونوں تصور کی تصاویر کی نمائش دیکھنے بھی گئی تھیں۔ دونوں ہی کو وہ تصاویر بہت پسند آئی تھیں۔ لیکن تزئین کو پینٹنگ بنانے والا بھی پسند آگیا تھا۔ یہ بات عارفہ کو دوسرے سال اس وقت معلوم ہوئی جب لاہور میں تصور کی دوسری نمائش ہوئی۔ تزئین نے آرٹ گیلری .... لے جا کر تصور سے اس کا تعارف کرایا۔ عارفہ نے تصور کے لیے تزئین کا والہانہ انداز محسوس کیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ بعد میں اس نے تزئین کو کریدا تو تزئین نے اس سے دل کی بات نہیں چھپائی۔

کراچی ہی میں ان دونوں کے تعلقات بڑھ گئے تھے پھر جب تزئین لاہور چلی آئی تھی تو دونوں میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا تھا پھر تزئین ہی نے لاہور میں تصور کی تصاویر کی نمائش کا انتظام کروایا تھا۔ ایک سال سے بھی کم عرصے میں وہ ایک دوسرے کو بہت چاہنے لگے تھے اور دونوں نے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

لندن چلے جانے کے باعث عارفہ کو اس کا علم نہیں ہو سکا تھا کہ ان دونوں کی شادی کس طرح ممکن ہوئی تھی۔ تزئین نے اسے خط میں لکھا تھا کہ جب وہ لندن سے واپس آئے گی تو وہ اسے اپنی شادی کی تفصیلات سے آگاہ کرے گی۔

عارفہ نے اسے مبارک باد کا ٹیلیگرام بھیج دیا تھا لیکن پھر وہ اپنا کورس مکمل کرنے میں ایسی مصروف ہوئی تھی کہ تزئین سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری نہیں رکھ سکی تھی۔

کورس مکمل کرنے کے بعد وہ گزشتہ روز ہی کراچی پہنچی تھی۔ اس کا ارادہ تو یہ تھا کہ ائرپورٹ پر ہی اپنے چچا وغیرہ سے ملنے کے بعد پی آئی اے کی کسی فلائٹ سے لاہور چلی جائے گی لیکن اس وقت خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں جب اس نے کراچی ائرپورٹ پر ہی اپنا استقبال کرنے والوں میں اپنے پاپا اور ممی کو بھی دیکھا۔

عارفہ کے پاپا کو اپنے کسی کاروباری سلسلے میں کراچی آنا پڑا تھا اور چونکہ لندن سے انہیں عارفہ کی روانگی کا ٹیلیگرام مل چکا تھا لہٰذا وہ عارفہ کی ممی کو بھی اپنے ساتھ کراچی لے آئے تھے۔ ان کا خیال اپنے بھائی ہی کے گھر میں رہنے کا تھا لہٰذا اب عارفہ بھی ان کے ساتھ اپنے چچا ہی کے گھر میں تھی۔ اس کے پاپا کو ابھی کراچی میں چند دن اور رکنا تھا۔

دوسرے دن عارفہ دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کر کے اپنی دونوں بہنوں کے ساتھ شاپنگ کرنے کے لیے نکل گئی تھی اور یوں اتفاقاً ایک ایسا شخص اس کی نظر میں آیا تھا جس کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ تصوری ہے۔

گھر پہنچتے ہی اس نے اپنے سامان میں سے وہ "کٹ" نکالی جس میں کچھ کتابیں اور کاغذات بھرے ہوئے تھے۔ انہی کاغذات میں اسے تزئین کی شادی کا کارڈ اور اس کا خط مل گیا۔ خط میں تزئین نے لکھا تھا۔

ڈیئر عارفہ!

"میری شادی کا یہ کارڈ دیکھ کر تمہیں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ضرور ہوگی لیکن خط میں وہ تفصیلات لکھنا مناسب نہیں ہوگا کہ وہ کام کیسے ہوا جو تمہارے خیال میں قریب قریب ناممکن ہی تھا۔ جب تم لندن سے آؤگی تو تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔

اپنی شادی کا کارڈ میں تمہیں بھیج تو رہی ہوں لیکن مجھے اندازہ ہے کہ تم جس مقصد سے لندن گئی ہو' اسے مکمل کئے بغیر پاکستان نہیں آسکوگی۔ ہاں' اتنا یقین مجھے ضرور ہے کہ شادی کی مبارک باد کا ٹیلیگرام ضرور بھیجوگی۔ لہٰذا میں اس خط میں تصور کے گھر کا پتا لکھ رہی ہوں۔ ٹیلیگرام یا خط اسی پتے پر بھیجنا۔ اب اجازت دو۔

فقط تمہاری تزئین۔

اس عبارت کے نیچے تصور کا پتا لکھا ہوا تھا۔

تصور کے گھر وہ اکیلی ہی جانا چاہتی تھی۔ اگلی صبح اس نے گھر میں سب سے کہہ دیا کہ وہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے لیے اپنی ایک پرانی دوست سے ملنے جائے گی کیونکہ یہ شہر اس کا اچھی طرح دیکھا بھالا ہوا تھا اس لیے کسی نے اس کے اکیلے جانے پر اعتراض بھی نہیں کیا۔

اس روز بینا جب کالج سے واپس آگئی تو عارفہ اسی کی کار لے کر اس علاقے کی طرف روانہ ہوئی جہاں کا پتا اسے تزئین کے خط سے ملا تھا۔

راستے بھر اس کے ذہن میں تزئین کی وہ باتیں چکراتی رہیں جو وہ اس سے تصور کے بارے میں کرتی رہی تھی۔ تصور نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔ وہ کراچی میں تنہا رہتا تھا۔ والدین انتقال کرچکے تھے۔ کوئی بہن یا بھائی تھا نہیں۔ کچھ دور دراز کے عزیز تھے جن کی رہائش کراچی میں نہیں تھی۔ جب تک اس کے والد حیات رہے۔۔۔' ان عزیزوں سے خط وکتابت کی حد تک رابطہ رہتا تھا لیکن والد کے انتقال کے بعد وہ بھی نہ رہا۔

تصور کی زندگی بڑی حد تک تنہائی میں گزر رہی تھی لیکن اس کا پینٹنگ کا شوق جنون کی حد۔۔۔ تک پہنچا ہوا تھا کہ اسے تنہائی بالکل گراں نہیں گزرتی تھی۔ اسی لیے وہ کبھی دوست بنانے کا خواہاں بھی نہیں رہا تھا۔ لے دے کہ صرف شرجیل سے اس کے تعلقات خاصے بڑھ گئے تھے۔ وہ ایک بڑے ہوٹل میں منیجر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ ان دونوں کے گہرے تعلقات کا ایک سبب شاید یہ قدر مشترک تھی کہ شرجیل کا بھی دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی رہائش اسی ہوٹل کے ایک کمرے میں تھی جہاں وہ ملازم تھا۔ کبھی کبھی دن میں وہ تصور سے ملنے آجایا کرتا تھا۔ اس کے تین اسسٹنٹ تھے۔ وہ انہی میں سے کسی کو ہوٹل کی ذمے داری سونپ آیا کرتا تھا۔ دن کے وقت ہوٹل کی کچھ ذمے داریاں بھی نہیں ہوتی تھیں۔

کراچی میں جب تزئین اور تصور کی قربت بڑھی تھی تو تصور نے تزئین کو شرجیل سے ملایا تھا اور ایک روز شرجیل نے اپنے ہوٹل میں ان دونوں کی دعوت بھی کی تھی۔ تزئین کے بقول تصور اور شرجیل کی عمروں میں خاصا تفاوت تھا مگر ان کے تعلقات ایسے تھے جیسے بچپن کی دوستی ہو!

دوسری بہت سی باتیں بھی عارفہ کے ذہن میں چکراتی رہیں اور پھر اس کے خیالات کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب وہ منزل پر پہنچ گئی۔

وہ ایک خوب صورت عمارت تھی جس کی پہلی منزل کے ایک اپارٹمنٹ کی نشاندہی اس خط میں کی گئی تھی جو تزئین نے عارفہ کو لکھا تھا۔

پہلی منزل پر عارفہ نے اپارٹمنٹ کا نمبر دیکھ کر کال بیل کا بٹن دبایا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس وقت اس کے دل کی دھڑکنوں میں خفیف سی تیزی کیوں آگئی تھی۔

پندرہ بیس سیکنڈ بعد اندر سے کسی نے پوچھا "کون؟" آواز نسوانی اور عارفہ کے لیے اجنبی تھی۔

"میرا نام عارفہ ہے۔" وہ بولی "تصور صاحب کا گھر یہی ہے نا؟"

"ایک منٹ۔" اندر سے کہا گیا اور پھر ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے دروازے کا لاک کھولا جارہا ہو۔

دروازہ کھلتے ہی عارفہ نے جسے دیکھا' وہ اٹھائیس تیس سال کی کوئی عورت تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ سادہ سی ساری میں ملبوس تھی۔

"فرمائیے؟" وہ عارفہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "آپ تصور بھائی سے کیوں ملنا چاہتی ہیں۔"

"تصور بھائی!' عارفہ کو حیرت ہوئی تھی۔ کیونکہ تزئین نے اسے بتایا تھا کہ تصور کی کوئی بہن نہیں ہے۔

"بس یوں ہی۔۔۔ ان سے ملنے چلی آئی ہوں۔" عارفہ نے کہا "دراصل اس وقت میں لندن میں تھی جب ان کی شادی ہوئی تھی۔ میں نے مبارک باد کا ٹیلیگرام تو بھیج دیا تھا لیکن اب لندن سے آئی ہوں تو سوچا کہ ان سے ملاقات کرلوں۔"

"آیئے' اندر آجایئے!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "میرا نام مہوش ہے۔"

عارفہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "تصور صاحب اور تزئین ہیں کہاں؟"

"ابھی بتاتی ہوں۔ آپ تشریف رکھیں۔" مہوش بولی "ممکن ہے تصور بھائی سے آپ کے تعلقات ایسے ہوں کہ آپ ان پر دباؤ

ڈال سکیں۔ میں اور میرے شوہر تو ناکام ہو چکے ہیں۔"

اس وقت عارفہ کو معلوم ہوا تھا کہ مہوش شادی شدہ تھی۔ اس نے عارفہ کو چکرا دیا کہ مہوش اور اس کا شوہر، تصور پر کس قسم کا دباؤ ڈالنے میں ناکام رہے تھے۔

عارفہ نے بیٹھتے ہوئے کہا "آپ کی اس بات سے تو میں چکرا گئی ہوں کہ آپ مجھ سے تصور صاحب پر کس قسم کا دباؤ ڈلوانا چاہتی ہیں۔ آخر وہ دونوں ہیں کہاں؟ میرا مطلب ہے وہ اور ان کی بیوی تزئین؟"

"تزئین کے بارے میں تو مجھے کچھ نہیں معلوم۔" مہوش نے سنجیدگی سے کہا "اور آپ کے انداز سے صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ آپ ان دونوں کے حالات سے بالکل بے خبر ہیں۔ میں آپ کو شروع سے سب کچھ بتاتی ہوں لیکن پہلے یہ فرمائیے کہ آپ کچھ ٹھنڈا لینا پسند کریں گی یا....."

"کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔" عارفہ نے جلدی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آپ کی باتوں سے میں اتنی زیادہ پریشان ہو گئی ہوں کہ سب سے پہلے ان دونوں کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"میں تزئین کو بہت پسند کرتی تھی۔" مہوش نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور کیونکہ آپ کے تصور صاحب کو میں تصور بھائی کہا کرتی تھی اس لیے تزئین کو بھی تزئین بھابی کہا کرتی تھی لیکن اب جی نہیں چاہتا کہ اس کے نام کے ساتھ بھابی بھی لگاؤں۔ اس نے تصور بھائی سے اس وقت بے وفائی کی جب وہ اپنی زندگی کے ایک تاریک موڑ پر کھڑے تھے۔"

"آپ مبہم سے انداز میں باتیں کر رہی ہیں!" عارفہ نے بے چینی سے کہا۔

"میری کچھ عادت سی ہے اس انداز میں بات کرنے کی۔" مہوش نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میری اس عادت سے میرے شوہر کو بھی چڑ ہے۔ خیر! میں آپ کو شروع سے اصل قصہ سنائے دیتی ہوں۔ تصور بھائی نے یہ اپارٹمنٹ اپنی شادی کے کچھ دن بعد کرائے پر لیا تھا۔ اس وقت میں سامنے والے فلیٹ میں رہتی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے تصور بھائی کسی اور جگہ رہتے تھے جہاں کرایہ خاصا کم تھا۔ یہاں آنے کے بعد میرے شوہر سے ان کے تعلقات اتنے بڑھے کہ وہ ہمارے گھر بھی آنے جانے لگے۔ میں انہیں تصور بھائی کہنے لگی۔ اوہ! میں شاید پھر کچھ زیادہ تمہید میں پڑ گئی۔"

عارفہ نے بے چینی سے پہلو بدلا لیکن کچھ بولی نہیں۔ وہ جلد از جلد اصل بات جان لینا چاہتی تھی لیکن مہوش کا انداز بیان اس کے ضبط کی آزمائش بن رہا تھا۔ اسے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ مہوش کو اسی طرح بیان کرنے دے جس طرح بولنے کی اسے عادت تھی۔ اگر اسے ٹوکا جاتا تو بات اور زیادہ طویل ہو سکتی تھی۔

مہوش نے کہا "تزئین بھی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ ان دونوں کی محبت دیکھ کر مجھے رشک آتا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تزئین ایک بے وفا بیوی ثابت ہوگی۔"

عارفہ کو تیسری مرتبہ پہلو بدلتے دیکھ کر مہوش بولی "آپ اصل واقعات جاننے کے لیے بہت بے چین ہو رہی ہیں۔ اب میں اسی کی طرف آتی ہوں۔ یہ ان کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد کی بات ہے۔ ان کے گھر میں..... میرا مطلب ہے، جس فلیٹ میں آپ بیٹھی ہیں، اچانک آگ لگ گئی۔"

"اوہ!" عارفہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

مہوش کہتی رہی۔ "تصور بھائی اس وقت تصویر بنانے میں مصروف تھے لیکن جب آگ لگی، اس وقت وہ کچن میں اپنے لیے چائے بنا رہے تھے۔ دراصل تزئین اس وقت قریب کے ڈیپارٹمنٹل اسٹور سے کچھ خریدنے گئی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت لوٹی جب یہاں خاصا شور مچ چکا تھا۔ فائر بریگیڈ اسٹیشن یہاں سے قریب ہی تھا اور شاید کسی نے ٹیلیفون کرنے میں بھی خاصی عجلت کی تھی۔ اگر تزئین نہ آجاتی تو فائر بریگیڈ والے فلیٹ کا دروازہ توڑ دیتے۔ چابی تزئین کے پاس تھی۔ اس سے دروازہ کھول لیا گیا۔ تزئین چیخ چیخ کر رو رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ تصور بھائی کو تو وہ گھر ہی میں چھوڑ کر گئی تھی، آخر انہوں نے اندر سے دروازہ کیوں نہیں کھولا! ان باتوں سے میرا دل بیٹھ گیا کہ خدا نخواستہ تصور بھائی آگ کی لپیٹ میں نہ آگئے ہوں لیکن خدا کا شکر ہے وہ زندہ تھے۔ وہ لاؤنج میں اکڑوں بیٹھے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں رگڑ رہے تھے۔ انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لہٰذا انہیں فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بروقت آجانے کی وجہ سے آگ دوسرے فلیٹوں تک نہیں پہنچ سکی تھی لیکن تصور بھائی کے فلیٹ کے تینوں ہی کمروں کا بیشتر سامان جل گیا اور لاؤنج کا کچھ حصہ بھی متاثر ہوا تھا۔"

"تصور صاحب کا کیا ہوا؟" عارفہ بول ہی پڑی۔

"ان کی بصارت زائل ہو گئی۔" مہوش نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ان کے بیان کے مطابق انہیں آگ لگنے کا علم اس وقت ہوا جب وہ پیالی ہاتھ میں لیے، چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے کچن سے نکلے اور انہوں نے اس کمرے میں آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے دیکھے..... وہ چائے کی پیالی پھینک کر اس آتش زدہ کمرے میں گھس پڑے تھے۔ میں تو یہی کہوں گی کہ اگر انہیں تزئین سے بے پناہ محبت نہ ہوتی تو وہ اندھے نہ ہوتے!"

اب عارفہ کے لیے اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ اس نے پوسٹ آفس کے باہر جس شخص کو کام کرتے ہوئے دیکھا تھا، وہ تصور ہی تھا لیکن وہ سارے حالات جاننا چاہتی تھی کیونکہ مہوش نے تزئین کی بے وفائی کا ذکر بھی کیا تھا۔

مہوش نے اس کے سوال کے جواب میں کہا "دراصل اس

کمرے میں جہاں تصور بھائی نے اپنا اسٹوڈیو بنا رکھا تھا' تزئین کی ایک تصویر بھی تھی۔ میں نے اور میرے شوہر نے بھی وہ تصویر دیکھی تھی۔ ہمارے خیال میں تو وہ مکمل ہوچکی تھی لیکن تصور بھائی کے خیال کے مطابق ابھی اس میں کچھ کمی تھی۔ تصور بھائی اسی تصویر کو بچانے کے لیے آگ میں کود پڑے تھے..... وہ تصویر کو بچانے میں کامیاب بھی ہوگئے تھے لیکن جس وقت وہ کمرے سے نکل رہے تھے تو انہوں نے زوردار دھماکے کی آواز سنی تھی اور کمرے میں اتنا خوف ناک شعلہ چمکا تھا کہ آگ کے شعلے بھی اس کے سامنے ماند تھے۔ شاید اسی شعلے کی وجہ سے تصور بھائی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھاگیا اور ان کی بصارت زائل ہوگئی۔ آگ بجھانے والوں کا تو یہ خیال ہے کہ آگ کے شعلے جب بجلی کے تاروں تک پہنچے ہوں گے' تبھی وہ دھماکا ہوا ہوگا اور وہ شعلہ چمکا ہوگا لیکن یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہوا ہوگا؟"

"کیا کسی نے عمارت کا مین سوئچ آف نہیں کیا تھا؟"

"کسی کو اس کا ہوش ہی نہیں رہا ہوگا۔ یہ کام تو فائر بریگیڈ والوں ہی نے یہاں پہنچنے کے بعد کیا لیکن اس وقت تک تصور بھائی کے ساتھ وہ سانحہ پیش آچکا تھا۔"

"آپ تزئین کی بے وفائی کا ذکر کرچکی ہیں!" عارفہ نے مہوش کو یاد دلایا۔

"ہاں۔" مہوش نے کہا "لیکن وہ واقعہ جاننے کے لیے آپ کو تھوڑی سی تمہید برداشت کرنا ہی پڑے گی۔"

عارفہ نے دل میں کہا 'اس سے پہلے بھی تو برداشت کرچکی ہوں'

مہوش نے بتایا کہ آگ نے تصور کے گھر کا تقریباً سارا ہی سامان جلا ڈالا تھا اور کمروں کی حالت ایسی نہیں رہی تھی کہ صرف صفائی کرکے وہاں رہا جاسکتا اس لیے مہوش اور اس کا شوہر بے حد اصرار کے ساتھ تصور اور تزئین کو اپنے گھر لے گئے تھے جہاں وہ اس وقت تک رہے جب تک ان کا جلا ہوا فلیٹ پوری طرح ٹھیک نہیں کردیا گیا۔

مہوش بولی "پھر جب وہ ہمارے گھر سے اپنے گھر منتقل ہوگئے تو کچھ دن بعد ہم میاں بیوی کو احساس ہوا کہ تصور بھائی کے مالی حالات ٹھیک نہیں تھے۔" مہوش نے کہا "یہ اندازہ ہم نے اس لیے لگایا کہ ان کے گھر کا سارا سازوسامان جل چکا تھا مگر انہوں نے دوسرا سازوسامان نہیں خریدا تھا۔ میں نے تزئین کو اور میرے شوہر نے تصور بھائی کو ٹٹولنے کی کوششیں کیں مگر ان دونوں نے واضح بات نہیں کی اور مبہم سے جوابات دے کر ٹال دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں میاں بیوی نے سوچا کہ کسی وقت شرجیل کو چپکے سے بلا کر اس سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جائے!"

"شرجیل!" عارفہ بول پڑی "میرا خیال ہے ایک مرتبہ تزئین نے مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایا تھا۔ آپ تصور صاحب کے اس دوست کا ذکر تو نہیں کررہی ہیں جو کسی ہوٹل میں منیجر ہے۔"

"جی ہاں' وہی۔" مہوش نے کہا "شاید وہ تصور بھائی کا واحد دوست تھا۔"

'تھا' کیا مطلب؟' عارفہ کی زبان پر یہ سوال آجاتا لیکن اس نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ مہوش ہی کو بولنے دے۔

اور مہوش بولتی رہی "تصور بھائی سے ملنے وہ روزانہ آیا کرتا تھا۔ تصور بھائی کے نابینا ہونے کے بعد بھی آتا رہا۔ ایک روز جب وہ جارہا تھا تو میرے شوہر نے اسے زینے کے پاس پکڑلیا اور اپنے گھر لے آئے۔ اس نے ہمیں بتادیا کہ تصور بھائی کے مالی حالات ٹھیک نہیں تھے لیکن وہ اس کے یعنی شرجیل کے زیادہ احسان مند بھی نہیں ہونا چاہتے تھے۔ حالات کے پیش نظر انہوں نے بڑے دکھے دل سے تزئین کو ملازمت کرنے کی اجازت دے دی تھی اور شرجیل نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تزئین کی ملازمت کا بندوبست کروادے گا۔ اس سے زیادہ اس نے کچھ نہیں بتایا اور چلا گیا پھر کچھ دن بعد میں نے یہ بات خاص طور سے نوٹ کی کہ تزئین دن میں ڈھائی بجے کے قریب چلی جاتی اور رات کو گیارہ بجے کے بعد واپس آتی تھی۔ چونکہ ہمارا میل جول بدستور قائم تھا اس لیے جلد ہی معلوم ہوگیا کہ شرجیل نے تزئین کو اپنے ہوٹل میں ریسپشنسٹ کی حیثیت سے ملازم کروادیا تھا۔ تصور بھائی اس بات سے بہت دکھی تھے کہ ان کی محبوب بیوی کو جس نے ان کی خاطر اپنے لکھ پتی والدین کو چھوڑ دیا تھا' ایک معمولی ریسپشنسٹ کی ملازمت کرنا پڑرہی تھی۔"

بقول مہوش' تصور پر ایک اور ذہنی دباؤ یہ بھی پڑا تھا کہ فلیٹ کا کرایہ کس طرح ادا کیا جائے مگر تزئین نے اسے تسلی دی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کرائے کی ادائیگی کے لئے ہوٹل کی انتظامیہ سے اس شرط پر ایڈوانس رقم کی درخواست کرے گی کہ وہ ماہانہ قسط کی صورت میں اس کی تنخواہ سے کٹتی رہے۔ تزئین کا خیال تھا کہ شرجیل کی سفارش پر اسے وہ رقم ضرور مل جائے گی۔ تصور چپ رہ گیا لیکن اس کی پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس طرح یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک تو نہیں چل سکتا تھا۔

مہوش بولی "انہوں نے مجھ سے اور میرے شوہر سے کہا کہ مہوش کو ایڈوانس رقم مل جانے کے بعد وہ یہ مہنگا فلیٹ چھوڑدیں گے اور کسی معمولی سی جگہ پر جاکے رہیں گے تاکہ تزئین کی تنخواہ سے وہاں کا کرایہ بہ آسانی ادا ہوسکے۔ مشکل یہ تھی عارفہ بہن کہ وہ کسی کا احسان نہیں لینا چاہتے تھے ورنہ تو کرائے کی ادائیگی کے لیے میرے شوہر کے علاوہ ان کا دوست شرجیل بھی آمادہ تھا لیکن وہ کہتے تھے کہ ساری زندگی کا مسئلہ ہے لہٰذا اس طرح بھی بات نہیں بن سکتی۔"

"بات تو ٹھیک ہی تھی تصور کی۔" عارفہ نے کہا "ساری زندگی تو اس طرح کسی کا ساتھ نہیں دیا جاسکتا۔"

"بہر حال۔" مہوش نے کہا "اس کے بعد تصور بھائی نے یہ ذمے داری بھی شرجیل صاحب کو سونپ دی کہ ان کے لیے کوئی معمولی سا فلیٹ ڈھونڈ دیا جائے۔ اسی دوران میں انہوں نے ایک کام اور شروع کردیا تھا۔ کسی زمانے میں وہ ٹائپنگ سیکھ تو چکے تھے مگر انہیں یہ اعتماد بھی تھا کہ وہ کچھ عرصے کی مشق کے بعد اندھے ہونے کے باوجود صحیح ٹائپنگ کرلیا کریں گے۔ یہ تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس مشق میں کامیابی کے بعد بھی انہیں کہاں سے اور کس قسم کا کام مل سکے گا لیکن میں تین بجے سے رات کے گیارہ بجے تک ٹائپنگ کی مدھم سی آواز مسلسل سنا کرتی تھی۔ یہ مشق وہ تزئین کے ڈیوٹی پر جانے کے بعد سے لے کر تزئین کی آمد تک کیا کرتے تھے اور کبھی کبھی میں دن میں بھی ایک آدھ گھنٹے ٹائپنگ کی آواز سنا کرتی تھی۔" مہوش نے چپ ہو کر کچھ سوچا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تزئین کی ملازمت کے دو ماہ بعد قیامت کی ایک رات آگئی۔"

اس رات تزئین اپنی ڈیوٹی سے واپس آئی ہی تھی کہ تصور کی زور زور سے بولنے کی آواز سن کر مہوش اور اس کا شوہر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ دونوں اپنے فلیٹ سے باہر تو نہیں نکلے لیکن اپنے فلیٹ کے دروازے سے لگ کر انہوں نے وہ آوازیں سننے کی کوشش کی۔ زیادہ تر تصور ہی بول رہا تھا اور بے حد غصے میں معلوم ہو تا تھا۔ تزئین دبی ہوئی آواز میں بول رہی تھی اس لیے اس کا کہا ہوا ایک لفظ بھی مہوش اور اس کے شوہر کی سمجھ میں نہیں آسکا۔ سارے الفاظ تو تصور کے بھی ان کے کانوں تک نہیں پہنچ رہے تھے لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ تزئین پر گرج برس رہا تھا۔ مہوش اور اس کے شوہر کے لیے وہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تزئین کو بے پناہ چاہنے والا شوہر اس پر اتنی شدت سے ناراض بھی ہو سکتا تھا۔ اس کی ساری باتیں تو ان دونوں کو سنائی نہیں دے سکیں مگر انہیں اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ تصور کسی مخص آفتاب کے سلسلے میں بہت برافروختہ تھا اور تزئین پر بے وفائی کا الزام بھی لگا رہا تھا پھر چند منٹ بعد ان کے فلیٹ کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر تزئین کے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ وہ وہاں سے کہاں جارہی تھی، اس کا اندازہ لگانا مہوش اور اس کے شوہر کے لیے ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ وہ باہر نکل کر تزئین کو روکتے اور پھر تصور کے پاس جا کر اس سے بات کرتے لیکن مہوش کے شوہر نے لفظ "بے وفائی" سن لینے کے باعث فیصلہ کیا کہ معاملہ سنگین معلوم ہوتا ہے لہٰذا انہیں فوری طور پر اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے۔

مہوش نے عارفہ سے کہا "میرے شوہر کا خیال تھا کہ اتنی رات گئے کسی کے گھریلو معاملے میں دخل دینا کوئی مناسب بات نہیں لگتی اس لیے کل صبح تصور بھائی کے پاس جا کر ان سے تزئین کے بارے میں اس طرح پوچھا جائے جیسے ہمیں رات کے جھگڑے کا علم ہی نہ ہو۔"

لیکن دوسرے دن جب وہ دونوں تصور کے فلیٹ میں جا کر اس سے ملے تو معلوم ہوا کہ معاملہ سمجھانے بجھانے کی حد سے گزر چکا تھا۔ تصور نے تزئین کو طلاق دے دی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ اسی وقت اس کے گھر سے چلی جائے اور وہ چلی گئی تھی۔

"یہ سب کچھ سن کر ہم میاں بیوی پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔" مہوش نے افسردگی سے کہا "ہم نے اس معاملے کو مزید بھی کریدنا چاہا لیکن تصور بھائی نے کچھ نہیں بتایا۔ ہمیں مایوس ہو کر اپنے گھر آجانا پڑا۔ میں اپنے دونوں بچوں کو اسکول بھیجنے کے لیے تیار کرانے میں لگ گئی اور میرے شوہر بستر پر پڑے رہے۔ اس واقعے سے ان کی طبیعت بھی مکدر ہوگئی تھی اور انہوں نے اس روز اپنے آفس جانے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔"

عارفہ خاصی مضطرب نظر آنے لگی۔ وہ تزئین کے کردار سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے یہ سب کچھ تزئین پر ایک تہمت معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی دانست میں یہ ایک ناممکن سی بات تھی کہ تزئین، آفتاب نام کے کسی مخص سے اتنی قریب ہو جاتی کہ تصور اسے طلاق دینے کا فیصلہ کر بیٹھتا۔

مہوش کچھ سوچتے ہوئے بولی "دوسرے دن شرجیل صاحب، تصور بھائی سے ملنے آئے۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ رخصت ہو رہے تھے تو میرے شوہر انہیں ایک بار پھر اپنے گھر میں لے آئے۔ وہ بہت افسردہ نظر آرہے تھے لیکن ہمارے بہت پوچھنے پر بھی انہوں نے نہیں بتایا کہ تصور بھائی نے تزئین کو طلاق کیوں دی تھی۔ ہمارے سوالوں سے زچ ہو کر آخر میں انہوں نے یہ تک کہہ ڈالا تھا کہ کسی کی نجی زندگی کے بارے میں سب کچھ جان لینے کا حق ہمیں ہرگز نہیں ہے۔"

"انہوں نے نامعلوم مخص آفتاب کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟" عارفہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" مہوش نے جواب دیا "پھر وہ ہمارے گھر سے چلے گئے تھے لیکن تصور بھائی کے پاس روزانہ ہی آتے رہتے تھے۔ یقیناً انہیں اپنے دوست کی دلجوئی مقصود ہوگی۔ میں اور میرے شوہر بھی تصور بھائی کا پہلے سے زیادہ خیال رکھنے لگے۔ وہ بہت چپ اور اداس رہنے لگے تھے پھر کوئی آٹھ دس دن بعد انہوں نے بتایا کہ وہ اگلے روز یہاں سے چلے جائیں گے۔ شرجیل صاحب نے ان کے لیے کوئی جگہ تلاش کرلی تھی۔ پہلے تو تصور بھائی کوئی چھوٹا موٹا فلیٹ چاہتے تھے مگر تزئین کے بعد بالکل تنہا ہونے کے باعث انہوں نے چاہا تھا کہ انہیں کوئی چھوٹی موٹی کوٹھری ہی مل جائے۔ شرجیل صاحب نے اس کے لیے ایک ایسی ہی جگہ تلاش کردی تھی۔

میں اور میرے شوہر اب بھی آٹھ دس دن میں ایک آدھ بار تصور بھائی سے ملنے وہاں جاتے ہیں۔"

"کہاں؟" عارفہ نے بے ساختہ پوچھا۔
مہوش نے ایک بلڈنگ کا نام اور پتا بتایا جو عارفہ نے اپنے پاس نوٹ کرلیا اور پھر پوچھا "وہ کرتے کیا ہیں؟"
"ٹائپنگ میں انہوں نے مہارت حاصل کرلی تھی اس لیے شرجیل صاحب ... نہ جانے کہاں سے ان کے لیے ٹائپنگ کا خاصا کام لادیا کرتے تھے لیکن کچھ ہی دن بعد شرجیل صاحب کو ملازمت کی وجہ سے کراچی چھوڑنا پڑا۔ ان کے جانے کے بعد سے۔"
مہوش نے ٹھنڈی سانس لی "تصور بھائی ایک پوسٹ آفس کے سامنے بیٹھ کر کام کرنے لگے ہیں۔"
یہ بات عارفہ کی عقل اب بھی تسلیم نہیں کررہی تھی کہ تزئین کے مزاج میں کوئی فرق آگیا ہے۔
"میں نے آپ کو سب کچھ بتادیا۔" مہوش بولی "اور یہ خیال میں نے شروع ہی میں ظاہر کیا تھا کہ جو کام ہم میاں بیوی نہ کرسکے، وہ شاید آپ کرواسکیں۔ دراصل ہم خود اپنی آنکھوں سے انہیں پوسٹ آفس کے سامنے دھوپ میں بیٹھ کر کام کرتے ہوئے دیکھ چکے ہیں۔ جب میں نے انہیں وہاں پہلی بار دیکھا تھا تو گھر آکر بہت روئی تھی۔ شاید ان سے میری محبت کا سبب یہ ہو کہ میرا کوئی بھائی نہیں ہے، اسی لیے میں نے انہیں اپنا بھائی بنالیا تھا۔ انہیں بھائیوں کی طرح چاہنے بھی لگی تھی اور اب بھی چاہتی ہوں۔"
عارفہ نے مہوش کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھے تو متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی۔
"آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟" عارفہ نے آہستہ سے پوچھا۔ "شروع میں آپ نے غالباً کچھ اس قسم کی بات کی تھی کہ آپ مجھ سے تصور صاحب پر کسی قسم کا دباؤ ڈلوانا چاہتی ہیں!"
"جی ہاں۔" مہوش نے کہا "ہماری بات تو انہوں نے مانی نہیں۔ ممکن ہے وہ آپ کا بہت زیادہ لحاظ رکھتے ہوں اس لیے آپ کی بات مان لیں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ لکڑی کی اس کوٹھری کو بھی چھوڑدیں جہاں وہ رہتے ہیں اور پوسٹ آفس کے سامنے بیٹھ کر کام نہ کریں۔ وہ یہاں آجائیں۔ ہمارے ساتھ آکر رہیں۔ میرے شوہر کا بھی یہی کہنا ہے کہ ایک آدمی کا اضافہ ہم پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کی آمدنی خاصی معقول ہے۔ ہم لوگ اپنا ایک بنگلا بھی بنوا چکے ہیں لیکن کرائے کے اس اپارٹمنٹ میں اس لیے رہتے ہیں کہ میرے شوہر کو اپنی کمپنی کی طرف سے کرائے کا گھر لینے کی سہولت حاصل ہے۔"
"آپ نے بتایا تھا کہ یہاں پہلے تصور صاحب رہتے تھے اور آپ سامنے کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھیں؟"
"جی ہاں۔" مہوش نے کہا "جب تصور بھائی یہاں سے چلے گئے تو ہم نے اپنا وہ اپارٹمنٹ چھوڑ کر یہ اپارٹمنٹ کچھ زیادہ کرائے پر حاصل کرلیا۔ دراصل اس اپارٹمنٹ کی بالکونی کا رخ سڑک کی طرف ہے اس لیے خاصا ہوا دار ہے۔ اس سہولت کے علاوہ مجھے اس اپارٹمنٹ سے یوں بھی لگاؤ ہے کہ یہاں تصور بھائی رہتے تھے۔"

عارفہ نے کچھ سوچتے ہوئے سرہلادیا۔ اس کا ذہن ابھی تک اس سوال میں الجھا ہوا تھا کہ تزئین جیسی لڑکی جو تصور کو بے انتہا چاہتی تھی، اس سے بے وفائی کرکے کسی آفتاب نامی شخص سے کس طرح تعلقات استوار کرسکتی ہے؟
"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا!" مہوش بولی "کیا آپ تصور بھائی کو آمادہ کرلیں گی کہ وہ ہمارے ساتھ آکر رہیں اور ایک ایسی زندگی نہ گزاریں جسے شاید کسمپرسی کی زندگی بھی کہا جاسکتا ہے۔"
"آپ کے جذبات قابلِ قدر ہیں میری اچھی بہن!" عارفہ نے کہا "لیکن جب تک میں تصور صاحب سے ایک بار مل نہ لوں، آپ سے کسی قسم کا وعدہ نہیں کرسکتی۔"
"آپ ابھی جاکر ان سے مل لیجیے۔" یہ جملہ مہوش کی بے تابی کا مظہر تھا۔
عارفہ نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ گھر پر کہہ کر آئی تھی کہ وہ اپنی دوست سے مل کر ایک ڈیڑھ گھنٹے میں لوٹ آئے گی۔
"اس وقت تو میں ان سے ملنے نہیں جاسکوں گی۔" اس نے مہوش سے کہا "دیر ہوجانے کی صورت میں میرے گھر والے پریشان ہوسکتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی بڑا عجیب سا ہوگا کہ میں پوسٹ آفس کی فٹ پاتھ پر ان سے یہ باتیں کروں! مجھے ان کے گھر ہی جانا ہوگا۔"
"گھر۔" مہوش افسردگی سے مسکرائی "خیر! بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ آپ آج شام کو یا کل چلی جایئے گا لیکن اس بات کا خیال رکھیے گا کہ وہ لگ بھگ چھ بجے گھر پہنچتے ہیں۔"
"آپ نے یہ بات بتا کر بہت اچھا کیا۔ میں اس کا خیال رکھوں گی۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔"
"آپ نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں؟"
"آپ نے میرا نام جان لیا، فی الحال اسی پر اکتفا کیجیے۔" عارفہ نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کے گھر میں ٹیلی فون تو ہوگا۔"
"جی ہاں۔"
"مجھے نمبر دے دیجیے! میں فون کرکے ہی پھر کسی وقت آؤں گی تو آپ کو اپنے بارے میں بتاؤں گی۔"
مہوش نے اسے اپنا فون نمبر ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا اور کہا۔ "کیا مناسب نہیں ہوگا کہ آپ بھی مجھے اپنا فون نمبر دے دیں؟"
عارفہ نے اسے فون نمبر بتادیا لیکن یہ وضاحت نہیں کی کہ وہ نمبر اس کے گھر کا نہیں بلکہ اس کے چچا کے گھر کا ہے جہاں ان دنوں وہ اور اس کے والدین مہمان ہیں۔
وہاں سے واپسی پر عارفہ کا ذہن پہلے سے زیادہ الجھا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے کسی طرح تزئین کا پتا چل جاتا لیکن یہ شاید اسی صورت میں ممکن تھا کہ وہ تصور سے نہ صرف ملاقات کرلیتی بلکہ اسے وہ حقائق بیان کرنے پر آمادہ کرلیتی جن کا علم مہوش کو بھی نہیں تھا۔

اچانک عارفہ کو خیال آیا کہ وہ لاہور فون کرکے تزئین کے والدین سے بات کرے‘ شاید ان لوگوں سے کچھ معلوم ہو سکے۔

یہ خیال اس کے ذہن میں ایسا جما کہ گھر پہنچتے ہی اس نے لاہور ٹیلی فون کیا۔ اسے پہلے ہی سے تزئین کا وہ ٹیلی فون نمبر معلوم تھا جہاں تزئین شادی سے پہلے اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔

دوسری طرف کئی مرتبہ گھنٹی بجی پھر ریسیور اٹھایا گیا۔ جو نسوانی آواز سنائی دی‘ وہ عارفہ کے لیے اجنبی تھی۔

”مجھے بیگم ضیاالدین سے بات کرنا ہے۔“ عارفہ نے تزئین کی والدہ کے بارے میں کہا۔

”ان سے تو آپ بات نہیں کرسکتیں جی! وہ تو سخت بیمار ہیں۔ ڈاکٹر لوگوں نے بولا ہے کہ ان کو تنگ نہ کیا جائے۔“ اس مرتبہ دوسری طرف سے بولنے والی کے لہجے سے ظاہر ہو گیا کہ وہ گھر کی ملازمہ تھی۔

”بیگم ضیاالدین کب سے بیمار ہیں؟“ عارفہ نے پوچھا۔

”ایک ہفتے سے ہیں جی۔“ جواب ملا ”کوئی ضروری بات ہو تو آپ چھوٹی بی بی سے کرلیجئے گا جی!“

”چھوٹی بی بی!“ عارفہ چونکی۔ اسے معلوم تھا کہ تزئین کی کوئی چھوٹی بہن نہیں تھی۔ بہن تو کیا‘ اس کا تو کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔

ملازمہ نے عارفہ کے چونکنے پر کہا ”آپ تزئین بی بی کو نہیں جانتی؟“

اس مرتبہ عارفہ پہلے سے بھی زیادہ چونکی ”تزئین؟ وہ کہاں ہے؟“

”تھوڑی دیر پہلے کہیں گئی ہیں جی!“ جواب ملا ”دو گھنٹے بعد آپ پھر فون کرلیں۔ آپ اپنا نام بتادیں‘ میں انہیں بتادوں گی۔“

لیکن عارفہ نے کوئی جواب دیے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ یہ جان کر اس کا جسم سنسنا سا گیا تھا کہ تزئین واپس گھر پہنچ چکی تھی۔ اول تو اس کا خیال تھا کہ تصور کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا ہوگا‘ تزئین اس سے بے وفائی کر ہی نہیں سکتی تھی اور اگر فرض کرلیا جائے کہ وہ آفتاب نامی کسی شخص کے بہکاوے میں آبھی گئی تھی تو اب اس کا اپنے والدین کے گھر میں ہونا اس بات کی دلیل تھی کہ آفتاب سے بھی اس کا نباہ نہیں ہو سکا اور پھر اس نے اپنے والدین کے گھر لوٹ جانے ہی میں عافیت جانی تھی۔ ان حالات پر یقین کرنے کی صورت میں عارفہ کے لیے یہ بھی ایک قابل غور نقطہ تھا کہ ان حالات میں اس کے والدین نے کیا اسے آسانی سے قبول کرلیا ہوگا؟

تصور اور تزئین میں بہرحال طلاق ہو چکی تھی اور وہ دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے۔ گویا ان کی محبت کا افسانہ ایک افسوسناک انجام پر پہنچ کر ختم ہو گیا تھا لیکن عارفہ اس تجسس کا شکار ہو گئی تھی کہ کسی طرح سارے حقائق معلوم کرے اور اس معاملے کی تہ تک پہنچے۔ اس سلسلے میں وہ آج ہی تصور سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کے اور تزئین کے بیانات کے بعد ہی ساری حقیقت اس پر منکشف ہوتی۔ تزئین کی ملازمہ نے تو کہا تھا کہ وہ دو گھنٹے بعد اسے فون کرسکتی ہے لیکن اس کا خیال تھا کہ صرف فون کرنے سے بات نہیں بن سکے گی‘ اسے تزئین سے ملنے کے لیے کم از کم ایک دن کے لیے لاہور ضرور جانا پڑتا‘ اسی لیے اسے فیصلہ کرنا پڑا کہ اپنے والدین کو ان حالات سے آگاہ کردے تاکہ اسے آج ہی شام کو تصور سے ملنے کے لیے جانے کی اجازت کے علاوہ ایک دن کے لیے لاہور جانے کی بھی اجازت مل جائے۔ فی الحال اس کے والد کو تو کراچی ہی میں رکنا تھا لہٰذا اکیلے لاہور جانے کے لیے اسے ان کی اجازت کی ضرورت تھی۔

○☆○

تصور اپنی تاریک دنیا میں ایک کربناک زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی پینٹنگ کی پہلی نمائش کی کامیابی کے بعد اس نے اپنے سنہرے مستقبل کے جو سپنے دیکھے تھے‘ وہ سراب بن کر رہ گئے تھے۔ کراچی سے شرجیل کے جانے کے بعد تو یہ بھی ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ دنیا والوں کی نظروں سے چھپ کر اپنی لکڑی کی کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے ٹائپنگ کرکے اپنے پیٹ کے دوزخ کا ایندھن بھرتا رہتا۔ شرجیل کے جانے کے بعد اسے اپنی کوٹھری سے نکلنا پڑا تھا۔ اس نے ڈاک خانوں کے باہر لوگوں کو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کام کرتے دیکھا تھا اور اسے اپنے پیٹ کے ایندھن بھرنے کے لیے وہی راہ سوجھی تھی۔

وہ چھڑی سے راستہ دیکھتا اور لوگوں سے پوچھتا ہوا اس بڑے پوسٹ آفس تک پہنچ گیا تھا لیکن اس کے بعد بھی اسے کچھ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا اگر قدرت اس پر تھوڑی سی مہربان نہ ہو گئی ہوتی‘ وہاں اس کی ملاقات حاجی شمس سے ہو گئی۔ وہ اچھی تصاویر کے بہت دلدادہ تھے۔ تصور کی پہلی نمائش میں انہوں نے اس سے ملاقات کی تھی اور اس کی کئی پینٹنگ خاصے داموں میں خریدی بھی تھیں۔ انہوں نے جب تصور کو پہچان لیا تو انہیں اس کے نابینا ہو جانے کا بے حد دکھ ہوا۔ تصور نے ان کے استفسار پر انہیں پوری کہانی نہیں سنائی تھی۔ بس اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کے گھر میں آگ لگ گئی تھی جس نے اس کی بصارت چھین لی۔ اس نے حاجی شمس کو اپنی شادی اور بیوی سے علیحدگی کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا۔ کیونکہ وہ سب کچھ ایسا تھا ہی نہیں کہ کسی کو بتایا جاسکتا۔

حاجی شمس نے از خود اس کے لیے کچھ کرنا چاہا لیکن جب تصور اس کے لیے تیار نہیں ہوا تو انہوں نے ڈاک خانے والوں اور فٹ پاتھ پر کام کرنے والوں سے بات کرکے تصور کے لیے نہ صرف بیٹھنے کی جگہ کا انتخاب کیا بلکہ اس کے لیے میز کرسی کی فراہمی بھی کرنا چاہی لیکن تصور اس کے لیے بھی تیار نہیں ہوا۔ اس کے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی‘ اسی سے اس نے پرانی میز اور ایک کرسی خریدی۔ ٹائپ رائٹر تو اس کے پاس تھا ہی اس طرح اس نے ایک وسیلۂ روزگار ڈھونڈ لیا جس کا اسے کبھی خواب و خیال نہیں آیا تھا۔

جب تصور اپنے گھر جاتا تو حاجی شمس کی دکان کا ایک ملازم لڑکا‘ اس کا سامان جو ایک کرسی‘ ایک میز اور ایک ٹائپ رائٹر پر

مشتمل تھا' حاجی شمس کی دکان میں رکھ دیا کرتا تھا۔ حاجی شمس نے اسی لڑکے کی یہ ڈیوٹی بھی لگائی تھی کہ وہ روزانہ صبح تصور کو اس کے گھر سے لے کر آیا کرے اور شام کو پہنچا دیا کرے۔ تصور ان پر اپنی یہ ذمے داری بھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے تو حاجی شمس اڑ ہی گئے اور تصور کو ان کی بات ماننا پڑی تھی۔

اپنے چوبی کیبن میں پہنچنے کے بعد تصور کسی وقت بھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ جب تک سو نہیں جاتا' نہ جانے کیا کیا سوچتا رہتا تھا۔ رات کے لیے اس کا کھانا قریب کے ایک معمولی ہوٹل سے آجایا کرتا تھا۔ کھانا لانے والا پیسے لے کر چلا جایا کرتا تھا پھر صبح جو آدمی ناشتا لے کر آتا تھا' وہ رات کے برتن اٹھا کر لے جایا کرتا تھا۔ اسی طرح ناشتے کے برتن شام کو کھانا لانے والا لے جایا کرتا تھا۔

'کسی دن اسی کیبن میں مجھے موت بھی آجائے گی' وہ لیٹے لیٹے کبھی سوچا کرتا تھا اور اس وقت بھی اس کے ذہن میں کچھ اسی قسم کے خیالات گردش کر رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

تصور چونک پڑا۔ ابھی اسے ڈاک خانے سے آئے ہوئے صرف دس منٹ گزرے تھے۔ ہوٹل سے کھانا لانے والا آٹھ بجے کے قریب آیا کرتا تھا اور آٹھ بجنے میں ابھی خاصی دیر تھی۔

"کون ہے؟" اس نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا آپ دروازہ کھولنے کی زحمت کریں گے؟" ایک نسوانی آواز آئی۔

تصور پھر چونک گیا لیکن چونکنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ وہ لڑکی کی آواز تھی۔ چونکا وہ اس لیے تھا کہ وہ آواز گزشتہ روز سے اب تک اس کے ذہن میں چکرا رہی تھی.... گزشتہ روز جس لڑکی نے اس سے ٹیلیگرام کا فارم مانگا تھا' اس کی آواز تصور کو کچھ جانی پہچانی سی لگی تھی۔ اس نے کل سے اب تک اس آواز کے بارے میں جتنا سوچا تھا' اتنا ہی اسے یقین ہوتا چلا گیا تھا کہ وہ آواز اس نے پہلے کبھی سنی ضرور تھی اور سرسری انداز میں نہیں سنی تھی۔ سرسری انداز میں نہ سننے کا ایک مطلب یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لڑکی اسے بہ حیثیت تصور پہچانتی ہو۔

اور اب اپنے معمولی سے گھر کے دروازے پر وہ آواز سن کر اسے بالکل شک نہیں رہا کہ وہ لڑکی اسے جانتی تھی' اسی لیے وہ کسی نہ کسی طرح اس کا ٹھکانا تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

تصور نے ہمیشہ یہ چاہا تھا کہ اس کے پرانے کسی شناسا کو اس کی موجودہ حالت کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو لیکن یہ بھی نہایت غیر اخلاقی بات ہوتی کہ وہ اپنے گھر کے دروازے سے کسی کو بھگا دیتا۔

اس نے دروازہ کھول کر دھیمی آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"کیا آپ میرا نام پوچھے بغیر اندر بلانا پسند نہیں کریں گے۔" وہ بولی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھ اندھے شخص کے پاس دھرا ہی کیا ہے جو کسی بات کا خوف ہو۔ آئیے!" تصور ایک طرف ہٹا۔

اونچی ایڑیوں سے پیدا ہونے والی آواز اندر آگئی۔ مہنگے سینٹ کی خوشبو سے تصور نے اندازہ لگایا کہ یہ لڑکی کسی امیر گھرانے کی ہے۔ وہ الجھن میں پڑ گیا کہ ایسی کسی لڑکی نے اس معمولی سی جگہ آنا کیوں گوارا کر لیا؟ لیکن اس الجھن کے باوجود اسے اس نزاکت کا احساس تھا کہ وہ یہاں ایک جوان لڑکی کے ساتھ تنہا ہے لہٰذا اسے دروازے کی کنڈی نہیں لگانا چاہیے۔ اس نے دروازے کے دونوں پٹ صرف بھیڑ دیے اور مڑ کر بولا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ سے تشریف رکھنے کے لیے کیسے کہوں۔ یہاں کوئی ایسی چیز نہیں جس پر بیٹھنا آپ کے شایانِ شان ہو۔"

"آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں کسی شان و شوکت کی حامل ہوں؟"

"آپ نے جو سینٹ لگایا ہے' مجھے اس کی قیمت کا اندازہ ہے۔"

"اوہ! اچھا خیر' چھوڑیے! میں خود کو کسی شان و شوکت کا مالک نہیں سمجھتی۔ یہاں دو چھوٹے چھوٹے سے موڑھے پڑے ہوئے ہیں' میں ان میں سے کسی پر بیٹھ جاتی ہوں۔ لیجیے' میں بیٹھ بھی گئی۔"

"میری ایک منہ بولی بہن ہے۔ وہ اور اس کا شوہر کبھی کبھی مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ انہی کے لیے میں نے یہ موڑھے خریدے تھے ورنہ مجھے تو ان کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ جو ایک معمولی سا بستر آپ دیکھ رہی ہوں گی' میرے لیے یہی کافی ہے۔"

"اب آپ بھی بیٹھ جائیے نا!"

"کیا کوئی طویل گفتگو کرنا ہے۔" تصور کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

"آپ بیٹھیں تو سہی۔"

تصور اپنے بستر ہی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کہا "پوسٹ آفس پر آپ ہی نے مجھ سے ٹیلیگرام کا فارم لیا تھا نا؟"

"اوہ! آپ کو میری آواز یاد رہی!"

"اس لیے یاد رہی کہ میں یہ آواز پہلے بھی کبھی سن چکا ہوں۔ انسان اپنی زندگی میں بے شمار آوازیں سنتا رہتا ہے لیکن کچھ آوازیں یادداشت میں اس لیے محفوظ رہ جاتی ہیں کہ اس کا کوئی خاص سبب ہوتا ہے لیکن مجھے کوشش کے باوجود اب تک وہ سبب یاد نہیں آسکا ہے۔"

"میں آپ کو اپنا نام بتاؤں گی تو شاید آپ کو سب کچھ یاد آجائے گا۔ میرا نام عارفہ ہے۔"

یکلخت تصور کی آنکھوں کے اندھیرے میں ایک خوب صورت لڑکی کا چہرا ابھرا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "آپ تزئین کی دوست ہیں؟"

"جی ہاں۔"

تصور نے اپنا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ تزئین کے حوالے سے بہت سی یادیں اس کے دماغ میں ابھری تھیں اور اس نے اپنا پورا وجود کرب کی گہرائیوں میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔

"آپ کو میری آمد گراں تو نہیں گزری!" عارفہ بولی۔

"مہمان کوئی بھی ہو' اس کی آمد کسی انسان کو گراں نہیں

گزرنا چاہیے۔ میں بس یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تزئین نے آپ کو اب میرے پاس کیوں بھیجا ہے۔"

"آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ مجھے تزئین نے نہیں بھیجا۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ابھی تو اس سے میری ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ میں تو دو تین دن ہوئے' لندن سے آئی ہوں۔ پوسٹ آفس پر آپ کو دیکھا تو آپ کو پہچان گئی۔ آپ کو اس حال میں دیکھ کر مجھ پر جو کچھ گزری .... وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ بہت دکھ ہوا تھا مجھے! میں اسی وقت آپ سے بات کرتی لیکن میرے ساتھ میری چچا زاد بہنیں بھی تھیں۔ میں ان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ انہوں نے جسے ایک معمولی سا شخص سمجھا ہوگا' وہ بھی ایک بہت اچھا مصور تھا۔ نہ جانے کس کی نظر لگ گئی اس کو!"

"میں ہرگز کوئی بڑا مصور نہیں تھا کہ مجھے کسی کی نظر لگ جاتی۔ بس جو کچھ نصیب میں تھا' وہ ہوگیا۔"

"مگر کیسے ہوگیا؟ کیوں ہوگیا؟ تزئین کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ اب وہ کہاں ہے۔" تصور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں نے آخری ملاقات میں اسے بہت برا بھلا کہا تھا۔ میں اس وقت شدید غصے میں تھا لیکن اب میرا غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ میں نے خود کو سمجھا لیا ہے کہ آخر کوئی عورت کسی اندھے شخص سے آخر کب تک نباہ کر سکتی ہے! آپ کیونکہ اس کی دوست ہیں اس لیے آپ سے یہ سب کچھ کہہ رہا ہوں۔ جب بھی آپ اس سے ملیں' اسے بتا دیجئے گا کہ اب میرے دل میں اس کے خلاف کوئی جذبہ نہیں ہے اور میں دعاگو رہتا ہوں کہ وہ جہاں بھی رہے' خوش رہے' اس کی زندگی میں کبھی کوئی دکھ نہ آئے!" تصور کی آواز بھرّانے لگی۔

"آپ کے جذبات قابلِ تحسین ہیں لیکن میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آخر ہوا کیا تھا!"

"کیا کیجئے گا جان کر!" تصور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں اب غصے میں نہ ہونے کے باوجود یہ سوچتا ہوں کہ تزئین نے میرے ساتھ جو کچھ کیا' اچھا نہیں کیا لیکن میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اس نے اپنے لیے تو اچھا ہی کیا اور یہ ہر انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی بہتری کے لیے سوچے۔ میرا تو یہ مقدر تھا کہ اندھیروں میں کھو جاؤں لیکن اسے تو اپنی زندگی کے لیے روشنی کی ضرورت ہوگی جو اس نے پالی۔ خدا کرے کہ اس کی زندگی میں ہمیشہ روشنیاں ہی روشنیاں رہیں۔"

"آپ یہ مبہم باتیں کر کے مجھے ٹال نہیں سکیں گے۔ میں سب کچھ جانے بغیر آج یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

"میری باتوں پر آپ کو شاید جھوٹ کا گمان ہو۔ بہتر ہوگا کہ جب آپ اپنی دوست سے ملیں تو اسی سے پوچھ لیں۔"

"پوچھوں گی تو میں اس سے بھی کہ اس نے آپ کا ساتھ کیوں چھوڑا مگر آپ کی زبانی بھی میں سب کچھ جاننا چاہتی ہوں۔"

تصور نے پہلو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ عارفہ اس سے سب کچھ سنے بغیر آج یہاں سے نہیں جائے گی۔

"اچھا!" اس نے ٹھنڈی سانس لی "میں بتاتا ہوں آپ کو! یہ تو آپ جانتی ہی ہیں کہ ہم دونوں کی شادی ہوگئی تھی۔ آپ نے انگلینڈ سے ہمیں شادی کی مبارک باد کا ٹیلیگرام بھی بھیجا تھا نا!"

"وہ تو میں نے بھیجا تھا لیکن میں شروع سے سب کچھ جاننا چاہتی ہوں۔ آپ دونوں کی شادی کس طرح ممکن ہوئی تھی۔ دراصل میں اس کے خاندانی رسم و رواج سے پوری طرح واقف ہوں۔"

"تزئین نے اپنے گھر والوں سے بغاوت کردی تھی۔" تصور نے بتایا "میں نے تو اسے سمجھانا چاہا تھا کہ وہ میری خاطر اپنے گھر والوں کو نہ چھوڑے لیکن اس نے میری بات نہیں مانی اور کہا کہ اگر میں نے فوری طور پر اس سے شادی نہیں کی تو وہ کسی بلند عمارت سے کود کر خودکشی کرلے گی۔ اس کے لہجے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ محض دھمکی نہیں دے رہی تھی بلکہ وہ واقعی اس کا اٹل فیصلہ تھا۔ میں مجبور ہوگیا۔ ہم نے اسی دن سول میرج کرلی۔ اس روز لاہور میں میری تصاویر کی نمائش کا آخری دن تھا۔ اسی دن رات کی فلائٹ سے ہم کراچی چلے آئے۔"



کراچی میں ان دنوں تصور کے پاس ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جسے وہ اپنے لیے مناسب سمجھتا تھا لیکن شادی کے بعد اس نے سوچا کہ تزئین نے جس ماحول میں زندگی گزاری ہے' اس کے باعث وہ اس فلیٹ میں شدید گھٹن کا شکار ہو جائے گی لہٰذا اس نے شہر کے ایک اچھے علاقے میں ایک اچھا اپارٹمنٹ کرائے پر حاصل کرلیا۔

تصاویر کی دوسری نمائش سے تصور کو اچھی خاصی آمدنی ہوگئی تھی لہٰذا اس نے اپارٹمنٹ کو بہت اچھے انداز میں ڈیکوریٹ بھی کروایا اور ساری رقم خرچ کر ڈالی۔ تزئین اسے روکنے کی کوششیں بھی کرتی رہی کہ یہ سب کچھ کر کے خالی ہاتھ ہو جانا مناسب نہیں لیکن تصور کے بس میں ہوتا تو وہ تزئین کو سجانے کے لیے آسمان کے تارے بھی توڑ لاتا۔ اس نے تزئین کی کوئی بات نہیں سنی تاہم اسے تسلی دی کہ کئی بڑے آدمیوں کے لیے اسے تصاویر بنانا ہیں جن سے نہایت معقول رقم آجائے گی جس کے بعد اسے ایک خاصا لمبا کام بھی کرنا تھا۔ ایک بہت بڑے ہوٹل والوں کی خواہش تھی کہ وہ انہیں اتنی تصاویر بنا کردے کہ وہ ہوٹل کے تمام رہائشی کمروں میں آویزاں کی جاسکیں۔

"ان تصاویر کا آرڈر مجھے شرجیل کی وجہ سے ملا تھا۔" تصور نے تزئین کو بتایا تھا۔

شرجیل سے تزئین اس وقت مل چکی تھی جب کراچی میں تصور کی تصاویر کی پہلی نمائش ہوئی تھی۔

کچھ ہی عرصے میں تزئین کو اندازہ ہوگیا کہ تصور کے رسمی تعلقات تو بہت سے لوگوں سے تھے مگر اس کا دوست شرجیل کے سوا اور کوئی نہیں تھا' اسی لیے وہ شرجیل کی آمد پر اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتی تھی۔

تصور اس خیال سے بے حد پریشان تھا کہ اس کی مصروفیت کے باعث تزئین کہیں تنہائی کی اذیت سے دوچار نہ ہو جائے۔ آخر اس نے اس کا یہ حل نکالا کہ تزئین کو بھی پینٹنگ سیکھنے پر اکسایا۔ تزئین اس کے لیے تیار بھی ہوگئی۔ شاید اس نے بھی سوچا کہ اس طرح تنہائی اسے پریشان نہیں کرے گی یا ممکن ہے تصور سے شادی کرنے کے بعد اسے سچ مچ مصور بننے کا شوق ہوگیا ہو۔

تزئین نے گھر میں کوئی ملازمہ نہ رکھنے کا فیصلہ بھی اسی لیے کیا تھا کہ اس کا کچھ وقت گھر کے کام کاج میں بھی گزر سکے۔ اس نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی تھی' اسے کھانا پکانا سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوئی لیکن اب یہ سب کچھ اس نے کتابوں کی مدد سے کرنا شروع کیا پھر جب سامنے کے اپارٹمنٹ میں رہنے والی مہوش سے تعلقات بڑھے تو وہ بھی تزئین کو کھانا پکانے کے طریقے سکھانے لگی۔

دوپہر کو شرجیل بھی ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے آجایا کرتا تھا۔ تصور ہی نے اس کی یہ ڈیوٹی لگائی تھی اور کہا تھا "یار' میں چاہتا ہوں کہ تزئین کو گھر میں ہر وقت چہل پہل کا احساس رہے۔ وہ ایک بہت بڑے گھر کی بیٹی ہے۔ ساری کہانی تو میں تمہیں سنا ہی چکا ہوں۔ اگر وہ تنہائی کے احساس میں مبتلا ہوئی تو مجھے بڑی اذیت ہوگی۔"

"کیا پاس پڑوس سے تعلقات نہیں بڑھائے؟"

"بڑھائے تو ہیں۔ خاص طور سے سامنے والے اپارٹمنٹ میں جو میاں بیوی رہتے ہیں' ان سے تو ایسے تعلقات ہوگئے ہیں جنہیں گھریلو تعلقات کہا جاسکتا ہے پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ کچھ دیر کے لیے تم بھی آجایا کرو۔"

اور شرجیل نے اس کی بات مان لی تھی۔

کبھی تزئین کا جی چاہتا تھا تو وہ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے مہوش کے گھر جا بیٹھتی تھی۔ گھریلو قسم کی شاپنگ کی ذمے داری بھی اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ کبھی مہوش بھی اس کے ساتھ ہوتی اور کبھی وہ اکیلی چلی جاتی۔ تصور کیونکہ رات کو دیر تک کام کرتا تھا اس لیے تزئین تین چار گھنٹے پینٹنگ سیکھنے میں گزار دیتی۔

تصور کو شروع میں یہ خوف بھی تھا کہ محبت کے جذبات میں بہہ کر تزئین نے اس سے شادی تو کرلی تھی مگر کچھ دن بعد جب ان جذبات کی شدت میں کمی آئے گی تو اسے والدین یاد آنے لگیں گے' کیونکہ خون کا رشتہ بڑی اہمیت تو رکھتا ہے لیکن کئی ماہ گزرنے کے بعد بھی تزئین نے کبھی اپنے.......... گھر کا ذکر تک نہیں کیا۔

تصور کو شدت سے احساس تھا کہ ماں باپ کو چھوڑ کر تزئین نے اس کے لیے بہت بڑی قربانی دی تھی لہٰذا وہ تزئین کے لیے ہر طرح کی آسائش مہیا کرنے کے لیے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اس کے لیے نہایت قیمتی کپڑے خریدنے پر خرچ کردیتا تھا۔ زیورات کا تزئین کو بھی شوق نہیں رہا تھا اس لیے وہ لباس سے میچنگ کرنے والی امی ٹیشن جیولری کو ترجیح دیتی تھی۔

تصور نے تزئین کی ایک تصویر بھی بنائی۔ جو مہوش اور اس کے شوہر کو بے حد پسند آئی۔ تزئین بڑی بے تاب تھی کہ وہ تصویر جلد از جلد ڈرائنگ روم میں لگا دی جائے لیکن تصور کا کہنا تھا کہ ابھی اس تصویر میں کچھ کمی ہے۔

"کیا کمی ہے؟" تزئین کا سوال تھا۔

"یہ مجھے بھی نہیں معلوم لیکن کوئی کمی ہے ضرور! اور جب تک وہ کمی میری سمجھ میں نہ آجائے اور میں اسے دور نہ کردوں' اس وقت تک مناسب نہیں ہوگا کہ یہ تصویر ڈرائنگ روم میں لگائی جائے۔"

تزئین کا منہ بن جاتا تھا اور تصور سوچنے لگتا تھا کہ وہ تزئین کی تصویر بنانے میں جلدی کر بیٹھا ہے۔ درحقیقت تو تصویر مکمل ہوچکی تھی لیکن تصور چاہتا تھا کہ وہ تصویر تزئین کو شادی کی سالگرہ پر تحفے میں دے۔

ان دنوں بھی وہ ہوٹل کے لیے تصاویر بنانے میں مصروف رہتا تھا۔ ایک روز سہ پہر کے وقت جب اسے چائے کی خواہش محسوس ہوئی تو اس نے تزئین کو پکارا لیکن پھر اسے فوراً ہی یاد آگیا کہ دس منٹ پہلے ہی تزئین اس سے کہہ کر گئی تھی کہ کچھ ضروری چیزیں خریدنے جارہی ہے اور ایک گھنٹے میں لوٹے گی۔

چائے کی خواہش خاصی شدید تھی لہٰذا تصور کچن میں جا گھسا۔ شادی سے پہلے تو وہ ناشتا خود ہی تیار کرتا تھا اور کبھی کبھی کھانے کے لیے بھی کچھ بنالیا کرتا تھا لیکن اس روز ایک کپ چائے بنانے ہی میں اسے خاصی دیر ہوگئی۔ دراصل اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ پتی کہاں رکھی تھی اور چینی کا مرتبان کہاں رکھا تھا۔ اسی وجہ سے جو کام دس منٹ میں ہونا چاہیے تھا' اس میں بیس منٹ لگ گئے پھر وہ چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے ایک گھونٹ لیتا ہوا کچن سے نکلا تو یہ دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ جس کمرے میں اس نے اپنا اسٹوڈیو بنا رکھا تھا' وہاں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گر کر ٹوٹ گئی اور وہ پاگلوں کی طرح آتش زدہ کمرے کی طرف دوڑ پڑا۔

اس کمرے میں داخل ہونا حد درجہ خطرناک تھا۔ اگر صرف تصاویر کے زیاں کی بات ہوتی تو ممکن تھا کہ تصور اس کمرے میں داخل ہونے کا خطرہ مول نہیں لیتا لیکن اس کمرے میں اس کی ایک بہت قیمتی شے تھی۔ تزئین کی تصویر! تصور نے بڑی محنت سے بنائی تھی لیکن اس کے لیے اہمیت اپنی محنت کی نہیں بلکہ اس بات

کی تھی کہ وہ تزئین کی تصویر تھی' اس کی بیوی کی نہیں بلکہ اس کی محبوبہ کی تصویر!

اور یوں تصور اس آتش زدہ کمرے میں گھستا چلا گیا۔ دھوئیں سے اس کی آنکھیں جلنے لگیں لیکن اس نے دیکھ لیا کہ آگ اس ایزل تک نہیں پہنچی تھی جس پر تزئین کی تصویر لگی ہوئی تھی۔

آگ کی وجہ سے کمرا تنور بنا ہوا تھا۔ تصویر تک پہنچتے پہنچتے تصور پسینے میں نہا گیا۔ کئی مرتبہ آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آنے سے بھی بچا۔ دھوئیں کی وجہ سے وہ بُری طرح کھانس بھی رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو بھی بہہ رہے تھے لیکن وہ ایزل سے تزئین کی تصویر اتارنے میں کامیاب ہو گیا پھر جب وہ دروازے کی طرف واپس مڑا تو کمرے میں اچانک ایک دھماکا ہوا اور اتنا خوفناک شعلہ چمکا کہ تصور کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اب اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اس کا رخ کیونکہ دروازے کی طرف تھا لہٰذا وہ تصویر کو بغل میں دبائے سیدھا بڑھتا چلا گیا۔ اسے ایک معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ کچھ دکھائی نہ دینے کے باوجود وہ شعلوں کی لپیٹ میں آئے بغیر اس کمرے سے نکل کر لاؤنج میں پہنچ گیا پھر وہ کسی چیز سے ٹکرا کر گرا لیکن سنبھل کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس احساس نے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی مفلوج کر دی تھی کہ وہ اندھا ہو گیا ہے۔ اگر سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بیدار ہوتی تو اسے خیال آتا کہ آگ لاؤنج تک بھی پہنچ سکتی ہے اور وہ اس کی زد میں آ سکتا ہے لہٰذا اسے گھر سے ہی نکل جانا چاہیے۔ ایسا کوئی قدم اٹھانے کے بجائے وہ اپنی آنکھوں کو رگڑتا اور دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس حواس باختگی کے عالم میں اسے کچھ شور سنائی دیا جس میں تزئین کی چیخ پکار بھی شامل تھی۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ تزئین جلدی واپس آ گئی تھی اور فائر بریگیڈ والوں کو گھر کا دروازہ نہیں توڑنا پڑا تھا۔

"تصور!" چیختے ہوئے تزئین اس سے لپٹ گئی۔

"مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تزئین!" تصور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس وقت بھی تزئین کی تصویر اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔

تصور کو سہارا دے کر اپارٹمنٹ سے باہر لایا گیا اور پھر مہوش کے شوہر کی تجویز پر اسے فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا۔

"میں اندھا ہو گیا ہوں تزئین! میں اندھا ہو گیا ہوں۔" تصور بڑبڑا رہا تھا "میں اب کولھو کا بیل بن جانے کے سوا کچھ نہیں کر سکوں گا۔"

"خدا کے لیے ایسی باتیں زبان پر نہ لائیں کہ میرا کلیجا پھٹ جائے۔" تزئین کی آواز رُندھ گئی "آپ ضرور ٹھیک ہو جائیں گے۔"

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ اس اسپتال کے ڈاکٹروں سے جو کچھ ممکن تھا' وہ انہوں نے کیا لیکن تصور کی بصارت واپس نہ آ سکی۔

کچھ دن بعد اسے اسپتال سے رخصت کر دیا گیا۔

فوری طور پر ان کے رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ آگ اپارٹمنٹ کے دوسرے کمروں تک بھی پہنچی تھی۔ خاصا ساز و سامان جل گیا تھا۔ جو بچا تھا وہ مہوش نے اپنے گھر میں منگوا کر رکھ لیا تھا۔ وہ اور اس کا شوہر بہ اصرار تصور اور تزئین کو یہ کہہ کر اپنے گھر لے آئے کہ جب تک ان کا جلا ہوا اپارٹمنٹ ٹھیک نہ ہو جائے' وہ انہی کے ساتھ رہیں۔

اپارٹمنٹ کے جو حصے جلے تھے' سو جلے تھے مگر جہاں تک آگ نہیں پہنچی تھی' وہاں بھی دھوئیں نے چھتیں اور دیواریں سیاہ کر دی تھیں۔

جب تک وہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہوا' تزئین اور تصور' مہوش کے گھر میں رہے۔ تصور نے بینک اکاؤنٹ تزئین کے نام کھلوا رکھا تھا۔ اس اکاؤنٹ میں اتنی رقم تھی کہ پانچ چھ ماہ کا خرچ پورا ہو سکتا تھا۔ اس میں سے مناسب رقم نکلوا نکلوا کر تزئین' مہوش کو دیتی رہی۔ تصور کے شدید اصرار پر مہوش مجبوراً وہ رقم لیتی رہی۔

جب تصور کا اپارٹمنٹ ٹھیک ہو گیا تو میاں بیوی مہوش کے گھر سے منتقل ہو گئے۔ مہوش نے ان کا بچا کھچا سامان ان کے گھر میں سیٹ کروا دیا لیکن وہ سامان اتنا نہیں تھا کہ اس شاندار اپارٹمنٹ کے لیے کافی ہوتا۔ اس میں سے کچھ تو تھوڑا بہت جلنے کی وجہ سے خراب بھی ہو چکا تھا لیکن تصور کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپارٹمنٹ کو نئے سرے سے ڈیکوریٹ کروا سکتا۔ جو تصاویر تیار تھیں اور جن سے مناسب رقم مل سکتی تھی' وہ آگ کی نذر ہو چکی تھیں۔ اب جو کچھ بینک میں تھا' وہ زیادہ دن تک گھریلو اخراجات کے لیے بھی ناکافی تھا۔

تصور کو چپ سی لگ کر رہ گئی تھی۔ شرجیل اس دوران میں برابر اس کے پاس آتا رہا۔ وہ تصور کی ڈھارس بندھانے کی ہر ممکن کوششیں کرتا۔ اس کے لہجے میں افسردگی بھی ہوتی تھی۔ اس نے شدت سے چاہا تھا کہ تصور اس کا مالی تعاون قبول کر لے لیکن تصور نے انکار کر دیا تھا۔

"اس طرح آخر کب تک چل سکے گا!" تصور نے کہا تھا۔

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ تزئین بولی "میں ملازمت کر لوں گی۔"

تصور کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ یہ اس کے لیے بڑی اذیت ناک بات ہوتی کہ اس کی بیوی ملازمت کرے اور وہ گھر میں پڑے پڑے کھاتا رہے۔ اس نے فوری طور پر تو بات ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ آج کل ملازمت بھی آسانی سے تو نہیں مل جاتی!

شرجیل بولا "خیر' ملازمت کا بندوبست تو میں جلد ہی کروا دوں گا۔"

"کیسے!" تصور نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"میرے ہوٹل میں چھ ریسپشنسٹ ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی

کی شادی ہونے والی ہے۔ ہفتے بھر بعد ہی اس کی جگہ خالی ہو جائے گی۔"

"آپ کسی بھی طرح وہ جگہ مجھے دلوا دیجیے!" تزئین نے لجاجت سے کہا۔

"میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس کا بندوبست کروادوں گا۔"

"ریسپشنسٹ کو کیا تنخواہ ملتی ہو گی!" تصور نے ٹھنڈی سانس لی۔

"میرا خیال ہے اس تنخواہ سے اس اپارٹمنٹ کا کرایہ بھی شاید مشکل ہی سے ادا ہو سکے۔"

"ضروری تو نہیں کہ ہم اسی اپارٹمنٹ میں رہیں۔ کوئی دوسری جگہ دیکھ لیں گے جہاں کم سے کم کرایہ دینا پڑے۔" تزئین بولی۔

"کم سے کم کرائے کی جگہ کے لیے ڈپازٹ کے لیے تو مناسب رقم دینا ہو گی۔"

"اس اپارٹمنٹ کا ڈپازٹ واپس نہیں لیا جاسکتا؟"

"نہیں۔" تصور نے جواب دیا "کل اس اپارٹمنٹ کے مالک سے میری بات ہو چکی ہے۔ چھ ماہ کا جو ڈپازٹ تھا' وہ رقم اس نے اپارٹمنٹ ٹھیک کروانے کے اخراجات میں ایڈجسٹ کرلی ہے۔ غلطی تو میری ہی تھی نا! میں ایش ٹرے میں جلتی ہوئی سگریٹ چھوڑ آیا تھا۔ وہ کسی طرح ایش ٹرے سے گر پڑی اور میزپوش نے آگ پکڑلی۔ وہیں اسپرٹ کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ وہ میں نے کھلی ہوئی کیوں چھوڑ دی تھی۔ بہرحال' رپورٹ تو یہی ہے ناکہ آگ اس اسپرٹ کی وجہ سے پھیلی اور اس کا اقرار تو میں خود ہی کرچکا ہوں کہ میں جلتی ہوئی سگریٹ چھوڑ آیا تھا۔"

"اس اپارٹمنٹ کا مالک بہت سخت دل آدمی معلوم ہوتا ہے ورنہ اسے یہ احساس ہونا چاہیے تھا کہ تم کس سانحے سے دوچار ہو چکے ہو۔"

"آج کل زندگی اتنی دشوار ہو چکی ہے کہ ہر شخص اپنے ہی بارے میں سوچتا ہے۔"

"تو کل وہ کرایہ مانگنے آیا تھا؟"

"آیا تو شاید اسی لیے تھا مگر مانگا نہیں۔ چھ ماہ کا کرایہ بھی ایڈوانس دیا جا چکا ہے نا! ابھی اس کی طرف چار ماہ کا کرایہ باقی ہے۔ وہ یہ اشارہ ضرور دے گیا ہے کہ اگر مجھے اپارٹمنٹ چھوڑنا ہو تو معاہدے کے مطابق اسے تین ماہ قبل نوٹس دیا جائے۔ اس طرح مجھے اس سے صرف ایک ماہ کا کرایہ واپس مل سکتا ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب ہم یہ اپارٹمنٹ فوری طور پر خالی کردیں جب کہ دوسری جگہ ڈھونڈنے میں کچھ دن تو لگیں گے اور جگہ ڈھونڈنے کا کام بھی تمہیں ہی کرنا پڑے گا میرے دوست۔"

"وہ تو خیر میں کرلوں گا....."

"ایڈوانس کی رقم!" تصور کی مسکراہٹ بڑی پھیکی سی تھی۔

"تم اس کے لیے بھی فکرمند نہ ہو۔ دو ماہ کی ملازمت ہو جائے تو ہوٹل سے میں اتنی رقم ایڈوانس دلادوں گا کہ کسی کم کرائے کی جگہ کا ڈپازٹ دیا جا سکے۔"

تصور کو چپ ہو جانا پڑا۔ وہ حالات کے جبر کے سامنے بے بس تھا۔

چھ دن بعد تزئین کو ہوٹل سے اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا۔ دوسرے دن سے اس نے ڈیوٹی جوائن کرلی۔ ڈیوٹی کے اوقات سہ پہر تین بجے سے رات کے گیارہ بجے تک تھے۔

پہلے دن تزئین ڈیوٹی پر گئی تو تصور کا سارا وقت کرب کے عالم میں کروٹیں بدلتے ہوئے گزرا۔ تزئین اپارٹمنٹ کی چابی مہوش کو دے گئی تھی اس لیے پانچ بجے وہی تصور کے لیے چائے بنا کر لائی اور رات کو آکر کھانا بھی گرم کرکے کھلایا جو تزئین تیار کرکے گئی تھی۔

تصور نے مہوش اور اس کے شوہر کے اصرار پر بہ مشکل چند لقمے کھائے تھے۔ کچھ کھانے پینے کو اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔

دو تین دن گزرے تو تصور کو اپاہجوں کی طرح بستر پر پڑے پڑے وحشت ہونے لگی۔ اس نے شرجیل سے ایک واکنگ اسٹک منگوالی۔ اس کے سہارے وہ ٹٹول ٹٹول کر چلنے لگا۔ جب دھوپ ختم ہو جاتی تو بالکونی میں جا کھڑا ہوتا۔ اس طرف جو سڑک تھی' اس پر بھاری ٹریفک نہیں چلتا تھا لیکن کاریں وغیرہ تو چلتی ہی تھیں۔ بلند آواز میں بولے جانے والے راہ گیروں کے جملے بھی صاف سنائی دے جاتے تھے۔ وہاں کھڑے ہو کر تصور کے تخیل میں اس سڑک کے وہ سارے مناظر ابھرنے لگتے جو اس نے نابینا ہو جانے سے پہلے دیکھے تھے۔ کبھی کبھی وہاں اتنی دیر تک بھی کھڑا رہتا کہ اس کی پنڈلیاں دکھ جاتیں۔ گھر میں اندھیرا بھی چھا جاتا۔ جب کھانے کے وقت پر مہوش اور اس کا شوہر آتے تو وہی لائٹ جلاتے۔

رات کو جب تزئین آتی تو دیر تک تصور سے لپٹی رہتی پھر جب وہ سونے کے لیے لیٹتے تو وہ تصور کو ہوٹل کے قصے سنانے لگتی۔ ان قصوں سے تصور کو شدید اذیت ہوتی تھی۔ یہ احساس زیادہ سے زیادہ اذیت دینے لگتا تھا کہ اس کی بیوی ایک ہوٹل میں ریسپشنسٹ کی حیثیت سے ملازم تھی۔ ایک رات اس نے چڑ کر کہہ ہی دیا۔

"خدا کے لیے مجھے یہ سب قصے نہ سنایا کرو۔"

تصور کے لہجے کی تلخی محسوس کرکے تزئین نے دھیمی آواز میں کہا "میں تو یہ سب کچھ اس لیے سناتی ہوں کہ آپ کا دھیان بٹ سکے۔"

"اس سے میرا دھیان نہیں بٹتا بلکہ وہ کرب اور بڑھ جاتا ہے جو تمہاری عدم موجودگی میں مجھے تڑپاتا رہتا ہے۔"

"مجھے معاف کردیجیے۔ مجھے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا۔ آخری بار اس وقت ہوٹل کا نام زبان پر لا کر میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب آپ سے وہاں کی کوئی بات نہیں کیا کروں گی۔" تزئین اس کے

سینے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔

تصور نے اس کا شانہ تھپکا اور نرم لہجے میں بولا "مجھے بھی معاف کر دینا تزئین، میری جان! میں نے اس وقت تم سے بہت سخت لہجے میں بات کی تھی۔"

"مجھے آپ کی کوئی بات، کوئی بھی لہجہ بُرا نہیں لگ سکتا۔ میں اندازہ لگا سکتی ہوں کہ آپ کس ذہنی کیفیت سے گزر رہے ہیں!.... میں ہر وقت دعا کرتی رہتی ہوں کہ آپ معمول کی زندگی کے احساسات کی طرف لوٹ آئیں۔"

"معمول کی زندگی کے احساسات!" تصور تلخی سے مسکرایا۔

"ہاں۔" تزئین نے کہا "مجھے یقین ہے کہ ایسا ضرور ہوگا۔ گزرتا ہوا وقت انسان کو ہر چیز کا عادی بنا دیتا ہے۔"

"لیکن میں.... اچھا خیر! چھوڑو یہ بحث۔ آج دن میں مجھے ایک بات کا خیال آیا تھا۔ سوچا تھا کہ تم آؤ گی تو پوچھوں گا۔ ہمارے گھر میں ایک ٹائپ رائٹر تھا، کیا وہ بھی آگ میں جل گیا۔"

"نہیں۔ وہ بالکل محفوظ ہے۔"

"خدا کا شکر ہے۔"

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

"شاید سال بھر پہلے شرجیل سے ٹائپنگ سکھانے والے اسکولوں سے متعلق روا روی میں بات ہونے لگی تھی۔ شرجیل نے ایک ایسے اسکول کا ذکر بھی کیا تھا جس کے مالک سے اس کے خاصے تعلقات تھے۔ شرجیل نے بتایا کہ اس کے دوست کے اسکول میں ٹائپ کے لیے بعض دفاتر کا کام بھی آتا ہے جو اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ ان کے اسکول میں نہیں ہو پاتا اس لیے وہ یہ کام پیسے دے کر کچھ بے روزگار لوگوں سے کروا لیا کرتا ہے۔"

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کل میں شرجیل سے بات کروں گا کہ وہ اپنے دوست سے کچھ کام مجھے بھی لا دیا کرے۔ اس طرح گھر میں کچھ زائد رقم آجایا کرے گی۔"

"آپ ٹائپ کریں گے؟" تزئین کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تم اس لیے حیران ہو رہی ہو... کہ میں اندھا ہوں۔" تصور نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "لیکن مجھے خود پر اعتماد ہے کہ میں یہ کام کر لوں گا۔ ٹائپنگ تو میں سیکھا ہوا ہوں۔ ٹائپ رائٹر بھی میں نے اسی لیے خریدا تھا کہ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے باہر کے دھکے نہ کھانا پڑیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے دکھائی نہیں دیتا لیکن ٹائپ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دکھائی بھی دے۔ بس رفتار بڑھانے کے لیے مجھے کچھ دن مشق کرنا پڑے گی۔"

"لیکن کبھی کوئی غلط حرف بھی ٹائپ ہو جاتا ہے۔ وہ تو آپ کو دکھائی نہیں دے گا!"

"میں بہت ذہنی یکسوئی کے ساتھ اتنی مشق کروں گا کہ غلطی بھی نہ ہو۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو آمدنی ہو جائے گی، دوسرے میں اس گھبراہٹ کا شکار بھی نہیں رہوں گا جو تمہارے جانے کے بعد مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ اِدھر اُدھر کے پریشان کن خیالات سے بچالے گا مجھے یہ مشغلہ!"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ یہ سب کچھ کر سکیں گے۔"

"بھول گئیں!" تصور خفیف سا مسکرایا "تم ہی نے میرا نام تصور رکھا تھا۔ اگر میں اپنے تصور سے کام لے کر ایسے مناظر پینٹ کر لیتا ہوں جو میں نے کبھی نہیں دیکھے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں یہ کام نہ کر سکوں اور پھر یہ کہ۔" تصور کی مسکراہٹ میں افسردگی آگئی "سنا ہے کہ خدا اندھوں میں کچھ دوسری غیر معمولی صلاحیتیں پیدا کر دیتا ہے۔ کل تم ٹائپ رائٹر نکال کر ذرا صاف کر دینا۔"

"اچھا!" تزئین نے ٹھنڈی سانس لی۔ "جیسے آپ کی مرضی۔"

دوسرے دن شرجیل آیا تو تصور نے اس سے بھی وہی باتیں کیں۔ تزئین کی طرح شرجیل نے بھی حیرت کا اظہار کیا لیکن تصور نے کہا "یقین کرو کہ یہ کام میرے لیے ناممکن نہیں ہوگا۔ مجھے بے حد اعتماد ہے خود پر! آج تزئین نے ٹائپ رائٹر صاف کر کے رکھا ہے اور ایک صفحہ میں ٹائپ بھی کر چکا ہوں، دیکھو۔" تصور نے اسے ایک فل اسکیپ کاغذ دکھایا۔

"اس میں تو ٹائپنگ کی بہت سی غلطیاں ہیں۔" شرجیل نے دھیرے سے کہا "اور حروف بھی بہت مدھم ہیں۔"

"حروف تو اس لیے مدھم ہوں گے کہ اس میں پڑا ہوا ربن بہت پرانا ہو چکا ہے۔ ایک نیا ربن پڑا ہوا ہے۔ وہ تم اس میں لگا دو پھر حروف مدھم نہیں رہیں گے۔ بعد میں دو ایک مرتبہ کوشش کر کے میں خود بھی ربن تبدیل کرنے کا عادی ہو جاؤں گا۔ رہی غلطیوں کی بات تو وہ تو ابھی ہوں گی ہی! میں پیشہ ور ٹائپسٹ تو کبھی نہیں رہا لیکن مجھے یقین ہے کہ میں مہینے بھر کی مشق سے اپنی رفتار بھی بڑھا لوں گا اور غلطیاں بھی نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے یہ اصرار بھی نہیں کہ تم آج ہی سے میرے لیے کام لانے لگو۔ میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تمہیں اپنے دوست کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ ایک مہینے تو مجھے مشق کر لینے دو پھر جب تم اپنی آنکھوں سے دیکھ لو کہ میں نے غلط دعویٰ نہیں کیا تھا، تبھی مجھے کام لا کر دینا۔"

"کام تو میں تمہیں اتنا لا دوں گا کہ تم پانچ چھ گھنٹے بھی مصروف رہ سکو لیکن پہلے تم کو ثابت تو کرنا ہی پڑے گا کہ تم یہ کام کر سکتے ہو۔"

"میں خود کہہ چکا ہوں کہ جب تم مطمئن ہو جاؤ تو مجھے کام لا کر دینا ورنہ ہرگز نہیں۔"

اور پھر تصور نے اسی روز سے مشق شروع کر دی۔ شرجیل نے ٹائپ رائٹر کا ربن تبدیل کر دیا تھا۔

جب انسان کسی مشکل کام کے لیے کمر کس ہی لے تو پھر اس کے لیے وہ کام آسان ہو ہی جاتا ہے۔ تصور کا دعویٰ تھا کہ وہ ایک ماہ کی مشق سے سب کچھ کرنے پر قادر ہو جائے گا لیکن ہوا ایسا کہ

صرف بیس ہی دن میں اس نے یہ کمال کر دکھایا۔

اس کے بعد آمدنی کا ایک اور راستہ کھل گیا۔ شرجیل نے اس کے لیے کام لانا شروع کردیا۔

تزئین کی ملازمت کو اس وقت تک ایک ماہ گزر چکا تھا چنانچہ اپارٹمنٹ کے مالک کی طرف سے یہ بات چھیڑی گئی کہ اسے کرایہ ادا کیا جائے یا اس کا اپارٹمنٹ خالی کردیا جائے۔ اسے جواب دے دیا گیا کہ تین ماہ بعد اپارٹمنٹ خالی کردیا جائے گا۔

تصور کے لیے یہ بات خاصی باعثِ سکون تھی کہ اب اخراجات کی تمام ذمّے داری صرف تزئین پر نہیں رہے گی اور وہ اس احساسِ کمتری کا شکار نہیں ہوگا کہ وہ اپنی بیوی کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ شرجیل نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کم از کم چار ہزار روپے ماہانہ کا کام تو لا ہی دیا کرے گا۔

تنہائی کی وجہ سے تصور پر جو یاسیت طاری رہتی تھی وہ بھی اس مصروفیت کے باعث ختم ہوگئی اور دماغ میں اُلٹے سیدھے خیالات آنے کا سلسلہ بھی بند ہوگیا۔

پھر کوئی پندرہ دن اور گزرے تھے کہ تصور ایک ذہنی خلش سے دوچار ہوگیا۔ اس نے محسوس کیا کہ شرجیل کی دوپہر کی آمد کے معمول میں تو کوئی فرق نہیں آیا لیکن اس نے تزئین سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ اگر تزئین ہی اسے مخاطب کر بیٹھتی.... تو وہ جواب دے دیتا تھا ورنہ صرف تصور ہی سے باتیں کرتا تھا۔

تصور پانچ چھ دن تک اس خلش سے دوچار رہا۔ وہ اس تبدیلی کے بارے میں تزئین کے سامنے شرجیل سے کوئی سوال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چھٹے دن اس نے شرجیل سے کہا "یار مجھے تم سے کچھ کام ہے۔ کیا تھوڑی دیر کے لیے شام کو آسکتے ہو؟"

"آجاؤں گا۔" شرجیل نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

دو بجے کے قریب شرجیل چلا گیا۔ تزئین کو تین بجے ڈیوٹی پر پہنچنا ہوتا تھا۔ ڈھائی بجے وہ گھر سے روانہ ہوتی تھی لہٰذا اسے تصور سے یہ پوچھنے کا موقع مل گیا کہ اس نے شرجیل کو شام کو کیوں بُلایا ہے!

تصور کو اس سے اس سوال کی توقع تھی لہٰذا جواب اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا "دراصل میں کچھ دن سے محسوس کر رہا ہوں کہ شرجیل کچھ گم صم رہنے لگا ہے۔ میں اس کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔ تمہارے سامنے اس سے کچھ پوچھنا میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا اس لیے شام کو بلایا ہے۔"

"میرا خیال تو یہ ہے کہ آپ کے دوست گم صم نہیں رہتے لیکن جب وہ یہاں آتے ہیں تو مجھ سے کچھ کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں۔"

"ایسا کچھ تو میں نے محسوس نہیں کیا۔"

"مجھے تو یہی خیال آیا کہ آپ نے اسی بارے میں بات کرنے کے لیے انہیں میری عدم موجودگی میں بُلایا ہے۔"

"نہیں تزئین! ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ آج کل کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔"

تزئین اس بحث کو آگے نہیں بڑھانا چاہتی تھی یا اسے ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہونے کی جلدی تھی لہٰذا وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

پانچ بجے کے قریب شرجیل آگیا۔ تزئین اب بھی بیرونی دروازہ باہر سے مقفل کرکے چابی مہوش کو دے جاتی تھی لیکن دروازہ اندر سے کھولا جاسکتا تھا اور شرجیل نے واکنگ اسٹک کے سہارے چل پھر کر گھر کے بارے میں سارے اندازے لگا لیے تھے اور بیرونی دروازے تک جاکر اسے کھولنا اس کے لیے اب کوئی مشکل کام نہیں رہا تھا۔

وہ دونوں بیرونی کمرے ہی میں بیٹھ گئے اور شرجیل بولا "کیا بات ہے؟ اس وقت کیوں بلایا ہے مجھے؟"

"کیا ہوٹل میں تزئین ذمّے داری سے کام نہیں کر رہی ہے؟" تصور نے پوچھا۔

"یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟"

"میں نے محسوس کیا ہے کہ چند دن سے تم نے تزئین سے بات کرنا بہت کم کردیا ہے بلکہ بند ہی کردیا ہے۔"

"ایسی بھی کوئی بات نہیں یار! دراصل میں اپنی ایک ذاتی پریشانی کی وجہ سے الجھا رہتا ہوں۔"

"ایسی کیا پریشانی ہے کہ تم تزئین سے بات نہیں کرتے!"

"تمہاری زندگی میں کچھ کم الجھنیں تو نہیں کہ میں تمہیں اپنی الجھن میں بھی شریک کروں۔"

"دوستی کا تقاضا تو یہی ہے۔"

"دوستی کا تقاضا دراصل یہ ہے کہ تمہیں اپنی الجھن میں شریک نہ کروں۔ فی الحال میں تمہیں اتنا ہی جواب دوں گا کہ کچھ دن ٹھہر جاؤ پھر میں تمہیں اپنی پریشانی کا سبب بتادوں گا۔"

"کیا کچھ دنوں میں تمہاری پریشانی ختم ہوجائے گی؟"

"ابھی میں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میں تمہیں کچھ نہ کچھ بتا ضرور دوں گا۔"

"اس وقت تک مجھے خلش میں مبتلا رکھو گے!"

"تم اپنے ذہن سے یہ بات جھٹک کیوں نہیں دیتے۔"

"ایسا کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔"

"تمہاری قوتِ ارادی بہت مضبوط ہے۔ تم سب کچھ کرسکتے ہو اور اب کل سے میں شام ہی کو آیا کروں گا۔ اس طرح تم اس بات پر غور کرنا چھوڑ دو گے کہ میں تمہاری بیوی سے بات نہیں کرتا۔"

تصور نے خاصا اصرار کیا لیکن شرجیل یہی کہتا رہا کہ وہ اپنی پریشانی سے چند دن بعد آگاہ کرے گا۔

رات کو جب تزئین آئی تو اِدھر اُدھر کی کچھ باتوں کے بعد جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو تزئین نے پوچھا "کچھ معلوم ہوا؟ آخر آپ

کے دوست کو ایسی کیا پریشانی ہے کہ انہوں نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا ہے؟ ہوٹل میں تو مجھ سے ان کا رویہ ٹھیک ہی رہتا ہے ورنہ میں سمجھتی کہ وہ میری کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں۔ معاف کیجئے گا تصور! میں آج پھر ہوٹل کی بات کر بیٹھی لیکن یہ ایک الجھن ہی ایسی سامنے آگئی ہے۔ ان سے آپ کی کیا باتیں ہوئیں؟"

"میرا یہ اندازہ ٹھیک نکلا کہ وہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے لیکن اس نے مجھے اپنی پریشانی سے آگاہ نہیں کیا۔ اس نے کہا کہ کچھ دن بعد بتائے گا۔"

"ایسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ جب وہ گھر آئیں تو مجھ سے بات نہ کریں۔"

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تزئین! اب بس یہی ہے کہ جس طرح مجھے کچھ دن انتظار کرنا ہے' اسی طرح تم بھی انتظار کرو۔"

"ذہن میں ایک خلش سی رہے گی۔"

"میں نے بھی اس سے یہی کہا تھا۔"

تزئین خاموش ہو گئی۔ شاید وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔

دوسرے دن سے شرجیل نے دوپہر کو آنا چھوڑ دیا اور شام کو آنے لگا۔ تزئین نے دو تین دن بعد کہا "اب تو انہوں نے آنا ہی چھوڑ دیا ہے کیا ایسا ہے کہ میری عدم موجودگی میں آتے ہوں۔"

"ہاں وہ شام کو ہی آتا ہے۔" تصور نے جھوٹ بولنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ مہوش کی وجہ سے تزئین کو حقیقت معلوم ہو سکتی تھی پھر اس نے بات بنانے کے لیے کہا "اس کے بقول اسے جو پریشانی لاحق ہے' اسی کی وجہ سے دوپہر کو آنا مشکل ہو گیا ہے۔"

تزئین چپ ہو گئی۔ اگر تصور بصارت سے محروم نہ ہوتا تو تزئین کے چہرے کے تاثرات کو سمجھنے کی کوشش کرتا لیکن وہ بس اندازہ ہی لگا سکتا تھا کہ تزئین اس بحث کو طول دے کر اپنا ذہن منتشر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

چند دن بعد شرجیل آیا تو کہنے لگا "یار تصور! تم ایسا کر سکتے ہو کہ......" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔

"کہ؟" تصور کا لہجہ سوالیہ تھا۔

"کہ تم میری باتوں کو......" اس نے پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا تم میرے صبر کا امتحان لینا چاہتے ہو؟"

"نہیں یار! یہ بات نہیں ہے۔ دراصل......" وہ پھر چپ ہو گیا۔

"اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔" تصور نے خفا ہو جانے والے انداز میں کہا۔

"ناراض نہ ہو میری جان! دراصل میں تمہیں اپنی پریشانی کا سبب بتانے کے لیے بے چین ہوں لیکن مجھے احساس ہو رہا ہے کہ ابھی مجھے چند دن اور خاموش رہنا چاہیے۔"

"خواہ میری جان نکلتی رہے۔"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ مجھ سے غلطی ہوئی کہ آج یہ ذکر لے بیٹھا۔ تم نے اس دن کے بعد سے یہ بات چھیڑی ہی نہیں تھی۔"

"مستقل خلش سے دوچار ہوں لیکن اپنے ہونٹوں پر قفل لگا لیا ہے۔"

"چند دن اور قفل لگائے رہو۔ میں بھی کوشش کروں گا کہ اپنی بے قراری پر قابو پائے رکھوں۔"

تصور ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

دو دن بعد تزئین نے اسے بتایا کہ اس نے ایڈوانس لینے کے لیے ہوٹل کو درخواست دے دی ہے تاکہ دوسرا گھر لیا جا سکے۔ اس نے کہا۔

"آپ کے دوست نے سو فیصد یقین دلایا ہے کہ ایڈوانس مل جائے گا۔"

"چلو اچھا ہے۔ گھر بدل لیں گے تو دماغ سے خاصا بوجھ کم ہو جائے گا۔"

اس روز ان دونوں نے شرجیل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

اگلے روز شرجیل آیا تو گھنٹے بھر.... تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا یا وہ کاغذات دیکھے جو تصور نے اس ہفتے ٹائپ کئے تھے۔ تصور نے بھی وہ موضوع نہیں چھیڑا جس سے شرجیل گریز کر رہا تھا لیکن اس سے اگلے دن جب وہ آیا تو کچھ برافروختہ محسوس ہوا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"اب میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اپنے دوست کی عزت کو یوں نیلام ہوتے ہوئے دیکھوں۔ سمجھا سمجھا کر تھک گیا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا کہ میں اپنی زبان بند رکھوں۔"

"دوست کی عزت؟ نیلام؟ میں کچھ سمجھا نہیں۔"

جواب میں شرجیل نے تیزی سے کہا "لیکن اس سے پہلے کہ میں تمہیں کچھ بتاؤں' تمہیں مجھ سے وعدہ کرنا پڑے گا۔"

"کیسا وعدہ؟"

"تم کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کرو گے۔"

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہی ہیں؟" تصور نے الجھ کر کہا۔

"دراصل..... اچھا فرض کرو' اگر میں تمہیں کوئی ایسی بات بتاؤں جسے سن کر تمہیں غصہ آجائے تو بھی تم مجھ پر غصے کا اظہار نہیں کرو گے۔ دل میں تم خواہ کتنے ہی پیچ و تاب کھاؤ' زبان سے کچھ نہیں کہو گے بلکہ صرف سوچو گے کہ تمہیں ان حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ اگر تم اس نتیجے پر پہنچو کہ تمہارا غصہ بے جا ہے' تب تو بات ہی ختم ہو جائے گی لیکن اگر تم مجھے غلطی پر سمجھو تو کسی قسم کی تلخی پیدا کئے بغیر مجھ سے اپنے تعلقات ختم کر لینا۔"

"تمہاری ان باتوں نے تو میرا دماغ بالکل ہی منتشر کر دیا۔"

"جب میں تمہیں کچھ بتاؤں گا تو تمہارا یہ ذہنی انتشار تو بہرحال ختم ہو جائے گا لیکن تمہیں غصہ ضرور آئے گا۔ میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہوں کہ تم فوری طور پر اپنے غصے کا اظہار نہیں کرو گے۔"

"چلو میں وعدہ کرتا ہوں۔ تم مجھے بتاؤ تو سہی! میرا یہ ذہنی خلفشار تو ختم ہو۔"

"میں آج تمہیں جو کچھ بھی بتا رہا ہوں' بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن اب سمجھانے بجھانے سے مایوس ہونے کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں ان باتوں سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔"

"کن باتوں سے؟" تصور کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔

"مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے کیونکہ میں اس کے نتیجے کے بارے میں بھی اندازہ لگا چکا ہوں لیکن اب تمہیں یہ بتانے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ تمہاری بیوی کے قدم بہک گئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" تصور چونکا۔ شرجیل کے جملے سے ایک ہی خیال ذہن میں آسکتا تھا اور وہ ایسا تھا کہ تصور کا سارا وجود جھنجنا گیا۔

"ہوٹل میں میرے تین اسسٹنٹ ہیں۔" شرجیل نے بتایا "ان میں سے ایک کا نام آفتاب ہے۔ یہ ملازمت وہ اس لیے نہیں کر رہا ہے کہ اسے پیسوں کی ضرورت ہے بلکہ وہ صرف تجربہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ہوٹل مینجمنٹ کا کورس تو کر لیا ہے مگر اس کا کروڑپتی باپ چاہتا ہے کہ وہ باقاعدہ کام کر کے عملی تجربہ بھی حاصل کر لے تاکہ اس بڑے ہوٹل کے انتظامات بخوبی چلا سکے جو اس کا باپ بنوانے والا ہے۔ تزئین نے اسی کو اپنا اسیر بنا لیا ہے۔"

تصور اس طرح ساکت بیٹھا رہا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

شرجیل نے ایک لمحے کے لیے خاموش رہ کر شاید تصور کے چہرے کا جائزہ لیا اور پھر کہنے لگا "ملازمت کے پندرہ بیس دن بعد ہی تزئین اور آفتاب میں بے تکلفی ہو گئی تھی لیکن میرے ذہن میں کوئی غلط خیال نہیں آیا تھا۔ میں نے بس یہی سوچا تھا کہ دو افراد جب ایک جگہ کام کرتے ہیں تو ان میں بے تکلفی ہو ہی جاتی ہے لیکن کچھ دن بعد مجھے احساس ہوا کہ بات صرف بے تکلفی کی نہیں' اس سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ میں تمہارا دوست ہوں اس لیے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے آفتاب کو اپنے کمرے میں بلا کر بہت جھاڑا لیکن اسی وقت تزئین میرے کمرے میں آگئی اور اس نے بہت سخت لہجے میں مجھ سے کہا کہ مجھے اس کے اور آفتاب کے کسی معاملے میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے پھر وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر آفتاب کے بازو میں بازو ڈال کر میرے کمرے سے نکل گئی۔"

تصور اب بھی ساکت بیٹھا رہا لیکن اس کے چہرے کا رنگ بار بار بدلنے لگا تھا۔ دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تزئین اس سے اس طرح بے وفائی کر سکتی ہے۔

شرجیل نے پھر کہنا شروع کیا "پھر اس کے اگلے دن میں تمہارے پاس آیا تو میں نے تزئین سے کوئی بات نہیں کی۔ تم نے اس تبدیلی کو محسوس کر کے مجھے شام کو بلایا اور مجھ سے حقیقت جاننا چاہی لیکن میں ٹال گیا۔ دراصل میں چاہتا تھا کہ تمہیں کسی طرح اس صدمے سے بچالوں اور تزئین کو سمجھا بجھا کر واپس صحیح راستے پر لے آؤں لیکن جب میں نے ہوٹل میں تزئین کو سمجھانے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ تزئین نے آفتاب سے شادی کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے اور وہ چاہتی ہے کہ میرے ذریعے سے ساری بات تم تک پہنچ جائے اور تم اسے طلاق دے دو۔ اس نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ اسے واقعی تم سے محبت تھی لیکن محبت محض ایک جذباتی چیز ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ٹھنڈی پڑتی چلی جاتی ہے اور یہی اس کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جذبات ٹھنڈے پڑ جانے کے باوجود وہ تمہارے ساتھ گزارا کر لیتی لیکن یہ اس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ایک اندھے شخص کی خاطر ساری زندگی ملازمتیں کرتی پھرے۔"

"بس کرو شرجیل! بس کرو۔" تصور ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیاں دبالی تھیں "میرا دماغ پھٹ جائے گا۔"

شرجیل نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا "مجھے اندازہ تھا کہ تم پر کیا گزرے گی لیکن تم خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو کہ.... تم کسی فوری ردعمل کا اظہار نہیں کرو گے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے شرجیل کہ میرا سارا وجود آگ کی لپیٹ میں آجائے اور میرے منہ سے اُف بھی نہ نکلے۔" تصور کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

"تکلیف کے اظہار سے تکلیف ختم نہیں ہو جاتی۔" شرجیل نے کہا "اب اس آگ کی اذیت سے تم بتدریج ہی نجات حاصل کر سکتے ہو لیکن صرف اس صورت میں کہ تزئین کو طلاق دے دو۔ لیکن تم تزئین پر گرج برس گے نہیں۔ یہ میں تم سے وعدہ لے چکا ہوں کہ ضبط سے کام لو' سوچو سمجھو اور اس کے بعد کسی بحث و تمحیص کے بغیر تزئین کو طلاق دے دو۔ اس سے کیا فائدہ کہ تم تزئین پر غصے کا اظہار کرو اور پاس پڑوس کے لوگ بھی یہ تماشا دیکھیں۔ اس طرح تم خود بھی ایک تماشا بن کر رہ جاؤ گے اور ہاں! ایک بات بتانا میں بھول گیا۔ تزئین نے ہوٹل سے ایڈوانس کے سلسلے میں جو درخواست دی تھی' وہ منظور نہیں ہو سکی۔ صاف صاف جواب دے دیا گیا ہے کہ صرف دو ماہ پرانے ملازم کو اتنی رقم ایڈوانس نہیں دی جا سکتی۔ یہ جواب آج ہی ملا ہے اور آج ہی آفتاب نے اس سے کہا ہے کہ رات کو وہ ہوٹل سے دو گھنٹے قبل چھٹی لے لے اور اس کے ساتھ اس کے گھر چلے' وہ اسے اس کی

مطلوبہ رقم دے دے گا چنانچہ تزئین دو گھنٹے کی چھٹی کی درخواست دے چکی ہے۔"

"وہ اس کے ساتھ اس کے گھر جائے گی؟" تصور کی آواز غصے اور صدمے سے کانپ گئی۔

"ہاں۔" شرجیل نے کہا "اور یہ ایسا کوئی پہلا موقع نہیں ہوگا۔ کل رات بھی وہ ایک گھنٹا اس کے گھر پر گزار چکا ہے۔ آفتاب کا کوئی بھائی، بہن یا کوئی عزیز اس کے ساتھ نہیں رہتا۔ صرف باپ بیٹے اور ملازمین رہتے ہیں اور باپ پندرہ بیس دن سے بیرونِ ملک گیا ہوا ہے۔"

صدمے اور غصے کے باوجود تصور کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا "کاش یہ سب کچھ سننے سے پہلے زمین پھٹ جاتی اور میں اس میں سما جاتا۔"

"میں پھر کہوں گا کہ تمہاری کیفیت کا مجھے بہ خوبی اندازہ ہے مگر تزئین اب اس حد تک بہک چکی ہے کہ مجھے بھی یہ گوارا نہیں کہ وہ تمہاری بیوی رہے۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ کل سے پہلے بھی آفتاب کے ساتھ اس کے گھر جاتی رہی ہے۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ وہ ساڑھے نو دس بجے گھر آئی ہو؟"

"نہیں۔" تصور کے منہ سے بہ مشکل نکلا۔

"لیکن گزشتہ پندرہ دن میں اس نے کل سے پہلے بھی دو مرتبہ ہوٹل سے نو بجے چھٹی کی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ وقت بھی اس نے آفتاب کے گھر پر ہی گزارا ہوگا۔ کل تو مجھے کچھ شبہ ہوا تھا اس لیے ان دونوں کا تعاقب کر کے مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی لیکن اب تو بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ پہلے بھی دو مرتبہ وہ دو دو گھنٹے کی چھٹی کیوں لے چکی ہے۔ ویسے تو روزانہ ہی وہ دونوں ساتھ ساتھ ہی ہوٹل سے نکلتے ہیں اور آفتاب اسے یہاں چھوڑ کر جاتا ہے۔ تم اس وقت کمرے میں ہوتے ہو۔ اگر کبھی بالکونی میں ہوتے تو آفتاب کی گاڑی رکنے کی آواز کے ساتھ شاید ان دونوں کی آواز بھی سُن لیتے۔"

"اس میں اب اتنی ہمت ہوگئی ہے کہ وہ آفتاب کے ساتھ یہاں آتی ہے۔" تصور کے ہونٹ شدت سے لرز رہے تھے۔

"وہ تو چاہتی ہی یہ ہے کہ اگر میں تمہیں کچھ نہیں بتا رہا ہوں تو خود تمہیں ہی کسی طرح ان دونوں کے بارے میں پتا چل جائے۔ آج میں نے اسے آخری بار سمجھایا تھا لیکن اس نے میری ایک نہیں مانی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ چونکہ میں تمہیں اس کے معاملات کے بارے میں کچھ نہیں بتا رہا ہوں تو آج رات تمہیں رقم دینے کے بعد کل وہ خود ہی تم سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔"

"مجھ سے علیحدگی کی خواہش کے باوجود وہ مجھے روپیہ کیوں دینا چاہتی ہے؟"

"یہ سوال میں نے بھی اس سے کیا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ اس نے تمہارے ساتھ بہرحال کچھ اچھے دن گزارے ہیں اس لیے وہ تم سے یہ ہمدردی کرنا چاہتی ہے کہ تم اس روپے سے اپنے لیے رہنے کا کوئی ٹھکانا کر لو۔"

"وہ روپے میں اس کے منہ پر ماروں گا۔" تصور نے غصے سے بھڑکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تم ایسا ہرگز نہیں کرو گے۔ میں تم سے وعدہ لے چکا ہوں کہ فوری ردِعمل سے گریز ضروری ہے۔ کیا فائدہ کہ آس پاس رہنے والا کوئی ایک بھی فرد تمہارے گھر کا یہ تماشا دیکھ پائے۔"

"میں اب اسے اپنے گھر میں کیسے برداشت کر سکتا ہوں شرجیل!"

"کیا تم مجھ سے کیا ہوا وعدہ نہیں نبھاؤ گے؟"

تصور نے ہونٹ بھینچ لیے۔

شرجیل بولا "وعدے کے مطابق ضبط سے کام لو۔ کل یا پرسوں وہ خود ہی تم سے طلاق کا مطالبہ کرنے والی ہے ویسے بھی ازخود کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا سمجھنا ضرور چاہیے۔ آج رات تم بالکونی میں اس طرح ضرور کھڑے رہنا کہ تم کسی کو نظر نہ آسکو۔ اس طرح تمہیں خود بھی یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ آفتاب کے ساتھ اس کی کار میں آئے گی۔ بہت قیمتی کار ہے اس کے پاس۔"

"تزئین کو ہمیشہ قیمتی کاروں کا شوق رہا ہے۔" تصور کے لہجے سے اب زہر ابلنے لگا "آنکھوں والا تصور اس کا یہ شوق پورا نہیں کر سکا تھا تو ایک اندھا تصور کیا خاک کرے گا۔"

"بہرحال تم جو قدم بھی اٹھانا، سوچ سمجھ کر اٹھانا اور غصے میں تزئین کو برا بھلا کہہ کر آس پاس کے لوگوں کو تماشا نہ بنانا۔"

"فیصلہ تو میں ابھی کر چکا ہوں۔" تصور اب غصے سے ہانپ رہا تھا "جیسے ہی طلاق مانگے گی، میں اس کی خواہش پوری کر دوں گا۔ تم میرا ایک کام کر دو۔ کل مجھے طلاق کے کاغذات تیار کروا کے لا دو۔ میں دستخط کر کے وہ اسے دینے کے لیے تیار رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ کل میں آؤں گا تو کاغذات میرے پاس ہوں گے۔"

شرجیل تھوڑی دیر اور بیٹھا پھر جاتے جاتے تصور پر زور دے گیا کہ وہ ازخود تزئین سے کچھ نہ کہے بلکہ اس وقت کا انتظار کرے جب تزئین اس سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔

شرجیل کے جانے کے بعد بھی تصور شدید کرب میں جلتا رہا۔

اس رات وہ ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے ہی بالکونی میں جا کے بیٹھ گیا۔ اگر کھڑا رہتا تو اندھا ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ خود کو آڑ میں کس طرح رکھے۔ اس کمرے میں اس نے اندھیرا کر دیا تھا جس میں بالکونی تھی۔ اتنے دن میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے کمرے کی کون سی چیز کہاں ہوتی ہے۔ اس نے یہ اندازہ بھی کر لیا تھا کہ دیوار پر سوئچ بورڈ کہاں لگا ہوا تھا۔ وقت کا اندازہ اسے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی سے ہو جاتا تھا جو ہر گھنٹے

کے بعد مدھم سی آواز کا الارم بجاتی تھی۔
گیارہ بجے کے بعد باہر سناٹا ہو جاتا تھا۔ عمارت میں رہنے والے چہل قدمی کے لیے اتنی رات تک باہر نہیں رہتے تھے اور ٹریفک بھی برائے نام رہ جاتا تھا۔
جب بھی کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دیتی' تصور کے کان کھڑے ہو جاتے لیکن جب آواز گزر جاتی تو وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتا۔
تصور کے اندازے کے مطابق بارہ بجنے میں پانچ یا دس منٹ باقی رہ گئے تھے جب اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے بالکونی کے نیچے کسی کار کے رکنے کی آواز سنی۔ وہ واقعی کوئی بہت قیمتی کار معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس کے انجن کی آواز بہت کم تھی۔
"ارے!" تزئین کی آواز بہ مشکل ہی تصور سن سکا۔
"ہاں۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں دیکھا۔" یہ مردانہ آواز تھی۔
تصور کے ہونٹ بہت سختی سے بھنچ گئے۔ شرجیل اسے پہلے ہی بتا چکا تھا کہ تزئین روزانہ ہی آفتاب کے ساتھ آتی تھی۔
کار کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔
"اچھا آفتاب! خدا حافظ۔" یہ تزئین کی آواز تھی۔
"خدا حافظ تزئین!"
کار کا انجن اسٹارٹ ہی رہا تھا۔ اس کی آواز تیزی سے دور ہوتی چلی گئی۔
تصور کو سب کچھ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا لیکن اپنے کانوں سے ان دونوں کی آواز سن کر اس کا خون کھول اٹھا اور اس کو خیال آیا کہ اگر اس کے پاس ریوالور ہوتا تو آج وہ اس ریوالور کی ساری گولیاں اس عورت کے سینے میں اتار دیتا۔ جس نے اس سے اس وقت بے وفائی کی تھی جب اس کی زندگی ایک اعتبار سے ایک تاریک کھڈ کے کنارے کھڑی تھی۔
وہ بالکونی سے اٹھ کر کمرے میں پہنچا اور بستر پر لیٹ گیا۔ غصہ اب بھی اس کے رگ وپے میں بجلی کی طرح دوڑ رہا تھا لیکن اس کا دوست اس کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح بٹھا گیا تھا کہ وہ خود کو قابو میں رکھے گا۔
بیرونی دروازہ کھلنے کے بعد سینڈلوں کی آواز آئی پھر تصور کے کمرے کا دروازہ کھلا اور بجلی کا سوئچ آن کرنے کی آواز سنائی دی۔
"ارے! آج آپ اندھیرا کیے پڑے ہوئے ہیں!" تزئین نے کہا۔
تصور چت لیٹا خاموشی سے پلکیں جھپکاتا رہا۔
"آج آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا!" تزئین نے تیزی سے قریب آکر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔
تصور کا دل چاہا کہ اس کا ہاتھ جھٹک دے لیکن اس نے خود کو قابو میں رکھا اور اپنی آواز کے ارتعاش پر قابو پاتے ہوئے کہا۔
"نہیں' مجھے بخار نہیں ہے۔ بس کچھ مضمحل ہوں۔"

"ابھی میں آپ کو ایسی خبر سناؤں گی کہ آپ بالکل چاق وچوبند ہو جائیں گے۔ مجھے ہوٹل سے ایڈوانس مل گیا ہے۔ یہ لیجیے۔"
تصور نے اپنے ہاتھ پر نوٹوں کی گڈیاں محسوس کیں۔ وزن زیادہ نہیں تھا لیکن تصور کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ گڈیاں منوں وزنی ہوں۔ اس نے سوچا' شاید گناہ کا بوجھ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔
"یہ سائڈ کی دراز میں رکھ دو۔" وہ دھیمے سے لہجے میں بولا۔
"ارے! آپ کو بالکل خوشی نہیں ہوئی؟"
"میں نے کہا نا کہ طبیعت کچھ مضمحل ہے۔ اگر تمہارا انتظار نہ ہوتا تو شاید سو جاتا۔"
"یہ میں رکھے دیتی ہوں۔" تصور کی ہتھیلیوں سے گڈیوں کا منوں بوجھ کم ہو گیا "اب میں آگئی ہوں تو آپ سونے کی کوشش کیجیے۔ سونے سے ہی مضمحل طبیعت ٹھیک ہوتی ہے۔"
تصور نے کچھ کہے بغیر آنکھیں بند کرلیں مگر اسے اندازہ تھا کہ آج شاید وہ رات بھر نہ سو سکے۔
وہ واقعی رات بھر نہ سو سکا اور مسلسل سوچتا رہا کہ یہ سب کیا ہو گیا! مسلسل دو تین گھنٹے سوچنے سے اس کا غصہ بتدریج کم ہوتا چلا گیا اور پھر اس نے ٹھنڈے دل سے سوچنا شروع کیا تو خیال آیا کہ تزئین نے صرف یہ گناہ کیا ہے کہ اس سے طلاق لیے بغیر کسی اور کی ہو گئی۔ اگر وہ طلاق لینے کے بعد ایسا کرتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ مشکلات سے فرار انسانی فطرت کا خاصہ ہے اور تزئین نے چونکہ نہایت نازونعم میں پرورش پائی تھی لہٰذا مشکل حالات سے دوچار ہونے کے بعد اس کی بے وفائی کو انسانی فطرت کے مطابق ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر اس کا وہ اقدام اس کی ایک غلطی قرار دیا جاتا تو بھی یہ کلیہ ذہن میں آجاتا کہ غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے لیکن تزئین صرف بے وفائی کی نہیں بلکہ گناہ کی مرتکب ہوئی تھی۔
اس خیال سے تصور کا دل بھر آیا کہ اگر وہ اندھا نہ ہو جاتا تو شاید اس قسم کی صورتِ حال پیدا نہ ہوتی لیکن اندھا بھی تو وہ تزئین کی محبت میں ہی ہوا تھا۔ صرف اس کی تصویر کو آگ سے بچانے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں گنوا دی تھیں۔ تزئین کو کم ازکم ... اس کی اس قربانی کے بارے میں تو سوچنا چاہیے تھا! یا ممکن ہے اس نے سوچا ہو لیکن جب انسان کو اپنے بہتر مستقبل کی راہیں دکھائی دیتی ہیں تو وہ اپنے لیے دی جانے والی دوسروں کی قربانیاں بھی بھول جاتا ہے۔
دوسری صبح تزئین کے ساتھ ناشتا کرتے ہوئے اس نے کہا۔
"بس اسٹاپ یہاں سے پانچ ہی منٹ کے فاصلے پر ہے نا؟"
"اس سے بھی کم وقت لگتا ہے مگر اس وقت آپ کو یہ خیال کیوں آگیا؟"
"رات کو یہاں بڑا سناٹا رہتا ہے۔ تمہیں گھر کی طرف پیدل آتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟"
"نہیں تو۔" تزئین نے جواب دیا لیکن ذرا سا رک کر اور

اس کے اس توقف ہی کی وجہ سے تصور نے بہت کچھ سوچ ڈالا۔

دن معمول کے مطابق گزرتا رہا اور تصور کے دل کی دھڑکنیں تیز رہیں۔ ہر پل اسے یہ انتظار رہا کہ تزئین اس سے کب طلاق کا مطالبہ کرتی ہے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ تزئین ڈھائی بجے اپنی ڈیوٹی پر پہنچنے کے لیے گھر سے چلی گئی۔

تصور سوچنے لگا کہ کہیں شرجیل کو کسی قسم کی غلط فہمی تو نہیں ہوئی ہے؟ لیکن جب اتنی زیادہ تفصیلات بتائی جائیں تو پھر غلط فہمی کا امکان تو نہیں رہ جاتا!

شام کو شرجیل کے آنے تک تصور اسی خیال سے الجھتا رہا۔ شرجیل کے آتے ہی وہ اس سے کہہ بیٹھا "آج تو تزئین نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ نہیں کیا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے۔ میں تمہیں ابھی سب کچھ بتاتا ہوں لیکن پہلے تم دستخط کر کے یہ کاغذات اپنے پاس رکھ لو۔"

"طلاق کے کاغذات؟"

"ہاں۔"

شرجیل نے قلم کھول کر اس کے ہاتھ میں دیا' کاغذات اس کے سامنے رکھے اور پھر اس کا قلم ایک جگہ رکھوا کر بولا "یہاں دستخط کردو۔"

پھر جب کاغذات کا لفافہ تصور نے اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا تو شرجیل بولا "آج تزئین پر قیامت گزر گئی ہوگی۔"

"کیوں!" تصور نے چونک کر پوچھا۔

"کل رات میں نے تمہیں ایک بات نہیں بتائی تھی۔ جب سے مجھے تزئین اور آفتاب کے تعلقات کا علم ہوا تھا' میں چھپ کر ان کی گفتگو سننے کی کوششیں کرتا رہا۔ کبھی مجھے کامیابی ہوتی تھی' کبھی نہیں! تزئین ہمیشہ آفتاب سے اس کے کیبن میں ہی جاکر باتیں کرتی رہی ہے۔ آج میں ان کی باتیں سننے میں کامیاب رہا۔ تزئین کی خواہش ہے کہ تم سے طلاق ہوتے ہی آفتاب اس سے شادی کرلے۔ تزئین نے اسے بتایا کہ آج اس نے اپنے شوہر سے طلاق کی بات نہیں کی کیونکہ آفتاب نے گزشتہ رات بھی اسے حتمی طور پر نہیں بتایا کہ وہ اس سے کب شادی کرے گا۔ تزئین کی ان باتوں کے جواب میں آفتاب نے جو کچھ کہا' وہ سن کر تزئین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہوگی۔ آفتاب نے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایک مطلقہ عورت سے شادی کیوں کرے جب کہ ایک کروڑ پتی باپ کا بیٹا ہونے کے ناتے ہزاروں کنواری خوب صورت لڑکیاں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس نے تزئین کے ساتھ چند ہی مرتبہ کچھ خوش گوار وقت گزارا ہے اور گزشتہ رات اس نے اس کا معاوضہ بھی ادا کردیا ہے۔ یہ جواب سن کر تزئین سکتے میں آگئی پھر رونے اور گڑگڑانے لگی لیکن آفتاب نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو لڑکیاں اسے اچھی لگتی ہیں' وہ ان کے ساتھ کچھ خوشگوار وقت گزارنے کا عادی ہے لیکن اس کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ ایسی کسی لڑکی کو اپنی بیوی بنالے۔ اب میں تمہیں مزید تفصیل کیا بتاؤں۔ بس اتنا اور بتائے دیتا ہوں کہ تزئین جب اس کے کمرے سے نکلی تھی تو اس کا منہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ باتھ روم میں جاکر اس نے اپنی حالت درست کی اور پھر ریسپشن کاؤنٹر پر گئی۔"

"خوب!" تصور تلخی سے مسکرایا "بہت جلد ہی اسے مجھ سے بے وفائی کی سزا مل گئی۔"

"غلطی بہرحال انسان ہی سے ہوتی ہے یار! اب تو ظاہر ہے کہ وہ تمہاری ہی ہو کر رہے گی۔ اب یہ بھی ممکن ہوگیا ہے کہ تم اسے طلاق نہ دو۔"

"اب اس کا کوئی سوال نہیں کہ وہ میری بیوی بن کر رہے۔" تصور کا لہجہ بے حد سخت تھا "جو لڑکی ایک مرتبہ بہک سکتی ہے' وہ دس مرتبہ بھی بہک سکتی ہے۔ آج آفتاب اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن کل کوئی اور ماہتاب مل سکتا ہے۔"

"بات تو یہ بھی غلط نہیں ہے۔" شرجیل نے ٹھنڈی سانس لی۔

"لہٰذا اب وہ مجھ سے طلاق مانگے یا نہ مانگے' میں اسے طلاق دے دوں گا۔ میں اب اس اذیت میں مبتلا نہیں رہنا چاہتا کہ جب بھی وہ گھر سے جائے' مجھے اندیشوں کے ناگ ڈستے رہیں کہ نہ جانے کب وہ پھر کسی کی بانہوں میں چلی جائے!"

"میرا دل درد سے رو رہا ہے تصور!" شرجیل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "اب تم کتنے تنہا رہ جاؤ گے اور خود کو کتنا لاچار محسوس کرو گے۔"

"تنہائی اور لاچاری میرے لیے تزئین کے قرب سے زیادہ کربناک نہیں ہوگی۔ خیر' چھوڑو۔ کل سے میں ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ تم نے جب بھی مجھے مالی تعاون کی پیشکش کی ہے' میں نے اسے قبول نہیں کیا ہے لیکن آج۔" تصور کی آواز بھرا گئی "میں مجبور ہوگیا ہوں کہ تمہارے سامنے دستِ سوال دراز کروں۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو میرے یار! میں تمہارے لیے ہر طرح سے حاضر ہوں۔"

"تزئین کل جو روپے لائی تھی' وہ میں آج اسے طلاق نامے کے ساتھ واپس کردوں گا لیکن مجھے سر چھپانے کے لیے جو جگہ درکار ہے' اس کا بندوبست تمہیں اپنی جیب سے کرنا ہوگا۔"

"میں ہر طرح سے حاضر ہوں میری جان!"

"پہلے تو میں نے کہا تھا ناکہ ہمیں ایک چھوٹا موٹا فلیٹ دلا دینا لیکن اب میرے لیے کوئی چھوٹی موٹی سی کوٹھری بھی کافی ہوگی۔"

"کیا ضرورت ہے کوٹھری میں رہنے کی! میں فلیٹ ہی....."

"نہیں۔" تصور نے اس کی بات کاٹ دی "ایک تو یہ کہ زیادہ بڑی جگہ پر مجھے اندھا ہونے کے باوجود زیادہ تنہائی محسوس ہوگی اور دوسرے یہ کہ میں تمہارا زیادہ مقروض بھی نہیں ہونا چاہتا۔"

"مقروض؟ کیا مطلب؟"

"تم میرے سر چھپانے کی جگہ کے لیے جو کچھ خرچ کرو گے' وہ مجھ پر قرض ہوگا جو میں تمہیں دھیرے دھیرے لوٹا دوں گا۔ ٹائپنگ کا کام تو میں کر ہی رہا ہوں نا!"

شرجیل نے بہت چاہا کہ وہ اس سلسلے میں جو رقم خرچ کرے گا' اسے قرض نہ سمجھا جائے لیکن تصور نے اس کی بات نہیں مانی اور شرجیل کچھ سوچ کر چپ ہوگیا۔

شرجیل کے جانے کے بعد رات تک کا وقت تصور نے بڑی مشکل سے کاٹا۔ وہ بے چین تھا کہ جلد از جلد اس کی زندگی کا وہ فیصلہ کن وقت آجائے جب وہ تزئین کو طلاق دے دے اور اس کے سر سے ایک بوجھ اتر جائے۔ گزشتہ رات بھی اس نے بڑی مشکل سے کاٹی تھی۔ تمام تر سوچ بچار کے باوجود اسے یہ احساس رہا تھا کہ اس کے برابر میں لیٹی ہوئی تزئین اس کی بیوی نہیں "گندگی کا ایک ڈھیر تھی' اور اب تصور ایک پل کے لیے بھی گندگی کے اس ڈھیر کے پاس لیٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس رات بھی وہ ساڑھے گیارہ بجے سے ذرا پہلے بالکونی میں جا بیٹھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آج رات تزئین کس طرح گھر آتی ہے۔ اس کی توقع کے مطابق اس رات آفتاب اسے چھوڑنے نہیں آیا' یا اس نے خود ہی آفتاب سے قطعی علیحدگی کا فیصلہ کرلیا ہوگا۔ تصور کو کار کے انجن کی آواز کے بجائے سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی تھی اور وہ آہٹ اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔

تصور بالکونی سے کمرے میں آیا اور واکنگ اسٹک کے سہارے بیرونی دروازے تک پہنچ گیا۔ تزئین کے لائے ہوئے نوٹوں کی گڈیاں اور طلاق نامہ ایک بڑے لفافے میں اس کے پاس تھا۔ اس نے ٹٹول کر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور وہ سوئچ آن کردیا جس سے اس کمرے میں روشنی ہوتی تھی۔

○☆○

تصور اتنی تفصیل سے سب کچھ بتا رہا تھا کہ کوٹھری میں اندھیرا پھیلنے لگا۔ عارفہ ایک طرف لگا ہوا سوئچ پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ اس نے وہ سوئچ دبایا تو ساٹھ وولٹ کے ایک بلب کی روشنی اس کوٹھری میں پھیل گئی۔

سوئچ کی آواز سے تصور چونکا "کیا آپ نے لائٹ جلائی ہے؟ کیا اندھیرا ہوگیا ہے؟"

"جی ہاں۔" عارفہ نے کہا۔

"شاید میں جذباتی ہوگیا تھا۔" تصور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اسی جذباتیت میں اتنی تفصیل سے سب کچھ بیان کرتا رہا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔"

"میں کوئی سوال کیے بغیر بالکل خاموشی سے آپ کی باتیں سنتی رہی ہوں اور اب بھی کوئی سوال کرنے سے پہلے یہ جاننا چاہتی ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"بس پھر وہی ہوا جس کا اندازہ آپ نے لگا ہی لیا ہوگا۔" تصور نے ایک گہری سانس لے کر کہا "تزئین مجھے دروازے ہی پر کھڑا دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ اس کی حیرت کا اندازہ مجھے اس کے ایک جملے سے ہوا۔ میں بہت کچھ تفصیل سے بیان کرچکا ہوں۔ اب مختصر طور پر سن لیجیے کہ میں نے دروازے پر کھڑے کھڑے اسے رقم بھی لوٹا دی اور طلاق نامہ بھی اس کے حوالے کردیا۔ میں تو شرجیل سے کیے گئے اپنے وعدے کے مطابق خاموشی سے کھیل ختم کردینا چاہتا تھا لیکن تزئین نے بات بڑھا دی۔ اسے ایسا کرنا بھی چاہیے تھا۔ اسے وہ پتے ہوا دے گئے تھے جن پر اس نے تکیہ کیا تھا۔ اس کے بات بڑھانے پر مجھے بھی غصہ آگیا اور میں نے اس سے بہت سخت باتیں کہہ ڈالیں۔ بہرحال پھر میں نے اسے اپارٹمنٹ میں گھسنے نہیں دیا اور وہ چلی گئی۔"

"اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا تو چاہا ہوگا!"

"یقین کیجیے کہ وہ سب کچھ میں تفصیل سے بیان ہی نہیں کرسکتا۔ مجھے اچانک بہت شدید غصہ آگیا تھا اس لیے مجھے یاد نہیں کہ میں نے کیا کیا کہا تھا اور وہ کیا بولی تھی۔"

"اچھا خیر! اس کے بعد؟"

"اس کے بعد کی کہانی کچھ زیادہ طویل نہیں ہے۔ شرجیل برابر میرے پاس آتا رہا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ تزئین اس روز ہوٹل نہیں گئی تھی۔ وہ بعد میں بھی نہیں گئی لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں گئی اور اب کہاں ہے۔ شرجیل نے مجھے یہ جگہ دلا دی جہاں آپ اس وقت بیٹھی ہیں...... شرجیل ہی کے ذریعے مجھے ٹائپنگ کا کام بھی ملتا رہا۔ لیکن پھر میری زندگی میں میرے امتحان کا ایک اور وقت جلد ہی آگیا۔ شرجیل کو اسلام آباد کے کسی بڑے ہوٹل میں منیجری کی جگہ مل رہی تھی۔ تنخواہ بھی ڈیوڑھی سے کچھ زیادہ تھی۔ اس نے مجھے بتایا تو میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ فوراً اسلام آباد چلا جائے۔ اسے ایک اچھا رسپانس مل رہا تھا جسے گنوانا بے وقوفی ہوتی لیکن وہ میرے لیے فکرمند تھا۔ اس کے جانے کے بعد مجھے ٹائپنگ کا کام کون لا کے دیتا لیکن خود پریشان ہوجانے کے باوجود میں نے اس کی ڈھارس بندھائی کہ وہ میری فکر کرنے کے بجائے اپنے مستقبل پر نظر رکھے۔ میں کسی نہ کسی طرح گزارا کر ہی لوں گا پھر اچانک ہی مجھے ڈاک خانے پر بیٹھ کر کام کرنے کا خیال آیا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اب میں یہ پیشہ اختیار کرلوں گا۔ وہ بہت افسردہ ہوگیا۔ اس نے جانے سے پہلے مجھے ایک مناسب سی رقم بھی دینا چاہی جو میں نے اپنی عادت کے مطابق قبول نہیں کی۔ مختصر یہ کہ اس کے جانے کے بعد سے میں نے ڈاک خانے کی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر کام کرنا شروع کردیا۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے فاقے نہیں کرنا پڑتے۔"

عارفہ چپ رہی۔ اسے خیال آرہا تھا کہ وہ تصور سے کوئی خاص سوال کرنا چاہتی تھی لیکن تصور کے بولنے کے دوران میں

اسے نہ ٹوکنے کے خیال سے وہ سوال اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب آپ مزید تو کچھ نہیں جاننا چاہیں گی۔"

"جی ہاں۔" عارفہ نے ایک لمبی سانس لے کر کہا "اب شاید کوئی بات وضاحت طلب نہیں رہ گئی۔ ہاں اس پر مجھے بہت حیرت ہے کہ آپ نابینا ہونے کے باوجود ٹائپ کر لیتے ہیں۔"

"سب مشق کی بات ہے۔"

"لیکن ڈاک خانے کا فارم ٹائپ کرنا آخر کیسے ممکن ہے؟ ان پر تو لکیریں ہوتی ہیں۔ انہی لکیروں پر ٹائپ کرنا ہوتا ہے۔"

"آدمی اگر دماغ کو صحیح طرح کام میں لائے تو ہر مشکل کا کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیتا ہے۔ مجھے بھی اس مشکل پر قابو پانے کی ایک تدبیر سوجھ گئی۔ ڈاک خانے کے قریب ہی میرے ایک مہربان کی دکان ہے۔ انہوں نے ڈاک خانے پر بیٹھنے کے سلسلے میں میری کافی مدد کی تھی۔ انہی سے میں نے ڈاک خانے کے فارموں کی لکیروں پر ایسی کھردری لکیریں کھنچوالی تھیں کہ انہیں انگلیوں سے ٹٹول کر محسوس کر سکوں۔ چند دن مجھے اس کی بھی مشق کرنا پڑی تھی۔ اس کے بعد مجھے اندازہ ہو گیا کہ کون سی لکیر کہاں ہے اور ٹائپنگ کے لیے سیٹ کرنے کے لیے رولر کو کس حد تک گھمانا پڑتا ہے۔ آپ نے سنا تو ہوگا کہ جو لوگ اندھے ہو جاتے ہیں' انہیں قدرتی طور پر کچھ غیر معمولی صلاحیتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔"

عارفہ کو اب خاصی دیر ہو چکی تھی۔ اسے وہ سوال بھی یاد نہیں آرہا تھا جو وہ تصور سے کرنا چاہتی تھی اس لیے اس نے تصور سے جانے کی اجازت چاہی۔ اس وقت تصور نے ایک بار پھر کہا۔

"جب بھی آپ اپنی دوست سے ملیں' اسے میری طرف سے کہہ دیجئے گا کہ جو ہو گیا' سو ہو گیا لیکن اب میں اس کے لیے دعا گو ہی رہتا ہوں کہ وہ سدا خوش رہے۔"

"میں آپ کا پیغام اسے ضرور پہنچا دوں گی لیکن اس ملاقات کے بعد میں شاید آپ سے ملنے ایک بار پھر آؤں۔"

تصور نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کاش میں چشمِ ما روشن' دلِ ماشاد کہہ سکتا۔"

عارفہ جب وہاں سے روانہ ہوئی تو اس کا ذہن بہت بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس کی عقل یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی کہ تزئین جیسی باکردار لڑکی اس طرح بہک سکتی ہے۔

گھر پہنچتے ہی اس نے پھر لاہور فون کیا۔ اس مرتبہ تزئین سے اس کی بات ہو گئی۔ تزئین کا لہجہ بہت بجھا بجھا سا تھا۔ عارفہ نے تصور سے اپنی ملاقات کا ذکر کیے بغیر اس سے پوچھا "تصور سے شادی کے بعد تو تمہیں کراچی ہی میں ہونا چاہیے تھا' لاہور میں کیسے ہو؟"

"میری بپتا ایسی نہیں ہے عارفہ کہ میں تمہیں فون پر سنا سکوں۔" تزئین کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی "جب تم لاہور آؤ گی تو تمہیں سب کچھ بتاؤں گی۔ کاش تم جلد از جلد آسکو۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"کیا پریشانی ہے؟"

"میں نے کہا نا کہ فون پر اتنی تفصیلی گفتگو نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا تو پھر صرف تم سے ملنے ہی کی خاطر میں کل صبح ہی کی کسی فلائٹ سے لاہور پہنچ رہی ہوں۔ تم گھر پر ہی رہنا۔"

"روانگی سے قبل مجھے فون پر بتا دینا کہ تم کس فلائٹ سے آرہی ہو۔ میں تمہیں لینے ائرپورٹ آجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے' میں تمہیں فون پر بتا دوں گی۔"

○☆○

عارفہ سے فون پر بات کر کے تزئین نے جب ریسیور رکھا' وہ بے حد تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ چہرہ افسردگی اور پریشانی کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آنکھوں کی سرخی بتا رہی تھی کہ اسے گزشتہ رات نیند ہی نہیں آئی تھی یا وہ بہت زیادہ روتی رہی تھی۔

فون بند کرنے کے بعد وہ سیدھی اپنی والدہ کے کمرے میں گئی جو خاصی علیل تھیں۔ اس وقت وہ سو رہی تھیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس وہاں موجود تھی۔ اسے پوری طرح چاق وچوبند پا کر وہ اپنی والدہ کی طرف سے مطمئن ہو گئی۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے اس ساری سے نجات حاصل کی جو وہ صبح ہی سے پہنے ہوئے تھی۔ شب خوابی کا لباس پہن کر وہ بستر پر لیٹی لیکن سونے کے لیے آنکھیں بند نہیں کیں اور چھت کو تکتی رہی۔ عارفہ کے ٹیلی فون اور پھر کل صبح ہی اس کے لاہور آنے کے وعدے سے اسے کچھ سکون تو ملا تھا کیونکہ موجودہ حالات میں وہ ایک چارہ گر کی ضرورت محسوس کر رہی تھی لیکن یہ سکون ملنے کے باوجود اس کے دماغ میں اَن گنت خیالات کی گردش جاری تھی اور وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ اگر اس نے تصور سے شادی نہ کی ہوتی تو آج اسے اس بے بسی کی صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

لیکن مقدرات اٹل ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو اس نے تصور سے شادی کرنے کے لیے اپنے والد کی ناراضی مول لی تھی اور سارے خاندان سے ناتا توڑ لیا تھا۔ اس کی والدہ تو اس کے اور تصور کے معاملے میں سخت رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتی تھیں لیکن اس کے والد نے شدید غصے کے عالم میں اس سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اب وہ کبھی تصور سے ملی بھی تو وہ اسے عاق کر دیں گے۔

"تصور مجھے آپ کی دولت سے زیادہ پیارا ہے۔" تزئین نے والد کے غصے کی پروا کیے بغیر صاف صاف کہہ دیا تھا "اگر آپ مجھے دلہن بنا کر اپنے گھر سے رخصت نہیں کرنا چاہتے تو میں ایسے ہی یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے کہ میں تصور سے ہی شادی کروں گی۔"

اور پھر اس نے اپنے اٹل فیصلے پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ اس نے تصور سے شادی کرلی تھی۔ اس کے ساتھ کراچی میں جا بسی تھی۔ تصور کو پاکر اسے جیسے دنیا کی ساری خوشیاں، ساری دولت مل گئی تھی لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا کہ ماں باپ کی محبت کو اپنے دل سے نکال کر پھینک دیتی۔ کبھی کبھی اس کے دل میں یہ کسک شدید بھی ہوجاتی لیکن تصور پر اس نے اپنی اس کیفیت کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ بس وہ سوچتی رہتی تھی کہ کسی طرح والدین سے قطع تعلق کی کیفیت ختم ہوجائے۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی راستہ سوچ پاتی، تقدیر نے اس کے ساتھ ایک خوف ناک کھیل کھیلا۔ گھر میں لگ جانے والی حادثاتی آگ کے باعث جب تصور کی بینائی ختم ہوگئی تو زندگی کی گاڑی آگے دھکیلنے کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ نہیں رہا تھا کہ وہ ملازمت کرلے۔ وہ بے حد انا پرست اور خوددار تھی لہٰذا ان حالات کے باعث اس نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا کہ وہ اپنے والد کو منانے کی کوشش کرے۔

شرجیل کے ہوٹل میں ملازمت کرنے کے بعد تو اس نے صرف یہ سوچنا شروع کردیا تھا کہ ایسا کون سا راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ اس کی اور تصور کی زندگی بے بسی کے حصار سے نکل سکے اور اسے ایک ریسپشنسٹ کی حیثیت سے کام نہ کرنا پڑے۔

لیکن اس سوچ بچار کے باوجود وہ اپنی ہوٹل کی ذمے داریوں کی طرف سے بالکل غافل نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے ساتھ کام کرنے والوں کے مزاج سمجھنے کی بھی کوشش کی۔ شرجیل کے جو تین اسسٹنٹ تھے، ان کا مزاج سمجھنا تو اس نے بہت ضروری سمجھا۔

جس اسسٹنٹ کا نام آفتاب تھا، اس کے بارے میں وہ یہ بھی جان گئی کہ وہ ایک کروڑپتی کا بیٹا تھا اور محض ہوٹل مینجمنٹ کا تجربہ حاصل کرنے کے لیے اسسٹنٹ منیجر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ اس کی عمر تزئین کی عمر سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ وہ خاصی پُرکشش شخصیت کا مالک تھا اور ہمہ وقت اس کے ہونٹوں پر بچی ہوئی مسکراہٹ اس بات کی غماز تھی کہ وہ ایک کروڑپتی کا بیٹا ہونے کے باعث مغرور بالکل نہیں تھا۔

ملازمت کرتے ہوئے ہفتہ بھر گزرا تھا کہ ایک روز جب وہ ڈیوٹی پر پہنچی تو ہوٹل میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کا سامنا آفتاب سے ہوا اور وہ مسکرا کر بولا "آج تو آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔"

وہ جواب میں کچھ کہے بغیر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ گئی لیکن اسے یہ خیال ضرور آیا کہ یہ کہیں اس سے بے تکلف ہونے کی آفتاب کی پہلی کوشش تو نہیں ہے؟

پھر دو دن بعد اسی قسم کا واقعہ پھر پیش آیا۔ وہ کوئی بات پوچھنے کے لیے شرجیل کے کمرے کی طرف جارہی تھی کہ آفتاب سے آمنا سامنا ہوگیا اور وہ چھوٹتے ہی بولا "آپ باوقار اور دلکش تو ہمیشہ ہی لگتی ہیں، لیکن پرسوں آپ نے جو ساری باندھ رکھی تھی، وہ آپ پر کچھ زیادہ ہی سج رہی تھی۔"

تزئین کو اس وقت یقین ہوگیا کہ اس کو دو روز قبل آفتاب کی بات سے جو شبہ ہوا تھا، وہ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے لہٰذا اس نے "گربہ کشتن، روزِ اول" کے مصداق بڑی سنجیدگی سے کہا "سر! یہ صرف مغربی عورتوں کا شیوہ ہے کہ کسی مرد سے اپنی تعریف سن کر وہ مسکراتی بھی ہیں اور تعریف کا شکریہ بھی ادا کرتی ہیں لیکن میں ایک ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود... ایک مشرقی لڑکی ہوں جو مغربی عورتوں کا وتیرہ اختیار نہیں کرسکتی۔ آپ میرے باس ہیں لہٰذا میں نہایت معذرت کے ساتھ عرض کروں گی کہ آپ مجھ سے ہوٹل کے امور کے سوا کسی موضوع پر بات نہ کیا کیجیے۔"

آفتاب کی وہ مسکراہٹ کافور ہوگئی جو ہمیشہ اس کے ہونٹوں پر رہا کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر شاید کچھ اور بھی تبدیلی آئی ہو لیکن تزئین وہ سب کچھ دیکھے بغیر تیزی سے شرجیل کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ فوری طور پر تو اسے خیال آیا تھا کہ وہ شرجیل سے آفتاب کی شکایت کردے لیکن پھر اس نے سوچا کہ فی الحال بات بڑھانا مناسب نہیں۔ وہ خود ہی آفتاب کو اتنا سخت جواب دے چکی تھی کہ اب وہ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کرے گا اور اگر اس نے ڈھٹائی... کا ثبوت دیا تو پھر وہ شرجیل سے اس کی شکایت کر ہی ڈالے گی۔

رات کو گھر واپس لوٹتے ہوئے وہ سوچتی رہی کہ کیا ملازمت کے لیے گھر سے باہر نکلنے والی لڑکیوں کو اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟

گھر پہنچ کر اس نے تصور کو بھی اس واقعے سے آگاہ نہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چند ہی روز قبل تصور اس سے کہہ چکا تھا کہ وہ اسے اپنے ہوٹل کے واقعات کے بارے میں کچھ نہ بتایا کرے۔ بقول اس کے ان باتوں سے اس کا یہ احساس کرب بڑھ جاتا تھا کہ اس کی بیوی ایک ہوٹل میں ملازمت کررہی تھی۔

اگلے روز تزئین ڈیوٹی پر گئی تو آفتاب سے دو مرتبہ آمنا سامنا ہوا لیکن وہ نظریں چرا کر نکل گیا۔

'شکر ہے۔' تزئین نے دل میں کہا۔

لیکن اسی رات کو بارہ بجے کے قریب آفتاب نے ایک ایسی حرکت کی کہ اسے اپنے سارے وجود سے چنگاریاں اٹھتی محسوس ہوئیں۔ اس وقت کاؤنٹر پر کام کرنے والے اس کے دوسرے ساتھی کسی نہ کسی کسٹمر سے کوئی بات کررہے تھے۔ تزئین ایک رجسٹر میں کچھ اندراج کررہی تھی کہ اس نے محسوس کیا جیسے کوئی اس کے سامنے آیا ہو۔ اس نے یہ سوچتے ہوئے سر اٹھایا کہ کوئی کسٹمر ہوگا لیکن وہ آفتاب تھا۔ اس نے جلدی سے ایک لفافہ تزئین کے سامنے رکھا اور دھیمی آواز میں بولا "میں خود کو بڑا

بدقسمت سمجھوں گا اگر آپ نے یہ خط پڑھے بغیر پھاڑ ڈالا۔" پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا۔

شدید غصے کے باوجود تزئین نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ کسی نے آفتاب کی یہ حرکت دیکھ نہ لی ہو۔

استقبالیہ کاؤنٹر پر اس کے ساتھ کام کرنے والی ایک لڑکی نے آفتاب کی حرکت دیکھ لی تھی۔ تزئین سے نظریں چار ہوتے ہی وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ تزئین کا اشتعال بڑھ گیا۔ اس نے آفتاب کا دیا ہوا لفافہ اپنی مٹھی میں جکڑا اور اسی لڑکی سے بولی "میں شرجیل صاحب کے کمرے میں جا رہی ہوں۔ ابھی آتی ہوں۔"

تزئین کے تیور دیکھ کر اس لڑکی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

تزئین آندھی طوفان کی طرح شرجیل کے کمرے میں داخل ہوئی تھی اور شرجیل کوئی کام کرتے کرتے چونک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا "خیریت!" اس کے منہ سے نکلا۔

"آپ کے اسسٹنٹ مسٹر آفتاب نے اب مجھ سے پرچے بازی بھی شروع کر دی ہے۔" تزئین نے تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے کہا اور لفافہ شرجیل کے سامنے ڈال دیا۔

"اچھا!" لفافہ اٹھاتے ہوئے شرجیل کے لہجے میں حیرت تھی "میں نے تو اسے ہمیشہ ایک بہت ہی شریف لڑکا سمجھا ہے۔ کبھی بھی اس کی کوئی غلط حرکت میرے علم میں نہیں آئی۔"

"آپ خود دیکھ لیجیے!"

شرجیل نے لفافے میں سے پرچہ نکالا۔ فوری طور پر تو اس کی پیشانی پر ایک شکن نمودار ہو گئی لیکن غائب بھی فوراً ہی ہو گئی اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری جو پرچہ پڑھتے پڑھتے گہری ہوتی چلی گئی پھر اس نے ہنس کر تزئین کی طرف دیکھا اور بولا "تمہیں اس پرچے کی کیا بات بری لگی ہے؟"

"میں یہ پسند ہی نہیں کر سکتی کہ کسی کے گھٹیا پرچے پڑھوں۔"

"بہتر ہو گا کہ اسے میرے سامنے ہی پڑھ لو۔" شرجیل نے پرچہ تزئین کی طرف بڑھا دیا۔

تزئین وہ پرچہ پڑھنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس نے شرجیل سے کچھ کہنا چاہا مگر اتفاقاً اس کی نظر پرچے کی پہلی سطر پر پڑ گئی جس نے اسے چونکا دیا تھا "پیاری بہن" کے الفاظ اسے چونکا ہی سکتے تھے پھر اس نے بڑی تیزی سے سارا پرچہ پڑھ ڈالا۔

"پیاری بہن! مجھے اس بات سے بہت صدمہ پہنچا ہے کہ میں نے تمہاری تعریف کی تو تم نے اس سے کچھ اور ہی سمجھ لیا! میں نہیں چاہتا کہ تمہارے دل میں میرے لیے ایک غلط رائے بیٹھ جائے اس لیے یہ پرچہ لکھ رہا ہوں۔ زبانی کچھ کہنے کی کوشش کروں گا تو شاید تم سنو گی بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میری ایک بہن تھی۔ مجھ سے ایک سال چھوٹی! اب وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔ جب بھی وہ کوئی اچھا لباس پہنتی تھی اور مجھے اچھی لگتی تھی تو میں اس کی تعریف ضرور کیا کرتا تھا۔ غیر ارادی طور پر کچھ ایسی ہی بات میں تم سے بھی کر بیٹھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہاری آنکھیں ہو بہو میری بہن کی آنکھوں جیسی ہیں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے اپنی بہن ضرور یاد آتی ہے۔ میں زیادہ کچھ نہیں لکھنا چاہتا۔ بس اتنی خواہش ہے میری کہ اپنے دل سے وہ خیال نکال دو جو تم نے میرے بارے میں قائم کر لیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم سے میرا آمنا سامنا ہو۔ ایسا ہو گا تو مجھے اپنی مرحوم بہن ضرور یاد آئے گی اور میں بے اختیار تم سے کچھ کہہ بیٹھوں گا۔ اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر یہ پرچہ پڑھنے کے بعد بھی میرے بارے میں تمہاری رائے نہ بدلی اور تم نے میرے ان الفاظ کو فریب کاری سمجھ لیا تو کل سے میں اس ہوٹل میں نہیں آؤں گا۔ آخر میں... تمہارے لیے بہت سی دعائیں۔"

آخر میں آفتاب کا نام لکھا ہوا تھا۔ تزئین کے ہاتھ کانپ گئے۔ اسے پسینہ آگیا تھا۔ وہ شرجیل سے اجازت لیے بغیر ایک کرسی پر ڈھیری ہو گئی۔ وہ شرجیل سے آنکھ بھی نہیں ملا پا رہی تھی۔

شرجیل بولا "کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آفتاب کل سے نہیں آئے گا؟"

"نن... نہیں۔" تزئین نے اپنے خشک .... ہونٹوں پر زبان پھیری "وہ آتے رہیں گے۔"

"گڈ!" شرجیل نے کہا "تمہاری شکایت نے تو مجھے بہت بری طرح چکرا دیا تھا۔ خیر! کیا اب میں انٹر کام پر آفتاب سے بات کر کے اسے بلاؤں؟"

"نہیں۔" تزئین جلدی سے کھڑی ہو گئی "میں خود ہی...... ل کر ان سے معافی مانگ لوں گی۔"

تزئین تیزی سے چلتی ہوئی شرجیل کے کمرے سے نکل آئی اور فوراً آفتاب کے کیبن کا رخ کیا۔

آفتاب اس وقت اپنے کیبن ہی میں تھا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی اور وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ تزئین کو دیکھتے ہی وہ اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے وہ تزئین کا باس نہیں بلکہ تزئین اس کی باس تھی۔

تزئین جب چند قدم اٹھا کر اس کی میز کے قریب پہنچی تو اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ آفتاب سے نظریں ملا سکتی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔"

"شکر ہے خدا کا!" آفتاب کا چہرہ کھل اٹھا۔

"آپ کی جوان بہن کے انتقال کا بھی مجھے بہت افسوس ہے۔ انہیں کیا ہو گیا تھا؟"

"کینسر۔" آفتاب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اس کا علم بھی اس کی شادی کے بعد ہوا تھا۔"

"خدا آپ کو انہیں بھولنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

"ہم دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے اتنی محبت کرتے تھے

کہ میں شاید اسے کبھی نہ بھول سکوں لیکن اگر تم اجازت دو کہ میں تمہیں اپنی بہن سمجھتا رہوں تو اس سے میرا غم کچھ ہلکا ضرور ہو سکتا ہے۔"

"ایک مقدس رشتے سے انکار کون کر سکتا ہے۔ خدا نے مجھے بھائی سے محروم رکھا ہے۔ بھائی تو کیا میری کوئی بہن بھی نہیں ہے۔ آپ میرے بھائی بن جائیں گے تو میں سمجھوں گی....."

"بھائی بن جائیں گے؟ یہ کیا بات ہوئی؟ جب تمہاری غلط فہمی دور ہو گئی تو سمجھو کہ ہم بھائی بہن بن چکے اور اب تم مجھے آپ کہہ کر مخاطب نہیں کرو گی۔ تم تو میری ہم عمر معلوم ہوتی ہو لیکن میری مرحوم بہن مجھ سے ایک سال چھوٹی ہونے کے باوجود میرا نام ہی لے کر مخاطب کرتی تھی، کبھی مجھے آپ بھی نہیں کہتی تھی۔ ہم دونوں ساتھ ہی کھیل کود کر اور پڑھ لکھ کر بڑے ہوئے تھے۔"

"ٹھیک ہے۔" تزئین خفیف سا مسکرائی "اب میں آپ کو....."

"پھر وہی آپ!" آفتاب نے اسے ٹوکا۔

تزئین ہنس پڑی "جس بات کی عادت پڑ چکی ہو، اسے چھوڑنے میں کچھ دن تو لگیں گے نا۔"

"اچھا بیٹھو، بیٹھو! میں ابھی مٹھائی منگواتا ہوں۔ ہوٹل میں کام کرنے والے تمام افراد کو اس خوشی میں مٹھائی تو کھلانا ہی چاہیے۔"

"اتنی مٹھائی منگوائیں گے آپ؟..... مم..... میرا مطلب ہے..... تم....."

آفتاب ہنس پڑا "ہاں۔ یہ ضروری ہے۔ سب لوگوں کو ہمارے اس رشتے کا علم ہو جانا چاہیے تاکہ کسی وقت بھی ہم دونوں کو ساتھ دیکھ کر کوئی ہمیں شک کی نظر سے نہ دیکھے۔"

اور اس طرح وہ دونوں منہ بولے بھائی بہن بن گئے جس کا علم ہوٹل کے تمام افراد کو بھی ہو گیا۔

آفتاب رات کے وقت اپنی کار میں تزئین کو اس کے گھر چھوڑنے بھی جانے لگا۔

تزئین نے اس رشتے کے بارے میں تصور کو کچھ نہیں بتایا۔ اس کا خیال تھا کہ شرجیل ہی تصور کو بتا دے تو اچھا ہے مگر جب دو تین دن گزر گئے تو اسے شرجیل سے کہنا پڑا "آپ نے تصور کو میرے اور آفتاب کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"وہ مجھ کو سختی سے تاکید کر چکا ہے کہ میں اس سے ایسی کوئی بات نہ کیا کروں۔ جس کا تعلق تم سے اور ہوٹل سے ہو۔"

"یہی وہ مجھ سے کہہ چکے ہیں۔" تزئین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "انہیں اس کا بڑا دکھ ہے کہ میں ملازمت کر رہی ہوں۔"

شرجیل سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

حالات اسی طرح چلتے رہے مگر اچانک تزئین نے ایک عجیب سی بات محسوس کی۔ شرجیل جب گھر آتا تو اس سے کوئی بات نہیں کرتا تھا، صرف تصور سے باتیں کرتا رہتا تھا لیکن جب وہ ہوٹل میں ہوتی تو شرجیل اس سے معمول کے مطابق باتیں کیا کرتا تھا۔ آخر ایک روز وہ ہوٹل ہی میں شرجیل سے اس بارے میں استفسار کر بیٹھی۔

جواب میں شرجیل نے نرمی سے کہا "تم اپنے دماغ کو اس میں نہ الجھاؤ تزئین! بس کوئی وجہ ہے کہ میں جب گھر آتا ہوں تو تم سے بات نہیں کرتا۔ اگر کبھی کوئی مناسب موقع آیا تو میں تمہیں اس کا سبب بتا دوں گا۔"

تزئین کو چپ ہو جانا پڑا۔ وہ شرجیل پر کوئی دباؤ تو نہیں ڈال سکتی تھی لیکن اس کا ذہن اس میں الجھا ضرور رہا کہ آخر بات کیا ہے!

لیکن "بات" کا علم اسے نہیں ہو سکا اور اتنا وقت گزر گیا کہ اس نے "ایڈوانس" کے سلسلے میں ہوٹل کو درخواست دی جو منظور کر لی گئی اور جس دن اسے رقم ملی، وہ بے حد خوش خوش گھر پہنچی لیکن جب تصور کو اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی تو اس نے بس اتنا ہی سوچا کہ تصور کو اس بات کا بھی دکھ ہے کہ اس کی بیوی کو ہوٹل سے گویا "قرض" لینا پڑا تھا۔

دوسرے دن ناشتا کرتے وقت تصور اس سے ایک ایسی بات کر بیٹھا جو اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ بس اسٹاپ سے گھر تک کا راستہ زیادہ نہیں تھا لیکن اس نے یہ بات کہی تھی کہ اسے یعنی تزئین کو رات کے سناٹے میں وہ فاصلہ طے کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟

اس وقت پل بھر کے لیے اسے خیال آیا کہ تصور کو آفتاب کے بارے میں بتا دے لیکن پھر اس نے یہ بھی سوچ لیا کہ اب اسے یہ بات زبان پر نہیں لانی چاہیے، تصور خواہ مخواہ اس سوال میں الجھ کر خود کو ذہنی طور پر اور منتشر کر لے گا کہ تزئین نے اس سے یہ بات اتنے دن تک کیوں چھپائے رکھی۔

ڈیوٹی کے مقررہ وقت پر وہ ہوٹل چلی گئی۔ اس روز ہفتہ تھا۔ ہوٹل کے مختلف حصوں میں کئی پارٹیاں ہونے کی وجہ سے چہل پہل بڑھی ہوئی تھی۔ سب کام کرنے والوں کی مصروفیات بھی زیادہ تھیں۔ شرجیل نے آفتاب کی ڈیوٹی ایک ایسے ہال میں لگا دی تھی جہاں منعقدہ پارٹی ساڑھے بارہ بجے سے پہلے ختم نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ جب گیارہ بجے تزئین کی ڈیوٹی ختم ہوتی تو وہ اسے چھوڑنے کے لیے جا سکتا اور تزئین اس کا انتظار اس لیے نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے خیال کے مطابق دیر ہو جانے کی صورت میں تصور اس کے لیے پریشان ہو جاتا۔ ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد اس نے آفتاب سے بھی کہہ دیا کہ وہ اپنے شوہر کو پریشان نہیں کرنا چاہتی اس لیے آج بس سے ہی چلی جائے گی۔

آفتاب بھی اپنی ذمے داری کی وجہ سے مجبور تھا۔

تزئین نے ہوٹل سے نکل کر بس اسٹاپ کا رخ کیا۔ جب وہ

گھر پہنچی تو دروازہ کھولتے ہی یہ دیکھ کر ٹھٹک گئی کہ تصور وہیں کھڑا تھا۔

"کیا آج آپ یہاں میرا استقبال کرنے کے لیے کھڑے ہیں۔" تزئین کی ہنسی میں تھوڑی سی حیرت بھی تھی۔

"استقبال کرنے کے لیے نہیں بلکہ رخصت کرنے کے لیے۔" تصور کا لہجہ بہت سخت تھا۔ اس نے ایک چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس چادر میں سے اس کا ہاتھ باہر نکلا اور آگے بڑھا "یہ سنبھالو اور فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔"

غیر ارادی طور پر تزئین نے وہ لفافہ اس کے ہاتھ سے لے لیا لیکن دوسرے ہاتھ سے دروازہ بند کرکے تیز ہوتے ہوئے بولی "کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اتنی رات گئے آپ مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔"

"جہاں تمہارا دل چاہے۔" تصور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا "تم نے دروازہ کیوں بند کر دیا؟ دروازہ کھولو اور چلی جاؤ۔"

"آخر آپ کو ہو کیا گیا ہے تصور!" تزئین شدت سے حیرت زدہ تھی۔

"ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن اگر تم یہاں سے رخصت ہونے کے بجائے بحث کرتی رہیں تو پھر میرے منہ سے کچھ بھی نکل سکتا ہے۔ ابھی تو میں خود پر بڑی مشکل سے قابو پائے ہوئے ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ میں خود کو زیادہ دیر تک قابو میں نہیں رکھ سکوں گا۔ تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔"

"کیوں چلی جاؤں!" تزئین جھنجلا گئی "اگر آپ پر کسی قسم کا دورہ پڑ گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بھی پاگل ہو جاؤں اور آپ کے کہنے پر یہاں سے چلی جاؤں۔ آخر یہ میرا بھی تو گھر ہے۔"

"تم مجھ پر پڑنے والے اس دورے سے بے حد خوش ہوتیں لیکن آج تمہاری مجبوری یہ بن گئی ہے کہ آفتاب نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے۔"

"کیا!" تزئین کو جھٹکا سا لگا۔

"لیکن اس سے تمہارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" تصور کے ہونٹ کانپ رہے تھے "تم ابھی جوان ہو' حسین ہو۔ دس اور آفتاب مل جائیں گے تمہیں۔"

"آپ مجھ پر بہت گھٹیا اور گھناؤنا الزام لگا رہے ہیں۔" تزئین کو بھی غصہ آ گیا "اگر آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں تو آپ کو مجھ سے....."

"کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے تمہاری صفائی سننے کی۔" تصور یک لخت چیخ پڑا "میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھ سے نہ صرف بے وفائی کرو گی بلکہ ایک طوائف بن کر رہ جاؤ گی۔"

"تصور!" تزئین کی آواز کانپ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"میں کہتا ہوں فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔" تصور پھر چیخ پڑا۔ "کسی آفتاب کے پاس جاؤ یا کسی ماہتاب کے پاس لیکن مجھ سے دور ہو جاؤ۔ میں اب اس چھت کے نیچے تمہارا گھناؤنا وجود برداشت نہیں کر سکتا!"

تزئین اس وقت شدید کرب اور غصے کی کیفیت سے دوچار ہو چکی تھی لیکن اس کیفیت میں اس کے دماغ نے کام کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ تصور' آفتاب کے بارے میں کچھ جان کر کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی یہ غلط فہمی دور کرنا مشکل نہیں ہوتا لیکن اس وقت وہ آپے سے باہر ہوا جا رہا تھا اور تزئین نہیں چاہتی تھی کہ اس قسم کے شور شرابے کی بھنک بھی مہوش کے فلیٹ تک جائے۔

"تم ابھی تک گئیں نہیں!" تصور ہانپنے لگا۔

تزئین نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن اس نے بہتر یہی سمجھا تھا کہ اس وقت یہاں سے اس کا چلا جانا ہی بہتر ہو گا۔ دوسرے دن وہ شرجیل اور آفتاب کو اپنے ساتھ تصور کے پاس لا کر اس کی غلط فہمی دور کر سکتی تھی لیکن اس کے دل میں آیا ہوا یہ بال شاید کبھی نہ جاتا کہ تصور نے اسے طوائف تک کہہ ڈالا تھا۔

رات اب اتنی ہو چکی تھی کہ بس ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کو ایک رکشا مل گیا۔ رکشے میں بیٹھتے وقت وہ چونکی۔ تصور کا دیا ہوا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ ذہنی خلفشار میں وہ اس لفافے کی طرف دھیان ہی نہیں دے سکی تھی ورنہ شاید وہ اسے اپارٹمنٹ ہی میں پھینک کر باہر نکلتی۔

نہ جانے کیا تھا اس لفافے میں!

اب تزئین ہوٹل پہنچ کر ہی وہ لفافہ کھول کر دیکھ سکتی تھی۔ اس نے واپس ہوٹل ہی جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا کوئی اور ٹھکانا تھا بھی کہاں؟

آفتاب اس وقت تک ہوٹل سے رخصت نہیں ہوا تھا حالانکہ اس ہال میں اب سناٹا تھا جہاں آفتاب کی ڈیوٹی لگائی گئی تھی۔ وہ اس وقت شرجیل کے کمرے میں بیٹھا ہوٹل ہی کے امور پر گفتگو کر رہا تھا۔ تزئین کو دیکھ کر وہ دونوں چونک پڑے۔ آفتاب تو گھبرا کر کھڑا ہی ہو گیا اور بولا "خیریت تو ہے تزئین! ایسا لگ رہا ہے جیسے تم روتی ہوئی آ رہی ہو۔"

تزئین ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی اور پھر سچ مچ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آفتاب نے جلدی سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تاکہ اچانک کوئی وہاں نہ آ جائے پھر اس نے اور شرجیل نے تزئین کو چپ کرانے کی' اس کی ڈھارس بندھانے کی اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ تزئین نے سسکیاں لیتے ہوئے بمشکل سارا واقعہ سنایا۔

"کیا وہ پاگل ہو گیا ہے۔" شرجیل بڑبڑایا' پھر ایک طرف پڑا ہوا لفافہ اٹھاتا ہوا بولا "اس میں اس نے تمہیں کیا دیا ہے؟"

متفکر آفتاب نے تزئین سے کہا "تمہیں شروع ہی میں اپنے

شوہر کو میرے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا۔"
اس سے پہلے کہ تزئین کچھ کہتی شرجیل چونک کر بولا "ارے! اس لفافے میں تو رقم اور ایک لفافہ بھی ہے۔"
تزئین نے نوٹوں کی گڈیوں پر نظر ڈالی اور روہانسی آواز میں بولی "یہ وہی رقم معلوم ہوتی ہے جو کل مجھے ہوٹل سے ایڈوانس ملی تھی۔"
شرجیل نوٹوں کے ساتھ نکلا ہوا لفافہ کھولنے لگا۔
اور پھر اس لفافے میں سے جو کچھ نکلا، وہ تزئین کے لیے قیامت سے کم نہیں تھا!

○☆○

"اس لفافے میں طلاق نامہ تھا! تصور نے مجھے طلاق دے دی تھی۔" تزئین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور ہاتھ میں دبے ہوئے گلاس سے دو گھونٹ پانی پیا۔
صبح کے دس بجے تھے۔ تزئین ائر پورٹ جا کر عارفہ کو اپنے گھر لے آئی تھی اور اس وقت ڈرائنگ روم میں صرف وہی دونوں تھیں۔
عارفہ خاموشی سے اس کی کہانی سنتی رہی حالانکہ اس کا ذہنی انتشار بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ کسی طور بھی یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ شرجیل نے اپنے دوست کے ساتھ وہ شرمناک ڈراما کیوں کیا تھا جس کے نتیجے میں تزئین کو طلاق ہو جانا چاہیے تھی۔
اگر شرجیل تزئین کو طلاق دلوا کر خود اس سے شادی کرنا چاہتا تھا تو یہ ایک حیرت انگیز بات اس لیے سمجھی جا سکتی تھی کہ ایک مطلقہ لڑکی سے شادی کر کے شرجیل کو کیا فائدہ ہوتا! شرجیل ایک بڑے ہوٹل میں منیجر تھا۔ اسے کسی بھی غیر شادی شدہ لڑکی سے شادی کے مواقع ضرور حاصل ہوں گے اور تزئین اتنی حسین بھی نہیں تھی کہ شرجیل کو اتنی حسین کوئی لڑکی نہ مل پاتی۔ تصور سے شادی کر کے تزئین اپنے امیر والدین کو چھوڑ چکی تھی لہٰذا یہ امکان بھی نہیں تھا کہ شرجیل اس کے ذریعے اس کے والدین کی دولت کا مالک بن جاتا۔
تزئین پانی کے دو گھونٹ پی کر کسی سوچ میں ڈوب گئی تھی۔
"اس کے بعد کیا ہوا؟" عارفہ کے سوال نے اسے چونکایا۔
"آفتاب کو شدید غصہ آیا تھا۔" تزئین نے کہا "وہ اسی وقت تصور کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن شرجیل نے اسے سمجھایا کہ تصور اس کا نام ہی سن کر آگ بگولہ ہو جائے گا لہٰذا یہ رات گزرنے دی جائے۔ تصور کا غصہ کچھ کم ہوگا تو شرجیل خود جا کر اس سے بات کرے گا۔ اس پر میں نے شرجیل سے کہا کہ اب طلاق کے بعد تصور سے کچھ بات کرنے سے کیا حاصل ہوگا لیکن شرجیل چاہتا تھا کہ تصور کو اس کی غلط فہمی کا یقین دلا دے تاکہ تصور ساری زندگی اپنی اس غلطی پر پچھتاتا رہے۔"
اس موقع پر بھی عارفہ نے تزئین کو نہیں بتایا کہ وہ تصور سے مل چکی ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ پہلے تزئین اپنی ساری کہانی بیان کر ڈالے۔
تزئین نے بتایا کہ وہ رات اس نے ہوٹل ہی کے ایک کمرے میں گزاری تھی، ساری رات روتی رہی اور سوچتی بھی رہی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ہوٹل سے ایڈوانس ملی ہوئی رقم سے وہ کوئی چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لے گی اور اپنی باقی زندگی ملازمت کر کے ہی گزار دے گی۔
دوسرے دن اتوار ہونے کی وجہ سے اخبارات کے کلاسیفائڈ اشتہاروں کے کالم "کرائے کے لیے خالی ہے" کے عنوان سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں لہٰذا تزئین کا خیال تھا کہ وہ اگلے دن ہی اپنے لیے کوئی ٹھکانا ڈھونڈ لے گی۔
آفتاب صبح کے وقت ہوٹل نہیں آتا تھا مگر اس روز صرف تزئین کی خاطر آیا۔ شرجیل نے بھی کمرے میں آ کر اسے ناشتا کروایا اور پھر تصور سے ملنے چلا گیا۔
آفتاب کے استفسار پر تزئین نے اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کیا لیکن آفتاب کو اس کے فیصلے سے اتفاق نہیں تھا۔ اس کے خیال کے مطابق یہ بات صرف مغربی معاشرے میں ممکن تھی کہ کوئی خوب صورت لڑکی تنہا رہ کر زندگی گزارے لیکن تزئین اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔
دو گھنٹے بعد شرجیل آیا تو بہت غصے میں تھا۔ اس نے بتایا کہ جب اس نے تصور کو تزئین اور آفتاب کے منہ بولے رشتے کے بارے میں بتایا تو تصور نے فوراً کہا کہ تزئین جیسی عورتیں جب دیکھتی ہیں کہ ان کا راز کھل گیا ہے تو وہ اسی قسم کے رشتے تراش لیتی ہیں اور دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔
یہ سن کر تزئین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آفتاب کے چہرے پر غصہ نظر آنے لگا۔ اس نے شرجیل سے کہا "اسی بات کی وجہ سے آپ غصے میں ہیں۔ آپ کا جھگڑا بھی ہو گیا ہوگا۔"
"نہیں۔" شرجیل نے کہا "مجھے اس بات پر غصہ تو آیا تھا لیکن میں نے ضبط سے کام لیا تھا۔ جھگڑے سے کوئی فائدہ تو ہوتا نہیں۔ تصور نے تو اس سے بھی زیادہ گھٹیا باتیں کی تھیں لیکن میں اپنے غصے پر قابو پاتا رہا۔ میں نے اسے ایک گھنٹے تک سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی باتیں میرا غصہ بڑھاتی رہیں مگر میں نے خود کو قابو میں رکھا۔"
"لیکن آپ کے چہرے سے تو غصہ صاف ظاہر ہو رہا ہے۔" آفتاب بولا۔
"اس کے گھر سے نکلنے کے بعد ہی غصے کے آثار میرے چہرے پر آ گئے ہوں گے جو اس وقت بھی تم دیکھ رہے ہو۔" شرجیل نے جواب دیا اور پھر تزئین سے بولا "تمہارے بارے میں میرا اندازہ

ہے کہ تم بہت انا پرست اور خوددار ہو۔ ان حالات میں تم اپنے والدین کے پاس جانے کے لیے تو آمادہ نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک خیال ہے آپ کا!" تزئین نے کہا "کل رات سے پہلے تک تو میں سوچا کرتی تھی کہ میں کسی طرح اپنے والدین سے تعلقات استوار کرلوں لیکن رات کو میں نے سمجھ لیا ہے کہ اب میں ان کے لیے مرچکی ہوں۔" اس کی آواز بھرّا گئی "بدنامی کے اس داغ کے ساتھ ان کا سامنا کرنے سے بہتر تو میرے لیے یہ ہوگا کہ میں خودکشی کرلوں۔"

اس کے بعد تزئین نے شرجیل کو بھی اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا جو وہ آفتاب کو تو بتا ہی چکی تھی۔ آفتاب کی طرح شرجیل نے بھی اس کے اس فیصلے سے اتفاق نہ کیا اور معاشرے کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جو کسی بھی اکیلی لڑکی کے لیے کسی وقت بھی بے حد پریشان کن ثابت ہوسکتے تھے۔

آفتاب نے یہ پیشکش کی کہ تزئین اس کے ساتھ اس کے گھر چلی چلے۔ وہ اپنے گھر والوں کو اس کے بارے میں بتا بھی چکا تھا۔ اور وہ سب تزئین سے ملنے کے خواہش مند تھے۔ آفتاب نے کہا "تمہارے گھر میں تمہارے رہنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔"

"نہیں آفتاب!" تزئین نے سنجیدگی سے کہا "یہ تو ٹھیک ہے کہ ہم ایک دوسرے کے بہن بھائی بن چکے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم سگے بہن بھائی تو بہرحال نہیں ہیں۔ میں ساری زندگی تمہارے گھر میں کیسے رہ سکتی ہوں۔ میں خود کو ہمیشہ تم لوگوں پر ایک بوجھ سمجھتی رہوں گی۔"

اس وقت شرجیل نے آفتاب کی حمایت میں خاصی باتیں کہہ ڈالیں لیکن تزئین نے ان دونوں کی کوئی بات نہیں مانی۔

اسی دن کرائے کے ایک فلیٹ کا بندوبست کرلیا گیا اور تزئین نے ناغہ کیے بغیر اس رات بھی ہوٹل کی ڈیوٹی جوائن کی۔ اس نے آفتاب اور شرجیل سے درخواست کی تھی کہ ہوٹل کے کسی اور فرد کو یہ بات نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسے طلاق ہوچکی ہے۔

تزئین نے یہیں تک کے واقعات بیان کیے تھے کہ عارفہ بول پڑی "تمہارے کوئی عزیز بھی تو کراچی میں رہتے ہیں۔ کبھی کسی نے تمہیں اس ہوٹل میں نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔" تزئین نے کہا "دراصل میری اور تصور کی شادی سے چند دن پہلے ہی وہ سب لوگ امریکا شفٹ ہوگئے تھے۔ وہیں کوئی کاروبار کرلیا ہے انہوں نے۔"

"خیر! میں بلاوجہ تمہیں ٹوک بیٹھی۔ میں سارے واقعات سننے کے لیے بہت بے چین ہوں۔"

تزئین چند لمحے کچھ سوچتی رہی، پھر بولی "دو مہینے گزرتے گزرتے مجھے احساس ہوگیا کہ شرجیل اور آفتاب کے خدشات غلط نہیں تھے۔ میں نے کیونکہ کم کرائے کا فلیٹ ایک چھوٹے سے علاقے میں لیا تھا۔ وہاں کی عورتیں اس قسم کے فیشن نہیں کرتی تھیں۔ جیسا فیشن مجھے ہوٹل کی ملازمت کی وجہ سے کرنا پڑتا تھا۔ تصور کے گھر سے تو میں کچھ بھی لے کر نہیں آئی تھی لیکن ہوٹل سے ملنے والی رقم سے فلیٹ حاصل کرنے کے بعد میرے پاس کچھ رقم بچ گئی تھی جس سے میں نے بے حد ضرورت کے گھریلو سامان کے علاوہ چند اوسط درجے کی ساڑیاں اور میک اَپ کا سامان خرید لیا تھا۔ میرے فیشن کے علاوہ میری آمدورفت کا وقت بھی وہاں کے لوگوں کی نظر میں مشکوک تھا۔ حالانکہ میں نے کئی عورتوں کو بتا بھی دیا تھا کہ میں ایک بڑے ہوٹل میں ریسپشنسٹ ہوں لیکن میرا تنہا رہنا ان سب کی نظروں میں بے حد مشکوک تھا۔ مردوں نے تو شاید عورتوں کو یہ تاکید بھی کردی تھی کہ وہ مجھ سے نہ ملا کریں۔ خیر! اگر کوئی مجھ سے نہ ملتا تو مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ وہاں میرے بارے میں باتیں بھی بننے لگی تھیں جو میرے لیے بہت تکلیف دہ تھیں پھر یہ بھی شروع ہوگیا کہ اس محلے کے آوارہ لڑکوں نے مجھ پر آوازیں کسنی شروع کردیں۔ ایک رات میں ہوٹل سے لوٹی تو مجھ پر ایک ایسا فقرہ کسا گیا کہ گھر جا کے میں بے حد روئی اور دوسرے دن صبح ہی ہوٹل پہنچ کر شرجیل سے میں نے اعتراف کرلیا کہ اس کی اور آفتاب کی باتیں درست تھیں اور اب مجھے...... اس کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا کہ میں خودکشی کرلوں۔ شرجیل نے اسی وقت آفتاب کو فون کیا۔ آفتاب فوراً آگیا۔ شرجیل نے اسے ساری صورت حال بتائی اور پھر کچھ بہانہ کرکے کمرے سے چلا گیا۔ آفتاب نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ پریشانیوں کا آخری حل صرف خودکشی ہی نہیں ہوتا پھر اس نے خاصا گھما پھرا کر بات کرنے کے بعد یہ تجویز پیش کی کہ مجھے دوسری شادی کرلینا چاہیے۔ اس تجویز پر میرا سارا وجود جیسے شل ہو کر رہ گیا۔ یہ خیال میرے ذہن میں دور دور تک نہیں تھا۔ آفتاب کے کہنے سے مجھے خیال آیا کہ اگر میں خودکشی نہیں کرتی تو پھر میرے لیے یہی ایک راستہ ہے کہ دوسری شادی کرلوں۔"

"تمہیں کبھی تصور کا خیال نہیں آیا؟" عارفہ پوچھ بیٹھی۔

"آتا ہی رہتا تھا۔" تزئین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "شروع میں تو خیر میں بہت غصے میں تھی کہ تصور نے مجھے طوائف کہنے سے بھی گریز نہیں کیا تھا لیکن جب میرا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تو میں اکثر اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس سے مجھے محبت تو بہرحال تھی نا! اسی لیے مجھے یہ خیال ستاتا رہتا تھا کہ نابینا ہونے کے باعث اب تصور کی زندگی نہ جانے کیسے گزر رہی ہوگی جبکہ اس کے واحد دوست شرجیل نے بھی اس سے ملنا چھوڑ دیا تھا۔"

عارفہ کا دل شدت سے چاہا کہ شرجیل کو بُرا بھلا کہہ ڈالے مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ وہ تزئین کی ساری باتیں سنے بغیر کچھ نہیں کہنا چاہتی تھی۔

تزئین نے بتایا کہ اس نے فوری طور پر تو آفتاب کو کوئی جواب

نہیں دیا اور واپس اپنے فلیٹ چلی گئی لیکن چند دن بعد اس نے آفتاب کے دوبارہ استفسار پر اس سے کہا کہ ان چند دنوں میں اس نے خود کو ذہنی طور پر دوسری شادی کے لیے آمادہ تو کرلیا ہے مگر یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس کی شادی کیونکر ممکن ہے۔ وہ کسی کو بھی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتی لہٰذا جب کسی کو اس کے ماضی یا اس کے خاندان کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلے گا تو وہ اس سے شادی کے لیے کس طرح آمادہ ہوسکتا ہے۔

اس پر آفتاب نے کہا کہ' شرجیل صاحب کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"اوہ!" عارفہ پھر بے اختیاریوں بول اٹھی "تو پرنالہ یہیں آکر گرا۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔ تم مختصراً بتاؤ' کیا تم نے شرجیل سے شادی کرلی تھی؟"

"ہاں۔"

"تو اس وقت شرجیل کہاں ہے؟ اور تم اپنے گھر میں کیسے ہو؟"

"شرجیل سے شادی کے بعد میں نے ہوٹل کی ملازمت چھوڑ دی تھی۔" تزئین نے اپنے بیان کا تسلسل قائم رکھا "میں نے ہوٹل سے جو رقم ایڈوانس لی تھی' وہ شرجیل نے لوٹا دی تھی تاکہ اس کی ادائیگی کے لیے مجھے ملازمت جاری نہ رکھنا پڑے۔ میرے دل و دماغ نے تو شرجیل کو قبول نہیں کیا تھا لیکن میں اس صورت حال سے سمجھوتا کرنے کی پوری پوری کوشش کررہی تھی پھر کوئی پندرہ دن بعد شرجیل نے بڑے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ میرے لیے اس کے پاس ایک اچھی خبر بھی ہے اور بُری خبر بھی! اچھی خبر تو یہ تھی کہ میری والدہ نے اخبارات میں اشتہار چھپوائے تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں جس حال میں بھی تھی اور جہاں بھی تھی' وہاں سے ان کے پاس پہنچ جاؤں کیونکہ انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگانے کے لیے خاندان کی ناراضگی مول لینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اسی اشتہار میں یہ بات بھی لکھی تھی کہ کچھ دن ہوئے میرے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔"

"اوہ!" عارفہ چونکی۔ فطری طور پر تو اسے رسماً ہی سہی لیکن تزئین کے والد کے انتقال پر اظہارِ افسوس کرنا چاہیے تھا لیکن یہ بات جان کر اس کے ذہن میں کچھ اور ہی خیالات چکرانے لگے تھے۔

تزئین نے عارفہ کے اظہارِ افسوس نہ کرنے پر کوئی توجہ نہیں دی اور کہتی رہی "اشتہار میں یہ بات بھی تھی کہ والد کے انتقال کے صدمے نے انہیں بیمار ڈال دیا۔ میں تڑپ کر رہ گئی۔ میں اپنے والدین سے الگ ضرور ہوگئی تھی لیکن میرے دل سے ان کی محبت تو ختم نہیں ہوئی تھی۔ تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ والد کے انتقال کے بارے میں جان کر مجھ پر کیا گزری ہوگی پھر یہ کہ میری والدہ بھی بیمار تھیں۔ میں لاہور پہنچنے کے لیے بے قرار ہوگئی۔ ایک تو والد کا انتقال اور پھر میری والدہ خود مجھے اپنے پاس بلانا چاہتی تھیں لہٰذا میں شرجیل کے ساتھ فوراً لاہور آگئی۔ اس نے ہوٹل سے چند دن کی چھٹی لے لی تھی۔"

"تمہاری والدہ تو یہ سمجھ رہی ہوں گی کہ تم تصور کے ساتھ ہوگی۔"

"ہاں' لیکن جب میں نے انہیں اپنی ساری بپتا سنادی تو اس پر انہوں نے کسی بھی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اب میں اپنے مرحوم والد کا کاروبار سنبھال لوں لیکن میں نے کبھی اس قسم کے معاملات میں دلچسپی ہی نہیں لی تھی۔ مجھ سے ممکن نہیں تھا کہ .... وہ کاروبار سنبھال لوں جو والد کے انتقال کے بعد میرا ہوچکا تھا۔"

"خوب!" عارفہ نے ایک طویل سانس لی "تو اس طرح شرجیل تمہاری وجہ سے ایک بہت بڑے ادارے کا مالک بن گیا۔ اس وقت وہ غالباً دفتر گیا ہوا ہوگا مگر نہیں' آج تو اتوار ہے۔"

"ہاں۔" تزئین نے ٹھنڈی سانس لی "لیکن میں نہیں جانتی کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا؟"

○☆○

شرجیل اس وقت کراچی میں ایک پولیس اسٹیشن کی حوالات میں تھا۔ پولیس نے تصور کو بھی شبہے کے تحت حراست میں لے لیا تھا کہ اس نے ایک مجرم کو پناہ دی تھی۔

مہوش کا شوہر اس دن چھٹی کی وجہ سے گھر پر ہی تھا۔ اسے اس صورتِ حال کا علم ٹیلی فون پر ہوا۔ ٹیلی فون پولیس اسٹیشن سے کیا گیا تھا۔ تصور ہی نے انہیں مہوش کا ٹیلی فون نمبر دیا تھا۔

بچوں کو پڑوس کے ایک گھر میں چھوڑ کر دونوں میاں بیوی بوکھلائے ہوئے پولیس اسٹیشن پہنچے۔

ایس' ایچ' او نے ان سے کہا مجرم نے چونکہ مسٹر تصور کے گھر میں پناہ لے رکھی تھی اس لیے انہیں اس شبہے کے باعث حراست میں لیا گیا ہے کہ وہ اس جرم میں اپنے دوست کے شریک نہ ہوں مگر یہاں ان سے پوچھ گچھ کے دوران میں ہمیں اندازہ ہوچکا ہے کہ وہ ایک شریف آدمی ہیں اور اپنے دوست کے کرتوت سے بے خبر ہیں۔ اگر یہ کیس کراچی ہی کا ہوتا تو ہم انہیں چھوڑ دیتے لیکن سارا معاملہ لاہور کا ہے۔ لاہور پولیس کو شرجیل کی گرفتاری سے آگاہ کردیا گیا ہے۔ وہ لوگ مجرم کو لینے آج ہی یہاں پہنچ جائیں گے اور ممکن ہے وہ بھی مسٹر تصور سے پوچھ گچھ کرنا چاہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم انہیں کسی معزز شہری کی ضمانت پر رہا کریں۔ ہمارے اس اظہارِ خیال پر ہی مسٹر تصور نے ہمیں آپ کا ٹیلی فون نمبر دیا تھا۔ آپ کے بارے میں تفصیلات بھی بتائی تھیں۔ اگر وہ درست ہیں تو

آپ کی ضمانت پر انہیں رہا کیا جا سکتا ہے' بشرطیکہ آپ ضمانت دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"میں تیار ہوں۔" مہوش کے شوہر نے فوراً کہا۔

پھر ضمانت کی کارروائی کے دوران میں جو واقعات ان کے علم میں آئے' انہوں نے دونوں میاں بیوی کو چکرا کے رکھ دیا۔ ان کے لیے سب سے حیرت انگیز بات تو یہی تھی کہ شرجیل کی بیوی تزئین تھی۔ اس نے اپنے والد کے انتقال کے بعد ان کے کاروبار کی ساری ذمے داریاں شرجیل کو سونپ دی تھیں اور شرجیل نے کچھ دن بعد ہی کاروبار سے روپیا نکال نکال کر بیرون ملک منتقل کرنا شروع کردیا تھا اور آخر میں دفتر کی عمارت بھی فروخت کردی تھی۔ گزشتہ صبح اس نے گھر سے روانگی کے وقت اپنی بیوی کو بتایا تھا کہ ایک کاروباری مسئلے کی وجہ سے وہ دو دن کے لیے کراچی جا رہا ہے۔ اس وقت تزئین کو بالکل شبہ نہیں ہوا تھا کہ اس کا شوہر اب کبھی واپس نہ آنے کے ارادے سے جا رہا ہے۔ وہ بے چاری اپنی بیمار ماں کی تیمارداری میں مصروف رہا کرتی تھی۔ کاروبار میں تھوڑی بہت دلچسپی لینا تو کجا' اس نے کبھی دفتر کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے شوہر پر مکمل اعتماد تھا۔ اسے کبھی دفتر فون کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی کیونکہ شرجیل دوپہر ہی کو گھر آجایا کرتا تھا۔ لیکن گزشتہ روز اس نے کسی خاص وجہ سے شرجیل کو فون کیا تو دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی' کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد تزئین نے دفتر کے بورڈ کا نمبر ملایا۔ وہ آپریٹر سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ شرجیل کے ڈائریکٹ نمبر پر ریسیور کیوں نہیں اٹھایا جا رہا ہے لیکن اسے جب بورڈ سے جواب نہیں ملا تو وہ پریشان ہوکر اپنی کار میں دفتر پہنچی۔ پتا چلا کہ دفتر مقفل پڑا تھا۔ اب اس کی پریشانی بہت بڑھ گئی۔ اس نے گھر آکر اپنے مرحوم والد کی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ادارے کے جنرل منیجر کے گھر کا نمبر تلاش کیا۔ ٹیلی فون پر جنرل منیجر سے اس کی بات ہوگئی اور تب اسے پتا چلا کہ شرجیل اسے کتنا بڑا دھوکا دے گیا تھا۔ جنرل منیجر کے بیان کے مطابق شرجیل نے کاروبار کا چارج سنبھالنے کے بعد روپیا ادارے سے نکالنا شروع کردیا اور جنرل منیجر کو بھی بتادیا تھا کہ وہ یہ کاروبار بند کرکے کوئی دوسرا کاروبار شروع کرنا چاہتا ہے۔ لاہور چھوڑنے سے ایک دن قبل بھی وہ دفتر میں تھا اور اس روز سارے اسٹاف کے واجبات ادا کیے گئے تھے۔ اس کے اتنے پُرسکون انداز میں کام کرنے کی وجہ سے جنرل منیجر کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ یہ سب کچھ شرجیل بالا ہی بالا کر رہا تھا اور اس کی بیوی اس سے بے خبر تھی۔

واجبات کی ادائیگی کے بعد جب دفتر بند کیا گیا تو جن لوگوں نے دفتر خریدا تھا' انہوں نے وہاں اپنا تالا ڈال دیا۔ دفتر سارے فرنیچر کے ساتھ فروخت کیا گیا تھا۔

تزئین فوراً سمجھ گئی کہ شرجیل نے یہ سارا کام جب اس سے چھپا کر کیا ہے تو یقیناً اس کی نیت میں کوئی کھوٹ ہوگا اور اس نے وہ سارا روپیا بیرون ملک منتقل کرنے کے بعد خود بھی پاکستان سے فرار ہوجانے کی اسکیم بنائی ہوگی۔

غصے سے تزئین کا خون کھول اٹھا۔ اس نے شرجیل پر مکمل اعتماد اس لیے کرلیا تھا کہ اس کی دانست میں شرجیل نہ صرف شریف بلکہ اتنا دردمند انسان تھا کہ اس نے ایک مطلقہ سے شادی کرلی تھی لیکن تزئین کو اس پر صرف اعتماد ہی تھا' وہ اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔ اس نے بس حالات سے سمجھوتا کرلیا تھا لیکن شرجیل کی اس حرکت پر وہ آپے سے باہر ہوگئی اور اس نے پولیس اسٹیشن جاکر رپورٹ درج کرادی۔

لاہور پولیس نے فوری طور پر کراچی پولیس کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا جس کے بعد کراچی پولیس نے ائرپورٹ کی کڑی نگرانی شروع کردی۔ اس وقت تک بیرونِ ملک کے لیے کچھ فلائٹس پرواز بھی کرچکی تھیں لیکن پولیس نے تحقیقات کرلی تھیں کہ ان فلائٹس سے شرجیل نام کا کوئی آدمی بیرونِ ملک نہیں گیا۔

اس کے بعد پولیس نے تفتیش کا دائرہ بھی بڑھایا اور آخر کار دوسرے روز یہ پتا لگانے میں کامیاب ہوگئی کہ شرجیل نے تصور کی کوٹھری میں پناہ لے رکھی تھی۔

یہ بات مہوش اور اس کے شوہر کو پولیس سے نہیں معلوم ہوسکی کہ شرجیل نے ملک سے فرار ہوجانے کے بجائے تصور کے گھر میں کیوں پناہ لے رکھی تھی۔

"لاہور پولیس جب اس کی چمڑی ادھیڑے گی' تبھی وہ بہت کچھ بتائے گا۔" ایس ایچ او نے کہا تھا "ویسے ہم لوگ بھی نفسیاتی طریقے سے اس کی زبان کھلوانے کی کوشش کررہے ہیں۔ دراصل ہمیں اس کے سامان میں اس کا پاسپورٹ نہیں ملا۔ اس لیے ہمیں شبہ ہے کہ وہ عجلت میں یا تو اپنا پاسپورٹ لاہور ہی میں بھول گیا تھا یا پھر وہ کراچی آتے ہوئے راستے میں اس سے کہیں گم ہوگیا ہے۔ اب وہ یہاں اتنے دن چھپا رہنا چاہتا ہوگا کہ اس عرصے میں کسی فرضی نام سے دوسرا پاسپورٹ بنوالے۔"

اس کے بعد مہوش اور اس کا شوہر تصور کو اپنے ساتھ لے کر پولیس اسٹیشن سے روانہ ہوئے۔

"آخر یہ سب کیا معاملہ ہے تصور بھائی؟" مہوش بولی "آخر اس نے تزئین سے کیسے شادی کرلی؟"

"مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" تصور نے سپاٹ لہجے میں کہا "اس نے مجھ سے یہ بات چھپائی تھی کہ وہ تزئین سے شادی کرچکا تھا۔ کل رات وہ میرے پاس آیا تو اس نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا کہ اسے یورپ کے کسی ملک کے ہوٹل میں ملازمت مل رہی ہے اور اس کی روانگی میں کیونکہ دو تین روز لگیں گے اس لیے وہ یہ وقت میرے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔ مجھے اس کی ان باتوں پر کوئی شبہ تو نہیں ہوا تھا لیکن یہ بات میں نے ضرور محسوس کی تھی

کہ وہ کچھ پریشان تھا۔ بہرحال' اس نے تزئین کو دھوکا دیا ہے تو اسے اس کی سزا ملنی ہی چاہیے۔"

"کیا آپ کو تزئین سے ہمدردی ہے؟"

"ہاں۔" تصور نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "شروع میں تو مجھے اس پر بہت غصہ تھا لیکن میرا وہ غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ خیر! میں تم دونوں کا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے پولیس سے نجات دلائی۔ اب مجھے میرے گھر چھوڑ آؤ۔ میں خود کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔"

"شکر گزاری کی بات کر کے آپ غیریت کا اظہار کر رہے ہیں لیکن اس وقت میں آپ کو اپنے ہی گھر لے جاؤں گی۔ دو ایک دن میرے ہی گھر میں آرام کیجئے' پھر چلے جایئے گا۔ اس صورتِ حال نے آپ کے ذہن پر جو اثرات ڈالے ہوں گے' ان کی وجہ سے آپ کو چند دن تو اکیلے نہیں رہنا چاہیے۔"

تصور نے گریز کرنے کی بہت کوشش کی لیکن مہوش اسے اپنے گھر لے جا کر ہی مانی۔

"میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔ جب تک آپ چائے پئیں گے' میں آپ کے لیے .... کمرا ٹھیک کردوں گی۔ آپ کچھ دیر آرام کیجئے گا۔ اتنی دیر میں کھانا بھی تیار ہو جائے گا۔"

○☆○

جو کمرا تصور کے لیے تیار ہوا تھا' وہاں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے کھانا کھایا اور پھر اسی کمرے میں چلا گیا۔ اس کا بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا کہ کسی سے باتیں کرے۔ اس کے دماغ میں خیالات کا ایک طوفان امنڈ رہا تھا لیکن وہ کسی نتیجے تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔

ساڑھے چار بجے مہوش اس کے کمرے میں آئی "تصور بھائی! آپ تزئین کی دوست عارفہ سے مل چکے ہیں نا؟"

"ہاں۔ کیوں!" تصور چونکا۔

"وہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہیں۔"

تصور بستر سے اٹھ گیا تھا۔ مہوش اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ اس نے عارفہ کی آواز سنی جس نے اسے سلام کیا تھا۔ تصور نے سلام کا جواب دیا اور بولا "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں۔"

"آپ اپنے گھر پر نہیں تھے اس لیے میں سمجھ گئی کہ آپ یہیں ہوں گے۔ مجھے پولیس اسٹیشن سے معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کی ضمانت کس نے کرائی ہے۔"

"اوہ! تو آپ کو حالات معلوم ہو چکے ہیں؟"

"کل آپ سے باتیں کرنے کے بعد میں تزئین سے ملنے کے لیے اتنی بے چین تھی کہ آج صبح ہی کی فلائٹ پکڑ کر لاہور پہنچ گئی تھی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا تھا کہ تزئین وہاں ہے؟"

"مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ میں نے کراچی ہی سے اس کے گھر فون اس لیے کیا تھا کہ شاید اس کے گھر والوں کو اس کے بارے میں کچھ علم ہو پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ وہیں ہے تو میں نے اس تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ دراصل مجھے آپ کی کہانی سن کر اس بات پر یقین نہیں آیا تھا کہ تزئین کا کردار اتنا گھٹیا ہو سکتا ہے لیکن آپ نے اس پر اس لیے یقین کر لیا کہ آپ کو اپنے دوست شرجیل پر اعتماد تھا۔ ساری بات تو تزئین کی کہانی سن کر میری سمجھ میں آئی ہے۔ شرجیل نے دولت کے لیے بہت گھناؤنی سازش کی تھی۔"

"سازش؟"

"جی ہاں' سازش! اب سنئے کہ مجھے تزئین سے کیا معلوم ہوا ہے۔" عارفہ نے کہا اور تصور کا جواب سنے بغیر وہ واقعات بیان کرنا شروع کر دیے جو اسے تزئین سے معلوم ہوئے تھے۔

تصور دم بخود بیٹھا سب کچھ سنتا رہا۔ سب کچھ بیان کرنے کے بعد عارفہ نے تلخی سے کہا "شاید آپ سوچیں کہ تزئین نے مجھے گھڑ کر ایک کہانی سنادی ہے لیکن کیا آپ اس کا جواب دے سکیں گے کہ شرجیل نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کیوں کی جس کے بارے میں وہ آپ کو بتاتا رہا تھا کہ وہ بدکردار تھی؟ مجھے یقین ہے کہ آپ اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ دوسری بات یہ کہ آپ چاہیں تو ابھی میرے ساتھ ہوٹل چل کر اس کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ تزئین نے وہ رقم آفتاب سے نہیں' ہوٹل سے ایڈوانس لی تھی۔ ہوٹل والوں کو اس معاملے میں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں

ہوگی پھر یہ کہ وہاں کے ریکارڈ میں اس کا اندراج بھی ہوگا اور یہ بات بھی درج ہوگی کہ وہ رقم شرجیل ہی نے واپس کی تھی۔"

"لیکن اس نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟" تصور کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔

"تزئین کی دولت حاصل کرنے کے لیے۔"

"اس وقت تو تزئین دولت مند نہیں تھی۔"

"تھی۔" عارفہ نے زور دے کر کہا "دراصل اس کی والدہ کی طرف سے وہ اشتہار انہی دنوں میں چھپا تھا جب شرجیل نے آپ کے سامنے تزئین سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ اشتہار دیکھنے کے بعد ہی اس نے وہ ڈراما کھیلنا شروع کیا تھا کہ آپ اسے طلاق دے دیں۔ آفتاب اور تزئین کا بھائی بہن بن جانا بھی اسے بہت راس آیا۔ اسی کو اس نے اپنے ڈرامے کی بنیاد بنایا اور جس روز آپ سے اس نے یہ کہا تھا کہ آفتاب نے تزئین کو ٹھکرا دیا ہے اس دن اس نے آفتاب کو ہوٹل کے کاموں میں پھنسا دیا تھا۔ مقصد یہی تھا کہ جب وہ تزئین کو چھوڑنے نہ جائے تو آپ کو اس بات پر یقین آجائے کہ وہ تزئین کو ٹھکرا چکا ہے۔ میرے پاس اس وقت بھی اخبار موجود ہے جو تزئین کی والدہ نے چھپوایا تھا۔ اس پر اس کی اشاعت کی جو تاریخ درج ہے وہ میں مہوش بی بی اور ان کے شوہر کو دکھا چکی ہوں۔ آپ ان سے وہ تاریخ پوچھ لیں؟"

"عارفہ ٹھیک کہہ رہی ہیں تصور بھائی!" مہوش بولی۔

"میں یہاں ایک گھنٹے سے ہوں۔" عارفہ بولی "ان دونوں میاں بیوی کو میں نے سارا قصہ سنا دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تزئین نے وہ اخبار محفوظ رکھا تھا۔ اس اخبار سے تزئین کی سمجھ میں تو وہ سازش نہیں آسکی تھی لیکن میں اس لیے سمجھ گئی کہ آپ سے سارے واقعات سن کر گئی تھی۔"

"اُف خدایا!" تصور نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا "میں تزئین کے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کر بیٹھا۔"

"بھول جائیے کہ آپ کیا کر بیٹھے تھے؟ خود تزئین کو بھی سب کچھ جاننے کے بعد کوئی گلہ نہیں رہا ہے۔ آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا وہ شرجیل کی باتوں سے دھوکا کھا ہی جاتا۔ آپ تو اب مجھے یہ بتائیے کہ اپنی اس غلطی کا ازالہ کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟"

"میں اب اس کا کیا ازالہ کرسکتا ہوں!" تصور اپنا ہونٹ کاٹنے لگا۔

"آپ دونوں پھر ایک دوسرے کو اپنا لیجیے اور ان سب تلخیوں کو بھول جائیے۔"

تصور نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔

"خوب!" عارفہ قدرے رک کر تلخی سے بولی "آپ ایک ایسی لڑکی کو اپنی بیوی نہیں بنانا چاہتے جو کچھ عرصے آپ کے دوست کی بیوی بن کر رہ چکی ہے۔"

"خدا کی قسم میں یہ نہیں سوچ رہا تھا۔" تصور نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "اگر وہ کسی دوسرے کی بیوی بنی تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ساری غلطی تو میری تھی۔ اسے دوبارہ اپنانے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے حالانکہ اسے اپنا کر میں ساری زندگی اس سے شرمندہ ہی رہوں گا لیکن کیا وہ اس شخص کو دوبارہ اپنانے کے لیے تیار ہوگی جس نے اس کی محبت کی اتنی بُری طرح تذلیل کی ہو۔"

"میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ سارے حالات جاننے کے بعد اسے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ وہ آپ سے دوبارہ شادی کے لیے تیار ہے۔"

"لیکن وہ شرجیل کی بیوی ہے۔"

"اب نہیں رہے گی۔" عارفہ نے کہا "وہ ایک ایسے شخص کی بیوی بن کر کیسے رہ سکتی ہے جس نے اس کے ساتھ ایک خوفناک زیادتی اور اتنا بڑا فراڈ کیا ہو۔ وہ اس سے طلاق لے لے گی۔ عدالت کے ذریعے بھی شرجیل کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ تزئین کو طلاق دے دے۔"

"اگر میں اس طرح اپنی غلطی کا ازالہ کرسکا تو خود کو خوش قسمت سمجھوں گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔" عارفہ نے کہا "اب میں مہوش بی بی اور ان کے شوہر کو لے کر دوسرے کمرے میں جارہی ہوں۔ آئندہ کا لائحۂ عمل آپ خود تزئین سے طے کرلیں۔"

"کیا۔ مطلب!" تصور چونکا۔

"میں لاہور میں تزئین کے پاس ہی تھی جب لاہور پولیس نے فون کرکے تزئین کو بتایا کہ کراچی میں شرجیل کو گرفتار کیا جاچکا ہے اور تصور کو بھی شبہے میں حراست میں لے لیا گیا ہے تو تزئین یہ سن کر تڑپ اٹھی کہ آپ کو بھی حراست میں لے لیا گیا ہے۔ اسی لیے وہ بھی دوپہر کی فلائٹ سے میرے ساتھ کراچی پہنچی تھی کہ آپ کو پولیس کی گرفت سے آزاد کرلے۔"

اس کے بعد قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ مہوش اپنے شوہر اور عارفہ کے ساتھ اس کمرے سے جارہی تھی۔

اس احساس سے تصور کا سر جھک گیا کہ تزئین بھی وہاں موجود تھی۔

قدموں کی آہٹیں معدوم ہوتے ہی تصور کو یوں لگا جیسے کوئی دوڑ کر اس کے قریب آیا اور قالین پر بیٹھ کر اس کے پیروں سے لپٹ گیا پھر تصور نے تزئین کی سسکیاں بھی سنیں۔

تصور کے دونوں ہاتھ تزئین کے شانوں پر پہنچ گئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ اس کے رُندھے ہوئے گلے میں اٹک گئے۔ تزئین کے شانوں پر اس کے دونوں ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔

عارفہ نے ان دونوں کے لیے تجدیدِ ماضی کا آغاز بڑے ڈرامائی انداز میں کروایا تھا۔



مدفون ماضی

چہرہ در چہرہ

ازالہ

انوکھا سودا

دشمن وفا